خطباتِ صدیقی

ایمانیات • عبادات • اصلاح وتربیت

اور اجتماعی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

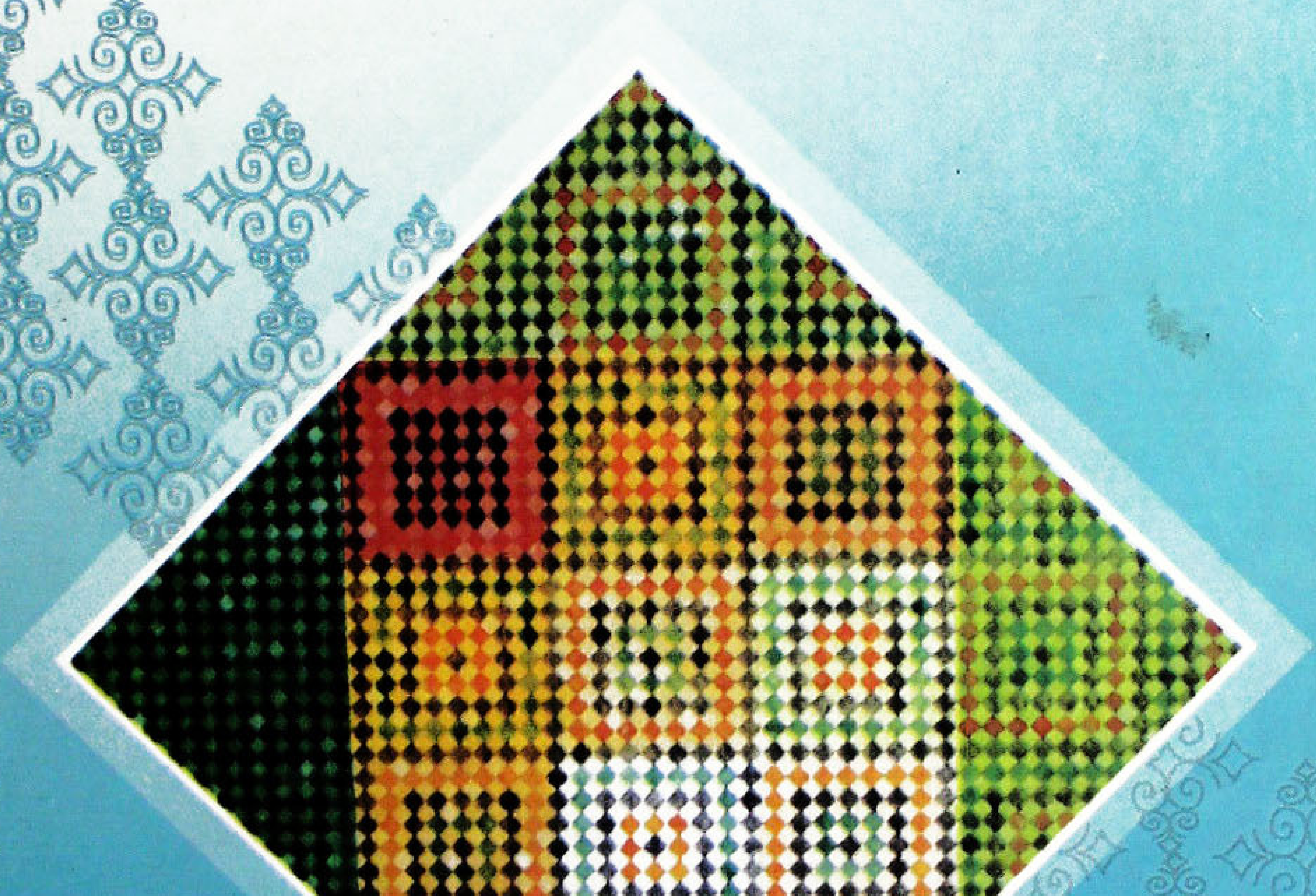

نشریات

Marfat.com

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ

کیا ایمان والوں کے لئے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد میں گڑگڑائیں؟ (الحدید)

هُدًى لِّلنَّاسِ

فہم دین کی تسہیل کے لئے مؤثر پیرائیہ بیان میں

خطباتِ صدیقی

مؤلف

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

فاضل درسِ نظامی، ایم اے، پی ایچ ڈی

نشریات

الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور۔ فون: 0321-4589419

Marfat.com

۲۹۷۶۱۸
ص ع ع خ
114089
را

جملہ حقوق محفوظ
۲۰۱۳ء

نام کتاب: ——— خطباتِ صدیقی

مصنف: ——— مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

اہتمام: ——— نشریات

مطبع: ——— شفیق پریس

صفحات: ——— ۵۵۱

جلد ساز: ——— بنیامین

ڈسٹری بیوٹرز

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اُردو بازار، لاہور فون: 37320318 فیکس: 37239884
ای میل: Kitabesaray@hotmail.com

فضلی
فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 32212991-32629724

Marfat.com

ترتیب

- تقریظ: مولانا مفتی عبدالمجید صاحب ۱۸
- 1- اسلامی تہذیب اور بِسْمِ اللّٰهِ ۲۱
- بِسْمِ اللّٰهِ کی اس قدر تاکید کیوں؟........ ۲۴
- صرف شریعت کے مطابق کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیے........ ۲۶
- برکت کا اصل مفہوم........ ۲۶
- بِسْمِ اللّٰهِ کا مفہوم........ ۲۸
- قرآن میں بِسْمِ اللّٰهِ کی اصل جگہ اور اہلِ علم کی رائے........ ۲۹
- 2- سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ سے متعلق چند حقائق ۳۰
- اسلوب سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ........ ۳۰
- اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ........ ۳۲
- 3- صفتِ ربوبیت ۳۶
- رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ........ ۳۶
- الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ........ ۳۸
- رحمت کا مفہوم........ ۴۰
- 4- روزِ جزا و سزا کا مالک ۴۴
- مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ........ ۴۴
- اِيَّاكَ نَعْبُدُ........ ۴۸
- وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ........ ۵۰
- 5- اعتراف سے دُعا تک کا سفر ۵۳

Marfat.com

اَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِمۡ سے مراد ۵۸
نبی ٦۰
صدیق ٦١
شہید ٦٢
صالحین ٦٣
مَغۡضُوۡبِ عَلَيۡهِمۡ ٦٤
ضَآلِّيۡنَ سے مراد ٦۵
مَغۡضُوۡبِ اور ضَآلِّيۡنَ کی مثال دینے سے مقصود کیا ہے؟ ٦٦
خلاصۂ سورۃ ٦٦
6- تقویٰ کا مفہوم اور تقویٰ کے مدارج ٦٨
هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ ٦٨
ہدایت اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے ٧١
7- ایمان بالغیب ٧٣
اَلَّذِيۡنَ يُؤۡمِنُوۡنَ بِالۡغَيۡبِ ٧٣
ایمان بالغیب کے حوالے سے بعض باتیں ٧٨
8- اقامتِ صلوٰۃ ٨٦
وَيُقِيۡمُوۡنَ الصَّلٰوةَ ٨٦
اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ٨٩
نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے ٩١
9- انفاقِ رزق، وحیِ الٰہی اور آخرت پر یقین ٩۵
ختم نبوت کی طرف اشارہ ١٠٢
ایمان اور ایقان میں فرق ١٠۵

Marfat.com

11- قرآنِ کریم کا چیلنج ۱۱۹
بتوں کو عذاب دینے کی وجہ ۱۱۹
وجوہِ اعجاز ۱۲۱
الفاظ کا اعجاز ۱۲۱
ترکیب کا اعجاز ۱۲۵
اسلوب کا اعجاز ۱۲۵
12- قرآن کریم کی پیشگوئیاں ۱۲۸
قرآنِ کریم کے انکشافات ۱۳۲
13- بعثت رسول ﷺ کے تین مقاصد ۱۳۷
تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے کی وجہ ۱۳۷
آیاتِ قرآنی کی تحقیق ۱۳۹
تعلیمِ کتاب وحکمت ۱۴۰
حکمت کیا ہے؟ ۱۴۱
تزکیۂ نفوس کا مفہوم ۱۴۲
تزکیہ کے لیے صحبتِ صالح ضروری ہے ۱۴۵
کیفیت سے کیفیت پیدا ہوتی ہے ۱۴۶
14- صبر اور نماز سے استعانت ۱۴۸
آیت کا پیش منظر ۱۵۰
خطرات اور مشکلات کا علاج ۱۵۰
نماز سے مدد ۱۵۳
15- اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا مفہوم اور اس کے تقاضے (حصہ اول) ۱۵۶
البر کا مفہوم ۱۵۷
وفاداری کے ایفاء کے لیے تین ناگزیر باتیں ۱۵۸
16- حُبِّ دُنیا میں بے اعتدالی بہت سی خرابیوں کا باعث ہے (حصہ دوم) ۱۶۳
آنحضرت ﷺ کی پریشانی کا حقیقی سبب ۲۶۴

Marfat.com

علیٰ حبہ کا مفہوم ۱۶۶
قرابتداروں پر خرچ کرنا ۱۶۸
یتیموں مسکینوں کی دیکھ بھال ۱۶۹
مسافر کی مدد ۱۶۹
السآئلین ۱۷۰
وَفِی الرِّقَاب ۱۷۰
17- اپنے آپ کو ہمہ تن دین کے سپرد کرنے کا نام ایمان ہے ۱۷۸
سِلْم کا مفہوم ۱۷۸
منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت ۱۷۸
طاغوت سے مراد ۱۸۰
کَآفَّةً کا مفہوم ۱۸۰
اسلام مکمل نظام حیات ہے ۱۸۳
18- تیسری طلاق کے احکام ۱۸۴
ایک ساتھ تین طلاق دینا سخت گناہ ہے ۱۸۶
ایک ساتھ تین طلاقیں بھی تین ہی واقع ہوتی ہیں ۱۸۶
ایک غلط فہمی کا ازالہ ۱۸۸
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے پیدا ہونے والے دو سوال اور ان کا جواب ... ۱۹۰
19- آیت الکرسی بیانِ توحید کا شاہکار ۱۹۴
اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۱۹۶
سِنَةٌ ..... نَوْمٌ ۱۹۷
شفاعت کی وضاحت ۱۹۹
شفاعتِ کبریٰ ۲۰۱
شفاعت کا غلط تصور اور اس کی تردید ۲۰۲
کرسی کا مفہوم ۲۰۴
اقتدارِ الٰہی کی ہمہ گیری ۲۰۵

Marfat.com

⊡ 20- بنی اسرائیل کی منصبِ امامت سے معزولی اور امتِ مسلمہ کا تقرر ۲۰۶
امتِ مسلمہ کی صفات ۲۰۷
اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا مفہوم ۲۰۸
⊡ 21- سود کی حقیقت، نقصانات حرمت اور دیگر تفصیلات (حصہ اول) ۲۱۴
ربطِ کلام ۲۱۴
تُعْرَفُ الْاَشْیَآءُ بِاَضْدَادِهَا ۲۱۵
سود کھانے والوں کا انجام ۲۱۶
سود اور ربا کا مفہوم ۲۱۸
عہد نبوت کو سمجھنے میں کوتاہی ۲۲۰
ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی تھا ۲۲۱
عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی مثال ۲۲۲
بینکنگ انٹرسٹ بھی حرام ہے ۲۲۲
تجارت اور سود میں فرق ۲۲۳
⊡ 22- سود کے نقصانات (حصہ دوم) ۲۲۸
مشارکت ۲۳۰
اجارہ ۲۳۱
مرابحہ ۲۳۱
امرہ الی اللہ کا مفہوم ۲۳۱
صدقات کے بڑھنے اور سود کے گھٹنے کا مفہوم ۲۳۳
سود کے مضر اثرات مختلف پہلوؤں سے ۲۳۴
معاشی نقطۂ نظر سے ۲۳۷
⊡ 23- رسولوں کی عزت وحرمت اور اللہ کی غیرت اس معاملے میں اہلِ کتاب کا رویہ ۲۴۱
یہود کی قومی شخصیت کی شناخت ۲۴۲
پیغمبروں کی توہین یہود کے ملی مقاصد میں شامل ہے ۲۴۴
عیسائی بھی یہود کے ہمنوا ہیں ۲۴۴

Marfat.com

یہود کی طرف سے مجلسی الفاظ کا غلط استعمال ۲۴۶

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے ۲۴۹

□ 24- رسول کا حقیقی مقام و مرتبہ ۲۵۱

وَ رَبِّكَ کا معنی و مفہوم ۲۵۴

ایمان کے ثبوت کے لیے تین شرائط ۲۵۵

□ 25- سلام مسلمانوں کی ثقافت کا آئینہ دار ۲۵۸

سلام مسلمان کی شناخت ۲۵۹

سلام کا مفہوم اور اس کی جامعیت ۲۶۰

سلام ملاقات کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی ۲۶۴

سلام کے لیے کچھ ضوابط ۲۶۵

□ 26- بحیثیت امت مسلمہ ہماری اصل ذمہ داری ۲۶۸

كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ کا مفہوم ۲۷۱

□ 27- صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کے حکم کا مفہوم ۲۷۵

سابقہ آیت کے اصحاب ایمان کے کردار کی تصویر ۲۷۷

منافقین کی پہلی علامت ۲۸۰

منافقین کی دوسری علامت ۲۸۲

□ 28- حقِ امانت کی ادائیگی اور عدل و انصاف کی پاسداری ۲۸۳

آیات کا شانِ نزول ۲۸۴

امانت کا مفہوم ۲۸۵

نااہلوں کو امانت سپرد کرنا خرابی کا اصل سبب ہے ۲۸۷

امانت کی اہمیت ۲۸۹

حق امانت میں عدل و انصاف پر زور ۲۸۹

□ 29- اسلامی اجتماعی زندگی کے اساسی اصول ۲۹۲

تمہیدی کلمات ۲۹۲

تین نظام ہائے حکومت ۲۹۳

Marfat.com

اصل خرابی انسان کو غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے ۲۹۴

اسلام میں امر و اطاعت کے مراکز ۲۹۸

اولوالامر سے کیا مراد ہے؟ ۳۰۱

اختلاف کی صورت میں آخری مرجع اور سند ۳۰۵

⊡ 30- ہدایت کے حوالے سے انتہائی توجہ طلب امور ۳۰۶

عذابِ الٰہی کے تدریجی مراحل ۳۰۶

دل کی سختی سے مراد ۳۰۸

مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے مراد: ۳۱۴

آج اللہ ظالم قوتوں کی جڑ کیوں نہیں کاٹ رہا؟ ۳۱۷

⊡ 31- لباس کے حوالے سے نہایت اہم ہدایات ۳۱۹

بنی آدم! اپنے باپ سے ابلیس کی دشمنی کو مت بھولنا ۳۱۹

لباس سے مقصود ستر پوشی بھی ہے اور زینت بھی ۳۲۱

اصل مقصود لباسِ تقویٰ ہے' کی وضاحت ۳۲۲

شیطان کا اصل ہدف لباسِ تقویٰ ہے ۳۲۴

شیطان کی چال ۳۲۶

آباؤ اجداد کے طرزِ عمل سے استدلال ۳۲۷

قریش کی دلیل کا جواب ۳۲۸

⊡ 32- آیات کے تناظر میں اصلاح و تربیت کے دو مؤثر طریقے ۳۳۰

داخلی احساسات پر اللہ کی نوازش ۳۳۷

اہلِ جنت کا جذبۂ شکر و سپاس ۳۳۹

⊡ 33- حضرت موسیٰ کی دُعا کے مصداق اور آنحضرتؐ کی صفات کی وضاحت ۳۴۲

امر بالمعروف نہی عن المنکر ۳۵۲

طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرے گا ۳۵۴

بوجھ اتارے گا اور بیڑیاں کاٹے گا ۳۵۵

⊡ 34- دُنیا اور آخرت میں کامیاب لوگوں کی چند صفات ۳۵۶

Marfat.com

قرآنِ کریم سے ایمان کی وضاحت ۳۵۶
ایمان کی تشریح حدیث سے ۳۶۲
آپ ﷺ کا احترام ۳۶۷
آپ ﷺ کی نصرت ۳۶۹
آپ ﷺ کی نصرت و حفاظت ۳۷۰
قرآن کا اتباع ۳۷۲
35- اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت اور اس کی اساسات ۳۷۴
پانچ بنیادیں ۳۷۶
معاہدے کا احترام ضروری ہے ۳۸۲
مسلمانوں کی مندرجہ بالا بنیادوں پر تشکیل کیوں ضروری ہے؟ ۳۸۴
36- اللہ تعالیٰ کا انسانِ مطلوب ۳۸۸
انسانِ مطلوب کا سراپا ۳۸۸
تین صفات پر تین بشارتیں ۳۹۵
37- آنحضرت ﷺ کا اسوہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ۳۹۹
مخلص مومنوں کا رویہ ۴۰۰
مردانِ خاص کا طرزِ عمل ۴۰۳
38- اپنی ذات اور اپنے اہلِ خانہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ ۴۰۴
39- اسلامی معاشرت کے چند آداب ۴۱۴
پردے کے بارے میں چند احکام ۴۱۷
40- پردے کے احکام میں ترتیب و تکمیل ۴۲۰
گھروں میں داخل ہونے کے بعد کی احتیاطیں ۴۲۱
غضِ بصر میں استثناء ۴۲۳
حفظِ فروج کا مفہوم ۴۲۴
گھر کے اندر عورتوں کو ہدایات ۴۲۶
وہ لوگ جن کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں ۴۲۸

Marfat.com

مخفی زینت کے اظہار کی ممانعت ۴۳۲
زینت کے مفہوم میں وسعت ۴۳۳
41- چند غور طلب اور فیصلہ کن باتیں ۴۳۴
اولوالالباب کی پہلی صفت ۴۳۶
عہدِ الست کا مفہوم ۴۳۷
دوسری صفت ۴۴۲
تیسری صفت ۴۴۴
چوتھی صفت ۴۴۵
پانچویں صفت ۴۴۵
چھٹی صفت ۴۴۶
ایسے اولوالالباب کا انجام ۴۴۷
ان کا اعزاز ۴۴۸
42- کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کا تقابل اور دونوں کے فطری اور طبعی نتائج ۴۴۹
کلمۂ خبیثہ کی وضاحت ۴۵۲
کلمہ طیبہ مومن کے لیے ثباتِ قدم کا باعث ہے ۴۵۳
43- عدل احسان اور اہلِ قرابت کے حقوق اور بے حیائی گمراہی اور سرکشی سے متعلق احکام وہدایات ۴۵۵
سابقہ آیات سے ربط ۴۵۵
اس آیت کی اہمیت ۴۵۷
عدل کا مفہوم ۴۵۸
احسان کا مفہوم ۴۵۹
اہلِ قرابت کو دینے کا حکم ۴۶۱
فحشاء کا مفہوم ۴۶۳
منکر کا مفہوم ۴۶۴
بغی کا مفہوم ۴۶۵

Marfat.com

⊡ 44- مسلمانوں کو جہاد کی اجازت ۴۶۶
اجازت کا سبب ۴۶۸
جہاد کی حکمت ۴۷۱
الفاظ کی وضاحت ۴۷۲
⊡ 45- امتِ مسلمہ کا منصب ۴۷۴
مطلوبہ صفات کی تیاری کی ہدایت ۴۷۴
نماز کا حکم ۴۷۵
اللہ کی اطاعت ۴۷۶
خلقِ خدا کی خدمت ۴۷۷
جہاد کا مفہوم اور اس کی اقسام ۴۷۸
جہاد کے حکم کا سبب ۴۷۹
دین میں حرج نہ ہونے کا مفہوم ۴۸۰
امتِ مسلمہ کے وجود کا مقصد ۴۸۱
⊡ 46- حضرت سلیمان علیہ السلام کی شخصیت کا ایک پہلو اور مسئلۂ تصویر کی وضاحت ۴۸۴
تماثیل کے مفہوم کی وضاحت ۴۸۵
اعتراضات کا جواب ۴۸۸
جِفَانٍ وَقُدُوْرٍ کا مفہوم ۴۹۰
نعمتوں پر شکر لازم ہے ۴۹۱
⊡ 47- کتاب اللہ کے منتخب وارث ۴۹۳
منتخب حاملین کے تین طبقات ۴۹۵
اِن منتخب لوگوں کا انجام ۴۹۷
⊡ 48- زندگی میں بے اعتدالی سے محفوظ لوگ اور ان کی صفات ۴۹۹
پہلی صفت مداومت کا مفہوم ۵۰۰
دوسری صفت انفاق ۵۰۱
تیسری صفت روزِ جزاء کا یقین ۵۰۲

Marfat.com

نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف	۵۰۳
چوتھی صفت کردار کی پاکیزگی	۵۰۴
ایک غلط فہمی کا ازالہ	۵۰۵
متعہ کا رد	۵۰۶
اہلِ تشیع کی جسارت	۵۰۷
پانچویں اور چھٹی صفت امانتوں اور عہد کی پاسداری	۵۰۷
اہلِ ایمان کی ایک اور صفت	۵۰۸
ساتویں صفت ادائے شہادت	۵۰۹
آٹھویں صفت نماز کی محافظت	۵۱۰
مذکورہ اوصاف کے حاملین کا انعام	۵۱۱
49- آنحضرت ﷺ کا مقصدِ بعثت اور اس کے تقاضے	۵۱۳
انذار کا پہلا حکم سب سے بڑے بگاڑ کی اصلاح ہے	۵۱۴
ثیاب کا مفہوم	۵۱۶
رُجْز کا تلفظ اور مفہوم	۵۱۸
مَن اور اِسْتِکْثَارُ کا مفہوم	۵۱۸
صبر کا مفہوم	۵۲۰
50- انسانی بگاڑ کا اصل سبب اور اس کے مسائل کا حل	۵۲۲
لہو اور تکاثر کا مفہوم اور تکاثر سے مراد	۵۲۲
کثرت کی خواہش موت تک جاری رہتی ہے	۵۲۵
تکاثر کی ہوس کامیابی نہیں	۵۲۶
غفلت کا اصل سبب	۵۲۷
51- انسانی زندگی میں خسارے سے بچاؤ کی ضمانت	۵۳۰
قسم کی وضاحت	۵۳۰
عصر کا مفہوم	۵۳۰
یہ ہے جوابِ قسم	۵۳۲

Marfat.com

خسر کا مفہوم ۵۳۳
خسارے سے بچنے والوں کی چار صفات ۵۳۳
ایمان کا مفہوم ۵۳۴
صالحات پر عمل ۵۳۶
تواصی بالحق ۵۳۸
تواصی بالصبر ۵۴۰
52- توحید کامل ایمان کی خشتِ اوّل ہے ۵۴۲
قُلْ کا مفہوم ۵۴۲
آیت کی ترکیب اور مفہوم ۵۴۳
اللہ کے لفظی خواص ۵۴۵
صَمَد کا مفہوم ۵۴۸
شرک سے پیدا ہونے والے واہموں کا ازالہ ۵۵۰

Marfat.com

صاحبِ تالیف

نام: ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی ابن مولانا فضل کریم صدیقی
(بانی دارالعلوم ربانیہ)

ولادت: 4/اپریل 1940ء

تعلیم:
1- حافظِ قرآنِ مجید
2- تکمیل درسِ نظامی، جامعہ اشرفیہ لاہور
3- فاضل عربی، پنجاب بورڈ
4- بی۔اے، پنجاب یونیورسٹی
5- ایم۔اے، گولڈ میڈلسٹ، پنجاب یونیورسٹی
6- پی۔ایچ۔ڈی، پنجاب یونیورسٹی
7- فاضل مدینہ یونیورسٹی

تدریس:
1- ادب، تفسیر اور حدیث کی تدریس، مرکز علوم اسلامیہ منصورہ، لاہور
2- وزیٹنگ پروفیسر ہیلی کالج، پنجاب یونیورسٹی
3- وزیٹنگ پروفیسر انسٹیٹیوٹ آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی
4- وزیٹنگ پروفیسر شعبہ اسلامیات برائے ایم۔اے کلاسز
5- وزیٹنگ پروفیسر اسلامک سینٹر برائے ایم فل

خطابت:
1- خطیب جامع مسجد نیلا گنبد، لاہور (ایک مختصر وقت کے لیے)
2- خطیب اسلام آباد یونیورسٹی، اسلام آباد
3- خطیب جامع مسجد، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

مناصب:
1- چیئرمین شعبہ مساجد پنجاب یونیورسٹی، لاہور
2- چیئرمین ادارہ ھُدًی لِلنَّاسِ، لاہور

Marfat.com

تقریظ

از: مولانا مفتی عبدالمجید صاحب، سابق خطیب قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

زیرنظر ''خطبات'' میں نہ صرف دیکھ چکا ہوں بلکہ زیادہ تر سن بھی چکا ہوں۔ اس لیے حتمی انداز میں یہ رائے دینے میں حق بجانب ہوں کہ یہ خطبات نہ صرف خطباءِ مساجد کے لیے راہنمائی فراہم کریں گے، بلکہ تمام تشنگانِ علم و ہدایت کی سیرابی کا سامان بھی بہم پہنچائیں گے۔ کیونکہ مؤلف نے علم و معرفت کے سمندر کی تہہ سے ایسے موتی نکال کر سجائے ہیں جن کی طرف ہر طالبِ علم و حقیقت کی نگاہ بصد اشتیاق اٹھے گی اور اپنا دامن ان موتیوں سے بھرنا چاہے گی۔ کیونکہ بازارِ آخرت میں یہی موتی قدر و قیمت پائیں گے۔

ان ''خطبات'' کے مطالعہ سے ہر قاری محسوس کرے گا کہ مؤلف کا اندازِ بیاں نہ صرف علم و حکمت کی نمود ہے، بلکہ سرمایۂ عشق و جنوں بھی ہے، جس کا افسونِ محبت ہر قاری کو اک ولولۂ تازہ دیتا اور نوجواں جذبوں کو بیکنار کرتا ہے۔ وہ نہ صرف ریشمی لہجے میں سوزِ دل کی بات کرتا ہے، بلکہ شعورِ آگہی دے کر ملت کی غمگساری کا درس بھی دیتا ہے اور گردوپیش میں پھیلی ہوئی نفرتوں کو ختم کرنے اور ان کی جگہ پیار و محبت کے جذبات ابھارنے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ اس کے لہجے میں کبھی مداہنت اور کمزوری نے راہ نہیں پائی، بلکہ ہمیشہ جرأت اور بے باکی سے تمام حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ ان ''خطبات'' میں خطابت کا عنصر غالب ہے اور بقول سید عطاء اللہ شاہ بخاری ''کامیاب خطیب وہ ہے جو عوام کو ان کی سطح سے اٹھا کر اپنی سطح پر لے آتا ہے۔'' جس نے بھی کبھی مؤلف کو سنا ہے وہ شہادت دے گا کہ مؤلف نہ صرف زورِ خطابت سے اپنے سامعین کو اپنا ہم آواز بنالیتا ہے، بلکہ اپنی سوچ میں بھی شریک کرتا ہے، لیکن وہ خطابت کی جادوگری کا قائل نہیں کہ دوسروں کی فکر کو شکار کر کے اپنا ہمنوا بنائے۔ وہ استدلالِ علمی سے اپنی فکر میں سامعین کو شریک کرتا ہے۔ اس کے دلائل کی ہمہ گیری اتنی طاقتور ہے کہ ہر سامع اس کو

Marfat.com

ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے ارشادات میں نہ وعظ کی یبُوسَت ہوتی ہے اور نہ خطابت کی ساحری، بلکہ ہر لحہ اس کی آنکھوں سے عشق کا سرور اور چہرے سے یقیں کا نور جھلکتا ہے۔ اس کے نگارشات سے تجرِ علمی، وسعتِ مطالعہ اور دلائل کی قوت کا اظہار ہوتا ہے جس میں شعر و ادب کی آمیزش رنگ بھرتی اور جوشِ خطابت اس کو دو آتشہ بنا دیتا ہے۔ اس پر سامع نہ صرف سر دھنتا، بلکہ اس کے اثرات کو دل و دماغ میں سمیٹ کر اپنے آپ کو اس کا حصہ بنا لیتا ہے۔

میرے نزدیک یہ سلسلۂ خطبات ایک قیمتی ارمغاں ہے۔ مساجد کے خطیبوں کے لیے خصوصاً اور ہر متلاشی حق کے لیے عموماً، کیونکہ اس میں دینی حوالے سے زندگی کے تقریباً جملہ موضوعات پر بے پناہ علمی مواد مہیا کر دیا گیا ہے۔ جس سے قاری محنت اور جستجو سے بچ کر مؤلف کی کاوش اور عرق ریزی پر اعتماد کر سکتا ہے۔ مؤلف کے پیش کردہ علمی اور فکری ذخیرہ سے صاف جھلکتا ہے کہ اس میں کس قدر دماغ سوزی صرف ہوئی ہے اور سوزِ دل، خونِ جگر اور جذبِ پیہم کا کتنا سرمایہ خرچ ہوا ہے اور آنکھوں کے نم نے شامل ہو کر کس قدر خلوص بھرا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ مؤلف نے اپنے دل کی دھڑکنیں اس میں سمو دی ہیں۔

آخر میں، میں یہ مشورہ بھی دیتا جاؤں گا کہ آپ اگر مؤلف کی وسعتِ علمی اور قرآن و سنت سے ان کے تعلق اور لگاؤ کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کی تالیف "تفسیر روح القرآن" کا ضرور مطالعہ کریں۔ اس کاوش سے نہ صرف تفسیری ضرورت پوری ہوگی، بلکہ یہ بھی معلوم ہو گا کہ مؤلف نے کس قدر محنت اور عرق ریزی سے اس کو ترتیب دیا ہے۔ ان مؤلفات سے استفادے کے بعد آپ یقیناً میری اس دعا میں شرکت کو ضروری سمجھیں گے کہ "اللہ تعالیٰ مؤلف کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور صحت کاملہ و عاجلہ سے نوازے تاکہ وہ اس دینی خدمت کو جاری رکھ سکیں۔"

Marfat.com

Marfat.com

1- اسلامی تہذیب اور بِسْمِ اللّٰہِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ کُلُّ اَمْرٍ ذِیْ بَالٍ لَّمْ یُبْدَا بِبِسْمِ اللّٰہِ فَھُوْا اَقْطَعُ﴾

ہر ذی روح اپنی ضروریات کے حصول کے لیے اپنے معمولات کو انجام دینے کا پابند ہے کیونکہ کسی عمل کے بغیر اسے اپنی ضروریات میسر نہیں آسکتیں جبکہ ضروریات کے میسر آنے پر ہی اس کی زندگی کا دارومدار ہے جسے بھی اللہ نے جسم و جان سے نوازا ہے وہ اپنی جسمانی بقا کے لیے معمولات کا ایک طریقہ بنانے، اسے سرانجام دینے اور اس کے لیے محنت کرنے کا محتاج ہے اس میں کسی مخلوق کی خصوصیت نہیں بلکہ حشرات الارض سے لے کر انسان تک یہی ایک قدر مشترک ہے جو ساری مخلوقات میں نظر آتی ہے لیکن جہاں سے انسانی زندگی کا سفر شروع ہوتا ہے وہیں ہم ایک اور چیز بھی جنم لیتی ہوئی دیکھتے ہیں وہ یہ کہ ہر ذی روح مخلوق اپنی ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیے محنت کرتی اور دکھ اٹھاتی ہے اور اس کے پیش نظر سوائے جسمانی زندگی کی ضرورتیں پورا کرنے کے اور کچھ نہیں ہوتا لیکن انسان میں انھیں معمولات کو انجام دیتے ہوئے ایک تقسیم شروع ہو جاتی ہے جسے ہم تہذیب کے نام سے جانتے ہیں جو مہذب انسان ہیں وہ ضروریات زندگی کے حصول کے ساتھ ساتھ ہر کام کرنے سے پہلے کچھ اور تصورات بھی رکھتے ہیں جو انھیں ان کی تہذیب سکھاتی ہے اور جو غیر مہذب لوگ ہیں وہ انسان ہوتے ہوئے بھی حیوانیت کے ان تصورات سے آگے نہیں بڑھتے جن کا ذکر ہم نے ہر ذی روح کے حوالے سے کیا ہے البتہ انسانوں میں مزید ایک یہ فرق بھی رہتا ہے کہ جن کی تہذیب اعلیٰ درجے کی ہے ان کے تصورات بھی اعلیٰ اور برتر قسم کے ہوں گے اور جن کی تہذیب پست اور حقیقی انسانی مقاصد تک نہیں پہنچی ان کے تصورات تہذیب کے نمائندہ ہوتے ہوئے بھی اعلیٰ اقدار کے نمائندہ نہیں ہوتے۔

Marfat.com

اسلام نے اپنے ماننے والوں کو جو تہذیب دی ہے مسلمانوں کی پوری زندگی اسی تہذیب میں ڈھل کر نکلتی ہے ان کا ہر کام اسی تہذیب کا غماز ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی تہذیب کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جب مسلمان کسی کام کو آغاز کرنا چاہیں تو کیا وہ صرف یہ سوچ کر آغاز کریں کہ ہمیں اس کام کے نتیجے میں جسمانی ضرورتوں کے حصول میں مدد ملے گی یا ہماری خواہشات اور ہماری بےپایاں ضروریات کو پورا کرنے میں آسانی ہو جائے گی یا اس کے علاوہ بھی ان کے کچھ تصورات ہونے چاہئیں چنانچہ ان کی تہذیب نے ان کو یہ سکھایا ہے کہ تمھارے مذہب، تمھارے دین اور اس سے پیدا ہونے والی تمھاری تہذیب کی بنیاد اللہ سے متعلق تمھارے صحیح تصور پر ہے اس لیے تمھارے ہر کام میں اسی تصور کو نمایاں مقام ملنا چاہیے۔ چنانچہ نسل انسانی کے آغاز سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ تصور دیا گیا ہوگا پوری نسل انسانی کی تاریخ جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہوتی ہے چونکہ پوری طرح محفوظ نہیں رہی اس لیے نوح علیہ السلام سے پہلے اس بات کا تو یقین ہے کہ انھیں بھی اسی طرح کی ہدایت ملی ہوگی لیکن اس کی کوئی حتمی گواہی انسانی تاریخ میں موجود نہیں۔ البتہ نوح علیہ السلام کے زمانے سے ہم جانتے ہیں کہ اس وقت کے مسلمانوں کو بھی یہ تہذیب سکھائی گئی تھی کہ تمھیں ہر کام کرنے سے پہلے اپنے ذہن میں اللہ کے تصور کو تازہ کرنا ہے اور اس کے بعد اللہ کا نام لے کر کام کا آغاز کرنا ہے چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام کے حالات کو بیان کرتے ہوئے قرآن کریم نے بتایا ہے کہ کفار کے مسلسل کفر کے باعث جب اللہ تعالیٰ کا عذاب طوفان کی شکل میں آیا تو حضرت نوح علیہ السلام جو اللہ کے حکم سے کشتی تیار کر چکے تھے انھوں نے کشتی پانی میں اتاری اور اپنے تمام ماننے والوں کو حکم دیا کہ اس کشتی پر سوار ہو جاؤ یہی کشتی تمھارے ایمان کی وجہ سے تمھارے لیے نجات کا باعث بنائی گئی ہے۔ چنانچہ انھیں کشتی میں سوار کرتے ہوئے آپ نے جو الفاظ کہے قرآن کریم نے اس کو نقل کیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسٰهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (هود۔ ۱۱:۴۱)

(اور اس نے کہا کہ اس میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا، بے شک میرا رب بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے)

اسی طرح سورۃ النمل سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو جب خبر ہوئی

Marfat.com

کہ یمن میں ایک ایسی حکومت ہے جس کی ملکہ اور اس کی رعایا ابھی تک کفر پر قائم ہیں تو آپ نے یمن کی ملکہ بلقیس کو جو خط لکھا اس کا آغاز انھیں الفاظ سے کیا گیا۔ قرآن کریم نے اس کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (نمل۔ ۲۷:۳۰) یہ سلیمان کی جانب سے ہے اور اس کا آغاز بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے ہوا ہے۔ ان دونوں مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پروردگار نے آغاز ہی سے انسانوں کو یہ تہذیب سکھائی کہ تمھیں ہر کام کی ابتداء کرتے ہوئے اللہ کا نام لینا چاہیے بعض اہل علم کا خیال ہے کہ اللہ کا نام لینے کا حکم تو تمام سابقہ امتوں کو دیا گیا تھا لیکن بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ صرف قرآن کریم کی خصوصیت ہے لیکن یہ رائے صحیح معلوم نہیں ہوتی کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے خط سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ نہ صرف اس سے واقف تھے بلکہ ہر کام کی ابتداء اسی سے کرتے تھے جیسا کہ آپ نے اپنے خطوط کی ابتداء اسی سے کی۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے مشرکین عرب اپنے کاموں کی ابتداء بتوں کے نام سے کیا کرتے تھے کیونکہ ان کی تہذیب کی بنیاد ان کی بت پرستی کے تصورات تھے لیکن آنحضرت ﷺ پر جو پہلی وحی اتری اس میں سب سے پہلا حکم یہی دیا گیا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۹۶:۱) پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا''۔ اس میں یہ ہدایت دی گئی کہ آئندہ آپ کو ہر کام اللہ کے نام سے کرنا چاہیے چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا اس کے بعد معمول ہو گیا کہ آپ ہر کام سے پہلے باسمك اللہ پڑھتے اور لکھتے تھے اور جب بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ نازل ہوگئی تو پھر آپ اور مسلمان ہر کام کے آغاز کے لیے نہ صرف کہ اسی کو پڑھنے لگے بلکہ آنحضرت ﷺ نے ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لیے اسی کے پڑھنے کا حکم دیا اور اس کی بار بار تاکید فرمائی۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''کہ گھر کا دروازہ بند کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، چراغ گل کرو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، برتن ڈھکو تو بِسْمِ اللّٰهِ کہو، کھانا کھانے، پانی پینے، وضو کرنے، سواری پر سوار ہونے اور اترنے کے وقت بِسْمِ اللّٰهِ پڑھنے کی ہدایات قرآن وحدیث میں بار بار آئی ہیں۔''

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ کی اس قدر تاکید کیوں؟

سوال یہ ہے کہ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنے کی اس قدر تاکید کیوں کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس چھوٹی سی ہدایت نے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑی تبدیلی کا آغاز کر دیا ہے کوئی بھی شخص جب کسی کام کا آغاز کرتا ہے اگر اس کے ذہن میں یہ تصورات نہیں ہیں جو اس ہدایت سے پیدا کرنا مقصود ہیں تو یقیناً وہ ہر کام کرتے ہوئے یہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں یہ سراسر میری ہمتوں، صلاحیتوں اور توانائیوں کا مرہون منت ہے میرے پاس جو ذہنی صلاحیتیں اور جسمانی توانائیاں ہیں اور میرے پاس جو وسائل میسر ہیں میں ان سے کام لے کر ایسا کوئی سا بھی کام کرنا چاہوں تو میرے لیے کوئی مشکل نہیں ایسے آدمی کا تمام تر بھروسہ اپنے وسائل اور اپنی قوتوں پر ہوتا ہے پھر اسی سے اس کے ذہن میں یہ تصور بھی پختہ ہو جاتا ہے کہ میں چونکہ اپنی صلاحیتوں اور اپنے وسائل سے تمام کام انجام دیتا ہوں تو مجھے اپنے کاموں کے سلسلے میں کسی کے سامنے جواب نہیں دینا میں کام اچھا کروں گا تو اس کی جزا مجھے ملے گی اور اگر کام برا کروں گا تو یہیں اس کے نتائج خود دیکھ لوں گا اور ممکن ہے کہ میں ان کاموں کو نتیجہ خیز ہونے سے پہلے بدل دوں یا اس کے اثرات زائل کر دوں اسی طرح وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ میرا رشتہ کسی ایسی ذات سے نہیں جو ہر وقت میری نگرانی کرتی ہو، میری تنہائیاں جس کے سامنے واضح ہوں، جو میری نیتوں تک سے واقف ہو، جس نے میرے لیے زندگی کے کچھ اصول یا کوئی تہذیب عطا کی ہو اور کبھی ایسا دن آئے گا جب وہ ذات میرے ان کاموں سے متعلق مجھ سے سوال کرے گی وہ ایسی ہر سوچ اور ہر تصور سے بالا ہو کر اپنی ذات کے گنبد میں بند رہ کر اپنے مفادات کے حوالے سے ہر کام کو سرانجام دیتا ہے اگر وہ امیر ہے تو اس کی امارت اس کی خواہشات کی تکمیل میں صرف ہوتی ہے اگر وہ حاکم ہے تو اس کی حکومت دوسروں کے لیے ظلم بن جاتی ہے اگر وہ پڑھا لکھا آدمی ہے تو اس کا علم برائی کا خادم بن جاتا ہے اور اگر وہ غریب آدمی ہے تو اس کی غربت صاحب امارت لوگوں کی دشمن بن جاتی ہے۔ اس کے اندر کا جوار بھاٹا بعض دفعہ نئے نئے جرائم کو جنم دیتا ہے اور اس کی محرومیاں اس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکاتی ہیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسی سوچ کے لوگ کسی بھی حیثیت کے مالک ہوں وہ اپنے ان بگڑے ہوئے تصورات کے باعث انسانیت کے لیے مہلک ثابت ہوتے ہیں ایسے تمام خطرات سے بچانے کے لیے نہایت حکیمانہ طریقے سے یہ

Marfat.com

مختصر سا حکم دے کر ایک ایسی تہذیب کی پہلی اینٹ رکھ دی گئی ہے جس کے نتیجے میں ایک ایسی عمارت وجود میں آتی ہے جس کے سائے میں انسانیت میٹھی نیند سوتی اور اقدارِ انسانیت پھلتے پھولتے ہیں جب ایک شخص بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم پڑھ کر ہر کام کا آغاز کرتا ہے تو فوراً اس کے ذہن میں یہ تصورات تازہ ہوتے ہیں کہ تم جن قوتوں اور صلاحیتوں سے کام لے کر یہ کام کرنے لگے ہو وہ تمھاری ذاتی نہیں اس ذات نے تمھیں عطا کی ہیں جس نے تمھیں پیدا کیا وہ تمھیں ہر کام کرتے ہوئے دیکھتا ہے تم ہر وقت اس کی نگرانی میں ہو تمھارے ہر کام اور ہر عمل کا ایک نوشتہ تیار ہو رہا ہے ایک دن ایسا آئے گا جب تمھیں اپنے ہر عمل کا جواب دینا پڑے گا تم سے پوچھا جائے گا کہ ہم نے تمھیں بے مقصد تو پیدا نہیں کیا تھا تمھیں ہر کام اپنے مقصد زندگی کے مطابق کرنا چاہیے تھا آج اسی مقصد کے حوالے سے تمھارے ہر کام کا حساب لیا جائے گا یہ تصورات جیسے جیسے اس کے دل و دماغ میں پختہ ہوتے جاتے ہیں ویسے ویسے اس کی نیت، اس کے اعمال اور اس کے اعمال کے نتائج صالح ہوتے جاتے ہیں وہ اپنی ذات میں ایک خیر کا سرچشمہ بن جاتا ہے جس سے ہر وقت لوگوں کے لیے بھلائی ابلتی ہے اور نیکی کی قوتوں کو فروغ ملتا ہے یہ ان تہذیبی تصورات کا اجمالی خاکہ ہے جو اس مختصر سی ہدایت سے وجود میں آتے اور آہستہ آہستہ پروان چڑھتے چلے جاتے ہیں۔

ان تصورات کے ساتھ ساتھ کچھ حقائق بھی ہیں بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم پڑھنے سے جن کا اظہار ہوتا ہے۔ آپ کو یاد ہے کہ پہلی وحی میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا تھا اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ (۹۶:۱) ہم جب قرآن پاک کی تلاوت بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْم سے شروع کرتے ہیں تو ہم اللہ کے اس حکم پر عمل کرتے ہیں اسی طرح یہ آیہ مبارکہ ہمیں اللہ کے ایک عظیم احسان کی یاد دلاتی ہے۔ اللہ کا وہ عظیم احسان یہ ہے کہ اس نے انسان کو نطق اور گویائی کی نعمت عطا فرمائی اگر ہمیں یہ نعمت میسر نہ آتی تو قرآن جیسی دولت بھی ہمیں نہ ملتی کیونکہ قرآن کریم کا تعلق زیادہ تر اسی صلاحیت سے ہے اور یہ اتنی بڑی نعمت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود سورہ الرحمٰن کے آغاز میں اس کا ذکر فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ۙ خَلَقَ الْاِنْسَانَ ۙ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (۵۵:۱۔۴) ''خدائے رحمٰن نے قرآن سکھایا اور اس نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو گویائی کی تعلیم دی''۔ مزید برآں یہ کہ اس مبارک کلمہ کی تلاوت سے موسیٰ علیہ السلام کی ایک خاص پیشگوئی کی تصدیق بھی ہوتی ہے جس کی

Marfat.com

سند گزشتہ آسمانی صحیفوں میں موجود ہے وہ یہ ہے کہ آپ خلق خدا کو جو تعلیم دیں گے وہ اللہ کا نام لے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پانچویں کتاب باب اٹھارہ (۱۸۔۱۹) میں یہ الفاظ وارد ہیں۔ ''میں ان کے لیے انھیں کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے گا تو میں اس کا حساب ان سے لوں گا۔''

صرف شریعت کے مطابق کام سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ پڑھنی چاہیے

ایک اور پہلو سے بھی ہر کام کو اس مبارک کلمہ کے ساتھ کرنے کی اس طرح آنحضرت ﷺ نے تاکید فرمائی ہے جس سے اس کی افادیت میں بہت اضافہ ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کل امر ذی بال لم یبدا باسم اللہ فھو اقطع او ابتر ''ہر جائز کام جسے بسم اللہ سے شروع نہ کیا جائے وہ بے برکت اور بے نتیجہ ہوتا ہے۔'' اس حدیث سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر جائز کام کرنے سے پہلے بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ پڑھنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی کام ناجائز ہو یعنی جسے اسلامی شریعت نے کرنے کی اجازت نہ دی ہو اس کا ارتکاب کسی مسلمان کے لیے ویسے ہی شرم کی بات ہے لیکن اس سے بڑھ کر بدنصیبی کی انتہاء یہ ہے کہ آدمی کسی ناجائز کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے یعنی اللہ کا حکم اللہ ہی کے نام سے توڑا جائے یہ نہ صرف گناہ ہے بلکہ ایک طرح سے اللہ کے حکم کے خلاف بغاوت ہے گناہ تو اللہ کی رحمت سے معاف ہو جاتا ہے بغاوت کا معاملہ تو بہت شدید ہے لیکن ہماری جسارتوں کی کیا انتہاء ہے کہ ہمارے امراء اللہ کی شریعت کا مذاق اڑاتے ہوئے سینما ہاؤس تک بنائیں گے اور پھر اپنے ضمیر کو یا لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے اس کا آغاز تلاوت قرآن کریم سے کیا جائے گا۔ اسی طرح کی اور بہت سی مثالیں آپ کو دیکھنے کو ملیں گی اس لیے اس حدیث میں یہ قید لگائی گئی ہے کہ ہر جائز کام کو کرو اور اللہ کے نام سے کرو۔

برکت کا اصل مفہوم

دوسری بات یہ ارشاد فرمائی گئی ہے کہ کوئی بھی جائز کام اللہ کے نام سے کیا جائے تو

Marfat.com

اللہ اس میں برکت دیتا ہے اور اگر اللہ کا نام نہ لیا جائے تو بے برکتی ہوتی ہے ضروری ہے کہ برکت کا مفہوم سمجھ لیا جائے ورنہ اس سے غلط فہمی کا اندیشہ ہے۔ برکت کا لفظی معنی تو بڑھنا اور ترقی کرنا ہوتا ہے لیکن ہر بڑھنے کو برکت نہیں کہتے ایک آدمی کا جسم موٹا ہو جائے یا پھول جائے لیکن ہمت نہ ہو تو ڈاکٹر بتاتے ہیں کہ اس کا جسم متورم ہو گیا ہے یا اس کے جسم میں پانی پڑ گیا ہے دونوں باتیں خطرناک بیماریوں کی خبر دیتی ہیں کوئی بھی شخص اسے صحت قرار دینے کی حماقت نہیں کرے گا حالانکہ بظاہر اس کے جسم میں برکت معلوم ہوتی ہے اس لیے میں نے عرض کیا کہ ہر اضافہ اور ہر ترقی برکت نہیں ہوتی بلکہ وہ اضافہ اور ترقی برکت ہے جو صحت کے اصولوں کے مطابق ہے اسی طرح یہاں جس بات کو برکت کہا گیا ہے وہ بھی وہ برکت ہے جو شریعت کے اصولوں اور مقاصد کے مطابق ہو اس کو میں ایک مثال سے واضح کرنے کی کوشش کرتا ہوں آدمی جب غذا لیتا ہے تو اس کے کچھ تو طبی اصول ہیں اور کچھ اس کے مقاصد ہیں طبی اصول میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غذا مضر صحت نہ ہو بلکہ حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ہو اور مقاصد میں سے پہلی بات یہ ہے کہ غذا جزو بدن بنے اور دوسری بات یہ کہ اس سے خون تیار ہو اور تیسری یہ بات کہ خون جسم میں قوت کا باعث بنے یہ تین چیزیں وجود میں آجاتی ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ صحیح غذا نے اپنے مقاصد پورے کر دیئے ہیں لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے ایک مقصد ابھی باقی ہے وہ اگر پورا نہیں ہوتا تو اسے بے برکتی کہا جاتا ہے اور اگر پورا ہو جاتا ہے تو اسے برکت سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مقصد یہ ہے کہ غذا نے جسم کو جو قوت، طاقت اور ہمت عطا کی ہے اگر وہ اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے بندوں کی خدمت میں صرف ہوتی ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے اس میں برکت دی ہے لیکن اگر وہ لادینیت کی خدمت اور شیطانی مقاصد کے فروغ میں استعمال ہوتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غذا اپنے سارے مقاصد پورا کرنے کے باوجود بے برکتی کا باعث بنی ہے۔ مختصر یہ کہ جسم کی قوت کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے سے اللہ کا کلمہ بلند ہو، شرافتیں توانا ہوں، نیکیوں کو فروغ ملے، مظلوموں کی حمایت اور دستگیری کے کام آئے، غریبوں کے دکھوں کا بوجھ اٹھائے اور انسانیت کی تقویت کا باعث بنے لیکن اگر یہی قوت ظلم کا باعث بنتی، نیکی کا راستہ روکتی، شرافتوں کو رسوا کرتی اور اذیتوں کا باعث بنتی ہے تو یہ قوت نہ صرف یہ کہ حقیقی مقصد سے محروم ہو گئی ہے بلکہ یہ وہ بے برکتی ہے جس سے اس حدیث میں متنبہ کیا گیا ہے۔

Marfat.com

بِسْمِ اللّٰہِ کا مفہوم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کی عظمت، اہمیت اور افادیت سمجھنے کے بعد یہ بھی جاننا چاہیے کہ اس کے الفاظ کا مفہوم کیا ہے جس سے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ جب ہم کسی کام کے آغاز میں یہ مبارک کلمہ بولتے ہیں تو اس وقت ہمارے ذہن میں اس کا مفہوم کیا ہونا چاہیے۔

بِسْمِ اللّٰہ تین لفظوں سے مرکب ہے ایک حرف با، دوسرے اسم، تیسرے اللہ، حرف با عربی زبان میں بہت سے معنی کے لیے استعمال ہوتا ہے جن میں سے وہ معنی جو اس مقام کے مناسب ہیں وہ تین ہیں۔ ان میں سے ہر ایک معنی بسم اللہ پڑھتے ہوئے لیا جا سکتا ہے۔

1- مصاحبت: یعنی کسی چیز کا کسی چیز سے متصل ہونا۔

2- استعانت: یعنی کسی چیز سے مدد چاہنا۔

3- تبرک: یعنی کسی چیز سے برکت حاصل کرنا۔

ان تینوں معنوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے بسم اللہ پڑھتے ہوئے جب ہم کسی کام کا آغاز کرتے ہیں تو گویا ہم یہ کہتے ہیں کہ میں یہ کام کرنے لگا ہوں اللہ کے نام کے ساتھ، اللہ کے نام کی مدد سے، اللہ کے نام کی برکت سے۔ لیکن اس میں آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ صرف اتنا کہہ دینے سے بات مکمل تو نہیں ہوتی جب تک اس کام کا ذکر نہ کیا جائے جو اللہ کے نام کے ساتھ یا اس کی مدد یا اس کی برکت سے کرنا مقصود ہے اس لیے نحوی قاعدے کے مطابق یہاں کوئی فعل مقام کے مناسب محذوف ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی آدمی کھانا کھانے لگتا ہے اور وہ بسم اللہ پڑھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ میں اللہ کے نام سے کھانا کھانے لگا ہوں اور اگر وہ پڑھنا چاہتا ہے تو وہ یہ کہنا چاہے گا کہ میں اللہ کے نام سے پڑھنا چاہتا ہوں لیکن یہ یاد رہے کہ جو فعل بھی یہاں محذوف سمجھا جائے اسے بسم اللہ کے بعد محذوف سمجھنا چاہیے تاکہ حقیقتاً اس کام کا آغاز اللہ ہی کے نام سے ہو۔ اسم اللہ کو پہلے لانے میں صحابہ نے اس حد تک احتیاط کی ہے اور یقیناً انھوں نے یہ بات آنحضرت ﷺ سے سیکھی ہوگی کہ جب قرآن کریم لکھا گیا تو حرف با کا اسم اللہ سے پہلے آنا تو عربی زبان کے لحاظ سے لازمی ہے لیکن اس میں بھی مصحف عثمانی میں صحابہ کے اجماع سے یہ رعایت رکھی گئی کہ حرف با رسم الخط کے قاعدہ سے ہمزہ کے ساتھ ملا کر لکھنا چاہیے تھا اور لفظ اسم الگ، جس کی صورت ہوتی باسم اللہ لیکن مصحف عثمانی کے رسم الخط میں حرف ہمزہ کو حذف کر کے حرف با کو سین کے ساتھ ملا کر صورۃً اسم کا جز بنا دیا تاکہ شروع اسم اللہ سے ہو جائے۔

Marfat.com

یہی وجہ ہے کہ دوسرے مواقع میں یہ حرف ہمزہ حذف نہیں کیا جاتا، جیسے اقرا باسم ربک میں ''ب'' کو ''الف'' کے ساتھ لکھا جاتا ہے، یہ صرف بِسْمِ اللّٰهِ کی خصوصیت ہے کہ حرف ''با'' کو ''سین'' کے ساتھ ملا دیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ میں اللہ اسم ذات ہے اور الرحمن الرحیم اللہ تعالیٰ کے دو صفاتی نام ہیں اس کی وضاحت ہم سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں کریں گے کیونکہ سورۃ الفاتحہ میں بھی ان تینوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

قرآن میں بِسْمِ اللّٰهِ کی اصل جگہ اور اہلِ علم کی رائے

اہل علم میں یہ بھی ایک اہم سوال رہا ہے کہ قرآن کریم میں بسم اللہ کی اصل جگہ کہاں ہے؟ یہ سوال اس وجہ سے پیدا ہوا ہے کہ سورہ توبہ کے علاوہ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ہر سورۃ کے آغاز میں لکھی گئی ہے لیکن ہر جگہ اس کو کسی سورت کا جز بنانے کی بجائے مستقل آیت کی حیثیت سے لکھا گیا ہے۔ سوائے سورۃ النمل کے کسی سورۃ میں بھی سورت کے جز کے طور پر اس کا ذکر نہیں فرمایا گیا۔ مدینہ، بصرہ اور شام کے قراء اور فقہاء کی رائے یہ ہے کہ یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی سورۃ کی بھی حتیٰ کہ سورۃ الفاتحہ کی بھی آیت نہیں بلکہ ہر سورۃ کے شروع میں اس کو محض تبرک اور دو سورتوں کے درمیان علامتِ فصل کے طور پر لکھا گیا ہے اس سے ایک سورۃ دوسری سورۃ سے ممتاز بھی ہوتی ہے اور قاری جب اس سے تلاوت کا آغاز کرتا ہے تو اس سے برکت بھی حاصل کرتا ہے یہی مذہب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا ہے اس کے برعکس مکہ اور کوفہ کے فقہاء کا مذہب یہ ہے کہ یہ سورۃ الفاتحہ کی بھی ایک آیت ہے اور دوسری سورتوں کی بھی ایک آیت ہے اور یہ مذہب امام شافعی اور ان کے اصحاب کا ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن بظاہر قراء مدینہ کا مذہب قوی معلوم ہوتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مصحف کی موجودہ ترتیب تمام تر وحی الٰہی کی رہنمائی اور رسول اللہ ﷺ کی ہدایات کے تحت عمل میں آئی اور بسم اللہ کی کتابت بھی اسی ترتیب کا ایک حصہ ہے اس ترتیب میں جہاں تک بسم اللہ کے لکھے جانے کی نوعیت کا تعلق ہے سورۃ الفاتحہ اور غیر سورۃ الفاتحہ میں کسی قسم کا فرق نہیں کیا گیا بلکہ ہر سورۃ کے آغاز میں اس کو ایک ہی طرح درج کیا گیا ہے جس سے اس کی حیثیت سورۃ سے الگ ایک مستقل آیت کی نظر آتی ہے۔

Marfat.com

2- سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ سے متعلق چند حقائق

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ
وَلَقَدْ اٰتَیْنَاکَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ

اُسلوب سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ:

سورہ فاتحہ قرآن پاک کی سب سے پہلی سورۃ ہے۔ لیکن یہ اپنے اختصار، فصاحت و بلاغت، اثر آفرینی اور مضامین کی جامعیت کے اعتبار سے ایک خاص مقام و مرتبہ کی حامل ہے۔ آنحضور ﷺ نے اسے مختلف ناموں سے یاد فرمایا، جن سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ نیز مختلف اوقات میں اس کے فضائل بیان فرماتے ہوئے فرمایا کہ اس جیسی کوئی دوسری سورۃ نازل نہیں ہوئی۔ بعض احادیث میں اسے سب سے بڑی سورۃ اور بعض میں سب سے بہتر سورۃ قرار دیا۔

جب ہم اس کے پیرایۂ بیان اور اس کی معنویت پر غور کرتے ہیں اور اس کے ناموں کو دیکھتے ہیں تو قرآن کریم سے اس کے تعلق کی مختلف نوعیتیں واشگاف ہوتی ہیں۔ اس کا پیرایۂ بیان اور طریقِ اظہار معلمانہ نہیں بلکہ دعائیہ ہے جس سے اس کی تاثیر اثر آفرینی اور دل و دماغ میں اس کے نفوذ کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ انسانی دل و دماغ کی کیفیت یکسر بدل جاتی ہے۔ آدمی اس کا تصور بھی نہیں کرتا کہ مجھے کوئی بات سکھائی جارہی ہے، بلکہ وہ یوں محسوس کرتا ہے کہ میں ایک ایسی ذات کی بارگاہ میں حاضر ہوں، جس کی رحمتیں اور برکتیں اور جس کا فیضانِ ربوبیت اور جس کی نصرت و اعانت کی چارہ جوئیاں مجھ پر مسلسل سایہ ڈال رہی ہیں، جس کے سامنے میرے دل و دماغ کا ایک ایک پردہ پوری طرح نمایاں ہے۔ میرے سینے کی تنگیاں، جس کی نظر کرم سے وسعتوں میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ میں ایک ایسی آغوش میں ہوں، جس کی ٹھنڈک ماں کی آغوش سے بھی زیادہ ہے۔

Marfat.com

ان تصورات کے ساتھ انسان جب اُس ذات عظیم کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا ہوکر، اِس دعا کے الفاظ کو اپنی زبان سے ادا کرنا شروع کرتا ہے تو بے اختیار اُس ذاتِ عظیم کی حمد وثنا اُس کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ وہ ان صفات سے اس کو پکارتا ہے، جس سے بڑھ کر اُس ذات بے مثال کو دل و دماغ میں قریب کرنے والے الفاظ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ان مختصر الفاظ میں اللہ کی حمد وثنا کو سمیٹنے کی کوشش میں اللہ کا عاجز بندہ، اس طرح اپنی عبدیت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ بے ساختہ اُس کی زبان پر عبدیت کا اعتراف اور احتیاج و درماندگی کا اقرار جاری ہو جاتا ہے۔ پھر وہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی کے ان گنت مسائل، خواہشوں کا بے پناہ ہجوم، انسانی تعلقات کی وسیع دنیا، احساسات کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا وسیع سمندر، اس میں انفعالات کے اُبھرتے ہوئے حباب نفسانی اور شیطانی قوتوں سے تصادم، اللہ کی طرف بڑھنے والے ہر بندے کے راستے کی وہ رکاوٹیں ہیں، جنھیں سر کرنا آسان نہیں اور یہ وہ تاریکیاں ہیں، جن میں راستہ دیکھنا از بس مشکل ہے۔ یہ سوچتے ہی زبان پر دعائیہ کلمات جاری ہو جاتے ہیں اور اس راستے کا مسافر، اپنی محبوب ذات سے، جس کی محبت میں ڈوب کر وہ یہ نغمہ الاپ رہا ہے صراط مستقیم کی دعا مانگتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ التجا اُس کے لبوں تک آ جاتی ہے کہ یہ صراطِ مستقیم اس قدر واضح ہونا چاہیے کہ اس کی پہچان میں مجھے ٹھوکر نہ لگے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے کہ یہ صراطِ مستقیم کتابی علم یا دانشِ برہانی میں لپٹا ہوا نہ ہو، جس کی پرتیں کھلتے کھلتے آدمی تھک ہار کر گر جاتا ہے بلکہ یہ ایسی شاہراہ ہونی چاہیے، جس پر اِس راستے کے مسافر کامیابی سے گزرنے میں کامیاب ہو چکے ہوں۔ اور اس پر ایسی علامتیں بھی ہونی چاہئیں، جس سے معلوم ہو کہ یہاں ٹھوکر کھانے والوں نے کن کن حوالوں سے ٹھوکر کھائی ہے تاکہ آج اس راستے پر چلنے والا ان ٹھوکروں سے بچ کر منزل مقصود پر پہنچنے میں دشواری محسوس نہ کرے۔

اِس دعا میں مزید تاثیر اور لذتِ شوق اِس چیز نے بھی پیدا کر دی ہے کہ اِس کا انداز اور اس کا اظہار اس قدر سادہ سہل اور دل نشیں ہے کہ معمولی سے معمولی انسان بھی اسے پڑھتا ہوا دشواری محسوس نہیں کرتا۔ گنتی کے سات بول ہیں، جو نہایت مختصر، دل آفرین اور دل آویز ہیں۔ نہ ان میں کوئی پیچیدگی ہے اور نہ کوئی الجھاؤ۔ نہایت جچے تلے، ایسا لگتا ہے کہ بے ساختہ از خود زبان پر جاری ہو گئے ہیں۔ جس طرح فطرت نہایت سادہ اور نہایت پاکیزہ ہے اور کسی گوشہ میں بھی الجھی ہوئی نہیں اور ہر فطری بات ہر طبیعت کو بھلی لگتی اور اُس

Marfat.com

کی قبولیت دل کی آواز بن جاتی ہے۔ یہی حال اس سورۃ کا بھی ہے۔ اس کے ایک ایک بول کو دہراتے ہوئے آدمی یوں محسوس کرتا ہے کہ یہ تو میرے دل سے اٹھنے والی باتیں ہیں۔

جس طرح رات کی تاریکی کا ستایا ہوا ایک شخص صبح خنداں کو دیکھتے ہی کھل اٹھتا ہے، طوفانِ برق و باراں سے سہما ہوا آدمی قوسِ قزح کو دیکھتے ہی اس کے حسن میں ڈوب جاتا ہے، سفر کی تھکاوٹوں سے چور چور شخص اپنی منزل کی ایک جھلک دیکھ کر تازہ دم ہو جاتا ہے، چلچلاتی دھوپ میں جھلسنے والا مسافر ٹھنڈے سائے میں جس طرح آرام محسوس کرتا ہے، اِس سے بڑھ کر وہ شخص ،جو علم و دانش کے پیدا کردہ الجھاؤ اور شیطانی قوتوں کے اٹھائے ہوئے فتنوں، شخصی گروہی اور مختلف وابستگیوں کے لگائے ہوئے زخموں اور جعلی شخصیتوں کے پُرفریب طریقوں سے زار و نزار ہے۔ جب کبھی اس دعا تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اِسے اس کی حقیقت، اِس کی سادگی، اِس کی تاثیر، اِس کی حقیقت بیانی اور اِس کی عقدہ کشائی، اِس سے بڑھ کر سکون اور اطمینان مہیا کرتی ہے۔ پھر جب وہ بار بار اسے ہر نماز میں دہراتا ہے اور بار باران مضامین کی تکرار کرتا ہے تو دھیرے دھیرے اُس کے اندر سے ایک ایسا انسان جنم لینے لگتا ہے، جو پہلے انسان سے یکسر مختلف اور انسانیت کا حقیقی نمونہ ہوتا ہے۔ پھر وہ اس کے الفاظ پر غور کرتا ہے تو وہ دیکھتا کہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ

میں حمد پر الف لام استغراق کا ہے یا جنس کا' اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام تعریفیں اور ہر طرح کی تعریفیں، یعنی تعریف کے جتنے انداز ہو سکتے ہیں اور تعریف جتنے پہلوؤں سے ممکن ہے اور تعریف کی جتنی اقسام تصور کی جا سکتی ہیں اور تعریف کے لیے جتنے خوبصورت الفاظ اہلِ لغت نے وضع کیے ہیں اور تعریف کی جتنی کیفیتیں آج تک اہلِ دل نے محسوس کی ہیں۔ اہلِ لغت اہلِ درد اور اہلِ دل کا یہ سارا سرمایہ صرف اللہ کی بارگاہ کے لیے ہے۔ اس وسعت کے ساتھ کوئی اس میں شریک نہیں ہے۔

''حمد'' کا معنی جس طرح تعریف کیا جاتا ہے۔ اسی طرح شکر بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن شکر حمد کے مقابلے میں معنویت کے اعتبار سے محدود ہے۔ شکر کا لفظ کسی کی صرف انہی خوبیوں اور انہی کمالات کے اعتراف کے موقع پر بولا جاتا ہے، جن کا فیض آدمی کو خود پہنچ رہا ہو۔ لیکن حمد ہر قسم کی خوبیوں اور ہر قسم کے کمالات کے اعتراف کے لیے عام ہے، خواہ

Marfat.com

ان کا کوئی فیض خود حمد کرنے والے کی ذات کو پہنچ رہا ہو یا نہ پہنچ رہا ہو۔ مزید برآں حمد اپنی معنوی وسعتوں کے اعتبار سے ایسے کمال سے متصف ہے جس کا شکر کے لفظ میں تصور کرنا بھی مشکل ہے۔ اس لیے شکر اگرچہ حمد کا ایک جزو ہے، لیکن پروردگار کے ذاتی اور صفاتی کمالات کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے حمد کا استعمال ہی ایسے وسیع معنوں میں کیا جا سکتا ہے۔ صرف شکر کا استعمال حمد کو محدود کر دینے کے ہم معنی ہوگا۔

ایک آدمی اگر فہم و شعور سے بالکل محروم نہ ہو تو یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی ذات، اپنے ماحول، اپنے گردوپیش، اپنے اوپر طاری ہونے والی کیفیتوں اپنے استعمال میں آنے والی نعمتوں پر غور کرنے کی کبھی زحمت نہ کرے۔ ایک مزدور اور محنت کش، جب چلچلاتی دھوپ میں سخت محنت کے بعد درخت کے ٹھنڈے سائے کے نیچے بیٹھ کر ٹھنڈا پانی پیتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر حمد کے الفاظ جاری ہو جاتے ہیں۔ ایک بیمار، جب بیماری سے نجات پاتا ہے اور اپنے قدموں چل کر گھر کے صحن میں چڑیوں کے چہچہوں کی آواز سنتا ہے تو بے اختیار اس کی زبان پر اللہ کی تعریف کا نغمہ پھوٹنے لگتا ہے۔ ایک آدمی مسلسل سنجیدہ کام کے باعث جب اپنے ماحول سے اچاٹ ہونے لگتا ہے تو وہ کچھ وقت پہاڑوں کے ٹھنڈے موسم سے محظوظ ہونے کے لیے پہاڑوں کا رُخ کرتا ہے۔ جیسے ہی اسے پہاڑوں میں ابلتے ہوئے چشمے، گرتی ہوئی آبشاریں ،برف کے پگھلتے ہوئے تودے، چاندی کے ابلتے ہوئے فوارے، سیماب اگلتے ہوئے جھرنے' چیڑوں کے گڑے ہوئے جھنڈے اور پربت پر چھائی ہوئی چھاؤنی اور بادلوں کے تنے ہوئے ڈیرے اور کہرے کی لگی ہوئی قناتیں دکھائی دیتی ہیں تو بے ساختہ اس کی زبان پر اللہ کی حمد کے زمزمے جاری ہو جاتے ہیں۔ میدانی علاقوں میں بہتی ہوئی پانی کی جدولیں' زمین پر سبزے کا مخملی فرش' کھیتوں میں پھولی ہوئی سرسوں اور پھولوں سے لدے ہوئے تختے جب نگاہ کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں تو بے ساختہ زبان پر اللہ کی صنعت و قدرت کی تعریف جاری ہو جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان جب بھی اپنے گردوپیش میں پھیلی ہوئی قدرت کی رعنائیاں دیکھتا ہے تو اگر اس کے سر میں معمولی سا دماغ بھی ہے تو وہ ان خوبصورتیوں کے خالق کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی تعریف کا جذبہ ہے، جو اسے اللہ کی بارگاہ تک جانے پر مجبور کرتا ہے۔ کیونکہ یہ اس کے اندر سے اٹھنے والی فطرت کی پکار ہے، جو الفاظ کا قالب اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے اہلِ علم نے حمد کو انسان کا جذبۂ بے اختیار قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض لوگوں

Marfat.com

نے اس فطری جذبے کو ارتقاء کا نتیجہ قرار دے کر گہنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندر سب سے قدیم اور ابتدائی جذبہ خوف کا جذبہ ہے۔ اور یہ جذبہ ان ہولناک اور خوفناک حوادث کے مشاہدہ سے پیدا ہوا، جو اس دنیا میں طوفانوں' زلزلوں اور وباؤں کی صورت میں آئے دن پیش آتے رہتے تھے۔ اس خوف کے جذبہ نے انسان کو اُن اَن دیکھی طاقتوں کی پرستش پر مجبور کیا، جن کو اُس نے اِن حوادث کا پیدا کرنے والا خیال کیا اور اس طرح انسان نے خوف کے جذبے سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ حالانکہ اگر تدبّر سے کام لیا جائے تو یہ بات سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ ہر خوف سے پہلے کسی نعمت کا شعور لازمی چیز ہے۔ جس کے چھن جانے کے احساس کو خوف کہا جاتا ہے۔ اور جب نعمت کا شعور پایا گیا تو ایک منعم کا شعور بھی لازمی ٹھہرا اور پھر اس کی شکر گزاری کا جذبہ پیدا ہونا بھی ناگزیر ہوا۔ اور مزید یہ کہ منعم کے اس تصور کو مزید اجاگر اور گہرا کرنے کے لیے انسان کا وہ شب و روز کا مشاہدہ ہے، جس سے وہ صرف نظر نہیں کر سکتا۔ وہ دیکھتا ہے کہ اس دنیا کے عام واقعات، زلزلے، طوفان اور سیلاب ہی نہیں، بلکہ اس میں بہاریں بھی آتی، چاندنی بھی پھیلتی، بارشیں بھی ہوتی، تارے بھی چھٹکتے، پھول بھی کھلتے اور فصلیں بھی پکتی ہیں۔ ان میں سے ایک ایک چیز اور ایک ایک مشاہدہ نہ صرف انسان کو اللہ کے آستانے پر جھکانے کے لیے کافی ہے، بلکہ اُس کے جذبۂ حمد کو مہمیز کرنے کا کام بھی دیتا ہے۔ اہلِ دل تو عجیب بات کہتے ہیں کہ اللہ کی بے حد و بے شمار نعمتوں کو دیکھ کر اور خود اپنی ذات کو اُس کی نعمتوں سے گرانبار پا کر تو شکر اور حمد کا جذبہ ابھرتا ہی ہے۔ لیکن خود یہ بات کہ آدمی اللہ کی تعریف کرنے لگے اور اس میں اسے ایک سکون اور اطمینان محسوس ہو، یہ نعمت تو ہر ایک کو میسر نہیں ہوتی۔ جس کسی کو یہ دولت نصیب ہو جائے، اسے اس دولت کے مل جانے پر بیش از بیش اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں، جنھیں بے شمار نعمتیں میسر ہیں۔ لیکن وہ منعمِ حقیقی کو پہچاننے کے لیے تیار نہیں۔ اس کے برعکس وہ خوش نصیب بھی ہیں، جو نانِ شبینہ پر گزارا کرتے اور جھونپڑے میں رہتے ہیں، لیکن اس پر بھی ہمیشہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ انھیں اگرچہ دنیا کی دولت نہیں ملی لیکن اس دولت کا مل جانا ان کے لیے دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ تو جس کو اتنی بڑی دولت مل جائے، اس پر اتنا ہی بڑا شکر ادا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیا خوب کہا کسی شاعر نے۔

میری طلب بھی انہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

Marfat.com

ایسے جذبۂ بے پناہ سے جو تعریف کی جائے گی، وہی حقیقت میں ثنائے جمیل کہلانے کی مستحق ہے۔ اور یہی وہ ثنائے جمیل ہے، جو حمد کا حقیقی معنی ہے۔ اور یہ بات کہنے کی ضرورت نہیں کہ جس ذات کی ثنائے جمیل کی جائے وہ خود جمیل نہیں ہوگی تو اور کیا ہوگی۔ جمیل ذات سے محبت کی جاتی ہے، ڈرا نہیں جاتا۔ جن مذاہب نے اللہ کا تعارف اس طرح کرایا کہ وہ ایک ایسی وحشت ناک اور ہیبت ناک ذات ہے، جس کے غضب سے ہمیشہ ڈرنا چاہیے۔ انھوں نے نہ اپنے ساتھ انصاف کیا اور نہ اللہ کے ساتھ۔ نہ اپنے آپ پر ہونے والے احسانات کو پہچانا، نہ اللہ کو محسنِ حقیقی سمجھا۔ انھوں نے اللہ کو ایک بادشاہ پر قیاس کیا۔ جو کبھی دعا سے ناراض ہو جاتا ہے اور کبھی دشنام پر خلعت بخشتا ہے۔ وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ جہاں بھی اللہ سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کوئی ڈراؤنی ذات ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال کی نگہداشت کرو۔ ایسا کوئی عمل نہ کرنا، جو اللہ کے احکام کے خلاف انسانیت کا دشمن اور اس کی ناراضگی کو دعوت دینے والا ہو۔ تمھیں اپنے اعمال کی پاداش سے ڈرنا چاہیے۔ اللہ کی ناراضگی یا خوشنودی اس کا نتیجہ ہے، اس کی علت نہیں۔ وہ ذات تو ایسی پیاری ذات ہے جس سے پیار کرنے والے سرفراز ہوتے ہیں۔ اور دنیا و عقبیٰ کی نعمتوں سے مالا مال ہوتے ہیں۔

Marfat.com

3- صفتِ ربوبیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

پروردگار کے اسمائے مبارکہ میں سے ایک اسم مبارک ''رب'' ہے۔ رب اللہ کی طرح سامی زبانوں کا ایک کثیر الاستعمال مادہ ہے۔ عبرانی، سریانی اور عربی تینوں زبانوں میں اس کے معنی پالنے کے ہیں اور چونکہ پرورش کی ضرورت کا احساس انسانی زندگی کے بنیادی احساسات میں سے ہے اس لیے اسے بھی قدیم ترین سامی تعبیر میں سے سمجھنا چاہیے۔ پھر چونکہ معلّم، استاد اور آقا کسی نہ کسی اعتبار سے پرورش کرنے والے ہی ہوتے ہیں اس لیے اس کا اطلاق ان معنوں میں بھی ہونے لگا۔ چنانچہ عبرانی اور آرامی کا (ربی) اور (رباہ) پرورش کنندہ معلّم اور آقا تینوں معنی رکھتا تھا اور قدیم مصری اور خالدی زبان کا ایک لفظ (رابو) بھی انھیں معنوں میں مستعمل ہوا ہے اور ان ملکوں کی قدیم ترین سامی وحدت کی خبر دیتا ہے۔

ربّ دراصل مصدر ہے جو فاعل کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے معنی میں انتہا درجے کا مبالغہ پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ جب ہم اس کی معنوی وسعت پر غور کرتے ہیں تو عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس کی وسعت کمیت کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ جہاں تک کمیت کا تعلق ہے تو وہ ذات جو رب ہے، وہ حقیقت میں رب العالمین ہے اور عالمین کا شمار کسی انسانی عقل کے بس میں نہیں۔ اس کی مخلوقات میں سے جو مخلوقات ہمارے سامنے ہیں اور جن میں سے ہر مخلوق کو ربوبیت کا فیضان پہنچ رہا ہے۔ ان میں سے صرف خشکی کی مخلوقات کو شمار کیا جائے تو یہ بھی ممکن نہیں۔ چہ جائیکہ سمندر کی مخلوقات،

Marfat.com

آسمانوں کی مخلوقات‘ پہاڑوں کی مخلوقات اور اُن جہانوں کی مخلوقات جن کے ناموں سے تو ہم کسی حد تک واقف ہیں۔ لیکن ان کی حقیقت سے واقف نہیں۔ ان کا شمار کون کرسکتا ہے اور پھر اگر ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا جائے مثلاً ایک درخت کے اندر جڑ‘ تنا‘ چھلکا‘ گودا‘ پھول‘ پھل‘ شاخ‘ پتوں کے اندر رنگ و روغن پھر تاثیر اور مزا اور پھر ان کی شکل و صورت۔ ان تمام کے اندر ایک جہانِ معنی موجود ہے جو ربوبیت کے فیضان کا اظہار کررہا ہے۔ مگر اس کی حقیقت تک پہنچنا آسان نہیں۔ اسی طرح خود انسان کو اپنے جسم‘ جسم کے مختلف اعضاء، اعضاء کے اندر مختلف اعصاب اور پھر ہر ایک کی الگ الگ غذا۔ ان پر ہی غور کیا جائے تو حیرت و استعجاب کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ اسی طرح جہاں تک اس ربوبیت کی کیفیت کا تعلق ہے وہ صرف ایسا نہیں کہ محض پرورش کا جاری و ساری عمل ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بعض آئمہ لغت نے اس کی تعریف میں یہ جو بات کہی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے کہ ربوبیت کی تعریف یہ ہے ”ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام“ یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ وہ اپنی حدِ کمال تک پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا کسی محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہے، جود ہے، احسان ہے، لیکن وہ بات نہیں جسے ربوبیت کہتے ہیں، ربوبیت کے لیے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود کو اس کی تکمیل و بلوغ کے لیے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہیں، ان سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ یہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے جذبہ سے خالی ہوگا ربوبیت نہیں ہوسکتا۔ ربوبیت کی ایک ادنیٰ مثال ہم اُس پرورش میں دیکھ سکتے ہیں جس کا جوش ماں کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے۔ مثلاً جب بچے کا معدہ دودھ کے سوا کسی غذا کا متحمل نہیں ہوتا تو اسے دودھ ہی پلایا جاتا ہے۔ اور جب دودھ سے زیادہ قوی غذا کی ضرورت ہوئی تو ویسی ہی غذا دی جانے لگی۔ جب اس کے پاؤں میں کھڑے ہونے کی سکت نہ تھی تو ماں اسے گود میں اٹھائے پھرتی تھی۔ جب کھڑا ہونے کے قابل ہوا تو انگلی پکڑ لی اور ایک ایک قدم چلانے لگی۔ پس یہ بات کہ ہر حالت اور ضرورت کے مطابق ضروریات مہیا ہوتی رہیں اور نگرانی و حفاظت کا ایک مسلسل اہتمام جاری رہے۔ یہ وہ صورتِ حال ہے جس سے ربوبیت کے مفہوم کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ مجازی ربوبیت کا یہ ناقص اور محدود عملی نمونہ سامنے رکھیے اور پھر ربوبیتِ الٰہی کی غیر محدود حقیقت کا تصور کیجیے تو اس کا

Marfat.com

رب العالمین ہونے کا معنی یہ ہوا کہ جس طرح اس کی خالقیت نے کائناتِ ہستی اور اس کی ہر چیز پیدا کی ہے اسی طرح اس کی ربوبیت نے ہر مخلوق کی پرورش کا سروسامان بھی کر دیا ہے اور یہ پرورش کا سامان ایک ایسے عجیب وغریب نظام کے ساتھ ہوا ہے کہ ہر وجود کو زندگی اور زندگی کی بقاء کے لیے جو کچھ مطلوب تھا وہ سب کچھ مل رہا ہے اور اس طرح مل رہا ہے کہ ہر حالت کی رعایت ہے' ہر ضرورت کا لحاظ ہے۔ ہر تبدیلی کی نگرانی ہے اور ہر کمی بیشی ضبط میں آ چکی ہے۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

رحمٰن اور رحیم اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں میں سے دو نام ہیں۔ ان دونوں کا مادہ رحمت ہے۔ لیکن یہ رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔

رحمٰن عربی زبان میں فعلان کے وزن پر مبالغے کا صیغہ ہے اور رحیم فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔

فعلان میں تین باتیں نمایاں ہیں۔

1۔ فعلان کا وزن صفات عارضہ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

جیسے پیاسے کے لیے عطشان' غضبناک کے لیے غضبان' سراسیمہ کے لیے حیران' مست کے لیے سکران' کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

2۔ فعلان کا وزن جوش وخروش اور ہیجان پر دلیل ہوتا ہے اس طرح رحمٰن کا لفظ جو رحمت سے اسم مبالغہ ہے کے معنی ہوں گے کہ رحمٰن وہ ذات ہے جس میں صفت رحمت پائی جاتی ہے اور اس کی رحمت میں ایک جوش اور ایک ہیجان ہے۔ یہ مخلوقات کے لیے اس طرح ابلتی ہے جیسے چشمہ ابلتا ہے۔

3۔ فعلان کا وزن اپنے اندر وسعت اور ہمہ گیری رکھتا ہے اس لحاظ سے رحمٰن کے معنی ہوں گے وہ ذات جس کی رحمت سارے عالم، ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا، سب پر حاوی اور شامل ہے۔ اسی وجہ سے اس اسم کو لفظ اللہ کے تقریباً برابر قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے:

Marfat.com

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِادْعُوا الرَّحْمٰنَ ط اَیًّامَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی﴾ (بنی اسرائیل: ۱۷۔۱۱۰)

(اے پیغمبر فرما دیجیے کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کے نام سے پکارو کسی طرح بھی پکارو اس کے سب نام بہتر ہیں)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی طرح لفظ رحمٰن بھی پروردگار کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی بھی ایسا نہیں ہو سکتا جس کی رحمت سے عالم کی کوئی چیز خالی نہ رہے۔ اس لیے جس طرح لفظ اللہ کی جمع اور تثنیہ نہیں آتا رحمان کا بھی جمع و تثنیہ نہیں آتا کیونکہ وہ ایک ہی ذات پاک کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں۔

یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ کفار قریش اسم اللہ سے تو واقف تھے، مگر اسم رحمان سے انھیں بالکل آگاہی نہیں تھی۔ اس لیے قرآن کریم نے متعدد مواقع پر اس کا ذکر فرمایا کہ کفار مکہ سے جب پوچھا جاتا کہ زمین و آسمان کا خالق کون ہے؟ سورج اور چاند کو کس نے مسخر کیا ہے؟ آسمان سے پانی کون اتارتا ہے؟ زمین کو از سر نو کون زندگی دیتا ہے؟ یہاں تک کہ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تمھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ تمھیں رزق کون دیتا ہے؟ دعائیں کون سنتا ہے؟ تو وہ اس کے جواب میں کہتے تھے کہ ”اللہ“ مگر جب ان سے کہا جاتا کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے کہ رحمان کیا ہوتا ہے؟ اسی لیے قرآن کریم نے کہا:

﴿وَهُمْ بِذِكْرِ الرَّحْمٰنِ هُمْ كٰفِرُوْنَ﴾ (الانبیا: ۳۶)

”کہ یہی تو وہ ہیں کہ جو رحمان کے ذکر سے انکاری ہیں۔“

اس لیے علماء نے لکھا کہ اگر کسی کا نام عبدالرحمٰن ہو تو اسے صرف رحمان کہہ کر بلانا جائز نہیں کیونکہ یہ نام ذات الٰہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس کے مقابلے میں لفظ رحیم جو اللہ تعالیٰ کے پیارے ناموں میں سے ہے، وہ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے اور فعیل کا وزن دوام و استمرار، پائیداری و استواری پر دلالت کرتا ہے اور یہ وزن ایسی صفات کے لیے بولا جاتا ہے جو صفاتِ عارضہ نہیں بلکہ صفاتِ قائمہ ہیں۔ مثلاً کریم، کرم کرنے والا۔ عظیم، بڑائی رکھنے والا۔ علیم، علم رکھنے والا۔ حکیم، حکمت رکھنے والا۔ دوسری یہ بات کہ اس میں رحمت کے کامل اور مکمل ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رحیم وہ ہوگا جس کی رحمت میں دوام اور تسلسل پایا

Marfat.com

جائے اور جس کی رحمت صفتِ کمال کے ساتھ متصف ہو۔ رحمان کے بعد رحیم کا ذکر کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پروردگار کی اپنی خلق کے لیے رحمت میں صرف جوش ہی نہیں بلکہ پائیداری اور استقلال بھی ہے۔ اس نے یہ نہیں کیا ہے کہ رحمانیت کے جوش میں دنیا پیدا تو کر ڈالی لیکن پیدا کر کے پھر اس کی خبر گیری اور نگہداشت سے غافل ہو گیا ہو۔ بلکہ اس کو پیدا کرنے کے بعد وہ اپنی پوری شان رحیمیت کے ساتھ اس کی پرورش اور نگہداشت بھی فرما رہا ہے۔ بندہ جب بھی اسے پکارتا ہے۔ وہ اس کی پکار سنتا ہے اور اس کی دعاؤں اور التجاؤں کو شرف قبولیت بخشتا ہے۔ پھر اس کی رحمتیں اسی چند روزہ زندگی تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ جو لوگ اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلتے رہیں گے ان پر اس کی رحمت ایک ایسی ابدی اور لازوال شان میں ہو گی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ رحیم میں دوام اور تسلسل صفت کمال کے ساتھ پایا جاتا ہے تو جس طرح اس کائنات کا ارتقاء بالآخر اسے آخرت میں داخل کر دے گا اور اس کی تمام نعمتیں جنت کی آغوش میں پہنچ کر ارتقاء کی انتہائی منزل کو پالیں گی اسی طرح پروردگار کے رحیم ہونے کی صفت دنیا سے آخرت کی طرف اس کی رحمت کے ارتقاء کا ایک عمل ہے، جو بنی صفتِ کمال کے ساتھ آخرت اور جنت میں رونما ہو گا۔ اس لیے جن علماء نے الرحیم کو آخرت کے ساتھ مخصوص کیا ہے ان کا شاید یہی مفہوم ہے کہ رحمت اپنی تکمیلی شان میں وہاں جلوہ گر ہوئی۔

رحمت کا مفہوم

یہ تو تھا الرحمٰن اور الرحیم کا مفہوم اور دونوں کے معنی میں فرق۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں معنوں میں ہم نے جس صفت رحمت کا ذکر کیا ہے، وہ رحمت ہے کیا؟ اگر اس رحمت کا مفہوم یہ ہے کہ اس نے کائنات کو عدم سے وجود بخشا تو یہ بات اس کی صفتِ خلق کا مظہر ہے اور اگر اس کا یہ معنی ہے کہ وہ پیدا کرنے کے بعد تربیت کا سامان کر رہا ہے اور ہر مخلوق کو اس کی ضرورت کے مطابق سامانِ تربیت میسر آ رہا ہے اور ہر ایک کی ضرورت کو پورا کیا جا رہا ہے اور ہر ایک کی نگرانی کی جا رہی ہے اور ہر ایک کو عہد بعہد آگے بڑھایا جا رہا ہے تو یہ وہ چیز ہے جس کو پرودگار کی صفت ربوبیت انجام دے رہی ہے۔ مگر یہاں تو رحمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ رحمت کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کائنات پر تدبر کی نگاہ ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کائنات کے لیے صرف پرورش اور تربیت کا سامان ہی مہیا نہیں ہو رہا

Marfat.com

بلکہ پرورش سے بھی زیادہ بنانے سنوارنے اور فائدہ پہنچانے کی حقیقت کام کر رہی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی فطرت میں بناؤ ہے، اس کے بناؤ میں خوبی، اس کے مزاج میں اعتدال، اس کے افعال میں خواص، اس کی صورت میں حسن، اس کی صداؤں میں نغمہ اور اس کی بو میں عطر بیزی ہے اور اس کی کوئی بات ایسی نہیں جو اس کارخانہ کی تعمیر اور درستگی کے لیے مفید نہ ہو۔
پھر اسی پر بس نہیں بلکہ اس دنیا میں مخلوقات کی اپنی زندگی اور بقاء کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے صرف ایسا نہیں کہ انھیں مہیا کر دیا گیا ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کارگاہِ عالم میں عناصر حیات میں سے ہر عنصر، اس کے مؤثرات میں سے ہر مؤثر، اس کے خواص میں ہر خاصہ، ایک بے پناہ فیضان کا جوش رکھتا ہے اور ہر کسی کے اندر یہ خواہش تڑپتی دکھائی دیتی ہے کہ وہ آگے بڑھ کر اپنے فیضان سے اور اپنی خدمت سے مخلوقات کو نوازے۔
سورج' چاند، تارے، ہوا، بارش، دریا، سمندر، پہاڑ ان میں سے کون ہے جو مخلوقات کے لیے راحت رسانی اور آسائش دینے میں دوسرے سے پیچھے ہو۔

تصور کیجیے ہم رات بھر خوابِ غفلت کے مزے لوٹتے ہیں، سہانے خواب دیکھتے رات گزر جاتی ہے۔ صبح نیند کا خمار اترتے ہی اپنے آپ کو بادِ سحر کی طرح تروتازہ اور شاداب محسوس کرتے ہیں۔ مگر ہم نے کبھی یہ غور کرنے کی زحمت نہیں کی کہ ہم نے تھکاوٹ سے چور ہو کر جیسے ہی اپنے آپ کو بستر پر گرایا تو نیند لوریاں دیتی ہوئی خود بخود آ موجود ہوئی۔ ہم آرام کرتے رہے، وہ شب بھر ہمیں تھپکتی رہی۔ ہم نے اگر گرانی محسوس کی تو نہ جانے وہ کون فرشتہ آ پہنچا جس نے وقفے وقفے سے ہمیں دنیا بھر کی سیر کرائی' ہمیں اس طرح مسرور و مخمور رکھا کہ ہمیں رات گزرنے کا احساس ہی نہیں ہونے دیا۔ یہ جو عناصر رحمت مسلسل اپنا فرض انجام دینے میں مصروف رہے ہیں، ہمیں تو انھیں بلانے کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑتی۔ یہ ان کا آپ سے آپ بے تابانہ ہمارے سکون اور آرام مہیا کرنے میں لگے رہنا' یہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کیا ہے۔

صبح اٹھتے ہی زندگی کی سرگرمیاں شروع ہو جاتی ہیں لیکن اس میں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ زندگی کی سرگرمیاں بروئے کار لانے اور انجام دینے کے لیے جس جس مؤثر اور عنصر کی ضرورت ہے، وہ خود بخود اس کے لیے بے تاب دکھائی دیتا ہے۔ ہم بیدار ہونے میں تاخیر کر سکتے ہیں مگر سورج طلوع ہونے اور روشنی پھیلانے میں کبھی تاخیر نہیں کرتا۔ اس کی کرنوں کو ہمیں بلانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ ہمیں روشنی بھی

Marfat.com

دے رہا ہے، ہماری کھیتیوں کو پکا بھی رہا ہے، زندگی کی گاڑی کو ایک انجن کی طرح کھینچ رہا ہے۔ اگر زمین کو آبیاری کی ضرورت ہے تو سمندر سے کرنوں کے ڈول بھر بھر کر کھینچ رہا ہے، ابر کی چادریں بچھا رہا ہے، پہاڑوں سے برف کو پگھلا رہا ہے اور ندی نالوں کے ذریعے زمین کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے۔

رات آتی ہے تو چاند اپنا فرض انجام دینے اور اہلِ زمین کی خدمت کرنے کے لیے آموجود ہوتا ہے۔ وہ رات کے مسافروں کو راستہ دکھاتا، دلوں کو مسرتوں سے معمور کرتا، پھلوں میں مٹھاس اور گداز پیدا کرتا ہے۔ ستارے جھلملانے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتے، کلیاں کبھی چٹکنے سے نہیں رکتیں، پھول خود بخود مشامِ جاں کو معطر کرنے کا فرض انجام دے رہے ہیں۔

قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ تمھیں اس حقیقت کو سمجھنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ (عبس: ۸۰۔۲۴) انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے ہی کو دیکھے کہ جو غذا اس کے سامنے پڑی ہے وہ کہاں سے آئی ہے۔ یقیناً یہ گیہوں سے تیار ہوئی ہے۔ گیہوں کا ایک ایک دانہ ہتھیلی پر رکھ کر سوچو کہ یہ کیسے تیار ہوا ہے۔ کسان نے گیہوں زمین میں کاشت کیا، سہاگہ سے اسے دفن کر کے گھر چلا آیا لیکن اس کی غیر حاضری میں زمین کی قوت روئیدگی نے اپنا کام کیا، ہوا نے اپنا فرض انجام دیا، سورج نے سمندر کا شورابہ کھینچ کر ابر کی چادریں بچھائیں، موسم کے تغیرات اور ہوا کی گردش نے آبیاری کا کام کیا، سورج نے اس دانہ گندم کو پکایا، چاند نے اس میں گداز پیدا کیا، غرضیکہ تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں خود بخود بے تابانہ مصروف ہے۔ کسان یہ سمجھتا ہے کہ گندم کا یہ کھلیان میری محنت کا نتیجہ ہے۔ لیکن وہ نہیں جانتا کہ کس طرح عناصر قدرت اور زمین کی گیسوں نے اس سے کہیں زیادہ اپنا فرض انجام دے کر اسے روٹی کے قابل بنایا ہے۔ اسی پیرائے میں پروردگار مختلف نعمتوں کا ذکر فرماتے ہیں، جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ہم بے خبری میں جن نعمتوں سے استفادہ کرتے ہیں وہ سراسر اللہ کی رحمت کا ظہور ہے۔ چند آیات ملاحظہ فرمائیے جس میں اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے:

﴿وَاِنَّ لَكُمْ فِى الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ط نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِىْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ○ وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا

Marfat.com

حَسَنًا ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ O وَاَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ O ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّكِ ذُلُلًا ط یَخْرُجُ مِنْ م بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴾

(اور دیکھو یہ) چارپائے (جنھیں تم پالتے ہو) ان میں تمھارے لیے غور کرنے اور نتیجہ نکالنے کی کتنی عبرت ہے؟ ان کے جسم سے ہم خون اور کثافت کے درمیان دودھ پیدا کر دیتے ہیں جو پینے والوں کے لیے بے غل وغش مشروب ہوتا ہے۔ (اسی طرح) کھجور اور انگور کے پھل ہیں، جن سے نشہ کا عرق اور اچھی غذا دونوں طرح کی چیزیں حاصل کرتے ہو۔ بلا شبہ اس بات میں اربابِ عقل کے لیے (ربوبیت الٰہی کی) بڑی ہی نشانی ہے اور (پھر دیکھو) تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طبیعت میں یہ بات ڈال دی کہ پہاڑوں میں اور درختوں میں اور ان ٹہنیوں میں جو اس غرض سے بلند کی جاتی ہیں، اپنے لیے گھر بنائے پھر ہر طرح کے پھولوں سے رس چوسے، پھر اپنے پروردگار کے ٹھہرائے ہوئے طریقوں پر کامل فرمانبرداری کے ساتھ گامزن ہو۔ (چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ) اس کے جسم سے مختلف رنگوں کا رس نکلتا ہے، جس میں انسان کے لیے شفا ہے، بلاشبہ اس بات میں ان لوگوں کے لیے جو غور وفکر کرتے ہیں (ربوبیت الٰہی کی عجائب آفرینیوں کی) بڑی ہی نشانی ہے۔ (النحل ۱۶: ۶۵۔۶۹)

غرضیکہ عناصرِ قدرت میں ایک ایک عنصر اور ایک ایک خاصہ مخلوقات کو راحت رسانی اور سہولت مہیا کرنے کے لیے بے تاب ہے اور کبھی اس نے تساہل سے کام نہیں لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ پروردگار میں صفت ربوبیت کے ساتھ ساتھ رحمت بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ سب اسی کا مظہر اور اسی کی نمود ہے۔

Marfat.com

4- روزِ جزاوسزا کا مالک

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْم
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْم

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

(جزااور سزا کے دن کا مالک)

امام بیضاوی نے "مالک" کا معنی بیان کرتے ہوئے فرمایا المتصرف فی اعیان المملوکة کیف شاء ''وہ ذات جو اپنی مملوکہ چیزوں میں جس طرح چاہے تصرف کرنے کی قدرت رکھتی ہو'' یعنی اسے ایسا قبضہ حاصل ہو کہ اس کے تصرف کو نہ کوئی روک سکے اور نہ اسے ناجائز کہہ سکے اس آیت کریمہ میں پروردگار نے اپنے آپ کو جزااور سزا کے دن کا مالک قرار دیا ہے۔ حالانکہ اس دنیا اور دنیا کی ہر چیز اور پھر آنے والی دنیا اور اس کی ہر چیز کا بھی اللہ ہی مالک ہے تو پھر بطور خاص اپنے آپ کو روز جزا کا مالک کہنے سے کیا مراد ہے؟ بات یہ ہے کہ یوں تو پروردگار کائنات کے ذرے ذرے کا مالک ہے ہر چیز کو اسی کے حکم سے وجود ملا ہے اسی کی عنایت سے اس کی زندگی وابستہ ہے اور ہر چیز کی بقاء اللہ ہی کے رحم و کرم پر ہے۔ لیکن یہ اس کی حکمت ہے کہ اس نے مخلوقات کو کسی نہ کسی حد تک ملکیت کا حق دے رکھا ہے۔ جنگل کے جانور طاقت کے بل بوتے پر جس بھٹ' بل یا آشیانے پر قبضہ کر لیں وہ اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں۔ اسی طرح انسان بھی بعض حوالوں سے بہت ساری چیزوں کو اپنی ملکیت خیال کرتا ہے اور شریعت نے بھی ہر جائز ملکیت کے حقوق تسلیم کیے ہیں۔ لیکن ایک تو یہ ملکیت چند روزہ ہے، زندگی کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو جائے گی اور دوسری یہ بات کہ یہ ایک ناقص ملکیت ہے اگر کامل ملکیت ہوتی تو قیامت کے دن اس کے بارے میں جواب دہی نہ کرنا پڑتی۔ پروردگار نے اس ناقص ملکیت کا بھی لحاظ فرمایا اس لیے انسانی زندگی اور اس کے زیر تصرف چیزوں پر

Marfat.com

کامل ملکیت رکھنے کے باوجود بھی ملکیت کا ذکر نہیں فرمایا۔ بلکہ اپنے آپ کو یوم الدین کا مالک کہا جس سے اشارہ اس جانب ہے کہ وہ دن ایسا ہوگا جس دن اللہ کی صفت عدالت پوری طرح ظہور میں آ چکی ہوگی اور وہ ہر شخص کو عدالت کے کٹہرے میں بلا کر جواب طلبی کرے گا۔ اس دن ناقص ملکیت رکھنے والے جو اپنی محدود ملکیتوں پر ناز کرتے تھے وہ اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوں گے اور وہ بڑے بڑے حکمران جنھیں ان کے اقتدار نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا، اس کے سامنے سر جھکائے سہمے ہوئے ایستادہ ہوں گے۔ پھر وہ اس دن اعلان فرمائے گا کہ باوجود اس کے کہ دنیا میں بھی اصل ملکیت اور حکومت میری تھی اور میں فی الحقیقت مالک ہوتے ہوئے ہر چیز کا حکمران تھا۔ لیکن تم نے اپنی ناقص حکمرانی سے دھوکہ کھا کر میری حکمرانی کو نظر انداز کیا۔ آج بتاؤ وہ تمھاری حکمرانیاں کہاں گئیں اور آنکھیں کھول کے دیکھو کہ آج کس کی حکومت ہے کہ اس کے مقرب بندے بھی سر جھکائے کھڑے ہیں اور اس کے انبیا و رسل بھی زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر پا رہے۔ اسی کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

﴿یَوْمَ هُمْ بَارِزُوْنَ لَا یَخْفٰی عَلَی اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ط لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ط لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ○ اَلْیَوْمَ تُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ م بِمَا كَسَبَتْ ط لَا ظُلْمَ الْیَوْمَ ط اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ﴾

"جس دن سب لوگ (خدا کے) سامنے آ موجود ہوں گے (کہ) ان کی کوئی بات خدا سے (صورۃً) بھی مخفی نہ رہے گی، آج کے روز کس کی حکومت ہوگی؟ بس اللہ ہی کی ہوگی، جو یکتا اور غالب ہے۔ آج ہر شخص کو اسکے کیے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا، اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔" (المومن آیت ۴۰:۱۶۔۷)

اس آیت کریمہ کا دوسرا لفظ ہے یوم الدین "جزا و سزا کا دن"۔ اس لفظ پر غور کرتے ہوئے سب سے پہلی بات جو ذہن میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ جزا اور سزا کا دن وہ ہوگا۔ جب اس دنیا کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور ہم سب اللہ کی بارگاہ میں جواب دہی کے لیے کھڑے ہوں گے اور جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے، جس میں اب ہم رہ رہے ہیں، یہ جزا و سزا کا دن نہیں، یہ دار العمل ہے۔ یہاں ہمیں مہلتِ عمل میسر ہے تا کہ ہم آنے والے دن کی تیاری کر سکیں۔ یہاں جو کچھ ہم کریں گے اس کا صلہ آنے والے دن میں پائیں گے نیکی کریں گے۔ تو

Marfat.com

اس کا صلہ اچھا ملے گا اور برائی کریں گے تو اس کے نتیجے میں برائی ملے گی۔ اس لیے اس دنیا میں ہر زندہ شخص کو یہ سوچ کر زندگی گزارنی ہے کہ یہاں میں صرف اعمال کا مکلّف ہوں اللہ نے مجھ پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں مجھے اپنی زندگی میں انھیں ادا کرنا ہے۔ وہ چاہے انفرادی ذمہ داریاں ہوں چاہے اجتماعی ذمہ داریاں۔ ان کی ادائیگی مجھ پر واجب ہے اور اسی حوالے سے کل کو مجھے جزا اور سزا ملے گی۔ آج کسی عمل کے بارے میں بھی مجھے یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اسی دنیا میں مجھے اس کی جزا بھی ملے گی۔ اس بات کو سمجھ لینے سے آدمی ایک بڑی غلط فہمی سے بچ جاتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی نیکی کرنے والا شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے تو وہ خود بھی اور اسے جاننے والے بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ نیکی کا صلہ تو اللہ بہتر اجر کی صورت میں دیتا ہے، یہ نیک شخص آخر اس مصیبت میں مبتلا کیوں ہے۔ اس سوچ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو اس نیک شخص کے بارے میں بدگمانی پیدا ہونے لگتی ہے اور یا اللہ کے بارے میں آدمی بدگمان ہو جاتا ہے کہ مذہب غلط کہتا ہے کہ نیکی کا صلہ اجر و ثواب کی صورت میں ملتا ہے اور دنیا میں ایک اچھی زندگی عطا ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو نیک لوگ مصیبتوں میں مبتلا کیوں ہوتے۔

اسی طرح اگر کوئی برا آدمی دولت میں کھیلتا ہے اور آئے دن اس کے کاروبار میں ترقی ہوتی ہے یا اس کا عہدہ و منصب بڑھتا ہے تو تب بھی لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگتے ہیں کہ اگر برائی کا نتیجہ برا ہوتا تو اس شخص کو یہ آسانیاں اور سہولتیں تو میسر نہیں آنی چاہئیں تھیں۔ اس لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ تم جس دنیا میں زندگی گزار رہے ہو یہ دار الجزاء نہیں، دار العمل ہے۔ تمھارا کام یہاں اچھے سے اچھا عمل کرنا ہے۔ اس کی جزا تمھیں قیامت میں ملے گی۔ اس لیے اگر آج نیکی کی جزا نہیں مل رہی تو مایوسی کی کوئی وجہ نہیں اور اگر کسی کو گناہ یا ظلم کی سزا نہیں مل رہی تو اس میں بھی ظالم کی خوشی کا کوئی موقع نہیں۔ البتہ ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ بعض دفعہ یہاں کبھی نہ کبھی نیکی کا صلہ مل بھی جاتا ہے اور کبھی کسی مجرم کو دنیا ہی میں سزا سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں کسی نیکی کا صلہ در حقیقت جزا نہیں۔ بلکہ نیکی کرنے والے کی حوصلہ افزائی ہے۔ اس کا تعلق قانون جزا سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل و رحمت سے ہے۔ اسی طرح کسی بدعملی کی سزا کا ملنا وہ بھی حقیقت میں جزا اور سزا کے قانون کا ظہور نہیں، بلکہ محض متنبہ کرنے کے لیے ہوتا ہے جو اصل سزا اور عذاب ہوگا۔ وہ تو قیامت کے دن ہی ہوگا قرآن کریم نے اس کے بارے میں ہمیں بتایا ہے:

Marfat.com

﴿وَلَنُذِيقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾ (سجدہ ۳۲:۲۱)

''یعنی ہم لوگوں کو (آخرت کے) بڑے عذاب سے پہلے (بعض اوقات) دنیا میں ایک عذابِ قریب کا مزہ چکھا دیتے ہیں تا کہ وہ باز آ جائیں''۔

﴿كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ط وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ م لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾

''ایسا ہوتا ہے عذاب اور آخرت کا عذاب بہت بڑا ہے' کاش وہ سمجھیں''۔ (قلم ۶۸:۳۳)

الغرض دنیا کی راحت و مصیبت بعض اوقات تو امتحان اور آزمائش ہوتی ہے اور کبھی عذاب بھی ہوتی ہے۔ مگر وہ عمل کا پورا بدلہ نہیں ہوتا، بلکہ ایک نمونہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ چند روزہ اور محض عارضی ہے۔ اصل بدلہ وہ راحت و کلفت ہے جو ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اور جو اس عالم سے گزرنے کے بعد عالم آخرت میں آنے والی ہے۔ اسی کا نام روز جزاء ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نیک و بد عمل کا بدلہ یا پورا بدلہ اس دنیا میں نہیں ملتا اور عدل و انصاف اور عقل کا تقاضا ہے کہ نیک و بد اچھا اور برا برابر نہ رہے بلکہ ہر عمل کی مکمل جزا یا سزا ملنی چاہیے۔ تو اس کا لازمی تقاضا ہے کہ اس عالم کے بعد کوئی دوسرا عالم، ہو جس میں ہر چھوٹے بڑے اور اچھے برے عمل کا حساب اور اس کی جزا یا سزا، انصاف کے مطابق ملے۔ اسی کو قرآن کی اصطلاح میں روز جزا یا قیامت یا آخرت کہا جاتا ہے۔ قرآن نے خود اس مضمون کو سورۃ مومن میں وضاحت سے بیان فرمایا ہے۔

﴿وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ط قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ○ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

''یعنی بینا اور نابینا اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور بدکردار باہم برابر نہیں ہو سکتے' تم لوگ بہت ہی کم سمجھتے ہو' قیامت تو ضرور ہی آ کر رہے گی (تا کہ ہر ایک عمل کا پورا بدلہ ہر عمل کرنے والے کو مل جائے)' اس کے آنے میں کسی طرح کا شک ہے ہی نہیں' مگر اکثر لوگ نہیں جانتے''۔ (المؤمن ۴۰:۵۸-۵۹)

Marfat.com

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ

(ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں)

یہ نغمہ ایک مومن کے دل کا سرجوش ہے جو ازخود اس کے دل سے اچھل کر زبان پر آ گیا ہے کیونکہ یہ بات انسان کے خمیر میں رکھی گئی ہے کہ وہ اپنے محسن کی احسان شناسی کے جذبے میں ڈوب کر اپنے محسن کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے پھر اگر وہ محسن اس کا ہم پایہ ہے اور اس کا احسان ایک عام سطح کا ہے تو یہ اس کی خدمت کر کے ایک تسکین محسوس کرتا ہے لیکن اگر وہ محسن ایک بڑی حیثیت کا مالک ہے تو یہ اس کی حیثیت کے مطابق اس کے آداب بجا لاتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو میرے بس میں ہے میں اس کی خوشنودی کے لیے کر گزروں اور اگر وہ احسان کرنے والی ذات ایسی ہے جو محبت، عقیدت اور بندگی کا مرجع ہے تو یہ احسان میں ڈوبا ہوا شخص اپنی زندگی کا سارا سرمایہ اور بندگی کا سارا خزانہ اور حمد و ثناء کی ساری پونجی اس کے قدموں میں ڈھیر کر کے خود بھی اس کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے یہ طرز عمل فطرت کا وہ رویہ ہے جو انسان کے خمیر میں گوندھ دیا گیا ہے اسی جذبے سے سرشار انسان جب اپنے رب کے احسانات کو دیکھتا ہے کہ اس کا وجود اس کے دل و دماغ کی رعنائیاں، اس کے احساسات کی سرگرمیاں، اس کے جذبوں کی فراوانیاں، اس کی ذہانت کی جولانیاں، اس کے عزائم کی بلندیاں، اس کی محبت کی گہرائیاں، اس کے جذبۂ ایجاد کی ہمہ گیریاں، اس کے انفعالی جذبوں کی خوبصورتیاں اور اس کی شخصیت کی تہ در تہ کرم فرمائیاں سب پروردگار کی عطاء اور بخشش ہے تو وہ بے ساختہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر اپنی ذات کی نفی کر کے اسی کی عبادت کا اقرار و اعتراف کرنے لگتا ہے اور پھر جب عبادت کی وسعتوں اور اپنی ناتوانیوں کو دیکھتا ہے تو اسی سے مدد کا طلب گار ہوتا ہے لیکن یہ سب کچھ وہ اس عاجزی اور سرافگندگی کے ساتھ کرتا ہے جس سے ایک طرف دعا کا آہنگ جنم لیتا ہے اور دوسری طرف بندے اور اس کے رب کے درمیان ایک عہد و پیمان کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے کہ بندہ اپنی بندگی کا سرمایہ لے کر جب حضورِ حق میں حاضر ہوتا ہے تو ادھر سے اسے آواز سنائی دیتی ہے کہ تم نے اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کر دیا تو ہم

Marfat.com

نے بھی تمھیں وہ سب کچھ دے دیا جو تم نے ہم سے مانگا اور جب تک تم اپنی بندگی کے اس عہد پر قائم رہو گے تو ہماری عنایات میں کبھی کمی نہیں دیکھو گے چنانچہ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ مسلمان وسائل کی کمی کے باوجود محض بندگی رب کے باعث اس سرزمین پر سرافراز رہے لیکن جب انھوں نے طاغوت کی بندگی شروع کر دی تو وہ ٹھوکروں کی نذر ہو کر رہ گئے یہی وہ عہد ہے جو آنحضرت ﷺ نے جنگ بدر شروع ہونے سے پہلے اپنے پروردگار سے کیا تھا آپ ﷺ رات بھر اللہ کے حضور کھڑے دعائیں مانگتے رہے آخر آپ کی زبان پر یہ جملہ آیا کہ یا اللہ یہ زمین انسانوں سے معمور ہے لیکن آج کی پوری نوع انسانی میں یہ چند گنتی کے لوگ ہیں جو آپ کی توحید کے پرستار ہیں اگر اس جنگ میں یہ لوگ مارے گئے تو پھر دنیا میں تیری پوجا کرنے والا کوئی نہیں رہے گا اگر آپ چاہتے ہیں کہ دنیا میں آپ کی عبادت کی جائے تو پھر ان چند گنتی کے لوگوں کو اپنی تائید و نصرت سے نواز دیں تاکہ یہ آپ کی زمین پر آپ کے نام اور آپ کے دین کو بلند کر سکیں پروردگار نے فرمایا کہ ہم تمھارے اس وعدے پر تمھاری مدد کے لیے فرشتے بھیج رہے ہیں اور آئندہ بھی یہی فیصلہ ہو گا کہ تم اللہ کی بندگی میں کمی نہیں آنے دو گے اور اللہ تعالیٰ کبھی تمھیں اپنی تائید و نصرت سے محروم نہیں کرے گا۔ اسی وعدے اور عہد کا اعادہ روزانہ ایک بندہ اپنے رب کے حضور کھڑا ہو کر کرتا ہے اب اس سے پہلے کہ ہم اس عبادت اور استعانت کی لفظی اور معنوی وضاحت کریں اس کی اہمیت اور افادیت کے حوالے سے چند بنیادی باتیں عرض کرتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جن و انس کا مقصدِ تخلیق عبادت ٹھہرایا ہے ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات ٥١:٥٦)

کہ میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

انسانوں کی ہدایت کے لیے اللہ نے انبیا اور رسول مبعوث فرمائے اور قرآن کریم کی صراحت کے مطابق تمام انبیا اور رسولوں کی دعوت کا عنوان صرف عبادت رہا۔ پروردگار کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُوْلًا أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ﴾

(النحل ١٦:٣٦)

Marfat.com

ہم نے ہر امت کی طرف رسول بھیجا (انھوں نے آ کر انھیں اللہ کا پیغام پہنچایا) کہ لوگو اللہ کی عبادت کرو۔

رسول اللہ ﷺ سب پیغمبروں کے آخر میں خاتم النبین بن کر تشریف لائے اور آپ ﷺ کے بعد نبوت اور رسالت کا دروازہ بند ہو گیا اور آپ کے واسطے سے اللہ تعالیٰ قیامت تک کے آنے والے انسانوں کو جو ہدایت دینا چاہتا تھا اسے تکمیلی انداز میں انتہائی جامعیت کے ساتھ عطا فرما دیا گیا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اس دعوت کا جب آغاز فرمایا گیا اس کا عنوان بھی یہی عبادت رکھا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿يَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرة ۲:۲۱)

اے لوگو! عبادت کرو اپنے اس رب کی جس نے تمھیں پیدا کیا اور تم سے پہلے لوگوں کو پیدا کیا۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں عبادت کی کیا اہمیت ہے کیونکہ یہی جن و انس کا مقصدِ تخلیق ہے، یہی تمام انبیا کی دعوت تھی اور یہی دعوت رسول اللہ ﷺ نے انتہائی جامعیت کے ساتھ جن و انس تک پہنچائی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عبادت کا مفہوم کیا ہے؟ رسول اللہ ﷺ جب مبعوث ہوئے تو آپ ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے دنیا میں عبادت کے حوالے سے چار تصورات پائے جاتے تھے۔

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ

(اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں)

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ ہماری محولہ بالا گزارشات سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ عبادت فی الحقیقت اللہ کی بندگی اور غلامی کا نام ہے اور غلامی بھی ایسی جس کے بعد ہر آستانے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔ اور ہر چوکھٹ سے گردن آزاد ہو جاتی ہے۔ لمحہ فکریہ یہ ہے کہ جب ایک بندہ ہر غلامی سے آزاد ہو کر صرف اللہ ہی کی غلامی کا قلادہ گلے میں ڈال لیتا ہے اور وہ ہر ایک سے تعلق توڑ کر اللہ کا ہو جاتا ہے تو کیا ایسے غلام کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے آقا

Marfat.com

کے علاوہ استعانت کے لیے کسی اور دروازے پر دستک دے۔ وہ ضرورت مند ہو تو ضرورتیں کسی اور آقا کے پاس لے کر جائے۔ اسے دکھ اور غم گھیر لیں تو مدد کے لیے کسی اور کو پکارے۔ جب اس کے سب ظاہری سہارے جواب دے جائیں تو وہ کسی اور کو آواز دے۔ ایسا کرنا یقیناً اس کی غلامی کے تصور کے خلاف ہے اور اس کے آقا کی توہین ہے۔ اس لیے جب بندہ ایک اللہ کی غلامی کا اعتراف کرتا ہے تو پھر وہ اپنا کشکول بھی توڑ دیتا ہے اس کے ارادوں کی کمزوری قوت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کی غلامی کو ایسی سربلندی ملتی ہے کہ بادشاہون کی رعونتیں بھی اس کے سامنے دم توڑنے لگتی ہیں۔ وہ بڑی سے بڑی قوت سے بھی مرعوب ہونے سے انکار کر دیتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میری غلامی کا رشتہ اس ذات سے ہے جو شہنشاہ کائنات اور آقائے کل ہے۔ جہاں تک اسباب کی دنیا کا تعلق ہے وہ لین دین تکافل و تعاون اور اعانت و استعانت میں بالکل دوسرے انسانوں کی طرح ہوتا ہے لیکن ماورائے اسباب کسی طاقت کے سامنے اللہ کے سوا کبھی ہاتھ نہیں پھیلاتا اگر اسباب ٹوٹنے لگیں اور ظاہری سہارے جواب دینے لگیں تو وہ پریشان ہونے کی بجائے مسبب الاسباب کو پکارتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کائنات میں سب سے بڑی ذات اللہ کے بعد محمد رسول اللہ ﷺ کی ہے۔ لیکن وہ بھی جنگ بدر میں رات بھر اللہ سے مانگتے رہے اور پھر جب اس کی طرف سے مدد اور نصرت کا پیغام پہنچ گیا تو پھر اسی کی مدد سے مسلح ہو کر ریت سے مٹھی بھر کر پھینکی اور دشمن کی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور قرآن کریم نے اس خیال سے کہ کہیں لوگوں کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ جس مٹھی بھر ریت نے فوج کے قدم اکھاڑے ہیں اس کے پیچھے شاید اللہ کے رسول ﷺ کی قوت کارفرما تھی ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ﴾ (الانفال: ۸۔۱۷)

''اے پیغمبر آپ نے جو مٹھی پھینکی وہ آپ نے نہیں پھینکی وہ تو اللہ نے پھینکی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کے ولیوں کی کرامات درحقیقت انبیا اور اولیاء کے ذاتی اعمال نہیں ہوتے۔ بلکہ ان کے ذریعے سے اللہ کی قوت کا اظہار ہوتا ہے ان کے ہاتھ کو اس لیے استعمال کیا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی حیثیت اور عظمت واضح ہو جائے ورنہ ہر مشکل وقت میں اللہ کے نبی

Marfat.com

اور ولی اللہ ہی کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور مدد کے طلب گار ہوتے ہیں اللہ کے ولیوں سے دعا کے لیے کہنا اور ان سے برکت حاصل کرنا یہ قرآن و سنت سے ثابت ہے۔ کیونکہ اس سے مقصود اللہ ہی سے مدد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی اس لیے کسی اللہ کے بندے کے پاس جائے کہ وہ ذاتی طور پر اللہ تعالیٰ کے اختیارات کا مالک ہے تو اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ جس طرح اِیَّاكَ نَعْبُدُ سے ہر طرح کی غلامی اور بندگی کا جواز ختم ہو گیا اسی طرح وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ سے ماورائے اسباب ہر طرح کی مدد طلب کرنا ناجائز ٹھہرا اور اس تصور نے جس طرح انسان کو ہر آستانے سے بے نیاز کر دیا اور اس کے اندر وہ فکری توانائی پیدا کی جو ایک مردِ مومن کی علامت ٹھہری اسی طرح اس کی ہر کمزوری کا علاج کر دیا وہ تمام سہاروں سے بے نیاز ہو کر محض اللہ کے سہارے پر اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ مشکل سے مشکل ماؤف لمحوں میں بھی کبھی مایوسی کا شکار نہیں ہوتا۔ اسے موت بھی آئے تو وہ اسے اللہ کا پیغام سمجھ کر مسکراتا ہوا قبول کرتا ہے۔

Marfat.com

5- اعتراف سے دُعا تک کا سفر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ﴾

سورۃ الفاتحہ کے آغاز سے وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ تک پورا سفر ایک بندے کے اقرار واعتراف کا سفر ہے وہ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمت اور اس کے مسلسل نظام ربوبیت کے ساتھ ساتھ جب اس کی رحمت کو اپنے اندر باہر دائیں بائیں بلکہ پوری کائنات میں پھوار کی طرح برستا ہوا دیکھتا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے حمد وثنا کا نغمہ جاری ہو جاتا ہے۔ پھر اسی کیفیت میں جب وہ اپنی اور مخلوقات کی زندگیوں میں قانون مکافات کو جاری وساری پاتا ہے تو اللہ کی صفت عدالت اور اس کی ہمہ گیر حاکمیت کا تصور اس کے ذہن میں ابھرنے لگتا ہے یہ دونوں تصورات جب اس کی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں کہ ایک طرف وہ اللہ کی حمد وثنا میں ڈوبا ہوا ہے اور دوسری طرف قانون مکافات اس کی فکرمندیوں میں اضافہ کر رہا ہے تو وہ بے ساختہ اللہ کے آستانے پر ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اسی کی بندگی اور غلامی اور اسی سے استعانت اس کی زندگی کا سرمایہ بن جاتی ہے۔ یہی اس کے لیے پناہ گاہ بھی ہے اور اس کے قلب وضمیر کے لیے فرحت بخش بھی۔ وہ بندگی کے اعتراف سے سرشار ہوتا ہے تو توکل واعتماد اس کی شخصیت میں پختگی پیدا کر دیتے ہیں۔ لیکن جب ان احساسات کے ساتھ وہ اللہ کی بندگی کے لیے زندگی کے کٹھن راستوں پر سفر کرنا چاہتا ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی فکری شخصیت کی تعمیر کی طرف متوجہ ہونا پڑتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ یہاں قیاسی فلسفوں نے اس قدر دھول اڑائی ہے کہ حقیقتِ نفس الامری کا سراغ لگانا بہت مشکل ہو گیا ہے پھر وہ انسانی زندگی کے دروبست کو سمجھنا چاہتا ہے تو اسے یہ دیکھ کر پریشانی ہوتی ہے کہ صحیح نظامِ اخلاق کی بنیادیں تلاش کرنا ہی ایک مشکل کام ہو گیا

Marfat.com

ہے چہ جائیکہ اس پورے نظام کو تلاش کیا جائے۔ پھر وہ انسانی احساسات، انفعالات، خواہشات اور مزعومات کی دنیا کو سنوارنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے اسے بے شمار پگڈنڈیوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ پریشانیوں میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ ایک طرف اس کے اندر کا بے پناہ جذبہ ہے جو اسے بندگی کے سفر پر رواں دواں رکھنا چاہتا ہے اور دوسری طرف متذکرہ بالا سفر کی دشواریاں ہیں جو اسے ایک ایک قدم اٹھانے سے روکتی ہیں۔ اب تک تو اقرار و اعتراف کے جذبات نے اسے یہاں تک پہنچایا تھا لیکن اب جب وہ اپنے سامنے کوئی راستہ کھلتا ہوا نہیں دیکھتا تو مجبوراً یا بے ساختہ اقرار و اعتراف کے اسلوب سے ہٹ کر وہ دعا کا اسلوب اختیار کرتا ہے اور اپنے پروردگار سے وہ دولت مانگتا ہے جو اس کی زندگی کے لیے کلید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسکے دل سے آواز اٹھتی ہے۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (الفاتحة ١:٦)

یا اللہ ہمیں وہ سیدھی راہ دکھا جو ہمیں تیری رضا تک پہنچا دے۔“

ہدایت کا مفہوم

ہدایت کا لفظ جس طرح رہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگا دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اسی طرح یہ منزل مقصود تک پہنچانے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایک مسافر جب کسی سے راستہ پوچھتا ہے تو راستہ بتانے والا کبھی تو اسے وہیں کھڑا کھڑا ہاتھ کے اشارے سے مختلف نشانات بتا کر راستے کو واضح کر دیتا ہے، اسے راستہ دکھانا اور عربی میں اراء الطریق کہتے ہیں اور دوسری صورت راستہ بتانے کی یہ ہوتی ہے کہ مسافر کا ہاتھ پکڑ کر اسے منزل تک پہنچا دیا جائے۔ اسے ایصال الی المطلوب کہتے ہیں۔ تیسری صورت یہ ہے کہ راستہ چلنے والا اپنی منزل کی دوری اور راستے کی دشواریوں کے باعث گھبرا اٹھتا ہے۔ بعض دفعہ سفر کے آغاز ہی کے لیے تیار نہیں ہوتا اور بعض دفعہ راستہ کی کٹھنائیاں دیکھ کر سفر کا ارادہ چھوڑ دیتا ہے اور ناکامی کا داغ لیے اپنے گھر کو لوٹ آتا ہے۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ اس کے دل میں سفر کی امنگ پیدا کی جائے، راستہ کی دشواریوں کو سر کرنے کے لیے حوصلے کی دولت دی جائے اور وہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے ذہن میں یہ بات بٹھا لے کہ راہ کی سختیاں حقیقت میں سامان سفر ہوتی ہیں جس کے بغیر سفر کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ طبیعت میں

Marfat.com

اس کیفیت کا پیدا کرنا کبھی تو قلبی نور و بصیرت کے ذریعے ہوتا ہے کہ دل میں اک روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور سفر کے آغاز کی ہمت ہو جاتی ہے اور کبھی دل میں حوصلے کی ایسی ترنگ اٹھتی ہے جو راہ کی سختیوں کو سفر کی سنت سمجھ کر برداشت کرنے کا شوق پیدا کرتی ہے، اسے اللہ کی توفیق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔قرآن کریم نے تینوں معنوں میں ہدایت کے لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے جب وہ کہتا ہے کہ قرآن کریم تمام جن و انس کے لیے ہدایت بن کر آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انھیں زندگی گزارنے کا وہ راستہ بتاتا ہے جس پر چل کر وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کر سکتے ہیں اور جب وہ یہ بتاتا ہے کہ اصحاب کہف چند لڑکے بالے تھے جب وہ اللہ پر ایمان لے آئے اور پھر ایمان کے مطابق زندگی گزارنا، بت پرستوں کے دیس میں ان کے لیے مشکل ہو گیا اور دل ان کے ڈولنے لگے تو ہم نے ان کی ہدایت میں اضافہ کیا یعنی ان کے دلوں کو حوصلے سے باندھ دیا اور ان کے دلوں میں وہ استقامت اور اولوالعزمی پیدا کی جس کے نتیجے میں وہ آبادی چھوڑ کر غاروں کا راستہ اختیار کرنے پر تیار ہو گئے۔ یہ وہ دل کا نور اور بصیرت ہے جس نے ان کے لیے مشکلات آسان کر دیں اور کبھی قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (الروم: ۳۰۔۶۹) جو لوگ ہمارے راستے میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی توفیق دیتے ہیں یعنی ان کے راستے کی دشواریاں ہم ان کے لیے سہل بنا دیتے ہیں اور منزل انھیں اس حد تک محبوب ہو جاتی ہے کہ اس کی طرف بڑھنا ان کی زندگی کا سب سے بڑا مقصد بن جاتا ہے۔

اس تفصیل سے آپ کو یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جائیگی کہ سورۃ فاتحہ میں صراط مستقیم کی ہدایت کی جو دعا سکھائی گئی ہے وہ سب کے لیے ہے اس میں عوام بھی شامل ہیں اور خواص بھی حتی کہ انبیائے کرام بھی اللہ سے ہمیشہ یہی دعا مانگتے رہے۔اور رسول اللہ ﷺ بھی ہمیشہ نماز میں یہ دعا کیا کرتے تھے۔اگر ہدایت کا ایک ہی مفہوم ہوتا تو یقیناً سب کے لیے مناسب نہ ہوتا۔عوام کی دعا اور ہوتی اور خواص کی اور لیکن ہدایت کے ان مختلف مفاہیم کو دیکھ کر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ہر دعا مانگنے والا اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق اللہ سے ہدایت مانگتا ہے۔ پھر دل کا نور اور بصیرت سب کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔ایک عامی کے لیے اس کے دل و دماغ کے مطابق فی الجملہ اطمینان کافی ہے لیکن قربت خداوندی کے مسافروں کے لیے تو ہمت کے

Marfat.com

مطابق الگ الگ مقامات ہیں۔کوئی ایک مقام پر پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے تو دوسرا سالک اپنی منزل کو بہت دور سمجھتا ہے اس لیے وہ اگلے مقام کے لیے بے قرار رہتا ہے۔اللہ کی توفیق سب کی دستگیری کرتی ہے۔لیکن ہر ایک کو بقدر ہمت عطا ہوتی ہے۔دل کا اطمینان دماغ کی آسودگی اور بندگی کا سوز و گداز اس دعا کے نتیجے میں سب کو ملتا ہے لیکن ہر ایک اپنے اپنے مقام و مرتبہ کے مطابق نوازا جاتا ہے صالحین صلاحیتِ عمل سے نوازے جاتے ہیں اولیاء ولایت کے مرتبے سے اور انبیا کرام نبوت کے مدارج اعلیٰ پر فائز کیے جاتے ہیں۔اور پھر تمام انبیا بھی یکساں مقام نہیں رکھتے۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں کبھی اپنے اللہ کے ساتھ ایسے قرب سے نوازا جاتا ہوں جہاں کسی مقرب فرشتے کا بھی گزر نہیں ہوتا۔

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ کا مفہوم

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ میں ضمیر جمع کی ہے۔حالانکہ ہر مانگنے والا واحد ہوتا ہے لیکن وہ اپنی دعا میں جمع کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہمیں صراط مستقیم کی ہدایت عطا فرما۔اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تیرے چاہنے والوں کے قافلے کا ایک فرد ہوں۔میری عاجزی میری بے بسی میری بے بضاعتی میری کم ہمتی پر پروردگار نظر نہ فرما بلکہ جب اس قافلے کے بڑے بڑے لوگوں پر رحمت کی برکھا برسے تو میں بھی اسی بارش سے نہال کیا جاؤں۔سمندر کا قطرہ بھی سمندر میں رہ کر سمندر ہی ہوتا ہے۔میں بے قدر و بے قیمت سہی لیکن بڑے لوگوں کے ساتھ تیری رحمت یقیناً مجھے ان کے ساتھ نوازنے میں بخل نہیں کرے گی۔

اس دعا میں صراط مستقیم کا لفظ بھی قابل غور ہے۔صراط کے معنی راہ کے ہیں اور مستقیم کے معنی سیدھا ہونے کے۔پس صراط مستقیم ایسی راہ ہوئی جو سیدھی ہو کسی قسم کا پیچ و خم نہ ہو۔اللہ کے دین کے لیے اس سے بہتر تعبیر ممکن نہیں۔کیونکہ جب بھی آدمی کسی منزل پر پہنچنے کے ارادے سے نکلتا ہے تو اس کی سب سے پہلے کوشش یہ ہوتی ہے کہ مین ایسا راستہ اختیار کروں جو سیدھا منزل تک جاتا ہو۔کیونکہ سیدھی راہ ہی ہمیشہ مختصر ہوتی ہے اور بالآخر وہی شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔جتنے غلط راستے ہوتے ہیں وہ ہمیشہ طویل اور ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔اس لیے دنیا کی ہر زبان میں ہمیشہ صحیح بات اور صحیح طرز عمل کو مستقیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔کیونکہ انسان کے فکر و عمل کا کوئی گوشہ ہو صحت و درستگی کی راہ

Marfat.com

ہمیشہ وہی ہوگی جو سیدھی راہ ہو، جہاں انحراف اور کجی پیدا ہوئی نقص وفساد ظہور میں آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی تمام زبانوں میں سیدھا ہونا اور سیدھی چال چلنا فلاح وسعادت کے معنی میں عام طور پر بولا جاتا ہے گویا اچھائی کے معنی میں یہ ایک ایسی تعبیر ہے جو تمام نوع انسانی کی عالمگیر تعبیر کہی جاسکتی ہے۔

حضرت مسیح کے چار سو برس پہلے دارایوش اول نے جو فرامین کندہ کرائے تھے ان میں سے بے ستون کا کتبہ آج تک موجود ہے۔ اور اس کا خاتمہ ان جملوں پر ہوتا ہے (اے انسان! ہورامزد کا (یعنی خدا کا) تیرے لیے حکم یہ ہے کہ برائی کا دھیان نہ کر سیدھا راستہ نہ چھوڑ گناہ سے بچتا رہ) خود پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی حقیقت کی وضاحت کے لیے یہی تعبیر اختیار فرمائی۔

عن ابن مسعود قال خط لنا رسول الله ﷺ بيده ثم قال هذا سبيل الله مستقيما ثم خط خطوطا عن يمين ذلك الخط وعن شماله ثم قال هذه السُّبُل ليس منها سبيل الاعليه شيطان يدعواليه ثم قرء هذه الاية

(اخرجه النسائی و احمد و البزار و ابن منذر و ابو الشيخ و الحاكم وصححه)

(عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے، بالکل سیدھا اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں، اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں، اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی)

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (الانعام ٦:١٥٣)

مزید ہم دیکھتے ہیں کہ اَلصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ پر الف لام عہد کا ہے اس سے یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اس صراط مستقیم سے ہر سیدھا راستہ مراد نہیں بلکہ کوئی خاص راستہ ہے جس کی طرف یہاں اشارہ کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ بعد کے الفاظ میں اس اشارے کو کھول دیا ہے۔ البتہ صراط مستقیم کے لفظ میں اس راستے پر چلنے والوں کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ تم اس راستے پر چلنے سے پہلے گھبرا نہ جانا۔ کیونکہ یہ راستہ سیدھا راستہ ہے، اور سیدھے راستے کبھی دشوار

Marfat.com

نہیں ہوتے وہ تمام راستوں میں قریب تر اور سہل تر ہوتے ہیں۔ لیکن اس کو واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ ان لوگوں کا راستہ ہے جن پر اللہ نے انعام کیا۔ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر غضب ہوا یا وہ گمراہ ہوئے۔ اس میں متعدد باتیں قابلِ غور ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ دعا مانگنے والا جو اس وضاحت سے صراط مستقیم کی دعا مانگ رہا ہے کیا وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ اگر اس نے یہ وضاحت نہ کی تو اللہ تعالیٰ شاید اس کی دعا کو پوری طرح سمجھ نہ سکے کوئی بھی اس راستے کا مسافر ایسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوسکتا۔ تو پھر اس وضاحت کا کیا مقصد ہوسکتا ہے؟ معمولی سے تدبر سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دعا مانگنے والا اس وضاحت سے اپنے شوق اور وارفتگی کا اظہار کررہا ہے۔ اور اس کا بے قرار دل عبادت کے جذبے سے سرشار اس راستے کی تلاش میں بے چین ہورہا ہے جس پر چل کر وہ اپنی زندگی کو شریعت کے مطابق گزار سکتا ہے اور اللہ کی رضا کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکتا ہے۔ اور وہ جلد از جلد ان بڑے لوگوں کے قافلے میں شریک ہونا چاہتا ہے جو اس صراط مستقیم پر چلنے میں کامیاب ہوئے اور اللہ کے انعام کے مستحق ٹھہرے۔ وہ اپنی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھتے ہوئے ان انعام یافتہ بندوں میں شامل ہونا چاہتا ہے تاکہ ان کی قربت اور ان سے نسبت اس کی کوتاہیوں کی تلافی کردے۔ اور غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ (الفاتحہ: ۷) کہہ کر اپنی بے زاری اور نفرت کا اظہار ان لوگون سے کررہا ہے جنھوں نے صراط مستقیم پر چلنے سے انکار کردیا یا اس سے بھٹک گئے اور اس طرح وہ اللہ کے غضب کا شکار ہوئے۔ اس طرح وہ اپنے لیے استقامت واستواری کی دعا کرتا ہے۔ اور ان لوگوں سے بچنے کی توفیق مانگتا ہے جو اس صراط مستقیم سے بے گانہ یا افراط وتفریط کا شکار ہیں۔

اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ سے مراد

دوسری بات جو اس میں غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صراط مستقیم کی وضاحت کے لیے کچھ ایسے لوگوں کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر اس صراط مستقیم کا حق ادا کرنے کے باعث انعام واکرام ہوا۔ حالانکہ اس کی وضاحت کے لیے یہ بات کہی جاسکتی تھی، کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کا راستہ ہے تم اسے اختیار کرو۔ تو بجائے صراط اللہ یا صراط الرسول کہنے کے آخر اس تعبیر میں کیا حکمت ہے۔ حقیقت تو اللہ جانتا ہے لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس میں

Marfat.com

انسانی فطرت کا لحاظ کیا گیا ہے۔ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کتابوں سے اس قدر نہیں سیکھتی جس قدر انسانی شخصیات سے متاثر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے صرف کتابیں نہیں اتاریں بلکہ نبی اور رسول بھی بھیجے۔ کیونکہ کتاب کے الفاظ انسانی تربیت کے لیے کافی نہیں ہوتے۔ بلکہ انسان تربیت کے لیے انسانی شخصیات کی ضرورت پڑتی ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ثابت ہوتی ہے۔ اس مدرسے کے کھینچے ہوئے نقوش دیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ اس سے صرف معلومات نہیں ملتیں بلکہ کردار اور صالح احساس ملتا ہے۔ کیونکہ

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

اگر صرف صراط اللہ کہا جاتا تو اللہ کے راستے کی تلاش اور اس پر چلنے میں ہزاروں الجھنیں پیدا ہوتیں اسی طرح اگر صراط رسول کہہ دیا جاتا تو وہ بھی وضاحت کے لیے کافی نہ ہوتا۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ کی حیات ظاہری ہمیشہ کے لیے نہیں تھی۔ آپ ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد یقیناً اس راستے کے تعین میں دشواری ہوتی شاید یہی وجہ ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ جب یہ امت پچھلی امتوں کی طرح مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی تو ان میں سے کون سی جماعت حق پر ہوگی۔ تو آپ ﷺ نے یہاں بھی محسوس انسانوں کا حوالہ دیا تا کہ راستے کے تعین میں دشواری پیش نہ آئے آپ ﷺ نے فرمایا ما انا علیہ و اصحابی ''جس پر میں ہوں اور میرے صحابہ ہیں۔'' یعنی میرے بعد تمھیں اس راستے پر چلنے میں رہنمائی میرے صحابہ سے ملے گی۔

اب سوال یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے جن مخصوص لوگوں کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی وہ اللہ کا انعام یافتہ گروہ ہے وہ کون ہیں؟ اس کا جواب ایک دوسری آیت کریمہ میں دیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ﴾ (النساء : ٤-٦٩)

''وہ لوگ جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوا وہ انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔''

Marfat.com

1- نبی:

تو یہ چار طرح کے لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام ہوتا رہا۔ دنیا میں بھی جن کی حفاظت فرمائی اور عزت اور سرفرازی سے نوازا اور آخرت میں بھی یہی لوگ سر بلند ہوں گے۔ تاریخ شاہد ہے کہ طوفان نوح آیا تو کشتی نجات نے ان کو اپنی آغوش میں جگہ دی جو نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے اور اس راستے کے مسافر تھے۔ اور جتنے لوگوں نے اس راستے پر چلنے سے انکار کیا وہ سب اس طوفان کی نذر ہو گئے۔ قوم عاد قوم ثمود قوم لوط قوم صالح اور بھی چند قوموں کے انجام تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں ہر جگہ ایک ہی حقیقت کار فرما نظر آتی ہے۔ کہ انبیا اور ان کے ساتھی بچ گئے اور ان کے مخالفین کو تباہ کر دیا گیا۔ اب قیامت تک کے لیے یہی اصول بتا دیا گیا کہ وہ لوگ جو راہ راست اختیار کریں گے اور نبی آخر الزمان کے طریقے پر چلیں گے وہ دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں گے اور جو ان کے راستے پر چلنے سے انکار کر دیں گے وہ خائب و خاسر ہوں گے اسی لیے قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی طرف سے یہ اعلان کیا گیا وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا فَاتَّبِعُوْهُ (الانعام:٦۔١٥٣) یہ ہے میرا سیدھا راستہ اسی کی پیروی کرو۔ یعنی میں جس راستے کی دعوت دے رہا ہوں جس پر میں خود چل رہا ہوں مجھ پر جو شریعت نازل ہوئی ہے اور جو مجھ پر کتاب اتری ہے اور جسے میں نے اپنے عمل سے سنت بنا دیا ہے۔ اور جسے میں نے اپنے جذبۂ ایثار اور استقامت سے تحریک کی شکل دے دی ہے اور پھر جس طرح مخالفتوں کے ہجوم میں میں نے یقین کی قوت اور اعتماد علی اللہ سے اس تحریک کو آگے بڑھایا اور اپنے اصحاب کو حوصلے کا سامان بخشا ہے اور پھر جس طرح دعوت الی اللہ کو زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی متاع کے طور پر پیش کیا ہے اور جس طرح قدم قدم پر دین کو دنیا پر ترجیح دی اور عبادات کے سوز سے حُبِّ دنیا کے بحران کو سرد کیا ہے اور جس طرح مادی دنیا میں فنا ہونے والوں کو اور دنیوی نعمتوں کے رسیا لوگوں کو آخرت کا مسافر بنایا ہے یہ وہ صراط مستقیم ہے۔ جو شخص اس کی پیروی کرے گا۔ وہی میرا پیروکار ہو گا اور وہی صراط مستقیم پر ہو گا۔ البتہ اس راستے پر چلنے والے سارے یکساں نہیں ہوں گے۔ اور نہ اس راستے پر چلنے والوں کی ضرورتیں اور صفات یکساں ہیں۔ اس لیے تم اپنی ہمت طلب اور ضرورت کے مطابق اس راستے کے رہنماؤں کو چننا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ ان میں سے کسی کا عمل اور طرز عمل میری سنت

Marfat.com

کے خلاف نہ ہو۔یعنی تمھیں اپنی رہنمائی اور زندگی بنانے کے لیے ہر دور میں ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہوگی جو محسوس شکل میں تمھارے لیے رہنمائی فراہم کرسکیں اور تمھارے لیے نمونہ بن سکیں لیکن انھیں اختیار کرنے سے پہلے یہ ضرور دیکھ لینا کہ ان کا عمل کتاب وسنت کے مطابق ہے یا نہیں وہ تین طرح کے لوگ ہوں گے صدیق ،شہید اور صالح۔اب ہم ہر ایک کی اختصار سے وضاحت کرتے ہیں۔

2- صدیق:

صدیق صراط مستقیم پر چلنے والے قافلے میں سب سے مخلص سب سے متقی،سب سے زیادہ وفا شعار اور سب سے زیادہ ایثار پیشہ فرد کا نام ہے۔جو بھی اسلامی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس کی معراج کو پہنچنے کی کوشش میں زندگی گزار دے گا وہ صدیق کے مرتبے پر فائز ہوسکتا ہے اس لیے عام طور پر اللہ کے ہر ولی کو صدیق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔لیکن اسلام کی تاریخ میں حضرت ابوبکر صدیق کا نام چونکہ ایک استعارہ بن گیا ہے اور قرآن کریم کی آیت نے اس لفظ کو ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔اس لیے اہل علم کا خیال ہے کہ صدیق اصل میں اس عظیم شخصیت کو کہتے ہیں جو کمالات ظاہری کے ساتھ کمالات باطنی میں بھی سب سے بڑھا ہوا ہو اس کا باطن اس قدر مصفا اور مجلا ہو کہ ایمانیات اور احکام شریعت کا عکس اس طرح اس کے باطن پر آسانی سے ثبت ہو جائے جس طرح آئینے کے سامنے اگر شمع جلائی جائے تو شمع جلتے ہی آئینے میں اس کا عکس بھی جل اٹھتا ہے۔حضرت صدیق اکبر کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد بھی اس بات کو واضح کرتا ہے آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے جس کسی کے سامنے بھی اسلام پیش کیا اسے ماننے میں تھوڑا یا زیادہ تردد ضرور پیش آیا لیکن جب میں نے ابوبکر کے سامنے اسلام پیش کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے وہ اس کے لیے پہلے سے تیار تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کا ہر ارشاد اور حضور ﷺ کا ہر عمل حضور ﷺ کی ہر پسند آپ کے آئینۂ دل کے سامنے شمع کی طرح جل اٹھتی تھی۔معاہدہ حدیبیہ میں آپ کا حضرت عمر فاروق کو جواب معراج کے واقعہ میں آپ کا قریش مکہ کو جواب اور بعض آیات کے نزول کے وقت فوراً اس کی مراد کو پاجانا ایسی بہت ساری مثالیں آپ کے مقام صدیقیت کو نمایاں کرتی ہیں۔مشکل اور پر خطر حالات میں استقامت کا ثبوت دینا یوں تو ہر مرد مومن کی

Marfat.com

صفت ہے لیکن اس لحاظ سے بھی صدیق دوسرے اصحاب ایمان کے لیے نمونہ ہوتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کے انتقال پر ملال کے بعد حضرت صدیق اکبر کا طرز عمل اس کی نمایاں شہادت ہے۔ مزید ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صفات صدیق میں سب سے بڑی صفت یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیشہ عزیمت پر عمل کرتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول اس کے لیے ایسی متاع عزیز بن جاتے ہیں کہ وہ ان کے مقابلے میں جائز سہولتوں سے فائدہ اٹھانا بھی گناہ سمجھتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تمام صحابہ نے اللہ کی راہ میں بڑھ چڑھ کر انفاق اور ایثار کیا لیکن اپنے اور اپنے اہل خانہ کے لیے کچھ نہ کچھ بچا کر بھی رکھا لیکن حضرت صدیق اکبر سے جب بھی انفاق کا مطالبہ ہوا تو آپ نے سب کچھ اٹھا کر بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا۔ یہی وہ مقام صدیقیت ہے جس کے لیے بطور اصطلاح یا استعارہ یہاں قرآن کریم نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اور یہ ایک جامہ ہے جو حضرت صدیق اکبر پر راست آتا ہے۔ ٹھیک کہا اقبال نے:

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس

3- شہید:

شہید کا معنی تو گواہ ہوتا ہے لیکن یہ لفظ بھی قرآن کریم میں بطور اصطلاح استعمال ہوا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ شخص جو صرف اللہ کی خوشنودی کی خاطر اللہ کے کلمے کو بلند کرنے یا اسلامی ملک کے تحفظ کی خاطر یا مسلمانوں کے دفاع میں جان دے دیتا ہے، اس کو شہید کہتے ہیں۔ لیکن ایک دوسرے پہلو سے اس کے لفظی معنی اور اس کے اصطلاحی معنی میں یکسانیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اس طرح کہ جو آدمی اللہ کی دین کی سربلندی کے لیے سر کٹواتا ہے۔ وہ درحقیقت اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے اس دین کی سچائی اور حقانیت میں کوئی شبہ نہیں کیونکہ اگر اس دین کی سچائی میں کوئی شبہ ہوتا تو میں اپنی زندگی جیسی انمول متاع کو کبھی اس پر قربان نہ کرتا۔ آدمی کسی چیز کی صداقت کے لیے تین طریقوں سے گواہی دیتا ہے۔ کبھی اپنی زبان سے اس کے حق میں کلمہ تائید کہہ کر اور کبھی اپنے عمل سے اسے اپنی زندگی کا طرز عمل بنا کر اور کبھی اس کے لیے مال و متاع اور بدرجۂ آخر جان دے کر، زبان سے دی ہوئی گواہی میں شبہ کیا جا سکتا ہے۔ عمل پر بھی الزام دھرا جا سکتا ہے۔

Marfat.com

لیکن جو آدمی اپنا سب کچھ حتیٰ کے زندگی بھی کسی صداقت پر قربان کردیتا ہے اس پر شبہ کرنا سنگدلی یا کورذوقی کے سوا کچھ نہیں۔ یہاں ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ کیا جارہا ہے کہ وہ لوگ جو اپنا سب کچھ اللہ کے راستے میں قربان کردیتے ہیں وہ اللہ کے ایسے گواہ ہیں جن سے دین کو قوت ملتی ہے۔ انسانیت کو جلا ملتی ہے اور تاریخ آئندہ نسلوں کے لیے اسے ایک نمونے کے طور پر پیش کرتی ہے۔ کیونکہ انھوں نے اپنا خون دیکر ایک ایسی روشنی مہیا کی ہے جو تادیر تاریکیوں کو کافور کرتی رہے گی۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

4- صالحین:

یہ صالح کی جمع ہے، اس کا معنی ہے نیکوکار۔ یعنی ایسا آدمی جو اپنے طرزِ عمل سے نیکی کی علامت بن جاتا ہے۔ یہ بھی شریعت کی اصطلاح ہے۔ اسے قرآن کریم نے مختلف جہتوں سے استعمال کیا ہے۔ لیکن ہم اس کا صرف عام معنی عرض کررہے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو فرائض، واجبات، اور مستحبات کا پابند، آدابِ شریعت کا لحاظ رکھنے والا، حقوق العباد کا ادا کرنے والا اور دین کے تقاضوں کو بجالانے والا ہو، اسے صالح کہتے ہیں۔

ان تینوں اصطلاحات کے ذکر کرنے سے مقصود یہ معلوم ہوتا ہے کہ صراطِ مستقیم، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا راستہ ہے۔ لیکن اس پر چلتے ہوئے تمھارے سامنے یہ تین طرح کے معیارات رہنے چاہییں۔ تمھیں عام زندگی میں ایک صالح آدمی کی طرح زندگی گزارنا چاہیے۔ لیکن اگر کبھی اسلامی حمیت یا اسلامی ضرورت قربانی و ایثار کا تقاضا کرے تو سر کٹوانے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ لیکن تمھارا اصل ہدف اس زندگی کا حصول ہے جس میں شہادت کی تڑپ اور حسن عمل کے نور کے ساتھ ساتھ آئینۂ دل ایسی آب و تاب رکھتا ہو جس میں قرآن وسنت کے احکام اور اس راستے پر چلنے والوں کے اتباع کے سوا کوئی اور جذبہ اپنی جگہ نہ بنا سکے۔ یہی وہ دل ہے جس پر بالآخر اللہ کے انوار اور رحمتوں کی بارش ہوتی ہے۔

صراطِ مستقیم کی ان مثبت وضاحت کے بعد جس میں اس راستے پر چلنے والے ان

Marfat.com

نمائندہ لوگوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے جن کی حیثیت اس راستے کے رہنماؤں کی بھی ہے اور سنگ ہائے میل کی بھی۔ جن سے تاریخ کے ہر دور میں اس راستے پر چلنے والے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اٹھاتے رہیں گے۔ کیونکہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جب یہ تینوں نمونے مسلمانوں میں موجود نہ رہے ہوں۔ البتہ اس راستے کے ہر مسافر کے لیے انھیں تلاش کرنا ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی قابل قدر نعمت کبھی تلاش کیے بغیر نہیں ملا کرتی۔

ہر مسافر کے لیے جس طرح راستے کی پہچان اور راہنماؤں کی شناخت ضروری ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ راستے کی مشکلات اور منفی قوتوں کا بھی اسے علم ہو جو راستے میں اس کے لیے مشکلات کا باعث بن سکتی ہیں یا اس سے بھٹکانے کی کوشش کر سکتی ہیں۔ اسی طرح ان منفی قوتوں کے نمائندوں کی شناخت بھی ہونی چاہیے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ جو لوگ صراطِ مستقیم چھوڑ کر دوسرے راستوں پر چلتے رہے ان کا انجام کیا ہوا۔ چنانچہ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ارشاد فرمایا:

﴿ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ﴾ (الفاتحہ :۷)
''جو نہ مغضوب ہوئے نہ گمراہ''۔

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ

مَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ سے مراد دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنی شریعت کی نعمت نازل فرمائی لیکن انھوں نے سرکشی کے سبب نہ صرف یہ کہ اس کو قبول نہیں کیا بلکہ اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور جن لوگوں نے اس کو ان کے سامنے پیش کیا ان کی بیخ کنی کی اور قتل کے درپے ہوئے جن کی پاداش میں ان پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور وہ ہلاک کر دیے گئے۔

دوسرے وہ لوگ جنھوں نے قبول تو کیا لیکن دل کی آمادگی کے ساتھ نہیں بلکہ مارے باندھے قبول کیا، پھر بہت جلد شہوات نفس میں پڑ کر انھوں نے اس کے کچھ حصہ کو ضائع کر دیا، کچھ حصہ میں کتر بیونت کر کے اس کو اپنی خواہشات کے مطابق بنا لیا اور جن لوگوں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی یا ان کو صحیح راستہ پر لانا چاہا انھوں نے ان میں سے بعض کو جھٹلا دیا اور بعض کو قتل کر دیا۔ پچھلی امتوں میں اس کی سب سے واضح مثال یہود ہیں۔ چنانچہ ان

Marfat.com

کے معتوب و مغضوب ہونے کا ذکر قرآن میں تصریح کے ساتھ ہوا بھی ہے۔ مثلاً:

﴿مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ﴾

''جن پر اللہ نے لعنت کی اور جن پر اس کا غضب ہوا اور جن کے اندر سے اس نے بندر اور خنزیر بنائے۔'' (مائدہ:۵۔۶۰)

﴿وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ ق وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ﴾

''اور ان پر ذلت اور مسکنت تھوپ دی گئی اور وہ اللہ کا غضب لے کر پلٹے۔'' (البقرۃ:۲۔۶۱۔بقرۃ)

ضَآلِّیْنَ سے مراد

ضَآلِّیْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین میں غلو کیا، جنھوں نے اپنے پیغمبر کا رتبہ اتنا بڑھایا کہ اس کو خدا بنا کر رکھ دیا، جو صرف انہی عبادتوں اور طاعتوں پر قانع نہیں ہوئے۔ جو اللہ اور اللہ کے رسول نے مقرر کی تھیں۔ بلکہ اپنے جی سے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ جنھوں نے اپنے اگلوں کی ایجاد کی ہوئی بدعتوں اور گمراہیوں کی آنکھ بند کر کے پیروی کی اور اس طرح صراطِ مستقیم سے ہٹ کر گمراہی کی پگڈنڈیوں پر نکل گئے۔ پچھلی امتوں میں سے اس کی نہایت واضح مثال نصاریٰ ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے انہی وجوہ کی بنا پر جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے ان کو گمراہ اور گمراہ کرنے والے قرار دیا ہے۔ مثلاً:

﴿يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ: ۵۔۷۷)

''کہہ دو اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور ان لوگوں کی خواہشوں و بدعتوں کی پیروی نہ کرو جو پہلے سے گمراہ چلے آرہے ہیں اور جنھوں نے بہتوں کو اللہ کے راستہ سے بھٹکایا اور جو خود بھی اس کے رستہ سے بھٹکے۔''

Marfat.com

مَغضُوبِ اور ضَآلِّینَ کی مثال دینے سے مقصود کیا ہے؟

یہ دو طرح کے لوگ جن کی نشاندہی ہماری دعا کے جواب میں بطور خاص اس لیے فرمائی گئی ہے کہ اے امت مسلمہ کے لوگو جس طرح تم ایک حامل دعوت امت ہو اور جس طرح تم پر آخری کتاب اتری ہے اسی طرح ان لوگوں پر بھی اللہ کی کتابیں اتری تھیں۔ انھیں حامل دعوت امتیں بنایا گیا تھا۔ انھیں رہنمائی دینے کے لیے اللہ کے نبی اور رسول آتے رہے اور بالکل انہی ذمہ داریوں سے انھیں گراں بار کیا گیا تھا جو ذمہ داریاں تمھارے حوالے کی گئی ہیں ان لوگوں نے جب اپنی ذمہ داریاں ادا نہ کیں وہ یا تو انبیا ورسل کی دشمنی اور اللہ کی شریعت کی نافرمانی کے باعث اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور یا اللہ کے نبیوں کی محبت میں غلو کے باعث شرک اور بدعات وخرافات کے ارتکاب کے مجرم ٹھہرے۔ یعنی یا تو انھیں شریعت کی دشمنی لے بیٹھی اور یا اللہ کے نیک بندوں کی محبت میں حد سے بڑھ جانا ان کی تباہی کا باعث بنا۔ دیکھنا تم یہ رویہ اختیار نہ کرنا تم آخری امت ہو آخری کتاب تم پہ نازل ہو چکی آخری رسول ﷺ تمھاری طرف مبعوث ہو چکے۔ تمھاری ہدایت کے لیے اب کوئی اور آنے والا نہیں آئے گا۔ اگر تم نے اپنی ذمہ داریوں میں کوتاہی برتی اور اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کو غالب کرنے میں کمزوری دکھائی اور تم انہی راہوں میں چلے جن راہوں میں پہلی قومیں چل کر تباہ ہوئیں تو یاد رکھنا تم اس انجام سے نہیں بچ سکو گے جس انجام سے وہ دوچار ہو چکے ہیں۔ تمھاری عافیت، سرفرازی اور بقاء کا ایک ہی راستہ ہے کہ تم ان لوگوں کے راستوں پر چلو جن پر اللہ کا انعام ہوا، تاکہ تم بھی ان انعامات کے مستحق ٹھہرو۔

خلاصۂ سورۃ

اس دعا پر یہ سورۃ تمام ہو جاتی ہے۔ اس کی تفصیلات اپنی ناچیز صلاحیت کے مطابق میں نے پیش کی ہیں۔ اب آپ پلٹ کر ان تفصیلات کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس مختصر لیکن

Marfat.com

مقتدر سورۃ کو دیکھئے کہ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں اور ہر بول پانچ لفظوں سے زیادہ نہیں اور ہر لفظ صاف اور دلنشین معنی کا نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے۔ پروردگار عالم کو مخاطب کر کے ان صفتوں سے پکارا گیا ہے جن کا جلوہ شب و روز انسان کے مشاہدے میں آتا رہتا ہے۔ اگرچہ اپنی جہالت اور غفلت سے انسان اس میں غور و فکر نہیں کرتا۔ اس کے بعد اس کی بندگی کا اقرار ہے، اس کی مدد اور نصرت کا اعتراف ہے اور زندگی کی لغزشوں سے بچ کر سیدھی راہ پر چلنے کی طلب گاری ہے۔ کوئی مشکل خیال نہیں، کوئی انوکھی بات نہیں، کوئی عجیب و غریب راز نہیں۔ اب کے ہم بار بار یہ سورۃ پڑھتے رہتے ہیں اور صدیوں سے اس کے مطالب نوع انسانی کے سامنے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہمارے دینی تصورات کی ایک بہت ہی معمولی سی بات ہے لیکن یہی معمولی بات جس وقت تک دنیا کے سامنے نہیں آئی تھی اس سے زیادہ کوئی غیر معلوم اور نا قابل حل بات بھی نہ تھی۔ بظاہر یہ نہایت سلیس، سادہ اور دلنشین اندازِ بیان ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کا ایک ایک لفظ دینِ حق کے کسی نہ کسی اہم مقصد کو واضح کر رہا ہے۔ جس کا اندازہ آپ کو کسی نہ کسی حد تک گزشتہ تفصیلات سے ہو چکا ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سورۃ کا پیرایہ دعائیہ ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر راست باز انسان جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اس کے دل سے اٹھنے والی آواز اور اس کے انگ انگ سے اٹھنے والی امنگ اگر الفاظ کا قالب اختیار کر لے تو اس کا انداز یقیناً اس سے مختلف نہیں ہوگا۔ یہ سورۃ بظاہر فصاحت و بلاغت کا نادر روزگار مرقع ہے۔ لیکن بباطن خدا پرستی کے فکر و وجدان کا ایک ایسا سرجوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑا ہے۔ اور اس سے بھی زیادہ سرخوشی سے جھوم اٹھنے والی بات یہ ہے کہ جیسے ہی ایک بندہ سوز و گداز میں ڈوب کر ان کلمات کے ذریعے اپنے رب سے صراطِ مستقیم کی دعا کرتا ہے تو اس کا رب اس کے جواب میں پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت و رہنمائی جس کی دعا تو نے مجھ سے کی ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ جب بھی آدمی سورۃ فاتحہ کی صورت میں اپنے اللہ سے دعا کرے نماز کے اندر کرے یا نماز کے باہر تو آخر میں ''آمین'' ضرور کہے۔ یہ سورۃ فاتحہ کا حصہ تو نہیں لیکن اس کا کہنا سنت ہے۔ اس کے کہنے سے آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق دعا کی قبولیت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلاَّ الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝

Marfat.com

6- تقویٰ کا مفہوم اور تقویٰ کے مدارج

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

هُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ

متقین متقی کی جمع ہے۔اور متقی اسے کہتے ہیں، جسے تقویٰ کی دولت نصیب ہو۔ ہدایت کی طرح تقویٰ کی بھی مختلف جہتیں اور مختلف مدارج ہیں۔کبھی تو تقویٰ کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کے نقصان سے بچنا، یعنی آدمی یہ دیکھتا ہے کہ فلاں کام کرنے سے یا فلاں جگہ جانے سے مجھے یہ نقصان پہنچ سکتا ہے تو آدمی اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔قرآن کریم میں تقویٰ اس معنی میں بھی استعمال ہوا ہے جیسا کہ:

﴿فَكَيْفَ تَتَّقُوْنَ اِنْ كَفَرْتُمْ يَوْمًا يَّجْعَلُ الْوِلْدَانُ شِيْبًا﴾

''اگر تم نے کفر کیا تو اس دن سے کیسے بچ سکو گے جو بچوں کو بوڑھا کردے گا۔'' (مزمل:١٧)

﴿وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً﴾

(انفال: ٢٥)

''اور اس آفت سے چوکنے رہو جو خاص طور پر انہی پر نہیں آئے گی جنھوں نے تم میں سے ظلم کا ارتکاب کیا ہوگا۔''

اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کریم ان لوگوں کے لیے ہدایت ہے جن میں اتنا شعور زندہ ہے کہ وہ اپنی اور کائنات کی حقیقت پر غور کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اس کائنات کے خالق نے کوئی چیز بھی بے مقصد پیدا نہیں کی اور مزید یہ کہ اس کی پیدا کردہ ہر مخلوق اس کے احکام کے تحت اپنی اپنی ذمہ داری ادا کرنے میں مشغول ہے۔اور جو مخلوق اپنی ذمہ داریاں

Marfat.com

ادا کرنے سے قاصر ہو جاتی ہے اسے مٹا دیا جاتا ہے۔ درخت جب تک پھل دیتا یا سایہ دیتا ہے اور اس کی سرسبزی باقی رہتی ہے تو وہ قائم رہتا ہے۔ اور جب وہ اپنی ان ذمہ داریوں سے قاصر ہو جاتا ہے تو اسے ختم کر دیا جاتا ہے۔ یہی حال ہر مخلوق کا ہے یہ انسان جسے اشرف المخلوقات بنایا گیا ہے اور جس پر تمام مخلوقات سے زیادہ انعامات کی بارش کی گئی ہے۔ اور پھر اسے جوہر عقل سے بھی نوازا گیا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو۔ اور اگر واقعی کوئی مقصد ہے اور یقیناً ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ یہ اگر اپنے مقصد کے مطابق زندگی نہ گزارے تو اسے ہمیشہ باقی رکھا جائے اور اس سے کبھی باز پرس نہ ہو۔ جو آدمی اتنا سا شعور اپنے اندر رکھتا ہے یہ قرآن اس کے لیے بھی ہدایت ہے، اور یہ تقویٰ کی پہلی منزل ہے۔

تقویٰ کا ایک معنی گناہ سے اس کے برے نتائج اور اللہ کے ڈر سے بچتے رہنا بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ گزشتہ بیان کردہ معنی کی نسبت اگلی منزل کا نام ہے کہ اسے صرف مقصد کا شعور ہی برے انجام سے بچنے کی ترغیب نہیں دیتا بلکہ یہ احساس اس کے اندر ایسی شدت اختیار کر گیا ہے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا ہر گناہ اللہ کی ناراضگی کا سبب بنتا ہے۔ میں جو کچھ بھی کرتا ہوں اسی پر میرے انجام کا ترتب ہوتا ہے۔ جس طرح سنکھیا کھانے سے آدمی مر جاتا ہے اور مرغن غذا کھانے سے قوت آتی ہے۔ اسی طرح گناہ سے برا انجام جنم لیتا ہے جس کا نتیجہ اللہ کی ناراضگی ہوتا ہے۔ اور نیکی سے آخرت سنورتی ہے اور زندگی پنپتی ہے اور اس کے نتیجے میں اللہ کی خوشنودی نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نیکی کا شوق اور اللہ کے غضب سے بچنے کے لیے گناہ سے نفرت یہ وہ تقویٰ ہے جس کے حاملین کے لیے یہ قرآن پاک ہدایت بن کر آیا ہے یعنی جس طرح ہدایت کے مختلف مدارج ہیں ایک ہدایت عام آدمی کی ہے اور ایک ہدایت درجہ بدرجہ ہدایت کے راستے پر چلنے والوں کی ہے جس کی آخری منزل کی کوئی انتہاء نہیں۔ اسی طرح تقویٰ ایک عام آدمی کا ہے اور ایک تق[illegible]ں آدمی کا ہے جو گناہ سے نفرت کرتا ہے اور نیکی کی طرف لپکتا ہوا جاتا ہے۔ اللہ کی ناراضی ا[illegible] کے لیے زندگی کی سب سے بڑی ناکامی ہے اور اس کی خوشنودی زندگی کی حقیقی منزل ہے۔ [illegible] پوری تفصیلات اگر ذہن میں رہیں تو پھر اس طرح کے اعتراضات کا کوئی موقع نہیں جو بعض ا[illegible]ں کی طرف سے کیے جاتے ہیں کہ قرآن کریم تو سب کے لیے ہدایت بن کر آیا ہے لیکن [illegible]ں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ صرف متقین کے لیے ہدایت ہے۔ بات بالکل واضح ہے کہ جو بھی ز[illegible]یں بداطواریوں کے انجام سے بچنے کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کرتا ہے وہ بھی متقی

Marfat.com

ہے اور یہ قرآن کریم اس کے لیے بھی ہدایت ہے اور جو درجہ بدرجہ اللہ کے قرب کی طرف بڑھتا جاتا ہے جس کی کوئی انتہاء نہیں وہ بھی متقی ہے اور قرآن کریم اس کے لیے بھی ہدایت ہے یہ تو قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ بظاہر ان ضرورتوں میں کس قدر تفاوت دکھائی دیتا ہے لیکن قرآن کریم کے فیضان نے سب کے لیے اپنی آغوش کھول رکھی ہے اور ہر کوئی بقدر ہمت اس سے اپنا حصہ وصول کررہا ہے۔ البتہ ایک عامیانہ سا سوال باقی رہ جاتا ہے کہ چلیے یہ بات تو واضح ہوگئی کہ قرآن کریم کی ہدایت کے بھی مدارج ہیں اور تقویٰ کے بھی مدارج ہیں۔ لیکن اس سے یہ بات تو ثابت ہوجاتی ہے کہ جس آدمی میں تقویٰ نام کی کوئی چیز نہیں۔ اس کے لیے تو قرآن کریم ہدایت نہیں ہوسکتا اور ویسے بھی تقویٰ کا سفر تو قرآن کریم کی ہدایت کے بعد کا ہے اس سے پہلے تقویٰ کیسے نصیب ہوسکتا ہے؟ یہ خیال سراسر قلّتِ فہم سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ دنیا کی کوئی بھی مؤثر قوت جو اپنی اثر اندازی میں بے مثال بھی ہو وہ اس وقت تک کسی پر اثر انداز نہیں ہوسکتی جب تک کوئی اثر پذیری کے لیے اس کی طرف متوجہ نہ ہو۔ سورج سب کو روشنی دیتا ہے اور اس سے بڑھ کر روشنی کے سرچشمے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانے کے لیے آنکھیں کھولنا ضروری ہے۔ جو شخص آنکھیں نہ کھولے یا بینائی سے محروم ہو اسے سورج کی روشنی کوئی فائدہ پہنچا نہیں سکتی۔ چمن میں بلبل ہزار چہکے۔ لیکن اگر ایک شخص بہرہ ہے تو وہ اس کے چہکنے سے کیا لطف اندوز ہوسکتا ہے۔ یہاں بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ قرآن کے نور اور سرچشمۂ ہدایت ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں۔ لیکن اس سے وہی شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے جس میں اثر پذیری یا متوجہ ہونے کی کم سے کم صلاحیت موجود ہو۔ وہ اپنے انجام کے بارے میں فکر مند ہو زندگی میں بداطواریوں سے نالاں ہو اور انھیں بدلنے کی فکر بھی رکھتا ہو اور یہی تقویٰ کی پہلی منزل ہے اور یہی انسان کی فطری صلاحیت ہے۔ اس لیے قرآنِ پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰی﴾ (نازعات: ۲۶)

(اس میں اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے درس عبرت ہے)

﴿ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰی لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَهُوَ شَهِیْدٌ﴾ (ق: ۳۷)

"بے شک اس کے اندر یاددہانی ہے اس کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا وہ پوری طرح متوجہ ہوکر بات سنے۔"

Marfat.com

ہدایت اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے

حاصل کلام یہ کہ قرآنِ کریم پوری نوع انسانی کے لیے ہدایت بن کے آیا اور یہ آفتاب جہاں تاب سے بڑھ کر اہل دنیا کے لیے ہدایت کا نور پھیلا رہا ہے۔ لیکن لِلْمُتَّقِیْنَ میں لام انتفاع کے لیے ہے۔ یعنی اس ہدایت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر تقویٰ ہو۔ تقویٰ بالکل ابتدائی درجے میں سادہ احساس کی حد تک بھی ہوگا تو قرآن تب بھی اسے ہدایت دے گا اور اگر درجہ بدرجہ ترقی کرتا ہوا مقام قرب تک پہنچ جائے گا تو قرآن تب بھی اس کے لیے ہدایت ہے۔ لیکن اگر ایک شخص مسلمان ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر اپنے انجام کی فکر نہیں پیدا کرتا وہ بس اس لیے مسلمان ہے کہ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا مستقبل کی فکرمندی، گناہ سے نفرت، نیکی کا شوق، اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس، یعنی تقویٰ کی کوئی رمق بھی اس کے اندر موجود نہیں وہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا اور اگر قرآن اس کی زندگی میں نافذ کر دیا جائے تو مسلمان ہوتے ہوئے بھی اس سے بغاوت کر دے گا۔ اس کی واضح مثال آج امتِ مسلمہ کی اکثریت ہے۔ حکمران مسلمان ہیں لیکن قرآنی تعلیمات سے الرجک، عوام مسلمان ہیں لیکن قرآن پاک کی تعلیمات کو زندگی میں داخل کرنے کے لیے تیار نہیں۔ مجموعی طور پر ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ چند مستثنیات کو چھوڑ کر قرآنی افکار سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ اس سے یہ بات سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کی ہدایت کے لیے متقی ہونے کا ذکر کیوں کیا گیا ہے کیونکہ تقویٰ ہی وہ اصل صفت ہے جو ایک مسلمان کو بھی اپنے انجام کے بارے میں فکرمند بناتی ہے اور یہی فکر ہدایت کے حصول کا سبب بنتی ہے۔ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانے میں بعض اسلامی احکام کے اجراء کی کوشش کی گئی لیکن خود مسلمانوں کے ہاتھوں ان کے نفاذ کو ناکام بنا دیا گیا وہ ایک تکلیف دہ داستان ہے۔ جس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اگر آدمی میں خدا خوفی نہ ہو تو قرآن کریم کو اللہ کی کتاب ماننے کے باوجود بھی وہ قرآن کریم کی ہدایت سے محروم رہتا ہے۔

یہ تلخ حقیقت کہ کوئی قوم خواہ وہ صاحب ایمان بھی ہو لیکن اگر اس کے اندر تقویٰ یعنی خدا خوفی نہ پائی جاتی ہو اور وہ اعمال کی مسلسل خرابیوں کے باعث اپنے دلوں کی دنیا اس حد تک اجاڑ چکے ہوں کہ ان پر کوئی نصیحت بھی اثر نہ کرے۔ تو امتوں کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ ان کے بارے میں انبیاء کی دعائیں بھی قبول نہیں ہوتیں اور ان کی دعاؤں کی قبولیت

Marfat.com

کے لیے یہ شرط عائد کردی جاتی ہے کہ جب تک یہ لوگ اپنے اندر تقویٰ پیدا نہیں کریں گے اس وقت تک یہ اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں ہوسکتے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں جب بنی اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا ہوئے تو اللہ نے ان کی توبہ قبول کرنے کے لیے ان کو سخت آزمائشوں سے گزارا۔ تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو آئندہ غضب الٰہی سے بچانے کے لیے پروردگار سے دعا مانگی: ''یا اللہ! آئندہ ان کو اپنے غضب سے محفوظ رکھنا اور اپنی رحمت سے کبھی محروم نہ رکھنا'' لیکن پروردگار نے موسیٰ علیہ السلام کی دعا کے جواب میں ارشاد فرمایا:

﴿وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ﴾

''اور میری رحمت ہر چیز کو حاوی ہے پس میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ پر قائم رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے۔''

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی رحمت انھیں لوگوں کو ملتی ہے جو تقویٰ اختیار کرنے والے، زکوٰۃ ادا کرنے والے اور اللہ کی آیتوں پر ایمان لانے والے ہوں۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کٹھن امتحانوں سے گزارنے کے بعد جب قوموں کی امامت پر سرفراز فرمانے کا وعدہ فرمایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا کہ یہ منصب میری اولاد کو بھی حاصل رہے گا یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا:

﴿لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ﴾

''کہ میرا یہ عہد تمھاری اولاد میں سے ان لوگوں کو حاصل نہیں ہوگا جو ظالم ہوں گے۔''

ظالم سے مراد ظاہر ہے کہ وہ لوگ ہیں جو توحید و اخلاص سے عاری اور تقویٰ وخشیت سے خالی ہوں۔

ان توضیحات سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم جو اللہ کی آخری کتاب ہے اس سے استفادہ کے لیے ہر سطح پر تقویٰ کا ہونا کیوں ضروری ہے؟ کیونکہ اثر پذیری کی یہ کم سے کم صلاحیت ہے جس کے بغیر قرآن کریم سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ یہ صلاحیت جیسے جیسے ترقی کرتی جاتی ہے۔ ویسے ویسے قرآن کریم کی ہدایت اور اللہ کی رحمت بندے کے شامل حال ہوتی جاتی ہیں۔

Marfat.com

7- ایمان بالغیب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ

(یہ قرآن) ان لوگوں کے لیے (ہدایت ہے) جو غیب پر ایمان لاتے ہیں)

ہماری محولہ بالا گزارشات سے یہ بات تو واضح ہوگئی ہے کہ قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے کم سے کم تقویٰ کی صفت ضروری ہے۔ یہ وہ صلاحیت ہے جو انسان کو اپنی زندگی اور اس کے انجام پر غور وفکر کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان قرآنِ کریم سے استفادہ کے لیے آمادہ ہو جاتا ہے۔ پھر جب اللہ کی اس کتاب کو وہ پڑھنا شروع کرتا ہے اور اس کی رہنمائی میں قدم قدم آگے بڑھتا ہے تو تقویٰ بھی اس کے ساتھ ساتھ ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کی رہنمائی میں تقویٰ کی جو پہلی کونپل پھوٹتی ہے، وہ ایمان بالغیب ہے۔ یہ قرآنِ پاک سے تعلق کا نتیجہ بھی ہے اور یہی تقویٰ کی اگلی منزل بھی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسی صفت ہے جو تقویٰ کے اگلے مراحل کے لیے زینہ کا کام بھی دیتی ہے۔ اور یہی قرآنِ کریم کے ابتدائی مطالعہ کا حاصل بھی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ جو شخص قرآنِ پاک سے استفادہ کے لیے اپنے آپ کو قرآنِ کریم سے وابستہ کردے گا تو سب سے پہلے یہی صفت اس کے اندر جنم لے گی اور جو شخص تقویٰ کے اگلے مراحل پر پہنچنے کے لیے کوشش کرے گا تو یہ صفت اس کے لیے معاون ومددگار ہوگی۔ حیرانی کی بات ہے کہ یہی صفت تقویٰ کا ثمرہ بھی ہے اور تقویٰ کے آئندہ مراحل کے لیے بیج اور تخم بھی ہے۔ ان دونوں میں فرق ملحوظ رہے تو اس صفت کے دوگونہ فوائد کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ان چیزوں کو مانتا ہے جن کا تعلق محسوسات اور

Marfat.com

مادیات سے ہے اور جنھیں وہ اپنے حواس خمسہ سے محسوس کر سکتا اور عقل کے ذریعے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب بھی اسے کسی ایسی چیز کو ماننے کی دعوت دی جائے جو اس کے حواس کی گرفت میں نہ آتی ہو تو وہ بالعموم اس کے وجود سے انکار کر دیتا ہے۔ اور اس کا اصرار یہ ہوتا ہے کہ میں جب تک اس چیز کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں یا اپنے حواس سے محسوس نہ کر لوں کیسے مان سکتا ہوں؟ مشرکین مکہ سے جب آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے نبوت دی ہے اور فرشتہ مجھ پر وحی لے کر اترتا ہے تو ان کا اصرار بھی یہی تھا کہ جو فرشتہ آپ ﷺ پر اترتا ہے وہ ہمیں نظر کیوں نہیں آتا اور وہ ہم سے باتیں کیوں نہیں کرتا؟ اور ہم اس کتاب کو جو تم پر اتر رہی ہے اس وقت تک نہیں مانیں گے جب تک ہم اسے مجلد شکل میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ یہ انسانی کمزوری اتنی گہری ہے کہ جس کے اثرات ہمیں دور تک تاریخ میں پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ بنی اسرائیل کے منتخب افراد کو جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے ساتھ لے کر کوہِ طور پر گئے اور انھوں نے پس پردہ اللہ کی آواز بھی سنی لیکن پھر بھی مطالبہ کیا "لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً" کہ "ہم ہرگز اے موسیٰ! تجھ پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔" اقبال نے اسی انسانی کمزوری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ؎

خوگرِ پیکرِ محسوس تھی انساں کی نظر
مانتا پھر کوئی ان دیکھے خدا کو کیوں کر

اسی انسانی کمزوری کی طرف توجہ دلاتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ تقویٰ کے نتیجے میں جو پہلی صفت قرآن کے ماننے والے میں پیدا ہوتی ہے اور جو قرآن سے مزید فیض حاصل کرنے کے لیے ضروری بھی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ مادیات اور محسوسات سے جو دراصل حیوانی زندگی ہے، اپنے آپ کو بلند کر لیتا ہے اور اس کی عقل اتنی دوررس اور اتنی دوربین ہو جاتی ہے کہ وہ ان حقیقتوں کو بھی ماننے لگتا ہے جو اگرچہ آنکھوں سے نہیں دیکھی جا سکتیں لیکن عقل سلیم انھیں ماورائے عقل نہیں سمجھتی۔ اس لیے وہ ان حقیقتوں کو بڑی آسانی سے قبول کر کے ہدایت اور تقویٰ کے اگلے مراحل کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں اس کی زندگی کے اعمال بدلنا شروع ہو جاتے ہیں اور ان اعمال کا ظہور شروع ہو جاتا ہے جو تقویٰ کے فیضان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ آج بھی ہم "ان پڑھوں کو تو جانے دیجیے" جب پڑھے لکھوں کو دیکھتے ہیں تو ان میں یہ تقسیم صاف

Marfat.com

دکھائی دیتی ہے کہ جو لوگ قرآنی ہدایت کے سائے میں پروان چڑھتے اور اسی کی رہنمائی میں زندگی گزارتے ہیں ان کے لیے ماورائے محسوسات حقائق کو دیکھ لینا اور مان لینا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ لیکن جن کی طبیعتیں محسوسات اور مادیات سے آگے نہیں بڑھتیں اور وہ اپنی عقلوں کو ہمیشہ محسوسات کی خدمت میں لگائے رکھتے ہیں ان کی زندگیوں میں یہ عجیب تضاد دکھائی دیتا ہے کہ ایک طرف تو اسلام کی بیان کردہ نادیدہ حقیقتوں کو تسلیم کرنا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے لیکن دوسری طرف ان کی ضعیف الاعتقادی مخلوقات میں عجیب وغریب قوتیں تسلیم کر لینے میں کوئی دشواری محسوس نہیں کرتی یہ عقل کی نارسائی، فکر کی کوتاہی اور مادے کی غلامی کا وہ نتیجہ ہے، جو تاریخ میں بھی اور آج بھی ہم ہر اس جگہ دیکھتے ہیں جہاں قرآنی تعلیمات کے اثرات کی کمی ہے۔ چنانچہ اسی بنیادی کمزوری سے بچانے کے لیے اس حقیقت کی عقدہ کشائی کی گئی ہے کہ قرآنِ کریم کی ہدایت کو قبول کرنے والے لوگ ہمیشہ اپنی صلاحیتوں میں بھی نوازے جاتے ہیں جس کا پہلا ثمرہ یہ ہے کہ وہ ایمان بالغیب کی حقیقت سے بہرہ ور ہو جاتے ہیں۔

اب ہم ایمان بالغیب کی وضاحت کرتے ہیں۔ ایمان امن سے ہے، جس کا معنی ہے امن دینا، قرآن کریم میں یہ لفظ بعض مقامات پر زبانی اقرار کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔ لیکن اس کا اصل استعمال کبھی لام کے صلہ کے ساتھ ہوتا ہے اور کبھی ب کے صلہ کے ساتھ آمَنَ لَهٗ کے معنی ہیں صَدَّقَهٗ وَاعْتَمَدَ عَلَيْهِ اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا اور آمَنَ بِهٖ کے معنی ہیں اَيْقَنَ بِهٖ اس پر یقین کیا۔ قرآنِ کریم جس حقیقی ایمان کی دعوت دیتا ہے اور یہاں جو معنی مراد ہے وہ یہی ہے جس میں تصدیق، اعتماد اور یقین تینوں شامل ہیں۔ اس لحاظ سے ایمان کی تعریف یہ ہوگی کہ جو شخص اللہ تعالیٰ پر رسول اللہ ﷺ پر، فرشتوں پر، تمام کتابوں پر، تمام نبیوں پر اور آخرت پر دل کی تصدیق اور یقین کے ساتھ صرف رسول اللہ ﷺ کے اعتماد پر ایمان لائے وہ مومن ہے۔ یعنی اس کے سامنے ماننے کی باتوں میں سے کوئی بات بھی پیش کی جائے چاہے اس کا تعلق اللہ کی ذات یا صفات سے ہو چاہے اس کا تعلق وحی یا نبی سے ہو چاہے اس کا تعلق احکام خداوندی یا احکام نبوت سے ہو اور چاہے اس کا تعلق عالم آخرت سے ہو اس کو دل کی تصدیق اور یقین سے ماننا اور کسی طرح کے شک میں مبتلا نہ ہونا اور دنیا بھر کے اہل دانش بے شک اسے ماننے سے انکار کریں اور بے شک ماننے والے کی اپنی عقل بھی اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے لیکن صرف اس لیے مان لینا کہ آنحضرت ﷺ نے اسے ماننے کا حکم دیا ہے اور یا یہ

Marfat.com

فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات کا حکم دے رہے ہیں۔ تو صرف آپ ﷺ کے اعتماد پر اسے تسلیم کر لینا یہ حقیت میں ایمان ہے اور یہی وہ ایمان ہے جسے مندرجہ ذیل آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔'' (الحجرات:۱۵)

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾

(حم السجدہ: ۳۰)

(جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ڈٹ گئے)

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتْ قُلُوْبُھُمْ﴾

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں کہ جب اللہ کا ذکر کیا جائے تو ان کے دل لرز جاتے ہیں۔'' (الانفال:۲)

﴿وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ﴾ (البقرۃ:۱۶۵)

''اور جو لوگ ایمان لائے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

﴿فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا﴾

''پس نہیں، (اے نبی) تمھارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمھیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔'' (النساء:۶۵)

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

﴿یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا آمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ﴾ (النساء: ۱۳۶)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔''

ہر دور میں انسان کی یہ کمزوری رہی ہے کہ وہ اللہ، اس کے رسول اور باقی ایمانیات

Marfat.com

پر ایمان لانے کا مطلب یہ سمجھتا رہا ہے کہ زبان سے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ میں نے ان صداقتوں کو قبول کرلیا ہے تو یہی وہ ایمان ہے جو میرے لیے کافی ہے۔ یہاں پوری طرح اس غلط فہمی کو دور کیا گیا ہے کہ کسی بھی صداقت کا زبانی اقرار کبھی قابل قبول نہیں ہوتا ہے جب تک اس اقرار کی علامات انسانی رویے میں منعکس نہیں ہوتیں اور یہ ایک حقیقت ہے کوئی بھی زبان کا اقرار انسان کے رویے پر اس وقت اثر انداز ہوتا ہے جب وہ اقرار اس کے دل کی تصدیق بن جاتا ہے یہی تصدیق اس کے رویے کو متشکل بھی کرتی ہے اور اس کے کردار میں پختگی کا باعث بھی بنتی ہے۔ ہم عام انسانی معاملات میں دیکھتے ہیں کہ باتیں مانی جاتی ہیں اور منوائی جاتی ہیں اور اگلے روز ان باتوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ بہت آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ رات گئی بات گئی۔ مفادات کے زیر اثر تسلیم کردہ باتیں مفاد کے بدلنے سے اپنا اثر کھو دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست دانوں میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ سیاسی وعدے پورا کرنے کے لیے نہیں ہوتے۔ حالانکہ وعدہ ایفاء کے تصور کے بغیر اپنا کوئی مفہوم نہیں رکھتا اور ہر دور میں اس کا احترام کیا گیا ہے۔ لیکن جو وعدے بھی مفاد کے تحت زبان کا عمل بن کے رہ جاتے ہیں، وہ اپنا احترام بھی کھو دیتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں زبانی اقرار کو اس وقت تک کوئی اہمیت نہیں مل سکتی جب تک اس کے ساتھ دل کی تصدیق اور عمل کی قوت شامل نہ ہو بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب دل کی تصدیق میسر آجائے تو اس کے بعد عمل کا اس سے الگ رہنا ناقابل تصور ہے۔ جب عام انسانی زندگی اور اس کے معاملات میں، عام حقائق کی یہ حالت ہے تو پھر کائنات کی سب سے بڑی حقیقت جسے ایمان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ اگر صرف زبان کے اقرار تک محدود رہے تو اس سے ایمانی زندگی کیسے پیدا ہوسکتی ہے اور اللہ کی نگاہ میں اس کی کیا قدر و عظمت ہوسکتی ہے؟ یہی وہ بات ہے جو یہاں کہی جارہی ہے اور یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبال نے اپنے انداز میں کہا تھا:

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا اِلٰہ اِلّا
لغتِ غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ میں غیب پر ایمان لانے کا ذکر کیا گیا ہے کہ متقین کی پہلی صفت یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں۔ دوسرا ترجمہ اس کا یہ کیا گیا ہے کہ وہ غیب میں رہتے ہوئے ایمان لاتے ہیں۔ پہلی صورت میں بالغیب مفعول ہے اور دوسری صورت میں ظرف

Marfat.com

ہے۔ ہمارے نزدیک مآل کار دونوں صورتوں میں مفہوم اور مراد میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مقصود یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں یعنی ہر اس چیز کو مانتے ہیں جسے ماننے کا انھیں حکم دیا جائے چاہے وہ چیز ان کے لیے غیب کا درجہ کیوں نہ رکھتی ہو اور غیب سے مراد ہر وہ چیز ہے جو آنکھوں سے اوجھل ہو اور یا اسے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔ نہ حواس اسے محسوس کر سکیں اور نہ عقل اس کا ادراک کر سکے لیکن جب قرآن کریم ایسی باتوں کو ماننے کا حکم دے تو متقی اس کے ماننے میں تأمل نہیں کرتے انھیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ ہمیں جس چیز پر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہمارے حواس یا ادراک کی گرفت میں نہیں آتی، کیونکہ وہ اس بات کو تسلیم کر چکے ہیں کہ ہمارے لیے ماننے کا اصل ذریعہ اور تسکین و اطمینان کا اصل حوالہ اللہ کا رسول ہے۔ ہمارے نزدیک اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ یہ بات اللہ کے رسول نے فرمائی ہے یا اللہ کی طرف سے ہمیں پہنچائی ہے اور آپ کی ذات سے اس کا انتساب ثابت ہے تو پھر ہمارے نزدیک اور کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں۔

ایمان بالغیب کے حوالے سے بعض باتیں

آپ نے غور فرمایا کہ ایمان بالغیب میں تین باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

سب سے پہلی یہ بات کہ دین اسلام جو مسلمانوں کے لیے ضابطۂ حیات ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول پر نازل فرمایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے جسے ہم اپنے حواس اور اپنی عقل سے احاطۂ ادراک میں نہیں لا سکتے اور اللہ کے اس کلام کو اللہ کے رسول پر لے کر آنے والا ایک فرشتہ ہے جن کا نامِ نامی جبریل امین ہے۔ انھیں بھی ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ جب وحی لے کر سرورِ دو عالم ﷺ پر نازل ہوتے ہیں اور آپ ﷺ کے قلب مبارک پر قرآن پاک اتارتے ہیں۔ تو اسے صرف رسول پاک ﷺ سنتے ہیں اور کوئی نہیں سن سکتا اور پھر اس کلام پاک میں جن باتوں کی خبر دی گئی ہے۔ مثلاً عالمِ برزخ، عالمِ آخرت، جنت، دوزخ، انسان کا دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جانا، اور تمام انسانوں کا ایک دن اللہ کی عدالت میں جواب دہی کے لیے پیش ہونا، تمام اعمال کا حاضر کیا جانا، اور تمام جن وانس کے اعمال کا حساب لیا جانا اور ایسی بہت ساری باتیں ہیں جو ہمارے حواس اور ہماری عقل سے ماوراء ہیں اور جنھیں ہم جاننے سے عاجز

Marfat.com

ہیں۔ غور فرمایئے! اگر قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے ایمان بالغیب کو ضروری قرار نہ دیا جاتا تو قرآن پاک کا پڑھنے والا ان میں سے ہر بات کے جاننے پر اصرار کرتا تو کیا قرآنِ پاک سے استفادہ کبھی ممکن ہوتا۔ وہ عالم غیب کی کسی بات کو حواس وعقل کے ذریعے جاننے سے عاجز ہوتا تو یقیناً ان باتوں کا انکار کر دیتا وہ یہ کہتا کہ جن صداقتوں پر پورے دین اسلام کی عمارت کھڑی ہے جب میں انھیں ماننے سے عاجز ہوں کیوں کہ وہ میرے حواس اور عقل کی گرفت میں نہیں آتیں تو پھر میں اس قرآنِ کریم کو کیسے تسلیم کرلوں۔ اس لیے صاف طور پر فرمایا گیا کہ اگر تم قرآن پاک سے ہدایت کے طلبگار ہو تو پھر ضروری ہے کہ غیب پر ایمان لاؤ۔ جس طرح ہر Subject کی تعلیم سے پہلے اس کی مبادیات اور مسلمات پر لیکچر دیا جاتا ہے کہ اگر تم اس Subject کو پڑھنا چاہتے ہو تو تمھیں یہ یہ باتیں پہلے تسلیم کرنا ہوں گی۔ فلسفہ کی مبادیات بالکل اور ہیں اور سائنس کی مبادیات بالکل اور ہیں ایک کا دارومدار Practice پر ہے اور دوسرے کا تخیلی اور فکری قوت پر۔ ان بنیادوں کو تسلیم کرنے کے بعد مطلوبہ علم حاصل کرنے کا مرحلہ آتا ہے۔ بالکل اسی طرح پروردگار نے قرآنِ پاک سے ہدایت حاصل کرنے کے لیے چند بنیادی مقدمات کا ذکر کر دیا ہے۔ جن پر درجہ بدرجہ ہدایت کا دارومدار ہے۔

دوسری بات جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے وہ ہے ایقان و یقین۔ یہاں جس ایمان کی بات کی جارہی ہے۔ وہ اسلام اور قرآن کی بنیادی صداقتوں کو زبان سے مان لینے کا نام نہیں۔ بلکہ اس کی حقیقی روح دل کی تصدیق اور دل کا یقین ہے۔ صرف زبان سے اقرار کر لینے سے آدمی دائرہ ایمان میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن جب تک دل کی تصدیق اور اس کے مطابق عمل کی قوت شامل نہ ہو ایمان مکمل نہیں ہوتا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ قوت جو انسان کو آمادۂ عمل کرتی اپنے اعتقادات پر استقامت عطا کرتی اور بڑی سے بڑی مخالفت میں بھی کھڑا رہنے کا حوصلہ دیتی اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی اور ایثار کو ممکن بنا دیتی ہے وہ یہی یقین کی قوت ہے۔ جس آدمی کو اس بات کا یقین ہے کہ میرا اللہ مجھے ہر وقت دیکھتا ہے وہ کبھی گناہ نہیں کر سکتا۔ وہ تخت نشین ہو کر بھی اپنے آپ کو ایک عاجز بندہ سمجھتا ہے اس کے ہاتھوں میں خزانہ بھی آجائے تو وہ اس کے ایک ایک پیسے کو خرچ کرتا ہوا فکر مند ہوتا ہے۔ یعنی اس کا ہر عمل اس لیے پاکیزہ ہو جاتا ہے کیونکہ اسے یقین ہے کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔ اسی طرح اللہ کا کوئی حکم

Marfat.com

جس پر اسے یقین ہے کہ میرے اللہ کا حکم ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ اللہ کے حکم سے سرتابی دنیوی اور اخروی تباہی کا باعث ہے اور یہ بھی وہ جانتا ہے کہ علم الٰہی سے نکلا ہوا کوئی حکم کبھی اپنے قابل عمل اور نتیجہ خیز ہونے میں غلط نہیں ہو سکتا۔ تو ایسے شخص کے لیے بہت مشکل ہے کہ وہ اللہ کے حکم سے انحراف کرے یا اس کے کسی حکم کو ناقابل عمل سمجھے، یا مستقبل میں اس کے نتائج کے بارے میں اسے کوئی تردد ہو۔

اسی طرح جب تک ایک مومن کو یقین ہے کہ میں جس ذات بابرکات پر ایمان لایا ہوں، وہ معصوم ہے وہ نہ دین پہنچانے میں غلطی کر سکتے ہیں اور نہ اس پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی کر سکتے ہیں ان کی ہر بات ہمارے لیے حجت ہے ایسے مومن سے اس بات کی کبھی توقع نہیں ہو سکتی کہ وہ رسولِ پاک ﷺ کی کسی سنت کے بارے میں کسی طرح کے ذہنی تحفظ کا شکار ہو۔ یہ فکر اور عمل کی حیرت انگیز تبدیلی یا استقامت کی یہ تصویر جس کا ذکر میں آپ سے کر رہا ہوں، یہ صرف یقین کے نتائج ہیں کیونکہ یقین ایک ایسی قوت کا نام ہے جو انسان کی کردار سازی کے لیے سب سے مؤثر عامل ہے۔

اقبال نے ٹھیک کہا تھا:

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملّت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملّت ہے

اور اگر کسی قوم میں یہ یقین اور ایمان کی قوت کی نہ رہے تو ایسی قوم نہ صرف کہ کردار کی عظمت سے محروم ہو جاتی ہے بلکہ وہ دھرتی کا ایسا بوجھ بن جاتی ہے جس کے لیے اپنا قومی وجود اور پنی سیاسی آزادی کا تحفظ بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ انسانوں کی ایک ایسی بھیڑ ہوتی ہے جسے کوئی بھی طاقت ور قوم بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح ہانکنے لگتی ہے۔ اس کے فیصلے اپنے نہیں ہوتے بلکہ دوسرے ان کے لیے فیصلے کرتے ہیں وہ بظاہر آزاد بھی ہو تب بھی غلاموں سے بدتر ہوتی ہے۔ بقول اقبال

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

تیسری چیز، جس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ وہ ہے اللہ اسکی کتاب اور اس کے رسول ﷺ پر اعتماد۔ دنیا کی ریت یہ ہے کہ یہاں ہر بات کو ہر آدمی نہیں جانتا۔ ہم اپنے بیشتر

Marfat.com

معاملات اور بیشتر ضرورتوں میں دوسروں پر اعتماد کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اور اسی اعتماد سے دنیا کا کاروبار چلتا ہے آدمی بیمار ہوتا ہے تو ڈاکٹر یا طبیب کے پاس جاتا ہے۔ وہ جو نسخہ لکھ کر دے دے، بے تردد اسے استعمال کرتا ہے۔ کبھی کوئی مریض کسی ڈاکٹر سے نہیں پوچھتا کہ آپ مجھے پہلے اپنے لکھے ہوئے نسخے اور اس کے اجزاء کے بارے میں مطمئن کریں، تب میں آپ کا نسخہ استعمال کروں گا کیونکہ مریض کو ڈاکٹر پر اعتماد ہوتا ہے اور وہ یقین رکھتا ہے کہ وہ مجھے جو بھی نسخہ لکھ کر دے گا میرے لیے اسی میں بھلائی ہے۔ اگر کوئی مریض ڈاکٹر کے نسخے پر اعتراض کرے تو ڈاکٹر اس کے علاج سے انکار کر دیتا ہے۔ بچہ جب تعلیم کے قابل ہوتا ہے تو اس کے اہل خانہ اسے کسی تعلیمی ادارے میں اساتذہ کے حوالے کر دیتے ہیں اور کبھی کسی استاد سے روزانہ تعلیم کی تفصیل نہیں پوچھی جاتی، بچے کو اور اس کے اہل خانہ کو اطمینان ہوتا ہے کہ بچے کو ٹھیک تعلیم مل رہی ہے اور اس اطمینان کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ انھیں اساتذہ کے علم پر اعتماد ہوتا ہے۔ غرضیکہ زندگی کے جتنے شعبے ہیں جن میں افادہ اور استفادہ کا عمل ضروری ہے ان تمام میں بنیادی چیز اعتماد ہی ہوتی ہے۔ حکومتوں پر عوام اعتماد کرتے ہیں تو چلتی ہیں، عدالتوں سے انصاف طلب کرنے کے لیے ہجوم لگا رہتا ہے، کیونکہ ججز پر اعتماد ہوتا ہے کہ وہ انصاف مہیا کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے ہر اس شعبے میں جس میں دوسروں سے احتیاج ضروری ہے وہاں اعتماد کے بغیر کام نہیں چل سکتا حالانکہ یہ تمام ادارے اور شعبے ایسے ہیں جس میں کام لینے والے اور کام دینے والے دونوں صلاحیتوں کے اعتبار سے بہت متفاوت نہیں ہوتے۔ لیکن ایک تقسیم کار ہے جس نے انسانوں میں یہ تقسیم قائم کر رکھی ہے اور اسی سے انسانوں کا کام چلتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شعبہ ایسا ہو کہ جس کی احتیاج بھی سب انسانوں کو ہو اور وہاں کام دینے والی ذات ایسی ہو کہ دوسرا کوئی اس کی جگہ بھی نہ لے سکے تو یہاں اگر اعتماد میں کمی آجائے تو اندازہ کیجیے کہ انسانی زندگی میں کیسی دراڑیں آجائیں گی۔ انسان اپنے اللہ کا بندہ ہے۔ بندہ ہونے کے اعتبار سے وہ اپنے رب کی بندگی کا پابند ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے کہ میرے رب نے میرے لیے بندگی کا کون سا طریقہ پسند فرمایا ہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ بات جاننا جس قدر ضروری ہے، اسی قدر براہِ راست اللہ سے جاننا ناممکن بھی ہے۔ انسانوں کی اس کمزوری کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی مبعوث فرمائے جن پر اپنی کتابیں نازل فرمائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندوں اور ان کے رب کے

Marfat.com

درمیان جاننے اور معلوم کرنے کا جو ذریعہ ہے وہ اللہ کے نبی ہیں۔اب اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ہمارا رب کن باتوں یں راضی ہے اور کن باتوں میں ناراض، تو ضروری ہے کہ ہم اس کے آخری رسول ﷺ پر آخری حدتک اعتماد کریں۔ اگر اس اعتماد میں کمی آجائے گی تو ہمارا تعلق اپنے رب سے ٹوٹ جائے گا کیونکہ ہم اس علم کے حصول سے براہ راست عاجز ہیں یہ وجہ ہے جس کی وجہ سے ایمان میں اللہ کے رسول پر اعتماد کرنا لازمی ٹھہرایا گیا ہے کہ اگر ہر امتی اللہ کے رسول سے ہر حکم خداوندی یا حکم نبی کے بارے میں سوال کرنا شروع کردے تو وہ کبھی بھی دینی احکام پر عمل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ دور نبوت اور دور صحابہ میں ہم یہ دیکھتے ہیں کہ صحابہ کو صرف یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کہ کسی چیز کے بارے میں آں حضرت ﷺ نے کیا فرمایا یا کیا پسند فرمایا اتنی بات معلوم ہوجانے کے بعد اب انھیں اس پر عمل کرنے میں کوئی تردد نہیں ہوتا تھا۔ بڑے سے بڑے نازک موقعوں پر بھی یہی اعتماد ان کا سب سے بڑا اسہارا ثابت ہوتا تھا۔معراج شریف سے واپسی پر جب اشرارِ قریش نے شور مچایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک ہی رات میں بیت المقدس اور آسمانوں تک کا سفر سمٹ جائے لیکن جب یہ بات حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو انھوں نے فرمایا" کہ جب میں اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ روزانہ اللہ کا فرشتہ آسمانوں سے حضور ﷺ پر نازل ہوتا اور واپس چلا جاتا ہے اور اس میں مجھے کوئی استبعاد محسوس نہیں ہوتا تو اگر پروردگار حضور ﷺ کو ایک رات میں بیت المقدس اور پھر آسمانوں میں لے گیا تو اس میں ایسی کیا بات ہے کہ جس کا ماننا میرے لیے مشکل ہو۔اگر یہ بات کوئی اور کہتا تو میں کبھی نہ مانتا لیکن یہ بات چونکہ حضور ﷺ فرمارہے ہیں ان پر اعتماد کی وجہ سے میں کبھی اس بات کا انکار نہیں کرسکتا۔"

معاہدۂ حدیبیہ مسلمانوں کے جذبات کے لیے بہت بڑا امتحان تھا۔وہ یہ یقین رکھتے تھے کہ اسلام کبھی کسی سے مغلوب نہیں ہوتا اللہ کی قدرت جس کی پشت پناہ ہو اسے کوئی نہیں جھکا سکتا اور دنیا میں اللہ کی قدرت اور نصرت کا مورد اللہ کے رسول سے بڑھ کر کوئی نہیں ہوتا۔یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ کا رسول صحابہ کو ساتھ لے کر عمرہ کے ارادہ سے سفر کرے اور پھر عمرہ کیے بغیر احرام کھول دے اور یہ بات کیسے باور کی جاسکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ قریش مکہ کے ساتھ ایک ایسا معاہدہ کرلیں جو سراسر یک طرفہ ہو اور جس میں اسلام اور مسلمانوں کی مرعوبیت کا احساس نمایاں ہو۔لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ آں حضرت ﷺ نے اس معاہدے کو قبول کرلیا ہے

Marfat.com

اور آپ ﷺ نے احرام بھی کھول دیا ہے تو مسلمان اپنی ساری غیرت وحمیت کے باوجود اس لیے اس معاہدہ کے سامنے جھک گئے کہ انھیں اس بات پر اطمینان تھا کہ اللہ کے رسول کوئی کام اللہ کے حکم کے بغیر نہیں کرتے۔ یہ معاہدہ اگرچہ مسلمانوں کی مصلحت کے خلاف دکھائی دیتا ہے لیکن آنحضرت ﷺ کا اسے قبول کر لینا اس بات کا غماز ہے کہ اس کے قبول کر لینے ہی میں مسلمانوں کی بھلائی اور اسلام کی عظمت ہے۔ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ ایمان میں جس اعتماد کو شرط قرار دیا گیا ہے وہ اعتماد اللہ پر بھی ہے، اس کے رسول پر بھی اور اس کی کتاب پر بھی یعنی اللہ کا کوئی حکم اس کی کتاب کے ذریعے نازل ہو، تو وہ اس لیے واجب الاذعان اور واجب التعمیل ہے کیونکہ ہم اللہ پر اور اس کی کتاب پر اعتماد رکھتے ہیں کہ اس کی ہر بات صحیح ہے اور اسی اعتماد پر مانی ہوئی بات ایمان کہلاتی ہے۔ اسی طرح جب آں حضرت ﷺ کوئی بات فرمائیں بے شک اللہ کی کتاب میں اس کا ذکر نہ ہو تو ہمیں اس لیے اس کے ماننے میں کوئی تأمل نہیں ہونا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور آپ ﷺ پر اعتماد ہی دراصل ہمارے لیے ایمان کا ذریعہ ہے۔ اگر ہم آپ ﷺ کی کسی بات اور کسی پسند وناپسند کے بارے میں تحفظ ذہنی کا شکار ہوں یا ہماری مصلحتیں اس پر غالب آجائیں یا ہماری عقل ہمیں یہ سمجھائے کہ آج کے دور میں یہ بات چلنے والی نہیں تو سمجھ لیجیے کہ حضور ﷺ کی ذات پر اعتماد نہ رہنے کے باعث آپ ایمان سے محروم ہو گئے ہیں۔ صحابہ اسی اعتماد سے سرشار تھے، یعنی انھیں اللہ اس کی کتاب اور اسکے رسول پر حد درجہ اعتماد تھا انھیں یقین تھا کہ یہ ممکن ہے کہ ہمارے حواس دھوکہ کھا جائیں ہماری عقل ٹھوکر کھا جائے دنیا بھر کے اہل دانش کسی بات کے سمجھنے میں ناکام رہیں، لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کی کوئی بات غلط ہو جائے یا اللہ کے رسول ہمیں کسی ایسی بات کا حکم دیں جو ہمارے لیے دنیا اور آخرت میں مفید نہ ہو اور یا دنیا میں قابل عمل نہ ہو۔ سورۃ توبہ میں ۹ ہجری کے ایام حج میں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوْا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا﴾

''یقیناً مشرک پلید ہیں اس سال کے بعد یہ مسجد حرام کے قریب نہ آنے پائیں۔''

یعنی اللہ کا گھر ہر طرح کی پاکیزگی کا سرچشمہ ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ اسے ہر

Marfat.com

طرح کی گندگی سے پاک کردیا جائے مشرکوں میں عقیدے اور اخلاق کی گندگی پائی جاتی ہے۔ جس کا اظہار وہ اللہ کے گھر میں مشرکانہ اعمال کے ذریعے کرتے ہیں۔ اب اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ کے بعد اسلام کو غلبہ عطا فرمایا ہے اس لیے حج کے موقع پر یہ اعلان کردیا جائے کہ اب شرک کی یہ پلیدی اور گندگی نا قابل برداشت ہے۔ اس لیے یہ ۹ ہجری کا حج تو مشرکوں کو اپنے طریقے سے کرنے کی اجازت ہے آئندہ حج سے پہلے یا تو وہ مسلمان ہوجائیں اور یا جزیرۂ عرب سے نکل جائیں۔ اب انھیں اپنی گندگیوں سمیت اللہ کے گھر کے قریب آنے کی اجازت نہیں ہے۔

اس حکم کے نزول کے بعد مکہ کے رہنے والے مسلمانوں میں پریشانی اور تشویش کی لہر دوڑ گئی کیونکہ ابھی تک جزیرۂ عرب میں ایک معقول تعداد مشرکین عرب کی تھی۔ وہ جب حج پہ آتے تھے تو اپنے ساتھ ضروریاتِ زندگی اور سامانِ تجارت بھی لے کر آتے تھے، حج کے فوراً بعد تجارتی بازار سج جاتے تھے اس تجارت سے مسلمانوں کو سال بھر کی گزر بسر کے لیے معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔ اس آیت کریمہ کے نازل ہوجانے کے بعد اب چونکہ مشرکین عرب مکہ معظّمہ نہیں آسکیں گے تو جس تجارت پر مکہ کے مسلمانوں کی گزر بسر کا انحصار تھا وہ ختم ہوجائیگی اور ادھر حجاز کا پورا علاقہ چونکہ اپنی آمدنی کا کوئی اور معقول ذریعہ نہیں رکھتا تھا۔ جس پر مسلمان بھروسہ کرسکتے اس لیے، مسلمانوں کا اپنی معیشت کے حوالے سے پریشان ہونا بالکل فطری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس پریشانی کو دور کرنے کے لیے آیتِ کریمہ کا دوسرا حصہ نازل فرمایا:

﴿ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ﴾

''اگر تمھیں اندیشہ ہے تنگدستی کا تو اللہ تعالیٰ تمھیں عنقریب غنی کردے گا، اگر اس نے چاہا۔''

غور فرمایئے اس آیت کریمہ میں ایک بہت بڑی پریشانی کے ازالے کے لیے اللہ تعالیٰ نے غنی کرنے کی صرف امید دلائی ہے۔ لیکن آیت کے اس ٹکڑے کے نازل ہوجانے کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں کی تشویش کے بادل چھٹ گئے۔ وہ بالکل مطمئن ہوگئے کہ اب ہمیں رزق کی تنگی اور اسبابِ معیشت کی کمی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ کیونکہ ہمارے رب نے قرآن کریم کی اس آیت کے ذریعے ہم سے غنا کا وعدہ فرمالیا ہے کیونکہ اللہ کا امید دلانا بھی وعدے سے کم نہیں اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدوں میں سچا کون ہوسکتا ہے۔ چنانچہ اسی اعتماد کی قوت نے ان کے سارے اندیشے دور کرڈالے اور ان کے سینوں کو حوصلوں سے بھردیا۔ اے کاش ہم اس بات پر غور کرسکیں کہ

Marfat.com

اللہ کے بیسیوں وعدے آج بھی موجود ہیں۔ مثلاً اس نے سود کو حرام کیا، تو ساتھ ہی یہ ارشاد فرمایا:

﴿ یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ ﴾

''اللہ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو پالتا اور بڑھاتا ہے۔''

یعنی وہ نظام جس میں سود داخل ہوگا وہ کبھی انسانی فلاح کا باعث نہیں بنے گا۔ اس سے سرمایہ دارانہ نظام وجود میں آئے گا۔ جس کے نتیجے میں غریب، غریب تر ہوتا جائے گا اور امیر، امیر تر۔ اس طرح دنیا طبقات کا شکار ہوکر ظلم کی چکی میں پستی رہے گی۔ لیکن جس نظام میں انفاق وایثار کا جذبہ شامل ہوگا جسے نظامِ زکوٰۃ کہا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ برکت عطا فرمائے گا اور اسی کے نتیجے میں انسانوں کو فلاح نصیب ہوگی۔ یہ آیت آج بھی قرآن مجید میں موجود ہے لیکن ہم اجتماعی طور پر اس حکم پر عمل کرنے سے اسلیے محروم ہیں کہ صحابہ کو جس طرح اللہ اور اس کے رسول پر اعتماد تھا ہم اس اعتماد سے تہی دامن ہیں۔ اسی اعتماد نے ان میں قوت کے طوفان بھر دیے تھے۔ اور کردار کی عظمتیں ان کے ہم رکاب ہوگئی تھیں۔ وہ وسائل کے اعتبار سے تہی دامن تھے افرادی قوت بھی زیادہ نہ تھی بااین ہمہ انھوں نے تخت الٹ ڈالے، اور دنیا کی تاریخ بدل دی اور ہم اپنے پاس سب کچھ رکھتے ہوئے ذلت کی علامت بنتے جارہے ہیں وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے پاس اللہ کی کتاب اور رسول ﷺ کی سنت موجود ہے لیکن ہمیں ان پر اعتماد نہیں ہے۔ ہمارا قومی شاعر اسی بھولے ہوئے سبق کے لیے دعائیں کرتا رہا لیکن ہمیں آج تک انھیں سمجھنے کی توفیق نہ ہوئی۔ وہ صحابہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ راز اس نے پایا انہی کے جگر میں
دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

Marfat.com

8- اقامتِ صلوٰۃ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

وَيُقِيمُوْنَ الصَّلوٰۃَ

ہم اس سے پہلے پڑھ چکے ہیں کہ یہ کتاب ہدایت ہے متقین کے لیے۔ یعنی ان لوگوں کے لیے جن میں شعور زندہ ہو، جو انسانی احساس سے بہرہ ور ہوں۔ ان کی عقل، اپنے خصائص کھو نہ چکی ہو بلکہ اس میں ابھی تک وہ نور باقی ہو جس کی وجہ سے وہ اپنے اور کائنات کے خالق کے بارے میں غور وفکر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جس کے لیے اس نتیجے پر پہنچنا مشکل نہ ہو کہ وہ خالق و مالک جس نے ہر چیز کو تخلیق فرمایا ہے وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت سے یہ بات بہت بعید ہے کہ انسان جو اس کائنات کا گلِ سرسبد ہے، اسے اس نے بے مقصد پیدا کیا ہو، ایک ایسی مخلوق جو حواس، عقل اور دل و دماغ کی رعنائیاں دے کر پیدا کی گئی ہو کیسے ممکن ہے کہ اس کی زندگی کا کوئی مقصد نہ ہو، جب اس کا سوچنے والا دماغ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ یقیناً میری زندگی کا کوئی نہ کوئی مقصد ہے تو مقصد کی تلاش کے لیے یہ کتاب اس کی رہنما ثابت ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا کی کوئی اور کتاب بہ تمام وکمال انسانی زندگی کے مقاصد کو واضح نہیں کرسکتی۔ اس فکر مندی اور سنجیدگی کے ساتھ جب وہ اس کتاب سے استفادہ کرتا ہے تو اس کے اندر جو سب سے پہلی صفت پیدا ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اسے اپنے خالق و مالک کو سمجھنا اور اس کی طرف سے نازل کردہ احکام کی حقیقت کو جاننا آسان ہوجاتا ہے وہ ہے ایمان بالغیب، جس کی وضاحت متذکرہ گزارشات میں ہوچکی ہے۔ چنانچہ ایمان بالغیب سے جب قرآن سے استفادہ کرنے والے کا اپنے اللہ سے حقیقی تعلق پیدا ہوجاتا ہے اور وہ نبوت ورسالت کی حقیقت کو بھی سمجھنے لگتا ہے اور اپنی زندگی کے مقاصد اس کے سامنے منکشف ہونے لگتے ہیں۔ تو یقیناً اس کے اندر اپنے خالق و مالک کی یاد کا ایک زوردار جذبہ سر اٹھاتا ہے۔ اب

Marfat.com

وہ یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے اللہ کے نام کا ذکر کروں اس کے سامنے سر جھکاؤں، اپنے دل کی دنیا کو اس سے آباد کروں، میرا انگ انگ اس کی یاد سے سرشار ہو جائے، میں کبھی اس کے سامنے جھک کر اسے یاد کروں، کبھی اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤں، کبھی بیٹھ کر اس سے مناجات کروں، میں زندگی کا کوئی عمل بھی کروں لیکن اس کی یاد برابر میری رفیق رہے۔ میرے اعضائے جسم کسی بھی کام میں مصروف ہوں لیکن میرے قلبی احساسات اور فکری توانائیاں اسی کے سامنے سجدہ ریز رہیں، یہ وہ فکری احساسات ہیں جو ایمان بالغیب سے بہرہ ور ہونے والے کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور وہ اس کے اظہار کی کسی نہ کسی صورت کا متلاشی ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم میں اسی جذبے کی کارفرمائی کے لیے نماز کی نعمت عطا فرمائی گئی ہے اور اس کو دوسری صفت کے طور پر بیان فرمایا گیا ہے کہ جو لوگ قرآن پاک سے ہدایت حاصل کرتے ہیں ان کے اندر کا تقویٰ جو انھیں اس آستانے تک کھینچ کر لاتا ہے وہی تقویٰ سب سے پہلے ایمان بالغیب سے متصف ہوتا ہے اور اس کے بعد عمل کی دنیا میں سب سے پہلے اقامتِ صلوٰۃ سے نوازا جاتا ہے اور اس تقویٰ کا حامل یعنی متقی ان صفات سے پہچانا جاتا ہے گویا یہ اس کی توضیحی صفات ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ (وہ نماز قائم کرتے ہیں)

یہاں یہ نہیں فرمایا کہ وہ نماز پڑھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ قرآن کریم کی اس اصطلاح کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ اقامت کا معنی ہے کسی چیز کو کھڑا کرنا یا اس طرح سیدھا کرنا کہ اس میں کوئی ٹیڑھ باقی نہ رہے۔ قرآنِ کریم میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر علیہما السلام کے ایک سفر کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ جس میں ایک جگہ بتایا گیا ہے کہ ایک گاؤں میں انھوں نے ایک جگہ دیکھا کہ ایک دیوار گرا چاہتی ہے تو انھوں نے اسے سیدھا کر دیا۔ اس کے لیے قرآن کریم نے تعبیر اختیار کی فاقامہ پس اس نے اسے سیدھا کر دیا تو یہاں دیکھئے اقامہ ٹیڑھی دیوار کے سیدھا کرنے کے معنی میں آیا ہے۔ تو اس لفظ کے معنی پر غور کرتے ہوئے کئی حقیقتیں واضح ہوتی ہیں:

۱۔ نماز قائم کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ نماز صرف اللہ ہی کے لیے پڑھی جائے کسی اور کو اس میں شریک نہ کیا جائے اس میں دکھاوے کی آلائش تک شامل نہ ہو۔ ریاکاری کی پرچھائیں نہ پڑنے پائے۔ نماز چونکہ اللہ کے لیے ہے اس لیے اسی کے گھر کی طرف منہ

Marfat.com

کر کے نماز پڑھی جائے اور دل کا رخ صرف اللہ کی طرف رہے اور کوشش یہ کی جائے کہ نماز میں مکمل یکسوئی حاصل ہو، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔

﴿وَاَقِیمُوا وُجُوهَکُم عِندَ کُلِّ مَسجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخلِصِینَ لَهُ الدِّینَ﴾

''اور اسی کی طرف اپنا رخ کرو ہر نماز کے وقت اور اسی کو پکارو اسی کے لیے اطاعت کو خالص کرتے ہوئے۔''

۲۔ نماز اس طرح پڑھی جائے جس سے محسوس ہو کہ واقعی اللہ کو یاد کیا جا رہا ہے۔ یعنی آدمی نماز کا ہر رکن ادا کرتے ہوئے، خشوع وخضوع میں ڈوبا ہوا ہو۔ آدمی پر اللہ کی خشیت بھی طاری ہو اور اس کی محبت سے دل لبریز بھی ہو۔ اور یہی وہ نماز ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں فرمایا گیا ہے۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُوْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلٰوتِهِمْ خَاشِعُوْنَ﴾

''ان مومنوں نے فلاح پائی جو اپنی نمازیں خشوع وخضوع سے ادا کرتے ہیں۔''

۳۔ نماز کو وقت کی پابندی کے ساتھ ادا کرنا، نہ تعجیل سے کام لینا نہ تاخیر سے۔ کیونکہ نہ وقت سے پہلے نماز ادا ہوتی ہے، نہ وقت کے بعد۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ کَانَتْ عَلَی الْمُوْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا﴾

''بے شک نماز مسلمانوں پر وقت کی پابندی سے فرض کی گئی ہے۔''

۴۔ نماز کا اس طرح ادا کرنا جس میں فرائض واجبات، سنن، اور آداب تک کا لحاظ رکھا جائے۔ اگر فرض یا واجب کی پابندی نہ کی گئی تو نماز نہیں ہوگی اور اگر سنت سے لاپرواہی کی گئی تو نماز مکروہ ہوگی اور اگر آداب کا خیال نہ رکھا گیا تو نماز بے برکت ہو جائے گی۔ اس لیے حقیقی نماز وہی ہے جو ان تمام پابندیوں کے ساتھ ادا کی جائے۔ آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ جلدی جلدی نماز پڑھ رہا ہے۔ نہ قیام درست ہے نہ قعود، نہ رکوع میں سلامتی ہے نہ سجدے میں، بس جلدی جلدی نماز نمٹانے کی کوشش کر رہا ہے۔ جس طرح عموماً ہم نماز پڑھتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے اسے بلا کر فرمایا نماز دوبارہ پڑھو، تم نے

Marfat.com

جو کچھ نماز کے طور پر کیا ہے یہ نماز نہیں ہے، کیونکہ نماز میں تعدیلِ ارکان بھی ضروری ہے۔

۵۔ پانچ نمازیں فرض ہیں، کوئی پڑھنا اور کوئی چھوڑ دینا، اسے نماز قائم کرنا نہیں کہتے۔ یہ تو اپنے نفس کی نماز ہوئی کہ جب جی چاہا پڑھ لی اور جب جی چاہا چھوڑ دی۔ اس لیے فرمایا حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوَاتِ (نمازوں کی محافظت کرو)۔ اور نمازیوں کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَائِمُوْنَ (وہ اپنی نمازوں پر برابر قائم رہتے ہیں)۔

۶۔ جماعت کی پابندی کرنا، قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ نے اس کی بے حد تاکید فرمائی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے وَارْكَعُوْا مَعَ الرَّاكِعِيْنَ (اور رکوع کرو رکوع کرنے والوں کے ساتھ) یعنی جماعت کی پابندی کرو۔ اور آنحضرت ﷺ نے رحمت للعالمین ہونے کے باوجود ارشاد فرمایا کہ ”جو لوگ اذان سننے کے بعد گھروں میں بیٹھ رہتے ہیں اور جماعت میں شریک نہیں ہوتے، میرا جی چاہتا ہے کہ میں کسی سے نماز پڑھانے کے لیے کہوں اور خود ان کے گھروں کو آگ لگا دوں۔ اگر مجھے بچوں، بوڑھوں اور بیماروں کا خیال نہ ہوتا تو میں ایسا ضرور کر گزرتا۔“

۷۔ جماعت کی پابندی کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی شیرازہ بندی جس کا اہم ذریعہ جماعت کے اندر نمازیوں کے صفوں کا سیدھا رکھنا ہے یہ بھی اقامتِ صلوٰۃ میں شامل ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

تَسْوِيَةُ الصُّفُوفِ مِنْ إِقَامَةِ الصَّلٰوةِ

”صفوں کا برابر کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کا ایک جز ہے۔“

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ نے یہاں تک ارشاد فرمایا کہ ”جس قوم کی صفیں ٹیڑھی ہوتی ہیں اندیشہ ہے کہ ان کے دل نہ ٹیڑھے کر دیے جائیں۔“

اقامتِ صلوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری

۸۔ جہاں قرآنِ کریم نے اقامت صلوٰۃ کی نسبت پوری امت یا ان کے امام کی طرف کی ہے تو وہاں اس سے مراد ایک تو اجتماعی نمازوں کا قیام ہے جس میں جمعہ، جماعت اور عیدین کی نمازیں شامل ہیں اور دوسرے اس میں حکومت اسلامی کی سب سے پہلی ذمہ داری سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی خطہ زمین میں مسلمانوں کو حکومت دے دے تو ان کی

Marfat.com

سب سے پہلی ذمہ داری نماز کا قائم کرنا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ﴾

''اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں معروف کا حکم دیں اور برائی سے روکیں۔''

اس آیت کو پھر پڑھئے اور اندازہ فرمایئے کہ جس طرح قرآنِ کریم اپنے استفادہ کرنے والوں میں سب سے پہلی عملی صفت اقامتِ صلوٰۃ قرار دیتا ہے۔ اسی طرح یہاں مسلمان حکومت کی پہلی ذمہ داری اقامت صلوٰۃ ٹھہرا رہا ہے۔ اگر تدبر سے کام لیں تو اس کی دو وجہیں معلوم ہوتی ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عظیم عمارت ہے، جو پانچ بنیادوں پر اٹھائی گئی ہے اور یہی پانچوں اس کے ستون ہیں۔ جن پر یہ عمارت ایستادہ ہے۔ ان میں پہلا اور اہم ترستون نماز ہے یہ ارکان اسلام میں سے ایسا رکن ہے جو سب سے پہلے امت مسلمہ پر فرض کیا گیا اور قیامت کے روز سب سے پہلے اسی سے متعلق سوال کیا جائے گا۔ اسی کے بارہ میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

﴿الصَّلٰوةُ فَارِقٌ بَیْنَ الْحَقِّ وَالْبَاطِلِ﴾

''نماز حق اور باطل کے درمیان فرق کرنے والی ہے۔''

مزید فرمایا:

﴿الصَّلٰوةُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَهَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنَ وَمَنْ هَدَمَهَا فَقَدْ هَدَمَ الدِّیْنَ﴾

''نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے گرادیا اس نے دین کو گرادیا۔''

کسی آدمی کے اسلام کی شناخت اور علامت یہی نماز ہے کیونکہ اسلام قبول کرنے کے بعد نماز کا وقت داخل ہوتے ہی یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ یہ شخص دعوائے ایمان میں سچا ہے یا جھوٹا۔ قرآنِ پاک میں فرمایا:

﴿فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِیْلَهُمْ﴾

''اگر یہ توبہ کریں اور نماز ادا کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کا راستہ چھوڑ دو۔''

Marfat.com

یعنی ان کے ایمان کو معتبر جانو۔آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا۔مسلمانوں کا لشکر اگر کسی آبادی پر گزرے اور معلوم نہ ہو کہ اہل بستی مسلمان ہیں یا غیر مسلم تو اذان کہو اگر بستی سے اذان کا جواب ملے تو اس بستی کو مسلمان جانو اور ان سے مسلمانوں جیسا سلوک کرو۔ کیونکہ نماز ہی اہل اسلام کی پہچان ہے۔ارکان اسلام میں سے کوئی رکن بجز زکوٰۃ کے ایسا نہیں جس کی قرآن وسنت میں اس تکرار کے ساتھ تاکید آئی ہو جیسی تاکید نماز کے لیے آئی ہے۔ قرآنِ کریم میں بار بار اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ (نماز قائم کرو) فرمایا گیا ہے۔نمازوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا۔ حَافِظُوْا عَلَی الصَّلَوَاتِ (نمازوں کی حفاظت کرو) ترک نماز پر شرک کے اندیشہ کا اظہار کیا گیا کہ نماز قائم کرو ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں مشرک نہ ہو جاؤ۔ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اور شرک ایسی برائی ہے جس کا تصور بھی ایک مسلمان کے لیے ناقابل قبول ہے۔مسلمانوں کو صرف اقامتِ صلوٰۃ ہی کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ اسے ہر مسلمان اور مسلمان معاشرے کی پہچان اور روح قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کی ایسی صفت قائمہ و مستمرہ ٹھہرایا گیا جو مسلمانوں سے کبھی منفک نہیں ہو سکتی یعنی جس طرح برف سے ٹھنڈک، آگ سے تپش، چاند سے چاندنی، سورج سے روشنی اور موتی سے آب الگ نہیں ہو سکتی اسی طرح ایک مسلمان بلکہ مسلمان معاشرہ سے نماز کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ارشاد فرمایا گیا: وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَلٰی صَلٰوتِہِمْ یُحَافِظُوْنَ (وہ مسلمان ہمیشہ اور ہر حالت میں نمازوں کی محافظت کرتے ہیں)۔جس طرح ان کے جسموں سے ان کی روحوں کو جدا نہیں کیا جا سکتا اسی طرح ان کی دینی زندگی نمازوں کے اہتمام اور اس کے اثرات سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔

نماز کی پابندی نہ کرنا نفاق کی علامت ہے

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام جس کسی مسلمان کو مسجد سے چند نمازوں میں غائب دیکھتے، تو اس کی مزاج پرسی اور تیمارداری کے لیے اس کے گھر کا رخ کرتے، انھیں یقین ہو جاتا کہ وہ یقیناً بیمار ہے یا اسے کوئی عذر لاحق ہے۔ان کے لیے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ کوئی مسلمان بدوں عذر بھی کبھی نماز باجماعت یا مسجد سے بیگانہ رہ سکتا ہے اور اگر انھیں یہ معلوم ہوتا کہ غیر حاضر شخص کوئی معقول عذر نہیں رکھتا تو انھیں اس کے منافق ہونے کا یقین ہو جاتا۔شاید یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ترک نماز نہیں بلکہ اہتمامِ نماز میں سستی کو بھی منافقین کی علامت قرار دیا۔ارشاد فرمایا:

Marfat.com

وَاِذْقَامُوْااِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی

''جب وہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو ڈھیلے ڈھالے اور کسمسائے ہوئے اٹھتے ہیں۔''

پروردگار کی نگاہ میں یہ مسلمان کا شیوہ نہیں پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں آخر منافقین نہ چاہتے ہوئے بھی نماز کیوں پڑھتے تھے؟ اس کی دو وجوہ تھیں۔

۱۔ وہ جانتے تھے کہ مسلمان معاشرہ میں رہنے اور خود کو انھیں میں سے ظاہر کرنے کے لیے نماز میں شرکت ضروری ہے ورنہ مسلمان انھیں کبھی مسلمانوں میں شمار نہیں کر سکتے تھے کیونکہ انھیں آنحضرت ﷺ کا یہ ارشاد خوب معلوم تھا:

مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّدًا فَقَدْ کَفَرَ

''جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دی اس نے کفر کیا۔''

۲۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو جس سانچے میں ڈھالا گیا تھا اس میں نماز کا اہتمام نہ کرنے والوں کے لیے کوئی گنجائش نہ تھی۔ جس طرح ایک صحت مند معدہ مکھی یا کسی ایسی ہی کسی چیز کو قبول نہیں کرتا بلکہ اگل دیتا ہے۔ اسی طرح صحت مند مسلمان معاشرہ کبھی بے نماز کو برداشت نہیں کرتا بلکہ بے نماز آدمی اس اکل کھرے معاشرے میں کھوٹ کی طرح الگ ہو جاتا ہے کیونکہ پروردگار نے اس مسلمان معاشرے کے معماروں یعنی انبیاء کرام کی یہ ذمہ داری ٹھہرائی تھی کہ وہ خود بھی نماز کی پابندی کریں اور اپنے ماننے والون کو بھی اس کا حکم دیں اور اس کا آغاز اپنے گھر سے کریں آں حضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا (اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس کی پابندی کیجیے)۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قرآن کریم میں قیامت تک کے لیے محفوظ فرما دی گئی۔ رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ (اے رب مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کرنے والا بنا)۔ ایسے معاشرے میں ترک نماز کی کہاں گنجائش رہ سکتی ہے۔ جس میں یہ بات دل و دماغ میں اتار دی گئی ہو کہ نماز زندگی میں بجز جنون اور بے ہوشی کے کسی حالت میں بھی ساقط نہیں ہو سکتی۔ اگر گھر کا سکون میسر نہیں حالت سفر درپیش ہے، تو سفر کی رواروی میں بھی نماز چھوڑی نہیں جا سکتی۔ البتہ قصر پڑھو یعنی دو رکعت نماز کافی ہے اور اگر بیماری کا عذر ہے تو عذر کے مطابق نماز پڑھو۔ یعنی قیام پر قادر نہیں ہو تو بیٹھ کر پڑھو بیٹھ بھی نہیں سکتے تو لیٹ کر سر کے

Marfat.com

اشارے سے اور اگر اتنی بھی ہمت نہیں تو آنکھوں کے اشارے سے پڑھ لو، اور اگر وضو نہیں کرسکتے تو تیمّم کرلو۔ خود نہیں کرسکتے تو دوسرا کرادے اور اگر جنگ کی حالت درپیش ہو تو صلوٰۃ الخوف یعنی ''خوف کی نماز'' پڑھو۔ اندازہ فرمایئے! جنگ کی ہولناکیوں میں غذا میسر نہیں آرام کا موقعہ نہیں جان کے لالے پڑے ہیں مگر نماز بہرحال پڑھنی ہے اگر مسلسل فائرنگ اور گولہ باری کی وجہ سے کسی طرح بھی نماز نہیں پڑھی جاسکتی، تو پھر جب موقع ملے جو نمازیں قضا ہوگئی ہیں انھیں پڑھ لو۔ جیسا کہ غزوۂ خندق میں آنحضرت ﷺ کی دو نمازیں کفار کے مسلسل حملے کی وجہ سے قضاء ہوگئی تھیں تو آپ ﷺ نے انھیں قضا پڑھا لیکن نمازوں کے قضا ہوجانے کا رنج اتنا شدید تھا کہ آپ ﷺ کی زبان سے ان کفار کے لیے بددعا نکلی۔ حالانکہ آپ ﷺ سراپا رحمت تھے اور کبھی اپنی ذات کے لیے کسی کو کبھی حرف ناملائم بھی نہیں فرمایا اور طائف کے پتھر کھا کر بھی بددعا نہیں فرمائی۔ لیکن نماز کے معاملہ میں آپ بہت حساس واقع ہوئے تھے کیونکہ نماز فی الحقیقت اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا اقرار واعلان ہے اور اس کی مداومت اور پابندی اس عہد وفا کی پاسداری ہے اس لیے جب آپ اس عہد وفا کو شکست ہوتا دیکھتے تو اس دھرتی پر سایۂ رحمت ہونے کے باوجود غضبناک ہوجاتے۔ آنحضرت ﷺ کے نماز کے بارہ میں شدید حساس ہونے اور نماز کی اہمیت وعظمت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ مرض الوفات میں جبکہ نقاہت کے باعث آپ کی آواز جواب دے رہی تھی اور چند لمحوں بعد آپ واصل بحق ہونے والے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت ﷺ کے لب مبارک جنبش کرتے ہوئے دیکھے تو میں نے لبوں سے کان لگادیئے۔ آپ فرمارہے تھے: اَلصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ (لوگو! نماز کی پابندی کرنا اور زیر دستوں سے حسن سلوک سے پیش آنا)۔ جس تحفہ کو عالمِ لامکاں سے شب معراج آپ اپنے رب سے لے کر آئے تھے، دنیا سے دم واپسیں اسی کی یاد دہانی فرمارہے تھے۔ مسلمان معاشرے میں اسی تاکید واہتمام کا اثر تھا کہ عالَم اسلام پر غیر ملکی استعمار کے مکروہ سایہ پڑنے تک مسلمانوں میں ہر طرح کا عیب تلاش کیا جاسکتا ہے مگر بے نماز ہونا یعنی ترک نماز، یہ برائی مسلمانوں میں کبھی نہ تھی کیونکہ مسلمان خوب جانتے تھے کہ اسلام اور پروردگار سے ہمارے تعلق کا یہ آخری ٹانکہ ہے اگر یہ بھی ٹوٹ گیا تو پھر رسمی تعلق تو شاید باقی رہ جائے حقیقی تعلق باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی اجتماعیت کے تحفظ کے لیے غلط کار اور بدعمل

Marfat.com

حکمرانوں کو بھی آخر حد تک زیادہ سے زیادہ برداشت کرنے کا حکم دیا مگر اس برداشت کی آخری حد یہ بیان فرمائی کہ جب تک وہ تمھیں اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتے رہیں یعنی اس کے بعد انھیں برداشت کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ قرآنِ حکیم نے گزشتہ قوموں کے حوالے سے ان کی جس آخری برائی اور گمراہی کو بیان فرمایا ہے جس کے بعد وہ ہلاکت سے نہ بچ سکے۔ وہ یہی نماز کا ضائع کردینے کی حالت ہے ارشاد پاک ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوْا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوْا الشَّهَوٰاتِ
(پھر ان کے بعد ایسے ناخلف آئے جنھوں نے نماز کو ضائع کردیا اور شہوات کے پیروکار ہو گئے)۔

پھر اللہ کا قانون حرکت میں آیا اور نامرادی و خسران اور تباہی و بربادی ان کا مقدر بن گئی۔ واحسرتا! آج امت مسلمہ اپنی اس متاعِ بے بہا کو گم کرچکی بالخصوص اس کا طبقۂ خواص اس کی اہمیت، افادیت اور عظمت کو بالکل بھلا چکا ہے۔

Marfat.com

9- انفاقِ رزق، وحیِ الٰہی اور آخرت پر یقین

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
وَمِمَّا رَزَقْنَا ھُمْ یُنْفِقُوْنَ O وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَۃِ ھُمْ یُوْقِنُوْنَ O

"اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو اس پر ایمان لاتے ہیں جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ آپ سے پہلے نازل کیا گیا ہے اور آخرت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔"

دوسری صفت جو متقین میں پیدا ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ نمازی ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کے بندوں پر خرچ کرنے میں بھی بہت فیاض ہوتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ایک مسلمان پر جس طرح یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اللہ سے تعلق کو درست رکھے اور اللہ کے حقوق ادا کرے۔ اسی طرح اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وہ اللہ کے بندوں سے محبت کرے اور ان کے جو حقوق اس پر عائد ہوتے ہیں انھیں ادا کرے۔ اس جملے کے الفاظ پر اگر غور کریں۔ تو کئی حقیقتیں منکشف ہوتی ہیں۔

۱۔ یہاں کسی چیز کا نام نہیں لیا گیا بلکہ یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے جو کچھ انھیں عطا کیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ یعنی ہم نے اگر انھیں مال عطا کیا ہے تو وہ مال خرچ کرتے ہیں اور اگر علم عطا کیا ہے، تو جاہلوں میں علم لٹاتے ہیں۔ اگر انھیں طلاقتِ لسانی سے نوازا ہے تو وہ تبلیغ ودعوت کا فرض انجام دیتے اور لوگوں کو راہ راست دکھاتے ہیں اور اگر انھیں عہدہ ومنصب دیا گیا ہے تو وہ غریبوں، بے کسوں اور بے سہارا لوگوں کے کام آتے ہیں۔ جنھیں جسمانی طاقت سے مضبوط بنایا گیا ہے وہ جسمانی طور پر کمزور لوگوں کی مدد کر کے اور ان کا سہارا بن کے اپنی اس طاقت کو صرف کر رہے ہیں۔ غرضیکہ رزق کا معنی چونکہ حصہ اور نصیب ہوتا ہے

Marfat.com

جو ہر نعمت پر بولا جاتا ہے اس لحاظ سے اس لفظ میں بڑی وسعت ہے۔

۲۔ یہاں یُنْفِقُوْنَ کے لفظ کو بھی عام رکھا گیا ہے۔ جو صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ دونوں کو شامل ہے۔ کہ وہ صرف صدقات واجبہ ہی ادا نہیں کرتے یعنی صرف زکوٰۃ، صدقۂ فطر یا نذر وغیرہ ادا کر کے مطمئن نہیں ہو جاتے بلکہ وہ اللہ کی راہ میں ہر ضرورت کے وقت اپنا مال بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔ کوئی بھی انفرادی ضرورت ہو یا اجتماعی ضرورت وہ صرف زکوٰۃ ادا کر کے فارغ نہیں ہو جاتے بلکہ اپنی وسعت کے مطابق ہر ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس میں ان کی فیاضی اور سخاوت کا یہ عالم ہے کہ بعض دفعہ اپنا پیٹ کاٹ کر بھی اور خود بھوکے رہ کر بھی دوسروں پر خرچ کر کے خوش ہوتے ہیں۔ اسی کی تعریف کرتے ہوئے پروردگار نے قرآنِ کریم میں فرمایا: یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ کَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں وہ خود اگرچہ بھوک سے ہوں''۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ ان کے پاس دولت کی فراوانی ہو تو وہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی طرح سینکڑوں مجاہدین کو مسلح کر دیں بلکہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا شوق انھیں یہاں تک کھینچ لاتا ہے کہ جنگ تبوک کے موقع پر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چندے کی اپیل فرمائی تو مسجد میں ڈھیر لگ گیا لیکن شام کے وقت ایک صاحب آئے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں چھوہاروں کی ایک پوٹلی پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول فرماتے ہوئے حکم دیا کہ ان چھوہاروں کو اس ڈھیر پر بکھیر دیا جائے کیونکہ وہ چھوہارے لانے والے کی دن بھر کی مزدوری تھی جو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر کسی دینے والے کے اخلاص میں کمی بھی ہو گی تو ان چھوہاروں کی برکت سے اللہ تعالیٰ سب کے عطیات کو قبول فرما لیں گے۔

۳۔ اس جملے میں چونکہ یہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے وہ اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی آدمی اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے تو وہ درحقیقت اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ یہ میں جو کچھ دے رہا ہوں۔ یہ مال میرا نہیں بلکہ اللہ ہی نے مجھے عطا کیا تھا اور میں نے اسی مال میں سے اللہ کے بندوں پر خرچ کیا ہے۔ یہ اعتراف ایک بہت بڑی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ ایک متمول آدمی میں خرابی اس وقت پیدا ہوتی ہے اور بخل کو اس وقت اس کے دل میں جگہ بنانے کا موقع ملتا ہے جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ مال میرا ہے اور میں نے اپنی صلاحیت سے کمایا ہے۔ اس لیے اب اسے خرچ کرنا جہاں چاہے

Marfat.com

خرچ کرنا اور جتنا چاہے خرچ کرنا مجھے بجا طور پر اس کا حق ہے کیونکہ میں بہر صورت اس مال کا مالک ہوں۔ ایسے شخص کو مالی بدعنوانی سے اور مال کو فسق و فجور کا ذریعہ بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔اسے روکنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اس کے ذہن میں یہ احساس پیدا کر دیا جائے کہ یہ مال تیری ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی دَین اور اس کی امانت ہے۔اس لیے اگر تم نے اس کے احکام سے ہٹ کر اس میں تصرف کیا تو تم خیانت کا ارتکاب کرو گے اور قیامت کے دن تم سے اس کی باز پرس ہوگی۔

۴۔ عبارت کے اس اسلوب سے انفاق کرنے والے کے لیے انفاق سہل ہو جاتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے ڈھیروں دیا ہے لیکن اس میں سے کچھ خرچ کرنے کا حکم دیا ہے وہ اس مال کا مالک ہے وہ اگر چاہتا تو یہ بھی حکم دے سکتا تھا کہ اپنی ضرورتوں کے لیے معمولی سا رکھ کر سارا میرے راستے میں خرچ کر دو یہ اس کا کرم ہے کہ اس میں سے صرف اڑھائی روپے مجھے خرچ کرنے کا حکم دیا ہے اور باقی میں مجھے اختیار دے دیا ہے۔تو جب آدمی اپنے اختیار سے خرچ کرتا ہے تو ایسا خرچ اور انفاق اس کے لیے بوجھ نہیں بنتا۔اگر وہ صحیح جذبے سے خرچ کرے تو وہ زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے بھی شرمندگی محسوس کرتا ہے کہ مجھ سے کچھ بھی نہ ہو سکا کیونکہ اگر میں سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو تب بھی یہ اسی کا دیا ہوا تھا اسی کو لوٹا دیتا۔یہ کون سے کمال کی بات ہے۔

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

قرآنِ کریم نے جس طرح اقامتِ صلوٰۃ کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ٹھہرایا ہے اسی طرح انفاق فی سبیل اللہ میں سے کم از کم زکوٰۃ کی ادائیگی کو اسلامی حکومت کی ذمہ داری بنایا ہے۔ایک وجہ تو ظاہر ہے کہ نماز کی طرح زکوٰۃ بھی ارکان دین میں سے ہے۔قرآنِ کریم میں تقریباً اسی (۸۰) جگہ نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو جاتا ہے کہ خلافت راشدہ میں جب کچھ قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے بالاجماع ان کے خلاف قتال کیا حالانکہ قتال غیر مسلموں کے خلاف ہوتا ہے۔وہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے تھے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے انھوں نے زکوٰۃ سے انکار کو اسلام کے انکار کے مترادف قرار دیا۔ اس کی دوسری وجہ یہ ہے (میں اس

Marfat.com

سے پہلے عرض کر چکا ہوں) کہ دین کے دو ہی مقاصد ہیں ایک اللہ سے تعلق کو درست کرنا اور دوسرا بندوں کا بندوں سے تعلق درست کرنا۔ یہ دو باتیں اگر مکمل ہو جائیں تو دین مکمل ہو جاتا ہے۔ پہلا مقصد نماز سے پورا ہوتا ہے اور باقی سارے اصلاحی احکام اسی کی شاخیں ہیں اور دوسرا مقصد انفاق فی سبیل اللہ سے پورا ہوتا ہے۔ جب اس کا تعلق بندوں سے ٹھیک نہج پر قائم ہو گیا تو اب اس کے لیے بندوں کے حقوق ادا کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا۔ یہ تعلق کی اصلاح انسانوں کے باہمی تعلقات کی اصلاح کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیا جائے تو اس صفت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ بات یہ ہے کہ اللہ سے اور بندوں سے تعلق میں جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اس کے متعدد اسباب ہیں۔ لیکن ان میں سے ایک اہم تر سبب انسانوں کی باہمی اقتصادی مشکلات ہیں۔ جب ایک معاشرے میں اقتصادی استواری کی بجائے اقتصادی ناہمواری پیدا ہوتی ہے اور غریب قُوت لایموت کے لیے پریشان ہوتا ہے۔ بنیادی انسانی ضرورتیں بھی انسانوں کو میسر نہیں آتیں تو اخلاقی قدریں بھی ٹوٹنے لگتی ہیں اور جرائم کو بھی کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ اس لیے اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ مسلمانوں کی بنیادی ضرورتوں کی کفیل ہو۔ اس کے لیے اسلام نے جس طرح زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیا ہے اور تمام ایسے راستوں کو بند کر دیا ہے جس سے اسراف، تبذیر، تعیش، فسق و فجور، قمار، ارتکازِ زر اور سود جیسے جرائم پرورش پاتے ہیں۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے ایک ایسا مزاج تیار کرتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے میں کوئی شخص نہ محرومیوں کا شکار ہوتا ہے اور نہ بنیادی ضرورتوں سے تہی دامن رہتا ہے۔ وہ ہر مال دار کے ذہن میں یہ بات پیوست کر دیتا ہے کہ تمھارے پاس دولت امانت ہے اور تہی دست تمھاری دولت میں شریک اور حصہ دار ہے۔ اگر تم نے اس کی ضرورت دیکھ کر بھی اس کا حصہ ادا نہ کیا تو تم اس امانت میں خیانت کرو گے۔ اقبال نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے:

کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمیں

Marfat.com

اس تعلیم وتربیت کا نتیجہ تھا کہ قرون اولیٰ میں ہر کھاتا پیتا شخص فجر کی نماز کے بعد گھر کی چھت پر چڑھ کر بلند آواز سے پوچھتا تھا کہ رات کو کسی گھر میں کوئی یتیم یا مسکین بھوکا تو نہیں سویا۔ اگر ایسا ہے تو فوراً اس کی خبر لو، ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں اللہ کا عذاب نہ نازل ہو جائے۔ محتاج امرا کو نہیں، بلکہ امرا محتاجوں کو ڈھونڈتے تھے اور ڈرتے تھے کہ ان کی احتیاج اللہ کی ناراضگی کا سبب نہ بن جائے۔ وہ زمانہ تو خیر و برکت کا زمانہ تھا۔ ہماری قریبی تاریخ میں پاکستان بننے سے چند سال پہلے کا واقعہ ہے۔ جس نے ایک بڑی شخصیت کو بدلنے میں مدد دی۔ معروف شخصیت علامہ اسد جو ایک یہودی نو مسلم تھے۔ اصل نام ان کا لیو پولڈ تھا۔ جرمنی کے رہنے والے تھے۔ جن دنوں وہ اسلام اور مسلمانوں کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دمشق کے سفر میں میں ٹرین میں سوار تھا کہ دوپہر کو جب کھانے کا وقت ہوا، تو ٹرین کے مسافروں میں حسب طاقت لوگوں نے کینٹین سے کھانا منگوایا یا اپنے اپنے توشہ دان کھولے۔ لیکن دو عرب مسافروں کو میں نے دیکھا، وہ آمنے سامنے بیٹھے تھے اور دونوں ایک دوسرے سے نا آشنا تھے۔ ایک نے اپنے تھیلے سے ایک تنور کی پکی ہوئی روٹی نکالی، جس کے ساتھ کوئی سالن وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے بغیر پوچھے اس کے دو حصے کیے، ایک حصہ اپنے پاس رکھا اور دوسرا سامنے کے مسافر کی طرف بڑھا دیا۔ اس مسافر نے لینے میں تامل کیا، لیکن اس مسافر کے اصرار پر دونوں نے ایک روٹی سے اپنا پیٹ بھر لیا۔ انفاق کا یہی جذبہ تھا، جس نے مسلمانوں میں بے سروسامانی کے باوجود، بنیادی ضرورتوں کا مسئلہ حل کر دیا تھا۔ ہم جیسے جیسے اس جذبے سے تہی دامن ہوتے گئے ویسے ویسے مسائل کا شکار ہوتے گئے۔ آج بھی قرآنِ کریم خود سے استفادہ کرنے والوں کو توجہ دلا رہا ہے کہ آج بھی اگر تم اپنے بنیادی مسائل حل کرنا چاہتے ہو، تو حصول معاش کی ضرورتوں کے ساتھ ساتھ یہ جذبہ اپنے اندر پیدا کرو کہ صاحبِ وسائل، اپنے وسائل میں دوسروں کو شریک کریں، تو بے وسیلہ لوگوں کو خود بخود ایک ریلیف میسر آئے گا۔ جس سے بنیادی ضرورت بھی پوری ہوگی اور باہمی محبت بھی پروان چڑھے گی۔ صرف وسائل کی فراہمی، اندر کی تربیت کے بغیر، معاشرے میں تفاوت میں تو اضافہ کر سکتی ہے، لیکن غریب کی غربت کا علاج نہیں کر سکتی۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ﴾

”(یہ کتاب ہدایت ہے) ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں، اس چیز پر جو تم پر اتاری گئی ہے اور جو تم سے پہلے اتاری گئی ہے۔“

Marfat.com

قرآنِ کریم کی ہدایت کے نتیجے میں متقین میں جو صفات پیدا ہوتی ہیں۔ ان میں سے یہ چوتھی صفت ہے۔ پہلی صفت تھی ''ایمان بالغیب''، دوسری صفت تھی ''اقامت صلوٰۃ'' یعنی عبادت اور تیسری صفت تھی ''انفاق فی سبیل اللہ'' یعنی صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ کا ادا کرنا۔ اب یہ چوتھی صفت بیان ہو رہی ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ ﷺ کی طرف نازل کی گئی ہے اور جو آپ سے پہلے نازل کی گئی ہے۔

آنحضرت ﷺ سے پہلے کم و بیش تین سو تیرہ یا تین سو چودہ رسول آئے۔ رسول وہ ہوتا ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نئی کتاب یا نیا صحیفہ نازل فرماتا ہے۔ جس کے ذریعے وہ نئی شریعت یا حکمتِ شریعت عطا فرماتا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے نزول سے پہلے تین سو تیرہ یا تین سو چودہ کتابیں یا صحیفے نازل ہو چکے تھے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کے فیض سے ایک مومن میں جو ذہن اور ذوق تیار ہوتا ہے، اس میں یہ بات پیوست ہوتی ہے کہ مجھے ہر صورت میں اللہ تعالیٰ کی رہنمائی کو قبول کرنا ہے اور اس پر ایمان لانا ہے۔ وہ جب بھی نازل ہو اور جہاں بھی نازل ہو چونکہ ایک ہی سرچشمۂ ہدایت سے وہ نکلنے والی تعلیم ہے، میں اس پر ایمان لاؤں گا۔ اس لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ جو کچھ حضور پر نازل کیا گیا ہے، قرآن سے استفادہ کرنے والے اس پر بھی ایمان لاتے ہیں اور جو کتابیں آپ ﷺ سے پہلے نازل ہو چکی ہیں، انھیں بھی وہ اللہ کی کتابیں تسلیم کرتے ہیں۔ اگر مزید تدبر سے کام لیں، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں چند باتوں کی طرف رہنمائی فرمائی گئی ہے۔

۱۔ انسان اگرچہ حواس اور عقل کی دولت رکھتا ہے اور وہ عقل کی مدد سے وہ کچھ جان لیتا ہے اور وہاں تک اس کی رسائی ہو جاتی ہے، جہاں کسی اور مخلوق کا تصور بھی نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن اپنے دل و دماغ کی تمام تر قوت کے باوجود وہ اس قابل نہیں ہے، کہ وہ یہ جان سکے کہ میرا خالق و مالک کن باتوں میں راضی ہوتا ہے اور کن باتوں میں ناراض۔ اسے زندگی گزارنے کے لیے ایسا نظامِ فکر اور نظامِ عمل درکار ہے جو اس کی دنیا و عقبیٰ کی کامیابی کا ضامن ہو، ظاہر ہے کہ جو عقل کے بل بوتے پر تجویز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ عقل اپنی تمام تر خوبیوں اور رعنائیوں کے باوجود، زندگی کے ہر معاملے میں رہنمائی دینے کے قابل نہیں۔ اس کا دائرۂ فکر محسوسات اور معقولات کی دنیا تک محدود ہے اور انسانی زندگی کا تعلق چونکہ مابعد الطبیعات سے بھی ہے اور اس کی روحانی زندگی کے ڈانڈے چونکہ عالم الٰہیات اور عالم غیب سے بھی علاقہ رکھتے ہیں۔

Marfat.com

اس لیے صرف عقل کی مدد سے ان ضرورتوں کو پورا نہیں کیا جاسکتا۔ مزید براں یہ کہ زندگی کے اجتماعی معاملات میں، چونکہ انسانی عقلوں میں بہت تفاوت ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی کہ عقل جذبات، خواہشات اور مفادات کی ہوس سے عموماً مغلوب و مقہور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اخلاقی دنیا میں اور انسان کی اجتماعی اقدار میں، عقل سے رہنمائی لینا، نہ قابل عمل ہے اور نہ خطرے سے خالی ہے۔ لیکن جو آدمی یا جو معاشرہ، اس بات پر یقین رکھتا ہو کہ مجھے وحیِ الٰہی کی رہنمائی کی کوئی ضرورت نہیں ہے، بلکہ میری رہنمائی کے لیے میری عقل کفایت کرتی ہے اور یا وہ یہ سمجھتا ہو کہ انسان از خود ترقی کر کے براہ راست اللہ سے رہنمائی حاصل کرسکتا ہے۔ تو اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ایسے شخص کے لیے قرآنِ کریم میں کوئی ہدایت نہیں۔

۲۔ جو آدمی وحیِ الٰہی کی راہنمائی کی ضرورت کا قائل تو ہو، لیکن قومی تعصب کا شکار ہو کر یہ سمجھے کہ میں تو اس وحیِ الٰہی کو تسلیم کروں گا، جو اس ذاتِ گرامی پر نازل ہوئی تھی، جسے میں اپنا رسول سمجھتا ہوں اور اس کے علاوہ اگر یہ وحی کسی اور پر نازل ہوتی ہے، تو میں اسے قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ جس طرح اہل کتاب آسمانی رہنمائی کو تسلیم کرتے تھے۔ یہود تورات کو مانتے تھے اور عیسائی انجیل کو۔ لیکن جب انھیں قرآنِ کریم پر ایمان لانے کے لیے کہا جاتا، کہ تم جانتے ہو کہ یہ بھی اللہ کی کتاب ہے اور اس کی صداقت کی گواہی تمھاری کتابوں میں موجود ہے۔ تو وہ صاف کہتے کہ ہم تو صرف اس کتاب کو مانتے ہیں، جسے ہم پر نازل کیا گیا تھا۔ اس لیے ہم اس کے علاوہ کسی اور رسول پر اترنے والی کتاب کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان کی اس گمراہی کو ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهٗ﴾

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ایمان لاؤ اس پر جو اللہ نے نازل کیا ہے۔ تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ جو کچھ نازل کیا گیا ہے، اس سے کفر کرتے ہیں۔''

یعنی اصلاً وہ لوگ گروہی تعصب کا شکار ہیں۔ ان کے نزدیک رہنمائی کے لیے اللہ کی طرف سے کتاب کا آنا کافی نہیں، بلکہ اس کتاب کا ان کے اپنے گروہ پر اترنا ضروری ہے۔ یہاں یہ فرمایا جارہا ہے کہ جو لوگ اصل سرچشمۂ ہدایت سے تعلق نہیں رکھتے، بلکہ صرف اپنی

Marfat.com

کتاب کو ماننے کے دعوے دار ہیں، وہ اس قرآنِ کریم کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

۳۔ اس آیت کے الفاظ پر غور کیجیے، یومنون بالقرآن نہیں کہا، بلکہ یُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَیْکَ فرمایا گیا ہے۔ یعنی قرآنِ کریم سے استفادہ کرنے والے وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ اگر یہاں قرآن کریم کا نام لیا جاتا، تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔ لیکن فرمایا یہ جا رہا ہے کہ وہ ہر اس چیز پر ایمان رکھتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح وہ قرآنِ کریم پر ایمان رکھتے ہیں، کیونکہ وہ آپ ﷺ پر اللہ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ اسی طرح وہ حدیث اور سنت پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ اس کا مفہوم و معنی بھی آپ ﷺ پر نازل کیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کے الفاظ اور معنی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں۔ لیکن حدیث کا معنی اور مفہوم اللہ کی جانب سے نازل ہوتا رہا ہے، لیکن اس کے الفاظ حضور ﷺ کے اپنے ہیں۔ چنانچہ یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے، کہ وہ لوگ صرف قرآن پاک پر ایمان لانے کو کافی نہیں سمجھتے، بلکہ قرآن پاک کی عملی تشریح اور اس کے مبہمات کی وضاحت اور اس کے مجملات کی تفصیل جو حدیث کی شکل میں ہے، اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ حدیث کو نظر انداز کر کے نہ قرآنِ پاک کو سمجھنا ممکن ہے اور نہ اس پر عمل کرنا۔ اور جو شخص حدیث کا انکار کرتا ہے اور صرف قرآنِ پاک کو کافی سمجھتا ہے، وہ قرآنِ پاک کی ہدایت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔

ختم نبوت کی طرف اشارہ

۴۔ آیت کے اس حصے میں آنحضرت ﷺ کی ختم نبوت کی طرف بھی اشارہ ہے کیونکہ اس آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ متقی وہ لوگ ہیں، جو ہر اس چیز پر ایمان لاتے ہیں، جو آپ ﷺ پر نازل کی گئی ہے اور جو آپ ﷺ سے پہلے نازل کی گئی ہے۔ حالانکہ جو کتابیں پہلے نازل ہوئی ہیں، وہ اپنا زمانہ گزار چکی ہیں۔ تحریف اور ترمیم کا شکار ہو کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھی ہیں۔ ان میں بیان کردہ اللہ کی شریعت کے متعدد احکام مٹا دیے گئے یا بدل دیے گئے، اس لیے قرآنِ کریم کے آنے کے بعد وہ منسوخ ہو گئیں۔ اب اگر کوئی شخص ان پر ایمان نہیں لاتا تو بظاہر قرآن پر ایمان لانے کے بعد، شرعی زندگی میں کوئی نقص واقع نہیں ہوتا اور اللہ کی عطا کردہ رہنمائی میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوتی کیونکہ قرآنِ کریم کی رہنمائی اپنے

Marfat.com

وقت نزول سے لے کر قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے کافی وشافی ہے۔ بااین ہمہ قرآنِ کریم ان پر ایمان لانے کو لازمی قرار دیتا ہے، کیونکہ آج اگرچہ ان پر عمل کی ضرورت نہیں، کیونکہ وہ قابل عمل نہیں رہیں۔لیکن ان پر ایمان لانا بہر حال ضروری ہے، کیونکہ وہ بہرصورت اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں۔ان پر ایمان نہ لانے کا مطلب اللہ پر ایمان نہ لانے کے مترادف ہے۔اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کتاب کسی دور میں بھی نازل ہو، اس پر ایمان لانا اس لیے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لانا اللہ پر ایمان لانے کو مستلزم ہے اور اس کو نہ ماننے کا مطلب اللہ کا انکار کرنا ہے۔اگر یہ بات سمجھ لی جائے، تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ اگر آنحضرت ﷺ کے بعد بھی اگر کسی رسول کو آنا ہوتا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآنِ کریم اس کا ذکر نہ کرتا۔ کیونکہ جب سابقہ رسول اور کتابیں، جن پر ایمان لانا یا نہ لانا عملی طور پر برابر ہے۔ان کا ذکر پورے اہتمام سے کیا جارہا ہے، تو آئندہ آنے والے رسول اور اس پر اترنے والی کتاب کا تذکرہ یقیناً بے حد اہمیت کا حامل تھا کیونکہ آئندہ آنے والی نسلوں کا ایمان وعمل اسی سے وابستہ تھا اور ان کی دنیوی اور اخروی کامیابیوں کا دارومدار یقیناً اسی پر تھا۔لیکن پورا قرآنِ کریم پڑھ جائیے، آپ کو بیسیوں جگہ قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ سابقہ کتب اور سابقہ پیغمبروں پر ایمان لانے کا ذکر ملے گا۔لیکن کہیں بھی آپ یہ نہیں دیکھیں گے کہ کسی آنے والے پیغمبر اور اس پر نازل ہونے والی کتاب پر ایمان کا ذکر کیا گیا ہو۔اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ جس طرح سابقہ آسمانی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے آنے کی خبر دی گئی، اگر آپ ﷺ کے بعد بھی کسی کو آنا ہوتا، تو یقیناً قرآنِ کریم اس کی بھی خبر دیتا اور اس پر ایمان لانے کو لازم ٹھہراتا اور اس آیت کریمہ میں وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ کے بعد ومایٔنزل بعدک کا لفظ ہوتا۔

﴿وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ﴾

''اور وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔''

اختصار کے ساتھ چند باتیں پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ غیب میں آخرت بھی شامل ہے۔ جو آدمی غیب پر ایمان رکھتا ہے، وہ یقیناً آخرت کو بھی مانتا ہے۔لیکن اس کا مستقلاً الگ ذکر، یہ معنی رکھتا ہے کہ قرآنِ کریم جو انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اور انسانی زندگی میں جس تبدیلی کا داعی ہے، اس کے لیے آخرت پر یقین بے حد

Marfat.com

ضروری ہے۔ اللہ، اس کے رسول ﷺ اور قرآن کو ماننا یقیناً ہدایت کی بنیاد ہے۔ لیکن جب تک آخرت کی فکر دل ودماغ میں راسخ نہیں ہوتی، اس وقت تک اللہ کی ذات وصفات کا صحیح استحضار اور قرآنِ کریم سے صحیح استفادہ اور ذات رسالت مآب ﷺ سے صحیح وابستگی پیدا نہیں ہوتی۔

۲۔ آخرت کا معنی تو ہے دوسری زندگی۔ جو قیامت کے بعد جن وانس کو ملے گی، لیکن اس کا اطلاق چند عقائد وحقائق پر ہے۔ ان میں سے ہر ایک پر یقین آخرت کے یقین کو مکمل کرتا ہے۔

1۔ ان میں سے سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں میں یہ تصور پیدا کرتا ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے غیر ذمہ دار نہیں بنایا۔ وہ کوئی خود کاشتہ پودا نہیں، جو یونہی مَل دَل کے ختم ہوجائے اور نہ وہ شتر بے مہار ہے جو جدھر منہ اٹھائے چلتا پھرے۔ بلکہ اس کی زندگی کا ایک مقصد ہے اور اس مقصد کے مطابق زندگی گزارنے کا اسے پابند بنایا گیا ہے۔ قیامت کے دن جسے آخرت کہا گیا ہے، اس سے اس مقصد کے حوالے سے باز پرس ہوگی۔ مختصر یہ کہ باز پرس کا یقین رکھنا اور اس کے لیے ایک دن کے آنے کا یقین رکھنا یہ آخرت کا پہلا تصور ہے۔

2۔ دوسری بات یہ کہ دنیا کا موجودہ نظام اور دنیا کی یہ زندگی دائمی اور ابدی نہیں۔ ایک وقت ایسا آئیگا جب یہ پورا کارخانہ تباہ ہوجائے گا۔ زمین پھٹ جائے گی آسمان ٹوٹ پھوٹ جائیں گے پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے پھریں گے۔ ہر طرف تباہی اور موت کی حکومت ہوگی۔

3۔ تیسری بات یہ کہ جس طرح دنیا کو موت کا شکار ہونا ہے اور اس زندگی کو ہمیشہ باقی نہیں رہنا، اسی طرح یہ تباہی اور بربادی بھی ہمیشہ نہیں رہے گی اس دنیا کے خاتمے کے ایک عرصہ بعد اللہ تعالیٰ ایک دوسرا عالم بنائے گا اور اس میں تمام نوع انسانی کو جو ابتداءِ آفرینش سے لے کر قیامت تک زمین پر پیدا ہوئی تھی، بیک وقت دوبارہ اٹھا کھڑا کرے گا اور پھر انھیں میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ جہاں سب کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر ایک کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔

4۔ چوتھی بات یہ کہ جو لوگ اللہ کے فیصلے کے نتیجے میں نیک قرار پائیں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور جو لوگ اپنی بداعمالیوں کے باعث بد ثابت ہوں گے، وہ جہنم کی نذر کردیے جائیں گے۔

Marfat.com

5- پانچویں یہ بات کہ قیامت کے دن کامیابی اور ناکامی کا دارومدار ایمان وعمل پر ہوگا۔ جس نے زندگی اللہ کے احکام کے مطابق گزاری ہوگی، وہ کامیاب ٹھہرے گا۔ کیونکہ کامیابی اور ناکامی کا دارومدار موجودہ زندگی کی خوشحالی یا بدحالی پر نہیں، بلکہ حقیقی کامیاب وہ ہے، جو آخرت میں جہنم سے بچالیا گیا اور جنت میں داخل کردیا گیا۔ دنیا میں اگر کسی نے کبھی خوشی نہیں دیکھی اور ساری زندگی دکھوں میں گزاری۔ لیکن اس کی پوری زندگی پر ایمان وعمل کی حکمرانی رہی اور اس نے ہمیشہ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کی، تو اس کی دنیا کی محرومیاں آخرت میں اس کے لیے توشہ ثابت ہوں گی۔ لیکن جس نے دنیا میں عیش وعشرت میں زندگی گذاری، اس کا یہ عیش وعشرت قیامت میں اس کے لیے حسرت کا سامان بن جائے گا۔

یہ چند عقائد اور حقائق ہیں جن پر یقین رکھنے کو ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔

یہاں غور فرمایے کہ آخرت کے ساتھ ''ایمان'' کے لفظ کی بجائے ''ایقان'' کا لفظ آیا ہے یہ نہیں کہا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں) بلکہ فرمایا وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (وہ آخرت پر یقین رکھتے ہیں)۔

ایمان اور ایقان میں فرق

''ایمان'' کے معنی تصدیق کرنے اور مان لینے کے ہیں۔ اس کی ضد کفر وانکار اور تکذیب ہے۔ ''ایقان'' کا معنی یقین کرنے کے ہیں۔ اس کی ضد گمان اور شک ہے۔ جس طرح کسی شے پر یقین رکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی اس پر ایمان بھی رکھتا ہو، اسی طرح کسی چیز پر ایمان رکھنے کے لیے اس پر یقین کرنا شرط نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے کہ آدمی کا ایمان محض گمان غالب پر مبنی ہو اور وہ آہستہ آہستہ گمان کی منزل سے نکل کر یقین کی منزل تک پہنچ جائے اور اس طرح اس کے ایمان کی تکمیل ہوجائے۔ دونوں کی مثالیں قرآنِ کریم اور تاریخ میں موجود ہیں۔ فرعون اور آلِ فرعون کے بارے میں قرآنِ کریم نے ہمیں بتایا کہ ان لوگوں نے مسلسل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر دل سے یقین کرلیا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ لیکن وہ اپنی سرکشی اور ظلم کے باعث ایمان لانے سے محروم رہے۔ ابوجہل کی یہ بات تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے کہ میں محمد (ﷺ) کو جھوٹا نہیں کہتا، میں جانتا ہوں اس

Marfat.com

نے کبھی جھوٹ نہیں بولا ،لیکن میں اس پر ایمان اس لیے نہیں لاسکتا کہ ایمان لانے کے بعد بنی ہاشم کا قبیلہ ہمیشہ کے لیے ہم سے بڑھ جائے گا اور مزید یہ کہ ہمیں جو عزت حاصل ہے، وہ ایمان لانے کے بعد باقی نہیں رہے گی ،کیونکہ اسلام تو ہر طرح کے تفاوت کو ختم کردیتا ہے۔ وہاں تو صرف تقویٰ سے عزت ملتی ہے، خاندانی انتساب سے کچھ نہیں ملتا۔ دور نہ جائیے ،برطانیہ کا مشہور ادیب برناڈ شا، اسلام کو سچا مذہب سمجھتا تھا اور یہ کہتا تھا کہ آج کے دور میں اگر کوئی مذہب چل سکتا ہے، تو وہ صرف اسلام ہے اور اگر کوئی شخصیت آج کے دور کی رہنما ہوسکتی ہے، تو وہ صرف محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلمان نہ ہوا اور ایسا تو بارہا ہوتا ہے کہ آدمی غالب گمان پر کسی چیز کو تسلیم کرلیتا ہے، لیکن پھر تجربے سے اس کا غالب گمان یقین میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یقیناً ایسے لوگ قرنِ اول میں بھی ہوں گے کہ جو جب ایمان لائے تو یقین کی معراج پر نہ تھے۔ بالخصوص فتح مکہ کے موقع پر ایمان لانے والوں میں ایسے لوگوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کا ایمان یقین کی صورت اختیار کرگیا۔ یقین بہرحال انسانی شعور اور انسانی احساسات کی سب سے اعلیٰ منزل ہے۔ اس کے بعد عمل، ایثار اور شہادت کے راستے میں کوئی چیز حائل نہیں ہوتی ،تو آخرت پر ایمان لانے کو اسی یقین کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔ کیونکہ آخرت کا عقیدہ ہی فرد اور قوم دونوں کی زندگیوں میں انقلاب کا سبب بنتا ہے۔ جس آدمی کو یقین آجائے کہ مجھے اپنے ایک ایک عمل اور زندگی کے ایک ایک لمحے کا اللہ کو حساب دینا ہے اور کچھ پتہ نہیں کہ کب اللہ کی طرف سے بلاوا آجائے ،ایسا شخص کبھی گناہ کے قریب بھی نہیں جاسکتا۔

Marfat.com

10- اسلام میں عبادت کا تصور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾

اسلام نے آ کر تمام تصورات کی اصلاح فرمائی اس نے سب سے پہلے اس بات کو واضح کیا کہ عبادت صرف بندگی کے چند مراسم بجالانے کا نام نہیں۔ بلکہ اس نے عبادات کے نام سے بندگی کے جن طریقوں کو اپنے ماننے والوں کے لیے لازم ٹھہرایا ہے اس کے بارے میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ یہ اسلام کی بنیادیں ہیں یہ اسلام کی مکمل عمارت نہیں ہے۔ ان کی حیثیت یہ ہے کہ کوئی آدمی ان سے صرف نظر اور انکار کر کے مسلمان ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا لیکن صرف انہی کو بجالانا مکمل عبادت نہیں ہے۔ کیونکہ صرف بنیادیں بھر دینے سے عمارت وجود میں نہیں آجاتی البتہ یہ ضرور ہے کہ جب بھی عمارت بنے گی انہی بنیادوں پر بنے گی۔ چنانچہ حضور ﷺ کا ارشاد ہے:

بُنِیَ الاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ

''اسلام کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔''

نماز کو عبادت میں سب سے اہم حیثیت حاصل ہے یہاں تک فرمایا گیا کہ نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو نماز نہیں پڑھتا وہ مسلمان کہاں وہ تو مشرک ہے۔ اور یہ بھی فرمایا گیا کہ قیامت کے دن جس عمل کے بارے میں سب سے پہلا سوال ہوگا وہ نماز ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم قرآن کریم میں دیکھتے ہیں کہ صاف طور پر فرمایا گیا:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ﴾ (طٰہٰ ۲۰:۱۴)

''نماز میری یاد کے لیے قائم کرو۔''

Marfat.com

اس کا مطلب یہ کہ نماز اپنی تمام تر اہمیت کے باوجود اصل مقصود نہیں۔ بلکہ مقصد پوری زندگی میں اللہ کی یاد ہے کہ وہ کسی کام میں بھی دل سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ مزید ارشاد فرمایا:

﴿إِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ﴾ (عنکبوت ۲۹:۴۵)

''نماز تو بے حیائی اور برے کاموں سے روکتی ہے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہاں نماز مثبت حیثیت سے اللہ کی یاد کا ذریعہ ہے وہاں اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ وہ بے حیائی اور منکرات سے روکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نماز آدمی کو بے حیائی اور بری باتوں سے نہیں روکتی تو وہ نماز مقصد نہیں ہے بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ نماز یعنی عبادت ایسی ہونی چاہیے جس کے نتیجے میں پوری زندگی کی فکری اور عملی تطہیر ہو جائے اس لیے اسلام نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ اس نے عبادت کو اللہ اور بندے کے درمیان پرائیویٹ معاملہ کی بجائے اس کو پوری زندگی کا دستور اور وظیفہ ٹھہرایا اور دوسرا تصور اس نے یہ دیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی تمام عظمتوں کے باوجود انسان کے اس قدر قریب ہے کہ شہ رگ بھی انسان کے اس قدر وقریب نہیں۔ یعنی شہ رگِ حیات زندگی کی بقا کی ضامن ہے اس کے کٹ جانے سے زندگی کٹ جاتی ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز انسان کے قریب نہیں ہو سکتی۔ مگر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میں انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہوں اور دوسرا اس نے اپنی کتاب میں بار بار فرمایا کہ میں سمیع ہوں، بصیر ہوں، علیم ہوں، تمھارا کوئی عمل حتیٰ کہ تمھاری کوئی احساس اور خیال بھی میرے علم سے باہر نہیں۔ اور تمھاری کوئی حرکت میری نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ تو جو ذات اس قدر قریب ہے اور اس قدر انسان سے آگاہ ہے اس کے اور بندے کے درمیان کسی اور واسطے کا کیا معنی۔ اس لیے اس نے بار بار ارشاد فرمایا کہ تم مجھ پر ایمان لائے ہو تو پھر مجھی کو پکارو، میں تمھاری ہر پکار کو سنتا ہوں اور اسے قبول کرتا ہوں۔ اس طرح اس نے درمیانی واسطے کا تصور ختم کر دیا مزید اس نے یہ اصلاح فرمائی کہ عبادت کا تعلق چونکہ تمھاری پوری زندگی سے ہے اور تم اپنی زندگی دنیا اور اہل دنیا میں رہ کر گذارو گے اس لیے دنیا اور اہل دنیا سے تعلقات تمھاری عبادت سے کیسے خارج ہو سکتے ہیں اور تم دنیا سے لاتعلق ہو کر عبادت کے تقاضوں کو کیسے پورا کر سکتے ہو۔ اس لیے عبادت یہ نہیں کہ تم دنیا سے ترک تعلق کر کے صرف اللہ کا نام پکارتے رہو بلکہ عبادت یہ ہے کہ دنیا میں رہ کر دنیا کو برت کر اس طرح دکھاؤ کہ نہ تمھارا دل کبھی اللہ کے تصور سے غافل ہو اور نہ

Marfat.com

تمھارا قدم کبھی اس کی عائد کردہ حدود سے باہر نکلے۔ نہ تمھارا ہاتھ کبھی اس کے حکم کو توڑے اور نہ تمھارے دل و دماغ کی قوتیں کبھی اس سے بغاوت کریں۔ جس طرح تم بھوکے رہ کر اس کی بندگی کے پابند ہو اسی طرح پیٹ بھر کر بھی دولت مند ہو کر بھی حتی کہ تخت و تاج کے مالک ہو کر بھی اسی کے بندے ہو اس طرح تمام تصورات کا ابطال فرما کر اور غلط خیالات کو رد کر کے اسلام کا صحیح تصورِ عبادت پیش کیا۔ لیکن اسلام کا کامل تر تصورِ عبادت اس وقت تک سمجھ نہیں آئے گا جب تک کہ عبادت کے معنی اور اس کے مصداق کو اچھی طرح نہ سمجھ لیا جائے۔

عبادت کا مفہوم

عربی زبان میں عبودۃ' عبادت اور عبودیت عَبَدَ سے مصدر ہے۔ اس کے اصل معانی خضوع اور تذلل کے ہیں یعنی تابع ہو جانا' رام ہو جانا۔ کسی کے سامنے اس طرح سپر انداز ہو جانا کہ اس کے مقابلہ میں کوئی مزاحمت یا انحراف و سرتابی نہ ہو اور وہ اپنی منشا کے مطابق جس طرح چاہے خدمت لے۔ اسی اعتبار سے عرب اس اونٹ کو بعیر معبد کہتے ہیں جو سواری کیلیے پوری طرح رام ہو چکا ہو اور اس راستے کو طریق معبد کہتے ہیں جو کثرت سے پامال ہو کر ہموار ہو گیا ہو پھر اسی اثر سے اس مادہ میں غلامی' اطاعت' پوجا' ملازمت اور قید کے مفہومات پیدا ہوئے۔ چنانچہ اسی مادہ عَبَدَ سے بننے والا ایک مشہور لفظ جو عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اکثر مستعمل ہے وہ عبد ہے عبد کا معنی ہے غلام اور یہ اردو اور عربی دونوں میں اسی معنی میں مستعمل ہے اور قرآن کریم نے بھی اس کو اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

﴿اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ﴾ (البقرۃ ۲:۱۷۸)

یہاں دیکھئے کہ حر کے بعد جس کا معنی آزاد ہے لفظ عبد غلام کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہے اسی طرح ایک جگہ غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرنے کا حکم دیا گیا تو فرمایا:

﴿وَاَنْكِحُوا الْاَيَامٰى مِنْكُمْ وَالصّٰلِحِيْنَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَاِمَآئِكُمْ﴾ (النور ۲٤:۳۲)

اس آیت میں دیکھئے لونڈیوں کے ساتھ عباد کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو عبد کی جمع ہے اسی طرح کائنات کی تمام مخلوق کے بارے میں جن میں نمایاں خود حضرتِ انسان ہے ارشاد فرمایا گیا:

Marfat.com

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾(النور ۲۴:۹۳)

یہاں بھی دیکھئے عبد کا لفظ غلام کے معنی میں استعمال ہوا ہے اسی طرح قرآن پاک میں اور بھی کئی مواقع پر آپ کو عبد یا عباد کا لفظ غلام کے معنی میں مستعمل نظر آئے گا۔ اسی طرح عبد کو باب تفعیل میں لے جا کر غلام بنانے کے معنی میں قرآن کریم میں ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حوالے سے بیان کیا گیا:

﴿وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ﴾

(الشعراء ۲۹۔ ۲۲)

یہاں دیکھئے عُبَّدتَّ غلام بنانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ عبد کا معنی ہے غلام اور عبادت، عبودیت، عبد سے مصدر ہے اس کا معنی ہے غلامی۔ یعنی کسی کی بالادستی و برتری تسلیم کر کے اس کے مقابلے میں اپنی آزادی اور خود مختاری سے دستبردار ہو جانا سرتابی اور مزاحمت چھوڑ دینا اور اس کے لیے رام ہو جانا۔ یہی حقیقت بندگی اور غلامی کی ہے۔ لہٰذا اس لفظ سے اولین تصور جو ایک عرب کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ بندگی اور غلامی ہی کا تصور ہے۔ پھر چونکہ غلام کا اصلی کام اپنے آقا کی اطاعت و فرمانبرداری ہے اس لیے لازماً اس کے ساتھ ہی اطاعت کا تصور پیدا ہوتا ہے اور جب غلام اپنے آقا کی بندگی و اطاعت میں محض اپنے آپ کو سپرد ہی نہ کر چکا ہو بلکہ اعتقاداً اس کی برتری کا قائل اور اس کی بزرگی کا معترف بھی ہو اور اس کی مہربانیوں پر شکر و احسان مندی کے جذبہ سے سرشار بھی ہو تو وہ اس کی تعظیم و تکریم میں مبالغہ بھی کرتا ہے۔ مختلف طریقوں سے اعتراف نعمت کا اظہار بھی کرتا ہے اور طرح طرح سے مراسم بندگی بھی بجا لاتا ہے اسی کا نام پرستش ہے۔ اور یہ تصور عبدیت کے مفہوم میں صرف اس وقت شامل ہوتا ہے جبکہ غلام کا محض سر ہی آقا کے سامنے جھکا ہوا نہ ہو بلکہ اس کا دل بھی جھکا ہوا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم میں ان تینوں معنوں میں عبادت کے لفظ کو استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن تینوں حوالوں سے اصل مقصود غلامی ہے اور یہ دونوں تصورات اس سے پھوٹنے والے اجزا ہیں۔ اس لیے اگر غلامی کی حقیقت کو سمجھ لیا جائے تو خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔

Marfat.com

اسلام میں غلامی کا مفہوم

اس غلامی کے حوالے سے قرآن وسنت اور اسلامی تاریخ میں ہمیں دو متضاد تصورات پہلو بہ پہلو سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ پہلا تصور یہ ہے کہ غلامی اسلام کی نگاہ میں انتہائی مکروہ اور ناقابل قبول ہے بلکہ یہ ایک ایسی برائی ہے جس کے تصور کو بھی قبول کرنے سے اسلام انکار کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ پورے قرآن پاک میں ہمیں اس کا کہیں ذکر نہیں ملتا کہ اگر امت غلام بنالی جائے تو پھر اسے زندگی کس طرح گزارنی چاہیے بلکہ ہم پورے قرآن کریم میں ایک آزاد قوم کے تصور حیات کو جا بجا پھیلا ہوا دیکھتے ہیں بلکہ قرآن پاک میں متعدد مرتبہ اس بات کو دھرایا گیا کہ تمھاری زندگی کے مقاصد میں نمایاں ترین مقصد یہ ہے کہ تم طاغوت سے اجتناب کرو۔ چنانچہ جس آیت شریفہ میں انبیا کی دعوت کے حوالے سے عبادت کا ذکر کیا گیا ہے اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا گیا: "واجتنبو الطاغوت"

اور تاریخ اسلامی میں ایسے متعدد واقعات ہمیں ملتے ہیں جن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان جن اصولوں کی بنیاد پر حالات بدلنے کے لیے اٹھے تھے ان میں سب سے بڑی بات انسان کو غیراللہ کی غلامی سے آزاد کرانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ عجم سے جو پہلی بڑی جنگ لڑی گئی ہے وہ جنگ قادسیہ ہے۔ اس میں حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ بھی مسلمانوں کی طرف سے سفیر بن کر رستم کے دربار میں گئے تو رستم نے پوچھا کہ تم کس مقصد کے لیے آئے ہو تو انھوں نے فرمایا تھا کہ ہم اس لیے آئے ہیں تاکہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرائیں۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ غلامی کا تصور اسلام کی نگاہ میں کس قدر ناپسندیدہ اور کس قدر ناقابل قبول ہے لیکن دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ تصور بھی قرآن پاک اور اس کی تعلیمات میں پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے اور جا بجا ہمیں پھیلا ہوا ملتا ہے کہ قرآنی تعلیمات کا حقیقی مقصد انسان کو اللہ کا غلام بنانا ہے اور جو لوگ اللہ کے حکم کی اطاعت اور اس کے راستے میں سرفروشی کی وجہ سے اس کے قرب کا مقام پا لیتے ہیں تو انھیں اس راستے میں جو بڑے سے بڑا اعزاز مل سکتا ہے وہ یہی لفظ عبد ہے جس کا معنی غلام ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم اور اس کی اطاعت سے کبھی سرتابی نہیں کرتے۔ ان کی تعریف کرتے ہوتے پروردگار نے فرمایا: بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ O "وہ معزز غلام ہیں۔" (الانبیآء:۲۱۔۲۶) انبیا کرام کا گروہ انسانیت کا گلِ

Marfat.com

سر سبد ہے۔ان کی تعریف میں جا بجا یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارہ فرمایا گیا: وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ نِعْمَ الْعَبْدُ ط ''کہ ہم نے حضرت داؤد علیہ السلام کو حضرت سلیمان علیہ السلام جیسا بیٹا عطا فرمایا تھا وہ کتنا اچھا غلام تھا۔'' (ص ۳۸:۳۰) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو مقصود کائنات اور سید المرسلین ہیں، ان کا بھی سب سے بڑا اعزاز یہی لفظ عبد ہے۔ معراج شریف کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا گیا: سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَيْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَى (بنی اسرائیل: ۱۷۔۱) ''پاک ہے وہ ذات جو لے گئی اپنے عبد یعنی اپنے غلام کو ایک ہی رات میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک'' یہاں دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد سے یاد کیا گیا حالانکہ حسی معجزات میں سے معراج حضور کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ اس معجزے کے حوالے سے جب حضور کا ذکر کیا جائے گا تو یقیناً اس اعزاز کے ساتھ کیا جائے گا جو اللہ کی نگاہ میں انتہائی قدر و منزلت کا حامل ہو گا۔ مگر ہم یہاں دیکھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو عبد کے لفظ سے یاد کیا جا رہا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عبدیت اللہ کی نگاہ میں ایک انسان کے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔ شائد اسی وجہ سے کلمہ شہادت میں بھی ''اشھدان محمداعبده ورسوله'' فرمایا گیا یعنی میں گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اس کے غلام اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

اب دیکھئے یہ متضاد تصورات کہ ایک طرف غلامی سے نفرت اور دوسری طرف غلامی ہی منزلِ مقصود ہے اس تضاد کو سمجھنے کے لیے ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیے وہ یہ کہ انسان کو جو خصوصیات دے کر پیدا کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے یوں معلوم ہوتا ہے کہ غلامی اور عبدیت انسان کی فطرت ہے وہ اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا۔ وہ ہزار یہ دعویٰ کرے کہ میں ایک آزاد زندگی اختیار کرنا چاہتا ہوں جس میں کوئی پابندی کسی اطاعت اور کسی بندگی کا شائبہ تک نہ ہو مگر عملاً اس کے لیے یہ ممکن نہیں کیونکہ وہ غذا کا محتاج ہے اس احتیاج سے بچ نہیں سکتا وہ آرام کے حصول کا خوگر ہے اس سے بے نیاز نہیں ہو سکتا وہ نہ جانے کتنے ماؤف لمحوں میں کبھی خوف اور کبھی امید کی گرفت میں آجاتا ہے اس سے وہ آزاد نہیں ہو سکتا۔ محبت اور نفرت اس کے ایسے لاحقے ہیں جو اس سے الگ نہیں کیے جا سکتے بڑا بن کر رہنا اور دوسروں پر برتری ظاہر کرنا یہ اس کی وہ اندرونی خواہشیں ہیں کہ جن کی زنجیروں کو وہ توڑ نہیں سکتا۔ ممکن ہے کہ وہ بادشاہت کی غلامی سے بچ جائے وہ کسی نظام کو ماننے سے انکار کر دے۔ وہ برادری کی برتری سے بغاوت کر

Marfat.com

دے۔ لیکن سٹیٹس اور پرسٹیج کی پوجا اور خواہشات کی پیروی سے وہ کبھی آزاد نہیں رہ سکتا۔ یہ غلامی کی کہ وہ چند در چند صورتیں ہیں جس کی کسی نہ کسی صورت میں وہ ضرور مقید رہتا ہے اور یہی وہ قیود ہیں جو اس کی صلاحیتوں کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوتی ہیں وہ جتنا جتنا ان غلامیوں سے آزاد ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی شخصیت میں قوت کے سوتے پھوٹتے جاتے ہیں اور جتنا ان غلامیوں کا شکار ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی صلاحیتیں دھیمی پڑتی جاتی ہیں۔ بقول اقبال:

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

چنانچہ انسانیت کا مستقبل، انسان کی صلاحیتوں اور اس کے آزاد ارادوں کو بروئے کار لانے اور اس کے ولولوں ہمھوں اور اس کی امنگوں کے پھلنے پھولنے میں مضمر ہے اس لیے پروردگار نے ہر قسم کی غلامی کو انسان کے لیے حرام قرار دے دیا۔ لیکن دوسری طرف چونکہ غلامی اس کی فطرت میں داخل ہے جس سے وہ کسی صورت بچ نہیں سکتا اس لیے ایک ایسی غلامی اس کی منزل مقصود بنا دی گئی کہ جس غلامی کو قبول کرنے کے بعد آدمی باقی ساری غلامیوں سے نجات پا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر مخلوق کی غلامیوں سے کسی غلامی کو مشروع قرار دیا جاتا تو پھر مخلوق کی غلامی سے بچنا ممکن نہ ہوتا اس لیے مخلوق کی ہر غلامی سے آزادی کا حکم دیا گیا اور صرف ایک غلامی کا جواز بخشا گیا بلکہ اس کا حکم دیا گیا وہ ہے ہمارے آقا ﷺ اور خالق کی غلامی کیونکہ خالق کی پرستش، اور خالق کی اطاعت اس کی غلامی کے بغیر ممکن نہیں اور پھر یہ وہ غلامی ہے جو باقی تمام غلامیوں سے خلاصی اور نجات کا ذریعہ ہے۔ بقول اقبال:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

یہی وہ غلامی ہے جس سے مخلوق کی ہر طرح کی غلامی کی جڑ کٹ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں آدمی آزادی کے اس تصور کو پا سکتا ہے جس کے سائے میں اس کی صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں خواہشیں صحیح حدود میں محدود رہتیں اور اس کے ولولے پوری طرح بروئے کار آتے ہیں۔ چنانچہ ہم آنحضرت ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب و عجم میں جس بری طرح سے انسان کو بگڑا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اگر حقیقت کو سمجھا جائے تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دور کا انسان پوری طرح اپنی خواہشوں کی گرفت میں تھا۔ وہ صرف اپنے مفادات کے لیے جیتا اور اپنے

Marfat.com

مفادات کے لیے مرتا تھا۔ خواہشات اور مفادات میں اجتماعی تصادم سے اللہ تعالیٰ کی یہ زمین فساد سے بھر گئی تھی اور انسانیت کا مستقبل تاریک ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسے ہی اس پر اللہ کی غلامی کی سحر طلوع ہوئی اس نے رفتہ رفتہ انسان کو اس کی خود عائد کردہ زنجیروں سے آزاد کیا تو وہ انسان تیار رہوا جس کی نظیر نہ اس سے پہلے کبھی چشم فلک نے دیکھی تھی اور نہ آج پوری طرح دکھائی دیتی ہے۔ لیکن صدیوں سے وقت اس کی راہ تک رہا تھا۔ وہ بالآخر صحابہ کی شکل میں نظر آئی۔ بقول اقبال:

طلب جس کی صدیوں سے تھی زندگی کو
وہ سوز اس نے پایا انہی کے جگر میں

اور پھر دعا کرتا ہے کہ:۔

دلِ مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے
وہ بجلی کہ تھی نعرۂ لاتذر میں
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے

اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے کہ اس غلامی کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ ہم نہایت اختصار سے عرض کریں گے کہ غلامی کے اس مفہوم میں چار تصورات داخل ہیں۔

1۔ غلام اسے کہتے ہیں جسے حق ملکیت حاصل نہ ہو اس کے پاس جو کچھ ہے چاہے وہ جسم ہے یا جان، اس کی صلاحیتیں ہیں یا اس کی امنگیں' اس کا مال و دولت ہے یا اس کے تعلقات ان میں سے وہ کسی چیز کا مالک نہیں۔ ان تمام چیزوں کا مالک اس کا وہ آقا ہے جس کا وہ غلام ہے۔

2۔ چونکہ وہ کسی چیز کا مالک نہیں اس لیے وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں اپنے زیرِ تصرف چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ یعنی مجھے آزادانہ تصرف کا حق حاصل ہے کہ جیسے چاہوں اور جہاں چاہوں استعمال کروں۔ اس لیے کہ آزادانہ تصرف کا حق اور من مرضی کا اختیار وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کو حقِ ملکیت حاصل ہو۔ کیونکہ اسی حق سے باقی حقوق پیدا ہوتے ہیں۔

3۔ غلام وہ ہوتا ہے جو اپنی زندگی کا نصب العین اور زندگی کا مقصد از خود متعین

Marfat.com

نہیں کرسکتا، وہ خود یہ فیصلہ کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ مجھے زندگی کس طرح گزارنا ہے۔ میں ایک عالم بن کر زندگی گذاروں یا ایک استاد بن کر۔ مجھے انجینئر بننا ہے یا ایک تاجر بننا ہے۔ میں زندگی اپنے لیے گزاروں یا لوگوں کی خدمت کے لیے صرف کروں۔ ان میں سے اسے کسی بات کا حق نہیں ہوتا' اس کی ان باتوں کا اختیار اس کے آقا کو ہے۔ وہ جو اس کا مقصد زندگی متعین کر دے اسے اسی مقصد کے مطابق زندگی گزارنا ہوگی۔

4۔ اس غلام کا آقا اسے جس حال میں رکھے اسے اس بات کا حق نہیں ہوتا کہ وہ حرفِ شکایت زبان پر لائے وہ ادب اور احترام سے اپنی ضرورتیں اپنے آقا کی خدمت میں پیش کرسکتا ہے بلکہ شائد آقا کو یہ بات اچھی لگے کہ اس کا غلام اس سے مانگے بلکہ مانگتا رہے۔ لیکن اگر وہ اسے دینا پسند نہ کرے یا اس کی مرضی کے مطابق دینا پسند نہ کرے تو اسے یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کے خلاف سوچے، زبان کھولے یا دوسروں سے شکایت کرے۔

تاریخ میں آتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مبارک ایک دن اپنے گھر میں بیٹھے تھے کھڑکیوں کے شیشوں سے انھوں نے گلی میں دیکھا کہ ایک نوجوان بار بار کسی کام کے لیے اس یخ بستہ رات میں آ جا رہا ہے۔ انھوں نے اسے غور سے دیکھا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس نے اکہرا لباس پہن رکھا ہے اور اوپر کوئی گرم چادر تک نہیں بہت حیران ہوئے۔ نہ رہ سکے' اس نوجوان کو اندر طلب کیا پوچھا' صاحبزادے تمھیں سردی نہیں لگتی؟ اس نے عرض کیا' جی لگتی ہے۔ کہا تم نے گرم کپڑے کیوں نہیں پہنے؟ عرض کیا کہ گرم کپڑے میرے پاس نہیں ہیں۔ فرمایا تم کون ہو؟ عرض کیا کہ میں غلام ہوں۔ پوچھا تم نے اپنے آقا سے گرم کپڑے نہ ہونے کی شکایت نہیں کی۔ اس نے حیران ہو کر حضرت عبداللہ ابن مبارک کی طرف دیکھا اور ادب سے عرض کیا کہ حضرت میں غلام ہوں میرے آقا جانتے ہیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہیں ہیں۔ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ سردیوں کا موسم ہے۔ اور رات بہت ٹھنڈی ہے اس کے باوجود وہ باہر مجھے کام کے لیے اس حالت مین بھیج رہے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مجھے اسی حال میں دیکھ کر خوش ہیں۔ اب میری غلامی کا یہ تقاضا ہے کہ جس حال میں میرا آقا خوش رہے میں اس کی خوشی میں خوش رہوں اور اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر نہ لاؤں کیونکہ اگر میں نے ایسا کیا تو یہ میری غلامی کے آداب کے خلاف ہوگا۔ یہ جواب سن کر حضرت عبداللہ ابن مبارک پھڑک اٹھے۔ فرمایا نوجوان تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور آج مجھے معلوم ہوا کہ غلامی کا

Marfat.com

حقیقی مفہوم کیا ہے؟ حیرت ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زیادہ پڑھے لکھے لوگ نہیں تھے لیکن آنحضرت ﷺ کی صحبت نے ان میں وہ چیزیں پیدا کر دی تھیں کہ برس ہا برس کے مطالعہ کے بعد بھی آدمی بصد مشکل سمجھ پاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ایک صاحب کو مغرب کی نماز پڑھ کر سلام پھیرتے ہی فوراً مسجد سے نکلتے دیکھا تو آپ کو حیرت ہوئی۔ دوسرے تیسرے چوتھے روز بھی آپ نے اسی طرح اسے نکلتے دیکھا تو آپ نے آواز دے کر اسے بلایا اور پوچھا کہ بھئی تم نماز کے فوراً بعد کیوں چلے جاتے ہو؟ اس نے عرض کی کہ حضور کوئی اور پوچھتا تو میں کبھی نہ بتاتا لیکن آپ سے کیسے چھپاؤں؟ بات یہ ہے کہ یہ جو میں اپنے اوپر چادر لے کر آیا ہوں یہی میرے گھر کا کل اثاثہ ہے۔ گھر میں میری بیوی منتظر ہیں کہ میں گھر پہنچوں تاکہ وہ بھی اول وقت میں نماز ادا کر سکیں کیونکہ ان کے پاس کوئی اور چادر نہیں ہے۔ اس لیے میں جلدی چلا جاتا ہوں۔ حضور ﷺ یہ سن کر آبدیدہ ہو گئے اور آپ نے ان کے لیے فراخیِ رزق کی دعا فرمائی۔ وہ صاحب جب گھر پہنچے تو بیوی نے پوچھا کہ آج آپ کچھ تاخیر سے تشریف لائے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ حضور ﷺ نے روک لیا تھا۔ بیوی نے پریشانی سے پوچھا کہیں آپ نے بتا تو نہیں دیا۔ انھوں نے کہا کہ بتا آیا ہوں۔ بیوی نے انتہائی پریشانی کے عالم میں کہا کہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس حال میں رکھا تھا ہم اس کے بندے ہیں ہمیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ ہم اس کے خلاف حرف شکایت زبان پر لائیں۔ آپ نے جو آنحضرت ﷺ سے ذکر کیا کہیں اس کا مطلب یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اپنے اس حال پر صابر و شاکر نہیں ہیں۔

یہ ہے غلامی کا وہ حقیقی مفہوم کہ ہر مسلمان اپنے اللہ کا غلام ہے۔ نہ اس کا جسم اپنا ہے نہ جان نہ اس کی صلاحیتیں اور توانائیاں اپنی ہیں نہ جسمانی قوتیں' نہ اولاد پر اسے حق ملکیت حاصل ہے نہ مال و دولت پر' یہ سب کچھ اللہ کی دَین ہے۔ وہی ان سب کا مالک ہے۔ مسلمانوں کے پاس یہ اس کی دی ہوئی امانت ہے۔ امانت میں ان حدود سے تجاوز کرنا جو امانت رکھنے والے عائد کر دی ہیں یا اپنی مرضی اس طرح استعمال کرنا جو امانت کو ملکیت بنا دے تو یہ امانت داری نہیں بلکہ خیانت ہے۔ ہم اپنی ان چیزوں میں اپنی مرضی کرنے کے ہرگز مجاز نہیں۔ زندگی اس نے ہمیں گذارنے کے لیے دی ہے تو گزارنے کے طریقے بھی عطا فرمائے ہیں۔ اس میں اپنی مرضی سے لکیریں کھینچنا' اپنی مرضی سے نقشے بنانا' اپنی مرضی سے اس کے اصول و ضوابط اور

Marfat.com

آداب وضع کرنا یہ بندگی اور غلامی کے آداب کے خلاف ہے اور پھر اس زندگی کے لیے از خود نصب العین اور مقصد زندگی متعین کرنا یہ سراسر حدود سے تجاوز ہے۔ اور پھر زندگی کے ہر شعبے کے لیے جو احکام دیے گئے ہیں انھیں کامل بندگی کے تصور کے ساتھ بجالانے کی بجائے انکے خلاف دل و دماغ کی قوتیں صرف کرنا' اس کے خلاف اپنے اعضاء و جوارح کو حرکت میں لانا بلکہ کھلم کھلا اس کے احکام کے خلاف زندگی کا فیصلہ کرنا یہ سراسر اس کی بندگی اور غلامی سے بغاوت ہے اور پھر وہ تنگی و ترشی' عسر و یسر اور امن اور خوف' جس حال میں بھی رکھے اس کے خلاف حرفِ شکایت زبان پر لانا یا اس کے سوا کسی اور کے سامنے دست سوال دراز کرنا اور کسی اور سے امیدیں باندھنا' محبت کسی اور سے کرنا' نفرت کا حوالہ کسی اور کو بنانا' دل کی دنیا کسی اور سے آباد کرنا' زندگی کے الجھے ہوئے مسائل میں اس کی دی ہوئی ہدایت کے برعکس کوئی اور ہدایت قبول کرنا یہ سب وہ باتیں ہیں جو اس بندگی اور غلامی کے خلاف ہیں۔

یہ غلامی کا وہ حقیقی مفہوم ہے جس میں کائنات کا ذرہ ذرہ جکڑا ہوا ہے۔ خالق حقیقی وہ غالب و قادر آقا ہے کہ اس کی کائنات کی ہر مخلوق اس کے سامنے سراپا تسلیم و انقیاد ہے جس مخلوق کو جس کام میں لگا دیا گیا ہے اس کی مجال نہیں کہ وہ اس سے سرتابی کر سکے۔ ایک چھوٹے سے چھوٹے ذرے سے لے کر بڑے سے بڑے کرّے تک ہر مخلوق اپنی اپنی مفوضہ ذمہ داری ادا کرنے میں سرتاپا مصروف عمل ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

﴿اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ﴾ (الحج: ۲۲۔۱۸)

(اللہ ہی کے لیے جھکے ہوئے ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور سورج اور چاند اور ستارے اور پہاڑ اور درخت اور چار پائے اور بہت سے لوگ (سب اسی کے سامنے سجدہ ریز ہیں)

﴿وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَافِي السَّمٰوٰتِ وَمَافِي الْاَرْضِ مِنْ دَآبَّةٍ وَّالْمَلٰٓئِكَةُ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ○ يَخَافُوْنَ رَبَّهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَايُؤْمَرُوْنَ﴾

"اور اللہ ہی کے لیے سجدہ کر رہے ہیں جو کوئی آسمانوں میں ہیں اور جو

Marfat.com

کوئی زمین میں ہیں چار پایوں میں سے اور فرشتوں میں سے اور وہ تکبر نہیں کرتے وہ اپنے اوپر اپنے رب سے ڈرتے ہیں اور وہ کرتے رہتے ہیں جس کا انھیں حکم دیا جاتا ہے۔''

﴿وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِیْحَهُمْ﴾ (بنی اسرائیل: ۱۷۔۴۴)

''ہر چیز اس کی تسبیح میں لگی ہوئی ہے مگر تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔''

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا﴾ (مریم: ۱۹۔۹۳)

''آسمانوں اور زمین میں جو کوئی ہے وہ اللہ کے پاس غلام بن کے آنے والا ہے۔''

سورج اس کی غلامی میں چمک رہا ہے۔ چاند اس کی بندگی میں دمک رہا ہے ہر سیارہ اس کی چاکری میں محو حرکت ہے۔ پہاڑ اس کے حکم کی تعمیل میں ایستادہ ہیں۔ زمین اس کی اطاعت میں بچھی ہوئی اپنا فرض انجام دے رہی ہے۔ فرشتے اس کے احکام کی بجا آوری میں ہمہ وقت اور ہمہ تن مصروف عمل ہیں کائنات کی ہر مخلوق سراپا خدمت و اطاعت ہے اور ایک لمحے کے لیے بھی اپنی ڈیوٹی سے غفلت یا سرکشی کا شکار نہیں ہوتی۔

Marfat.com

11- قرآنِ کریم کا چیلنج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ
﴿وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ﴾

قرآنِ کریم نے تین شکلوں میں یہ چیلنج دیا ہے۔ پہلے تو فرمایا کہ جن وانس مل کر اس قرآن جیسا کوئی قرآن بنا کر لائیں۔ جب اس کے جواب میں خاموشی رہی۔ لیکن مخالفت جاری رہی تو پھر فرمایا اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ اور جب یہ بھی نہ ہوسکا تو پھر فرمایا: فاتوا بسورۃ من مثلہ ''اس جیسی ایک ہی سورت بنا کر لے آؤ''۔ اندازہ کیجیے! اس سے ہلکا چیلنج اور کیا ہوسکتا ہے کہ صرف ایک سورت بنا کر لائی جائے کیونکہ سورت سے مراد کوئی بڑی سورت نہیں سورۃ الکوثر جیسی تین بولوں پر مشتمل سورۃ ہی پیش کر دو تب بھی چیلنج کا جواب ہو جائے گا، لیکن اگر تم ایسا نہ کرسکو اور یقیناً نہیں کرسکو گے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنی واضح دلیل اور اتنی مضبوط حجت قائم ہو جانے کے بعد بھی تم اگر رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لاؤ اور آپ کی نبوت کو تسلیم نہ کرو اور قرآن کریم کو اللہ کی کتاب نہ مانو تو پھر اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ اولاً دنیا ہی میں عذاب آئے اور اگر اللہ کی مشیت سے تم دنیا میں عذاب سے بچ جاؤ تو پھر جہنم کی اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ یہاں جن پتھروں کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مراد عام پتھر نہیں بلکہ وہ پتھر ہیں جنھیں بتوں کی شکل میں یا استھان کی شکل میں پوجا گیا ہو۔

بتوں کو عذاب دینے کی وجہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شرک اور کفر وہ آتش گیر مادے ہیں جس سے جہنم کی آگ بھڑکتی ہے۔ جن انسانوں میں یہ مادہ ہوگا وہ بھی اسی آگ کی تیزی کے کام آئیں گے اور جن پتھروں

Marfat.com

میں اس شرک کی آمیزش ہوگی انھیں بھی ایندھن کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔ دوسری جگہ قرآن کریم نے اس کی وضاحت بھی کردی ہے ارشاد فرمایا:

﴿ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ﴾

"بے شک تم اور جن کی تم پوجا کرتے ہو جہنم کا ایندھن ہو گے"۔

یعنی جن بتوں کو تم پوجتے ہو جو پتھروں سے تراشے جاتے ہیں انھیں بھی جہنم میں ڈالا جائے گا۔ اس کی وجہ یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ جس طرح ان میں شرک کا آتش گیر مادہ موجود ہے جس کی وجہ سے جہنم کی آگ بھڑکے گی اسی طرح انھیں جہنم میں ڈالنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جب یہ لوگ اپنے ساتھ انھیں بھی جہنم میں جلتا ہوا دیکھیں گے تو تب انھیں اندازہ ہوگا کہ جنھیں ہم خدا بنائے بیٹھے تھے ان کی اصل حقیقت کیا ہے۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ عرب اپنی فصاحت کلام میں یکتا تھے۔ ان کی طلاقت لسانی اور شعر گوئی کا پوری دنیا میں جواب نہ تھا اس لیے ان کے لیے قرآنِ کریم کا جواب دینا کوئی مشکل نہ تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے اگر جواب نہیں دیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ جواب دے نہیں سکتے تھے بلکہ انھوں نے اسے درخور اعتناء نہیں سمجھا اور اپنی حیثیت سے اسے بہت فروتر جانا۔ لیکن اس طرح کی بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو عربوں کے مزاج سے ناواقف ہو اور جس کے سامنے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد مکہ میں برپا ہونے والی کشمکش کی تاریخ نہ ہو۔ ورنہ جو آدمی عربوں کے مزاج سے آگاہی رکھتا ہے وہ یہ جانتا ہے کہ عربوں میں غیرت وحمیت انتہا کو پہنچی ہوئی تھی جس طرح وہ جنگ میں پیچھا دکھانے کو موت سے بدتر خیال کرتے تھے اسی طرح اگر انھیں خطابت یا شاعری میں مقابلے کا چیلنج دیا جاتا تو وہ اسے غیرت کا مسئلہ بنالیتے اور جب تک اپنے مقابل کا چیلنج قبول کرتے ہوئے جواب نہ دے لیتے انھیں چین نہیں آتا تھا۔ ملک کے دور دراز کسی کونے کا کوئی آدمی ملک کے دوسرے کنارے پر رہنے والے کسی آدمی کی ہجو کہتا تھا تو یہ لمبا سفر کرکے اس کا جواب دینے کے لیے وہاں پہنچتا تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ قرآنِ کریم کی تعلیمات کی رہنمائی میں اٹھنے والی تحریک کا 21 سال تک عربوں نے اس طرح مقابلہ کیا کہ اس کے لیے بیسیوں لڑائیاں لڑیں۔ اپنے بھائی بند اور بچے قتل کرائے مسلمانوں کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے کی کوشش کی۔ حتیٰ کہ اسی کشمکش میں عرب کی سرزمین ان کے لیے تنگ ہوگئی، خوش نصیب اسلام کی آغوش میں آگئے۔ بدنصیب قتل ہوگئے یا ملک سے

Marfat.com

بھاگ گئے۔ جزیرۂ عرب کی حد تک کفر مکمل طور پر فنا ہو گیا۔ جس قوم نے ایسی جانگسل کشمکش میں پیچھا نہ دکھایا اور جس نے خوں ریز معرکوں میں اپنے کفر سے کبھی پسپائی اختیار نہ کی ہو۔ اس کے بارے میں یہ سمجھنا کہ انھوں نے مخالفت میں سب کچھ کیا لیکن یہ قرآن کریم کا چیلنج اس لیے قبول نہ کیا کہ وہ ان کے نزدیک چنداں اہمیت کا حامل نہ تھا حالانکہ اسی پر کفر و اسلام کے معرکے کا دارومدار تھا۔ تو یہ بات کم فہمی اور بے عقلی کے سوا کچھ نہیں۔ البتہ ایک بات باقی رہ جاتی ہے کہ قرآن کریم میں آخر ایسی کیا بات ہے کہ قرآنِ کریم کے اس چیلنج پر صدیاں گزر گئیں اور دنیائے کفر نے اسلام کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کا جتن کر ڈالا لیکن اس چیلنج کا جواب دینے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ کس قدر آسان کام ہے کہ اگر قرآن جیسی کتاب یا اس جیسی چند سورتیں یا بدرجہ آخر ایک ہی سورت لا کر پیش کر دی جائے اور دنیا کے اہلِ علم و دانش فیصلہ کر دیں کہ واقعی یہ کوشش قرآن جیسی یا قرآن سے بہتر ہے تو اسلام کے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

وجوہِ اعجاز

اس حوالے سے مختلف علماء نے اعجازِ قرآن کے نام سے ان وجوہِ اعجاز کو بیان کیا ہے ،جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی مثال لانا انسان کے لیے ممکن کیوں نہیں۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ ان وجوہِ اعجاز میں سے اپنی ہمت کے مطابق کچھ نہ کچھ عرض کر دیں۔

الفاظ کا اعجاز

کسی بھی کتاب کا مطالعہ شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے اس کے الفاظ سے واسطہ پڑتا ہے۔ کتاب چاہے علم و فن کے کسی شعبہ سے متعلق ہو الفاظ کا استعمال تو ہر مضمون کی ضرورت ہے۔ اگر الفاظ فصاحت و بلاغت کی ٹکسال سے ڈھل کے نکلے ہیں تو پہلے ہی مرحلہ میں کتاب کا قاری کتاب کے مطالعے میں ایک لذت اور فرحت محسوس کرتا ہے۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کا علمی مقام کیا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی ہمیں سب سے پہلے الفاظ کا حسن اپنی طرف کھینچتا ہے۔ لیکن اس حسن اور خوبی کو سمجھنے کے لیے اصل ذریعہ تو پڑھنے والے کا اپنا حسنِ ذوق ہے۔ اگر وہ فصاحت و بلاغت کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے تو پھر اسے قواعد و ضوابط یا

Marfat.com

لغت سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس طرح جمالیاتی ذوق رکھنے والا ہر خوبصورت چیز میں پہلی نظر پڑتے ہی خوبصورتی محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ذوق چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر دیتا ہے کہ اس چیز میں خوبصورتی اور حسن کس کمال پر ہے۔ البتہ! جس شخص میں جمالیاتی ذوق کی کمی ہوگی اسے کسی بھی چیز کی خوبصورتی کو سمجھانے کے لیے اصول وضوابط کا حوالہ دینا پڑے گا۔ قرآنِ کریم کو جب عرب کے فصحاء وبلغاء نے دیکھا تو مخالف اور دشمن ہوتے ہوئے بھی اس کی فصاحت و بلاغت کے حسن سے گھائل ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ولید بن مغیرہ ہو، عتبہ بن ربیعہ ہو یا نضر بن حارث ہو، یہ لوگ ایمان نہیں لائے، لیکن قرآنِ کریم کی فصاحت و بلاغت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے علاوہ کئی اور اشرافِ قریش تھے جو قرآنِ کریم کو چھپ چھپ کر سنتے تھے۔ وہ اپنے قومی تعصبات کے باعث مخالفت بھی کرتے تھے، لیکن ساتھ ہی قرآن کی عظمت کو تسلیم بھی کرتے تھے۔ لیکن اہلِ عجم کو فصاحت و بلاغت کے بعض حوالوں سے واضح کرنا پڑے گا کہ قرآنِ کریم میں وہ ایسی کیا بات ہے جس نے اسے معجز بنا دیا۔ چنانچہ سب سے پہلے جب ہم اس کے الفاظ کو دیکھتے ہیں تو الفاظِ قرآن کے تین پہلو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتے ہیں۔

۱۔ دنیا کی کسی بھی زبان کی بڑی سے بڑی ادبی کتاب کو دیکھ لیجئے وہ یہ دعویٰ کبھی نہیں کرسکتی کہ اس کتاب کی عبارت آرائی جن الفاظ سے ہوئی ہے ان میں کوئی لفظ بھی غیر فصیح نہیں کیونکہ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جس کا ایک ایک لفظ فصاحت و بلاغت کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ عربی زبان بھی اپنی انتہائی وسعت کے باوجود اس کمزوری سے مبرّا نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم میں الحمد سے لے کر والناس تک نہ صرف یہ کہ کہیں کوئی ایک لفظ بھی غیر فصیح نہیں بلکہ ہر لفظ جس مقام پر آیا ہے وہ فصاحت و بلاغت کا شاہکار ہے۔ جسے تبدیل کرنا کلام میں عیب پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم کی احتیاط کا یہ عالم ہے کہ اگر کہیں اسے کوئی ایسی بات کہنا پڑی ہے جس کے صحیح مفہوم کی ادائیگی کے لیے عربی زبان میں کوئی فصیح لفظ موجود نہیں تو قرآنِ کریم نے اس لفظ کے استعمال کی بجائے عربی زبان کو ایک نیا لفظ عطا کیا ہے جس سے وہ مفہوم صحیح طور پر ادا ہو جاتا ہے جو قرآنِ کریم کے پیشِ نظر ہے۔ مثلاً زمانۂ جاہلیت میں موت کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بہت سے عربی الفاظ مستعمل تھے مثلاً موت، هلاك، فنا، حتف، شعوب، حمام، منون، سام، قاضيه، نيط، فود، مقدار، جباز، تيم، حلاق، طلاطل، طلاطله، عول، ذام،

Marfat.com

کفت ، جداع ، جُزرۃ ، خالج۔لیکن ان میں سے اکثر الفاظ کے پس منظر میں اہلِ عرب کا یہ قدیم نظریہ جھلکتا تھا کہ موت کے ذریعہ انسان کے تمام اجزاء ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں۔اور اس کا دوبارہ زندہ ہونا ممکن نہیں۔قرآنِ کریم نے جب موت کی حقیقت بیان کرنا چاہی تو اس نے متذکرہ بالا الفاظ میں سے کسی ایک کا استعمال کرنا پسند نہیں کیا کیونکہ ان کے اندر جو تصور کارفرما تھا وہ اسلامی عقیدے کے بالکل برعکس تھا۔اس لیے قرآنِ کریم نے ایک ایسا لفظ عربی زبان کو دیا جو نہایت خوبصورت مختصر اور جامع ہونے کے ساتھ ساتھ اس مفہوم کو ادا کر رہا ہے جو موت کی حقیقت ہے۔وہ لفظ ہے ''تَوَفّی'' جس کے لغوی معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا وصول کر لینا'' اس لفظ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ موت ابدی فنا کا نام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے روح قبض کرنے کا نام ہے۔چنانچہ جب اللہ تعالیٰ چاہے وہ جسم کے منتشر اجزا یکجا کر کے ان میں دوبارہ روح لوٹا سکتا ہے۔موت کے لیے یہ لفظ قرآنِ کریم سے پہلے کسی نے استعمال نہیں کیا۔اور آج نہ صرف عربی زبان بلکہ اردو زبان میں بھی وفات کے لفظ سے اس کا استعمال عام ہے۔

۲۔ اسی طرح آپ ہر زبان میں دیکھیں گے کہ بعض ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو صوتی اعتبار سے فصیح اور پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے۔لیکن زبان میں چونکہ ان الفاظ کا متبادل نہیں ہوتا۔اس لیے اہلِ زبان انھیں استعمال کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔لیکن قرآنِ کریم کی حیرت میں ڈال دینے والی فصاحت و بلاغت اس کے لیے عجیب راستہ نکالتی ہے کہ وہ اس لفظ کو استعمال نہیں کرتی۔البتہ! بات کہنے کے لیے ایسی خوبصورت تعبیر اختیار کرتی ہے کہ بات بھی ادا ہو جاتی ہے لیکن اس لفظ کے استعمال کی نوبت نہیں آتی۔عربی میں تعمیرِ مکان کے لیے پکی ہوئی اینٹوں کے لیے جتنے الفاظ استعمال ہوتے ہیں وہ سب ثقیل، مبتذل اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔مثلاً آجر ، قرمد اور رطوب ، یہ تینوں الفاظ صوتی اعتبار سے غیر فصیح سمجھے جاتے ہیں۔قرآنِ کریم نے فرعون اور ہامان کا واقعہ ذکر کرتے ہوئے جب یہ بیان کرنا چاہا کہ فرعون نے اپنے وزیر ہامان کو حکم دیا تھا کہ میرے لیے ایک اونچا محل تعمیر کرنے کے لیے اینٹیں پکاؤ۔تو اس میں اینٹوں کا لفظ آنا ناگزیر تھا اور میں عرض کر چکا ہوں کہ عربی زبان میں اینٹوں کے لیے تینوں مستعمل لفظ غیر فصیح ہیں۔قرآنِ کریم کے لیے یہ بات نامناسب تھی کہ وہ انسانی تحریروں کی طرح مجبور ہو کر غیر فصیح لفظ استعمال کرے۔چنانچہ اس نے اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے ایسا معجزانہ انداز اختیار کیا کہ مفہوم بھی ادا ہو گیا اور ثقیل الفاظ کے استعمال کا عیب بھی کلام میں

Marfat.com

پیدا نہ ہوا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَاَيُّهَا الْمَلَأُ مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِيْ فَاَوْقِدْلِيْ يَا هَامَانُ عَلَى الطِّيْنِ فَاجْعَلْ لِّيْ صَرْحًا﴾

''اور فرعون نے کہا! اے سردارانِ قوم! مجھے اپنے سوا تمھارا کوئی معبود معلوم نہیں پس اے ہامان! گیلی مٹی پر آگ روشن کرکے میرے لیے ایک محل تعمیر کرو۔''

اس آیتِ کریمہ میں دیکھ لیجئے کہ اینٹیں پکانے کا مفہوم بھی ادا ہو گیا لیکن اس کے لیے غیر فصیح لفظ کے استعمال کی نوبت نہیں آئی۔

۳۔ اسی طرح عربی زبان میں بعض الفاظ مفرد ہونے کی صورت میں نہایت سبک اور فصیح ہیں۔ لیکن ان کی جمع ثقیل سمجھی جاتی ہے۔ اس کی ادائیگی میں نسبتاً ثقالت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً زمین کو عربی زبان میں ''ارض'' کہتے ہیں۔ یہ واحد اور مفرد ہونے کی شکل میں کس طرح چست اور ہلکا پھلکا لفظ ہے۔ لیکن اس کی جمع دو صورتوں میں آتی ہے اور دونوں ہی ثقیل سمجھی جاتی ہیں۔ ''ارضون اور اراضی''۔ یہ دونوں لفظ اہلِ ذوق کو بوجھل محسوس ہوتے ہیں اور ان کے خیال میں ان کی وجہ سے کلام کی سلاست پر اثر پڑتا ہے۔ لیکن جہاں بھی جمع کا مفہوم ادا کرنا ہو تو عرب مجبور ہیں کہ ان دونوں میں سے کسی لفظ کو استعمال کریں۔ لیکن قرآنِ کریم میں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کہیں بھی ارض کو جمع کی صورت میں استعمال نہیں کیا گیا۔ حتی کہ جہاں یہ بتانا تھا کہ جس طرح اللہ نے سات آسمان بنائے ہیں اسی طرح سات زمینیں بھی بنائی ہیں تو وہاں بھی ارض کو مفرد صورت میں اس طرح لایا گیا ہے کہ جمع کا مفہوم ادا ہو گیا ہے۔ ذرا اس آیتِ کریمہ کو پڑھیے اور سر دھنیے۔ الله الذی خلق سبع سمٰوٰت ومِنَ الاَرضِ مِثلَهُنَّ ''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا کیے ہیں اور زمین میں سے بھی اتنی ہی۔'' اس آیتِ کریمہ میں دیکھیے سماء کی جگہ جمع لائی گئی ہے لیکن ارض کی جمع لانے کی بجائے ومن الارض مثلھن کہہ کر اس خوبی سے مفہوم ادا کیا کہ فصاحت و بلاغت سجدہ ریز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ ان دو مثالوں سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم کی فصاحت و بلاغت کا معیار اس کمال تک پہنچا ہوا ہے کہ جس کی مثال لانا انسان کے لیے ممکن نہیں۔

Marfat.com

ترکیب کا اعجاز

قرآن کے قاری کو عام کتابوں کی طرح دوسری جس چیز سے سابقہ پڑتا ہے وہ ان الفاظ سے بننے والے جملوں کی ترکیب اور ان کی ساخت ہے۔ قرآنِ پاک کا ایک ایک جملہ اپنے اندر وہ حسن، وہ چابک دستی، وہ چستی، اور وہ خوبصورتی رکھتا ہے کہ دوسری کسی کتاب میں جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مشکل سے مشکل بات کو سلاست کا لباس پہنا دینا، سادہ سی بات کو شوکت وشکوہ کی تصویر بنا دینا، اور پھر ان میں شیرینی پیدا کر دینا کہ حسنِ ذوق رکھنے والا داد دیے بغیر نہ رہ سکے۔ قرآنِ کریم کا معمول ہے میں صرف اس کی ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ عرب جیسے جری، بہادر، اور قانون سے بے خبر معاشرے میں خوں ریزی عام سی بات تھی۔ وہ اسے روکنے کے لیے قاتل سے قصاص لینے کو بہت بڑا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور اسی لیے اس پر ہمیشہ اپنے خطبوں اور اپنی حکمتوں میں زور دیتے رہتے تھے چنانچہ اس مفہوم کے کئی مقولے ان میں مشہور ہو گئے تھے۔ مثلاً القتل احیاء للجمیع "قتل اجتماعی زندگی ہے" اور القتل انفی للقتل "قتل سے قتل کی روک تھام ہوتی ہے۔" اکثروا القتل لیقل القتل "قتل زیادہ کرو تا کہ قتل کم ہو جائے"۔ ان جملوں کو اتنی مقبولیت حاصل تھی کہ یہ زبان زدِ عام تھے اور انتہا درجہ فصیح سمجھے جاتے تھے۔ قرآنِ کریم نے بھی اس مفہوم کو ادا فرمایا ہے، لیکن اس شان سے ادا فرمایا ہے کہ تمام مشہور جملوں کی فصاحت وبلاغت اس کے سامنے ماند ہو کر رہ گئی ہے۔ ارشاد ہے: ولکم فی القصاص حیاۃ "اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔" اس جملے کے اختصار جامعیت، سلاست، شوکت اور معنویت کو جس پہلو سے دیکھیے بلاغت کا معجز شاہکار معلوم ہوتا ہے اور پہلے کے تمام جملے اس کے سامنے سجدہ ریز دکھائی دیتے ہیں۔

اسلوب کا اعجاز

الفاظ اور ترکیب کے اعجاز کے بعد قرآنِ کریم کا حیرت میں ڈال دینے والا اعجاز وہ ہے جس کا اظہار قرآنِ کریم کے اسلوب میں ہوتا ہے۔ وہ بظاہر ایک فصیح وبلیغ عربی زبان کی کتاب ہے لیکن اس کے اسلوب کی شیرینی، اثراندازی اور رنگارنگی اپنے اندر وہ وسعت اور

Marfat.com

ندرت رکھتی ہے کہ آدمی جیسے جیسے اسے پڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے اس طرح حیران و ششدر ہوتا جاتا ہے جس طرح ایک آدمی اگر کسی ایسے گلشن میں داخل ہو جائے جس میں بے شمار اقسام کے پھول کھلے ہوئے ہوں اور ہر پھول کا رنگ، خوشبو، سائز، اور شکل وصورت بالکل ایک دوسرے سے الگ ہو تو آدمی اس گلشن میں رنگ ونور کے سیلاب میں ڈوبتا تو چلا جاتا ہے لیکن اس کے لیے ان پھولوں کے رنگوں کی پہچان، ان میں ہر ایک کی انفرادیت کی شناخت، ان میں سے ہر ایک کی خوشبو کا الگ الگ احساس اور ان میں پائے جانے والے تنوع کا شمار ہرگز ممکن نہیں ہوتا۔ اسی طرح قرآنِ کریم بھی ایک ایسا گلشن ہے جس کے اسلوب کے اتنے رنگ ہیں کہ کسی بڑے سے بڑے گلشن میں بھی ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس لیے زبانِ قلم کو یارا نہیں کہ اس کے اسلوب کے بارے میں کوئی کافی شافی بات لکھ سکے۔ لیکن اس میں جو باتیں بہت نمایاں ہیں جن کو جان لینا ہی اس کے اعجاز کو سمجھ لینے کے لیے کافی ہے ان میں سے چند ایک کا تذکرہ ہم کرتے ہیں۔

۱:۔ سب سے پہلی جو چیز اسے پڑھتے ہوئے یا سنتے ہوئے آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈالتی ہے وہ اس کا صوتی آہنگ ہے۔ قرآنِ کریم منظوم کتاب نہیں، وہ سراسر نثر پر مشتمل ہے۔ لیکن آج تک دنیا میں کوئی ایسی کتاب نثر میں نہیں لکھی گئی جس کو پڑھ کر یا سن کر آدمی کے جمالیاتی ذوق کو تحریک ہوتی ہو اور وہ ایک لذت اور حلاوت محسوس کرتا ہو۔ شعر میں تو ملتے جلتے الفاظ قافیہ آرائی، اوزان کی پابندی اور کبھی کبھی ردیف کی یکسانیت ایک صوتی آہنگ پیدا کرتی ہے، جو لطف ولذت کا باعث بنتی ہے۔ لیکن نثر میں تو کوئی ایسی بات نہیں ہوتی لیکن کوئی شخص بھی اس کا انکار نہیں کرسکتا کہ جب بھی کوئی اچھا قاری قرآنِ پاک کو اس میں ڈوب کر پڑھتا ہے تو سننے والا ممکن ہی نہیں کہ اس کے سحر میں مسحور نہ ہو جائے۔ ایسے بہت سارے واقعات مشہور رہیں کہ غیر مسلم تک قرآنِ پاک شوق سے سنتے اور اس کی تاثیر سے متاثر ہوتے اور بسا اوقات ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے۔ ممکن ہے اہلِ علم اس کا سبب قرآنِ کریم کے متوازن صوتی آہنگ کو قرار دیں، لیکن کسی اہلِ علم کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس کا سراغ پاسکے یا اس کی مثال لاسکے کہ یہ متوازن صوتی آہنگ عروض اور وزن کی پابندیوں کے بغیر کس طرح ممکن ہے اور قرآنِ کریم میں وہ کیا اسباب ہیں جس کی وجہ سے یہ معجزہ وجود میں آیا ہے۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص کو بھی ادبی ذوق اور جمالیاتی حس کا کچھ حصہ ملا ہے، وہ قرآنِ کریم کے اس اعجاز کو محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا۔

Marfat.com

۲۔ دنیا کے بڑے بڑے فصیح و بلیغ ادیب اور خطیب گزرے ہیں۔لیکن اگر ان کے ادب اور ان کی خطابت کا تجزیہ کیا جائے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہر ادیب اور خطیب کا ایک خاص رنگ اور ایک خاص آہنگ ہے اور جب وہ اس سے باہر نکلتا ہے تو بے رنگ ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ بڑے سے بڑے آدمی کا بھی ایک خاص ذوق ہوتا ہے اور ہمیشہ وہ اپنے ذوق کے مطابق لکھنے یا بولنے کی صلاحیت پیدا کرتا ہے۔ اس کے مطالعے کے مخصوص میدان ہوتے ہیں اور اس سے ہٹ کر وہ کبھی کوئی موثر رول ادا کرنے کے قابل نہیں ہوتا۔لیکن قرآنِ کریم کے اسلوب کا عجیب عالم ہے کہ لوگوں نے اسلوب کی قسمیں کی ہیں، خطابی، ادبی اور علمی۔لیکن قرآنِ کریم کا اسلوب ان تمام اسالیب پر حاوی ہے۔ وہ علم وادب، نصیحت وفہمائش اور دعوت وقانون کی ایک ایسی بہار ہے جس کے جلو میں اپنے اپنے وقت اور ضرورت کے مطابق تمام اسالیب پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس میں بیک وقت شگفتگی بھی ہے اور متانت بھی۔اس میں زور بھی ہے اور بالیدگی بھی۔ اس کا مخاطب صاحبِ علم ہے تو علم کے موتی چنتا ہے۔ الہڑ دیہاتی ہے تو وہ بھی سر دھنتا ہے۔ محققین ہیں تو ان کے لیے تحقیق کا وافر سامان موجود ہے۔ کوئی سائنس کا ذوق رکھنے والا ہے تو اس کے لیے فلسفہ اور سائنس کے دقیق مسائل کا حل بھی موجود ہے۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ قرآنِ کریم بعض دفعہ ایک ہی بات کو کئی مرتبہ دہرا کر کہتا ہے لیکن کیا مجال ہے کہ اس کی تاثیر میں کمی آنے پائے اس نے بعض ان مضامین کو بھی بلاغت کے اوجِ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ جس میں کوئی بشری ذہن ہزار کوشش کے بعد بھی کوئی ادبی چاشنی پیدا نہیں کرسکتا۔ مثلاً قانونِ وراثت کو لیجئے یہ ایک ایسا خشک اور سنگلاخ موضوع ہے کہ اس میں دنیا کے تمام ادیب اور شاعر مل کر بھی ادبیت اور عبارت کا حسن پیدا نہیں کرسکتے۔لیکن قرآنِ کریم نے جس اسلوب سے سورۃ نساء میں وراثت کے مسائل بیان کیے ہیں اسے پڑھتا ہوا آدمی یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ کسی ادبی شہ پارے کی تلاوت کر رہا ہو، اس کا ایک ایک جملہ اس کے دامنِ ذوق کو کھینچتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلوب کے بے شمار پہلو ہیں، جن کو شمار کرنے کے لیے بھی ایک سفینہ چاہیے۔لیکن قرآنِ پاک ایک ایسا خزینہ ہے جس میں علم کے ہر گوشے تحریر وتقریر کے ہر زاویے اور ادب کے ہر پیمانے کے حوالے سے ایسے بیش بہا ہیرے اور جواہرات بھرے ہوئے ہیں کہ اہلِ ذوق کا تجسس تھک کر ہار جاتا ہے، لیکن اس خزانے میں کبھی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

Marfat.com

12- قرآن کریم کی پیشگوئیاں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
﴿اِنَّہٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا ھُوَ بِالْھَزْلِ﴾

قرآنِ کریم کے وجوہِ اعجاز کا ایک پہلو وہ چیزیں ہیں جن کی صداقت دنیا پر منکشف ہو چکی ہے۔ ہم یہاں قرآنِ پاک کی تعلیمات کا ذکر نہیں کر رہے کیونکہ انھیں جانچنے کے لیے علم اور دیانت چاہیے۔ لیکن وہ باتیں جنھیں تاریخ نے سچا ثابت کر دکھایا یا دنیا ان انکشافات کو ماننے پر مجبور ہو گئی ان میں سے ہم چند ایک کا ذکر کرتے ہیں۔

۱۔ آنحضرت ﷺ کی مکی زندگی میں دنیا کی دو عظیم طاقتوں یعنی روم اور ایران میں شدید جنگ جاری تھی۔ اس جنگ میں ایرانی فوجیں مسلسل رومیوں پر غالب آتی جا رہی تھیں۔ ملک کا بیشتر حصہ رومیوں کے ہاتھوں سے چھن چکا تھا۔ ایرانی لشکر شام کے بڑے بڑے شہروں کو تاراج کرتا ہوا قسطنطنیہ کے دامن میں پڑاؤ ڈال چکا تھا۔ رومی حکومت کے لیے اپنی آزادی برقرار رکھنا تقریباً ناممکن ہو رہا تھا۔ اس صورتحال سے قریشِ مکہ بہت خوش تھے وہ ایران کو آتش پرست ہونے کی وجہ سے اپنے مشابہ اور روم کو اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے مشابہ سمجھتے تھے اور ایرانیوں کا غلبہ ان کے نزدیک اپنی فتح اور مسلمانوں کی شکست کا شگون تھا۔ ان حالات میں سورۃ روم کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جس کا ترجمہ یہ ہے:

"الٓمٓ۔ روم والے قریب ترین سرزمین (یعنی شرقِ اردن) میں مغلوب ہو گئے اور وہ اس مغلوبیت کے بعد چند ہی سالوں میں غالب آجائیں گے۔ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے کام پہلے بھی اور بعد بھی۔ اور اس روز مسلمان اللہ کی مدد کی وجہ سے خوش ہوں گے، اللہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے اور وہ زبردست اور مہربان ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے اور اللہ اپنے

Marfat.com

وعدے کے خلاف نہیں کرتا لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

جو لوگ روم اور ایران کے جنگی حالات سے باخبر تھے ان کے لیے یہ پیشگوئی قطعی طور پر نا قابلِ یقین تھی۔ چنانچہ قریش کے ایک ممتاز سردار ابی ابن خلف نے حضرتِ ابوبکر سے شرط لگائی کہ اگر تین سال کے دوران رومی غالب آ گئے تو میں تمھیں دس اونٹ دوں گا اور غالب نہ آسکے تو تم مجھے دس اونٹ دو گے۔ اس وقت اس طرح کی شرط جائز تھی۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے منظور فرمالیا اور آنحضرت ﷺ کو اس کی اطلاع کی آپ نے فرمایا قرآن نے بضع سنین ''چند سالوں میں'' فرمایا ہے اور عربی میں لفظِ بضع کا اطلاق ''تین سے لے کر نو سالوں'' تک ہوتا ہے۔ لہٰذا تم ابی ابن خلف سے اونٹوں کی تعداد بڑھا کر شرط کی مدت نو سال مقرر کر لو۔ مشہور مورخ ایڈورڈ گبن اس پیشگوئی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس وقت جب کہ یہ پیشگوئی کی گئی کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از قیاس نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمے کا اعلان کررہے تھے۔'' (سقوطِ زوالِ سلطنتِ روما۔ ج:۵،صفحہ: ۷۳،۷۴)

اپنی پہلی شکست کے ٹھیک سات سال بعد قیصرِ روم بالکل خلافِ توقع قسطنطنیہ سے باہر نکلا اور اس کی فوجوں نے ایرانیوں پر پے در پے حملے کر کے ان کو متعدد مقامات پر شکست دی اور اس کے بعد رومی لشکر ہر جگہ غالب ہی آتا چلا گیا۔ اس طرح سے قرآنِ کریم کی یہ پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔

۲۔ قرآن کی پیش گوئیوں میں آنحضرت ﷺ کے قیامِ مکہ کے دوران وہ پیش گوئی بھی ہے جس میں قرآنِ کریم نے واضح طور پر فرمایا کہ اسلام مکہ کی طرف بڑھ رہا ہے اور مکہ کے اطراف سمیٹے جا رہے ہیں۔

مکی زندگی میں قریش کے مظالم سے تنگ آ کر آپ نے ہجرت کا ارادہ فرمایا۔ قریش بالکل سر پر پہنچ گئے تو آنحضرت نے نہائیت اطمینان سے صدیق اکبر سے فرمایا: گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ان اللہ معنا ''بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے۔'' قرآنِ کریم نے انھیں الفاظ میں اس واقعہ کو ذکر کیا اور پھر جب آپ غارِ ثور میں تین دن قیام کے بعد مدینہ طیبہ کے راستے پر جحفہ کے قریب پہنچے تو وہاں سے مکہ معظّمہ جانے والی سڑک نظر آئی اور طبعی طور سے آپ کو وطن کی یاد آئی اور اسے مستقلاً چھوڑ دینے کے خیال سے رنج ہوا۔ تو قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل

Marfat.com

ہوئی: ان الذی فرض علیك القراٰن لرآدك الی معاد ''بلاشبہ! جس ذات نے قرآن کے احکام آپ پر فرض کیے ہیں وہ دوبارہ آپ کو لوٹائے گا''۔ اس وقت آپ جس بے سروسامانی کے عالم میں مکہ مکرمہ سے نکلے تھے اس کے پیشِ نظر ظاہری لحاظ سے اس پیشین گوئی کے پورا ہونے کی کوئی توقع نہ تھی۔ لیکن چند ہی سال بعد آپ اسی شہر مکہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اور یہ پیشین گوئی پوری ہو کر رہی۔

۳۔ اس طرح کی پیش گوئیاں جن کا تعلق ذہانت اور حالات سے ہو تو کوئی بھی ذہین آدمی حالات کا جائزہ لے کر کر سکتا ہے۔ لیکن ایسی پیش گوئی کرنا جس کا تعلق سراسر دوسری قوم کے ارادوں اور ان کے قلبی احساسات سے ہو، وہ یقیناً انسانی بساط سے باہر ہے۔ اس طرح کی پیشگوئی یقیناً وہی کتاب کر سکتی ہے جو اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہو۔

یہود ہمیشہ یہ دعویٰ کرتے تھے کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں۔ آخرت کی فلاح و کامیابی صرف ہمارے لیے ہے اور صرف ہم ہی لوگ جنت میں جائیں گے۔ قرآنِ کریم نے ان کی بات کا جواب دیتے ہوئے ایک بات کا ان سے مطالبہ کیا اور پھر حتمی انداز میں پیش گوئی فرمائی کہ تم یہ کام کبھی نہیں کرو گے۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ﴾

''آپ فرما دیجیے! (اے یہودیو!) اگر اللہ کے پاس صرف تمہارے لیے خالص طور پر دارِ آخرت ہے دوسروں کے لیے نہیں تو تم موت کی تمنا کرو اگر تم سچے ہو (اور پھر حتمی انداز میں فرمایا) اور یہ لوگ اپنے کرتوت کی وجہ سے ہرگز موت کی تمنا نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔''

اندازہ کیجیے! یہ پیش گوئی اس وقت کی جا رہی ہے جب یہود کے تمام قبیلے پوری شان و شوکت سے مدینے میں آباد ہیں اور ہر طرف ان کے علم اور تقدس کے چرچے ہیں اور وہ ہمیشہ بحث اور مناظرے کا بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ یہ چیلنج سن کر ان کو سانپ سونگھ گیا حالانکہ وہ ایک لمحے میں قرآنِ کریم کے اس چیلنج کو غلط ثابت کر سکتے تھے۔ لیکن

Marfat.com

ان میں سے ایک شخص بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے آگے نہ بڑھا۔

جنگِ احد کے دو گروہوں کے بارے میں یہ خبر دی گئی کہ ان میں سے دو جماعتوں نے دل میں ارادہ کرلیا تھا کہ پسپا ہو جائیں، ان کے دل کی حالت کو وہ خود جانتے تھے یا پروردگار۔ لیکن پروردگار نے اپنی کتابِ پاک میں ان کے دل کے راز کو فاش کیا تو وہ اقرار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ جس کتاب کا نازل کرنے والا لوگوں کے قلبی احساسات، ان کے مخفی ارادوں، اور آئندہ کے عزائم کے بارے میں قطعی علم رکھتا ہو اس کتاب کو کتاب اللہ کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے۔

۴۔ جس زمانے میں یہ کتاب نازل ہوئی ہے اس زمانے میں کسی کتاب کے دیر تک محفوظ رہنے کے اسباب یکسر ناپید تھے اور پھر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ اس وقت تک جتنی کتابیں آسمانوں سے نازل ہو چکی تھیں وہ محفوظ نہیں رہی تھیں اور مخالفتوں کا ہجوم بجائے خود یہ کہتا ہوا دکھائی دے رہا تھا کہ اس کتاب کے باقی رہنے کی کوئی صورت نہیں۔ بااین ہمہ! قرآنِ کریم نے خود دعویٰ کیا اور آج تک وہ دعویٰ اس کتاب میں موجود ہے: انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون ''ہم نے ہی اس قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے''۔ دشمنوں سے پوچھیے کہ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ اور اللہ کریم کا یہ وعدہ پورا ہوا یا نہیں۔ صدیاں گزر گئیں اس کا کوئی شوشہ تک نہ بدل سکا۔ اس کا کوئی نقطہ تک نہ مٹ سکا۔ اس میں تحریف وترمیم کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ قرآنِ کریم کو مٹانے اور اس میں تحریف وترمیم کرنے کی جو سازشیں ہوتی رہیں اس کا ریکارڈ تاریخ میں محفوظ ہے۔ قرآنِ کریم کی آیات اور سورتوں کی ترتیب بدل کر اہلِ مغرب کی نگرانی میں نہائیت سستے نسخے قرآنِ کریم کے شائع کیے گئے۔ لیکن لوگوں نے خود انھیں نفرت سے ٹھکرادیا۔ قرامطہ کے فتنے نے عالمِ اسلام کو ہلا ڈالا۔ تاتاریوں نے مسلمانوں کا قتلِ عام کیا، کتب خانے جلا ڈالے، قدیم کتابوں کے بڑے بڑے ذخیرے دریا میں بہا دیئے۔ انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں پریس پر پابندی لگا کر اور قرآنِ کریم کو جلا کر اسے ختم کرنے کی کوشش کی۔ لیکن قرآنِ کریم کی یہ پیشگوئی کہ اللہ اس کی حفاظت فرمائے گا آج تک اس پیش گوئی کی صداقت کو کوئی نہ جھٹلا سکا۔

Marfat.com

قرآنِ کریم کے انکشافات

قرآنِ کریم کی پیش گوئیوں کی طرح اس کے انکشافات بھی ہیں۔جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے انکشافات صرف کتاب اللہ کا ہی حصہ ہو سکتے ہیں اور جن باتوں نے اس کتاب کو معجز بنایا ہے ان میں یہ انکشافات بھی شامل ہیں۔ان انکشافات میں بہت سے علمی اور تاریخی حقائق کی نشاندہی کی گئی ہے۔جن سے اس کتاب کے نزول کے وقت کوئی شخص بھی واقف نہیں تھا۔ان انکشافات کی ایک لمبی فہرست ہے لیکن ہم ان میں سے چند ایک کا ذکر کرنے پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ جس وقت فرعون دریا میں غرق ہونے لگا تو اس نے جان بچانے کے لیے زبانی طور پر ایمان لانے کا اقرار کیا جس کے جواب میں باری تعالیٰ نے فرمایا:

﴿آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ○ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً﴾

”(اب (ایمان لاتا ہے؟) حالانکہ پہلے نافرمانی کرتا رہا اور فساد مچانے والوں سے تھا۔پس ہم تیرے بدن کو نجات دیں گے تا کہ تو اپنے بعد والوں کے لیے عبرت بن جائے۔“ (یونس ۱۰: ۹۱)

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت اور اس کے بعد بھی صدیوں تک کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ فرعون کی لاش اب تک صحیح سلامت موجود ہے۔لیکن تقریباً دو صدیاں پیشتر اہرامِ مصر کی کھدائی میں ایک ایسا ہال دریافت ہوا جس میں بعض فراعنۂ مصر کی حنوط شدہ لاشیں ملیں۔جب انھیں تابوتوں سے نکال کر ان کی پٹیاں کھولی گئیں تو ایک لاش ایسی نکلی جس پر نمک کی تہہ جمی ہوئی تھی اور اس کی ناک پر مچھلی کے کاٹنے کا نشان تھا۔فرانسیسی ماہرین جوان لاشوں کا جائزہ لے رہے تھے، انھیں حیرت ہوئی کہ یہ نمک کی تہہ کہاں سے آ گئی۔تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ ایک ایسا فرعون ہے جو کسی سمندر میں غرق ہوا اور پھر سمندر نے اس کی لاش باہر اگل دی اور یہ نمک سمندر کا نمک ہے جو پانی کے ساتھ اس کے جسم میں سرایت کر گیا اور پھر آہستہ آہستہ جسم کے اوپر آ کر اس کی تہہ جم گئی۔تب انھیں معلوم ہوا کہ قرآنِ کریم نے جس فرعون کے

Marfat.com

بارے میں خبر دی تھی کہ وہ بحرِ قلزم میں غرق ہوا تھا اور پھر ہم نے اس کے جسم کو نجات دے دی تھی اور اسے آنے والی نسلوں کے لیے باقی رکھا یہ وہی فرعون ہے۔ چنانچہ آج اس کی وہ لاش قاہرہ کے عجائب خانہ میں محفوظ ہے۔

۲:۔ قرآن کریم کا دوسرا ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (الذّٰریٰت ۵۱:۴۹)

''اور ہم نے ہر چیز کے دو جوڑے پیدا کیے ہیں تا کہ تم نصیحت حاصل کرو۔''

جس وقت یہ آیت نازل ہوئی اس وقت عام تصور یہ تھا کہ نر اور مادہ کے جوڑے صرف انسانوں یا جانوروں میں ہوتے ہیں یا پھر چند نباتات میں۔ لیکن سائنس کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ قرآنی حقیقت واضح ہوتی جا رہی ہے کہ نر و مادہ ہر چیز میں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں ان جوڑوں کا نام نر و مادہ رکھ لیا کہیں مثبت (Positive) اور منفی (Negative) اور کہیں الیکٹرون اور پروٹون اور کہیں نیوٹرون اور پوزیٹرون بلکہ ایک آیت میں قرآنِ کریم نے صراحۃً یہ بھی واضح فرما دیا کہ بہت چیزوں میں جوڑوں کا پایا جانا ابھی لوگوں کو معلوم نہیں:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ (۳۶:۳۶)

''پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑوں کو پیدا کیا ان میں جن کو زمین اگاتی ہے اور انسانوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جنھیں یہ لوگ نہیں جانتے۔''

مختصر یہ کہ جن وجوہِ اعجاز نے قرآنِ پاک کو معجزہ بنا دیا ہے ان پر گفتگو نامکمل رہے گی اگر ہم اس موضوع کا تذکرہ نہ کریں جس سے یہ کتاب بحث کرتی ہے۔ اور ضمناً یہ ذکر نہ کریں کہ قرآنِ کریم نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر کس قدر اثر ڈالا ہے۔ ہم اس سلسلے میں دنیائے اسلام کے ایک مشہور مفکر کے خیالات مستعار لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

''جس موضوع سے یہ کتاب بحث کرتی ہے وہ ایک وسیع ترین موضوع ہے جس کا دائرہ ازل سے ابد تک پوری کائنات پر حاوی ہے۔ وہ کائنات کی حقیقت اور اس کے آغاز و انجام اور اس کے نظم و آئین پر کلام کرتی ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس کائنات کا خالق اور ناظم مدبر کون ہے؟ کیا اس

Marfat.com

کی صفات ہیں؟ کیا اس کے اختیارات ہیں؟ اور وہ حقیقتِ نفس الامری کیا ہے جس پر اس نے یہ پورا نظامِ عالم قائم کیا ہے۔ وہ اس جہان میں انسان کی حیثیت اور اس کا مقام ٹھیک ٹھیک متشخص کر کے بتاتی ہے کہ یہ اس کا فطری مقام اور یہ اس کی پیدائشی حیثیت ہے جسے بدل دینے پر وہ قادر نہیں ہے۔ وہ بتاتی ہے کہ اس مقام اور اس حیثیت کے لحاظ سے انسان کے لیے فکر و عمل کا صحیح راستہ کیا ہے، جو حقیقت سے پوری مطابقت رکھتا ہے اور غلط راستے کیا ہیں جو حقیقت سے متصادم ہوتے ہیں۔ صحیح راستے کے صحیح ہونے اور غلط راستوں کے غلط ہونے پر وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز سے نظامِ کائنات کے ایک ایک گوشے سے انسان کے لیے نفس اور اس کے وجود سے اور انسان کی اپنی تاریخ سے بے شمار دلائل پیش کرتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی بتاتی ہے کہ انسان غلط راستوں پر کیسے اور کن اسباب سے پڑتا رہا ہے اور صحیح راستہ جو ہمیشہ ایک ہی تھا اور ایک ہی رہے گا کس ذریعہ سے اس کو معلوم ہو سکتا ہے اور کس طرح ہر زمانے میں اس کو بتایا جاتا رہا ہے۔ وہ صحیح راستے کی صرف نشاندہی کر کے نہیں رہ جاتی بلکہ اس راستے پر چلنے کے لیے ایک پورے نظامِ زندگی کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ جس میں عقائد، اخلاق، تزکیۂ نفس، عبادات، معاشرت، تہذیب، تمدن، معیشت، سیاست، عدالت، قانون، غرض حیاتِ انسانی کے ہر پہلو کے متعلق ایک نہائیت مربوط ضابطہ بیان کر دیا گیا ہے۔ مزید برآں وہ پوری تفصیل کے ساتھ بتاتی ہے کہ اس صحیح راستے کی پیروی کرنے اور ان غلط راستوں پر چلنے کے کیا نتائج اس دنیا میں ہیں اور کیا نتائج دنیا کا موجودہ نظام ختم ہونے کے بعد ایک دوسرے عالم میں رونما ہونے والے ہیں۔ وہ اس دنیا کے ختم ہونے اور دوسرا عالم برپا ہونے کی نہایت مفصل کیفیت بیان کرتی ہے۔ اس تغیر کے تمام مراحل ایک ایک کر کے بتاتی ہے۔ دوسرے عالم کا پورا نقشہ نگاہوں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ اور پھر بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ

Marfat.com

وہاں انسان کیسے ایک دوسری زندگی پائے گا اور کس طرح اس کی دنیوی زندگی کے اعمال کا محاسبہ ہوگا، کن امور کی اس سے باز پرس ہوگی، کیسی ناقابلِ انکار صورت میں اس کا پورا نامۂ اعمال اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ کیسی زبردست شہادتیں اس کے ثبوت میں پیش کی جائیں گی۔ جزا اور سزا پانے والے کیوں جزا اور سزا پائیں گے۔ جزا پانے والوں کو کیسے انعامات ملیں گے اور سزا پانے والے کس کس شکل میں اپنے اعمال کے نتائج بھگتیں گے۔ اس وسیع مضمون پر جو کلام اس کتاب میں کیا گیا ہے وہ اس حیثیت سے نہیں ہے کہ اس کا مصنف کچھ صغری کبریٰ جوڑ کر قیاسات کی ایک عمارت تعمیر کر رہا ہے بلکہ اس حیثیت سے ہے کہ اس کا مصنف حقیقت سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے۔ اس کی نگاہ ازل سے ابد تک سب کچھ دیکھ رہی ہے۔ تمام حقائق اس پر عیاں ہیں کائنات پوری کی پوری اس کے سامنے ایک کھلی کتاب کی طرح ہے۔ نوعِ انسانی کے آغاز سے اس کے خاتمہ تک ہی نہیں بلکہ خاتمہ کے بعد اس کی دوسری زندگی تک بھی وہ اس کو بیک نظر دیکھ رہا ہے اور وہ قیاس وگمان کی بنا پر نہیں بلکہ علم کی بنیاد پر انسان کی رہنمائی کر رہا ہے۔ جن حقائق کو علم کی حیثیت سے وہ پیش کرتا ہے ان میں سے کسی ایک کو بھی آج تک غلط ثابت نہیں کیا جا سکا۔ جو تصورِ کائنات وانسان پیش کرتا ہے وہ تمام مظاہر اور واقعات کی مکمل توجیہ کرتا ہے اور ہر شعبۂ علم میں تحقیق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ فلسفہ وسائنس اور علوم وفنون کے تمام آخری مسائل کے جوابات اس کے کلام میں موجود ہیں اور سب کے درمیان منطقی ربط ہے کہ ان پر ایک مکمل، مربوط، اور جامع نظامِ فکر قائم ہوتا ہے۔ پھر عملی حیثیت سے جو رہنمائی اس نے زندگی کے ہر پہلو کے متعلق انسان کو دی ہے، وہ انتہائی پاکیزہ ہی نہیں بلکہ ۱۴سو سال سے روئے زمین کے مختلف گوشوں میں بے شمار انسان بالفعل اس کی پیروی کر رہے ہیں اور تجربے نے ان کو بہترین ثابت کیا ہے۔ کیا اس شان کی کوئی انسانی تصنیف دنیا میں موجود ہے

Marfat.com

یا کبھی موجود رہی ہے جسے اس کتاب کے مقابلے میں لایا جاسکتا ہو؟‘‘

کیا دنیا کی کوئی ایسی کتاب ہے جس نے نوعِ انسانی کے افکار، اخلاق، تہذیب اور طرزِ زندگی پر اتنی وسعت اتنی گہرائی اور اتنی ہمہ گیری کے ساتھ اثر ڈالا ہو کہ پہلے اس کی تاثیر نے ایک قوم کو بدلا اور پھر اس قوم نے اٹھ کر دنیا کے ایک بہت بڑے حصے کو بدل ڈالا۔ کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جو اس قدر انقلاب انگیز ثابت ہوئی ہو۔ یہ کتاب صرف کاغذ کے صفحات پر لکھی نہیں رہ گئی ہے بلکہ عمل کی دنیا میں اس کے ایک ایک لفظ نے خیالات کی تشکیل اور مستقل تہذیب کی تعمیر کی ہے۔ ۱۴سو برس سے اس کے ان اثرات کا سلسلہ جاری ہے۔ اور روز بروز اس کے یہ اثرات پھیلتے چلے جارہے ہیں۔ آج اگرچہ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی میں براہِ راست اس کے اثرات کم محسوس ہورہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج بھی امتِ مسلمہ کو اگر کوئی چیز بچا رہی ہے اور بہت سارے دلوں میں شعلہ بن کر سلگ رہی ہے اور جب اندھیرا گہرا ہوجائے گا تو وہ روشنی بن کر طلوع ہوگی اور امتِ مسلمہ نئے سفر پر نکل کھڑی ہوگی۔ وہ یہی کتاب ہے اور یا وہ ذات ہے جس پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ یہی اس کا سب سے بڑا اعجاز ہے جس نے اس کتاب کو بے مثل اور معجز بنادیا ہے۔

Marfat.com

13- بعثت رسول ﷺ کے تین مقاصد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْھُمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُھُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْھِمْ﴾

آنے والے رسول کے تین مقاصد بیان کیے گئے ہیں۔

ا: تلاوتِ آیات۔ ۲: تعلیمِ کتاب وحکمت۔ ۳: تزکیۂ نفوس۔

تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ بیان کرنے کی وجہ

یہاں غور کیجیے! تلاوت اور تعلیم کو الگ الگ دو مقاصد کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ تلاوت کا تعلق الفاظ سے ہے اور تعلیم کا معانی سے۔ ان دونوں کو الگ الگ بیان کرنے سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم میں جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح اس کے الفاظ بھی مقصود ہیں۔ جب قرآنِ پاک کی تعریف کی جاتی ہے تو صرف اس کے معانی کو قرآن نہیں کہا جاتا بلکہ یہ کہا جاتا ہے: ھو النظم والمعنی جمیعا کہ ''قرآنِ کریم الفاظ اور معنی دونوں کا نام ہے''۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اہلِ کتاب کی طرح اسلام میں وحی کا تصور صرف معنی کا دل میں القا کر دینا نہیں وہ اپنی کتابوں کے بارے میں یہی تصور رکھتے ہیں کہ ان کتابوں کا معنی اور مفہوم ان کے پیغمبروں پر نازل ہوا تھا جسے انھوں نے اپنے الفاظ میں ترتیب دے کر اپنی امتوں تک پہنچایا، شائد یہی وجہ ہے کہ ان کی کتابیں مختلف زبانوں میں ترجمہ ہوتی گئیں اور ہر ترجمے کو انھوں نے کتاب اللہ قرار دیا جس کا نتیجہ رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ جس اصل زبان میں سب سے پہلے وہ کتاب مرتب ہوئی تھی وہ مٹ گئی۔ باقی صرف ترجمے رہ گئے اب یہود اور نصاریٰ کو یہ تک معلوم نہیں کہ ان کی کتابیں اصل میں کس زبان میں تھیں۔ مسلمان یہ عقیدہ رکھتے ہیں اور یہ قرآن

Marfat.com

وسنت کے دلائل پر مبنی ہے کہ آنحضرت ﷺ پر قرآن کے الفاظ نازل ہوئے تھے، جس طرح آج ہم قرآنِ پاک کے الفاظ کی تلاوت کرتے ہیں، اسی طرح یہ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئے تھے اور مزید یہ کہ صرف الفاظ ہی نازل نہیں ہوئے تھے بلکہ ان کے پڑھنے کا طریقہ ان کے مخارج، ان کی ادائیگی کا اسلوب، ان کا لب ولہجہ، جسے آج تجوید کے نام سے ایک فن کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ یہ سب کچھ آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا تھا۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کو قرآنِ پاک پڑھنا سکھایا اور پھر انھیں الفاظ کا دور ہر سال ایک دفعہ حضور کے ساتھ کرتے اور آخری سال دو دفعہ کیا۔ آنحضرت ﷺ نے یہی لب ولہجہ اور قرآنِ پاک پڑھنے کا طریقہ امت تک منتقل کیا۔ چنانچہ آج ہم جب قرآنِ پاک پڑھتے ہیں تو ہم ان دونوں باتوں کی پابندی کرتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی لفظ بدلنے نہ پائے، اس کے اعراب میں غلطی نہ ہو۔ دوسرا یہ کہ پڑھنے کے انداز میں کوئی تبدیلی نہ آنے پائے۔ آنحضرت ﷺ کی تلاوت سے اہلِ علم نے جو اصول اخذ کیے ہیں انھیں فنِ تجوید کے نام سے مدون کر دیا گیا ہے۔ قراء حضرات انھیں اصولوں کی پابندی سے قرآنِ پاک خود پڑھتے ہیں اور دوسروں کو پڑھنا سکھاتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی صرف قرآن پاک کے معنی اور مفہوم اور اس کے احکام کو قرآن قرار دیتا ہے تو وہ سخت غلطی کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مقصود اگرچہ قرآن پاک کا سمجھنا اور اس پر عمل کرنا ہے لیکن چونکہ الفاظ بھی قرآنِ کریم کی حقیقت میں شامل ہیں اور یہی کلام اللہ ہے اس لیے ان سے صرفِ نظر کرنا انتہائی گمراہی ہے۔ مسلمانوں کو اسے سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن حصولِ ثواب وتقرب کے لیے قرآنِ کریم کی تلاوت انتہائی ضروری ہے۔ ایک آدمی اگر قرآنِ کریم کو نہیں سمجھتا وہ صرف اس کو سادہ پڑھنا جانتا ہے، تو قرآن سمجھنے کی کوشش نہ کرنا یقیناً ایک کوتاہی ہے جس کی باز پرس ہوگی۔ لیکن بغیر سمجھے اس کی تلاوت اجر وثواب سے خالی نہیں۔ یہ اللہ کا کلام ہے اسے پڑھنے سے آدمی اپنے رب سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اس کے انوار اس پر برستے ہیں، وہ جتنا اخلاص اور محبت سے پڑھے گا اتنا ہی اجر وثواب سے نوازا جائے گا۔ صحابہ کرام باوجودیکہ قرآنِ پاک کی زبان کو خوب سمجھتے تھے لیکن وہ صرف غور وفکر پر اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مسلسل اس کی تلاوت کرتے رہتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دفعہ قرآنِ پاک ختم کرنا تو ایسا معمول تھا جس میں کوئی صحابی بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ قرآنِ پاک کے الفاظ کے بارے میں مسلمانوں کا یہ عقیدہ اور یہ نازک احساس ہی ہے جس نے آج تک قرآنِ پاک کے الفاظ

Marfat.com

میں کوئی تبدیلی نہیں ہونے دی اور یہ قرآن سے محبت کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک بڑی تعداد حفاظ کی رہی ہے اور اسی عقیدہ اور احساس کا نتیجہ ہے کہ فقہائے کرام نے صرف ترجمے کو بغیر الفاظ کے شائع کرنا حرام قرار دیا ہے اور صرف ترجمے کو قرآن کہنے سے منع کیا ہے اور یہ بھی ان کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص صرف ترجمہ پڑھتا ہے تو اسے قرآن پڑھنے پر جو اجر وثواب ملتا ہے وہ اس سے محروم رہے گا۔

آیاتِ قرآنی کی تحقیق

آیاتِ قرآنی اگرچہ الفاظ ہی کے مجموعے کا نام ہے، لیکن اس کا معنی اور مفہوم ایک اور حقیقت کی طرف بھی رہنمائی کرتا ہے۔ آیات، آیت کی جمع ہے۔ یہ اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی چیز پر دلیل لائی جاسکے۔ اس پہلو سے آسمان اور زمین کی ہر چیز آیت ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر چیز اللہ کی قدرت اور حکمت اور اس کی مختلف صفاتِ خلق و تدبیر پر ایک دلیل ہے۔ اسی طرح انبیائے کرام کے معجزات بھی آیت کہلاتے ہیں کیونکہ وہ بھی اپنے پیش کرنے والوں کی سچائی پر دلیل تھے۔ علی ہذا القیاس قرآن پاک کے الگ الگ جملوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں سے ہر آیت کی حیثیت ایک دلیل اور برہان کی ہے۔ جس سے اللہ کی صفات اور اس کے احکام وقوانین کا علم حاصل ہوتا ہے۔ اور ان میں سے ایک ایک آیت بعض دفعہ گہری حقیقتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

مختصر یہ کہ الفاظِ قرآن، قرآن کی حقیقت میں شامل ہیں۔ اس لیے رسول اللہ ﷺ کے منصبی فرائض میں سے پہلا فریضہ یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے قرآنِ کریم کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں۔ لیکن یہ بات ذہن میں رہنی چاہیئے کہ تلاوت کے ساتھ جب علیٰ کا صلہ آتا ہے تو اس سے فعل تلاوت میں ایک زور اور اختیار کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جس سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اللہ کا نبی اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے تو وہ اس طرح تلاوت نہیں کرتا جیسے خوش الحان قاری لوگوں کو قرآن پڑھ کر سناتا ہے۔ وہ خود بھی جھومتا ہے لوگ بھی جھومتے ہیں بلکہ اللہ کا نبی جب قرآن پڑھ کر سناتا ہے تو وہ اللہ کے قاصد اور اس کے سفیر کی حیثیت سے اللہ کے فرامین اللہ کے بندوں تک پہنچاتا ہے۔ سننے والے چاہے ہزار مخالف ہوں، چاہے ان کے ہاتھوں پیغمبر کی جان کو بھی خطرہ ہو لیکن جب وہ قرآن پڑھتا ہے تو چونکہ اس کی زبان سے اللہ

Marfat.com

بولتا ہے اس لیے اس کا لب ولہجہ ایک تحکم کا انداز رکھتا ہے اور اس کی بے خوفی اور بے نیازی احکم الحاکمین کی بے خوفی اور بے نیازی کا پرتو ہوتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں جو کچھ پڑھ کر سنا رہا ہوں یہ میرا نہیں بلکہ اللہ کا کلام اور اس کے احکام کا مجموعہ ہے۔ اس کے لب ولہجہ میں شان وشکوہ کے ساتھ ساتھ گہری فکر مندی اور دل سوزی بھی ہوتی ہے۔ جس سے وہ سننے والوں کے نازک احساسات کو بھی انگیخت کرتا ہے اور آنے والے خطرے سے بھی انھیں آگاہ کرتا ہے کہ اگر تم نے قرآن کریم کو کما حقہ اہمیت نہ دی تو یاد رکھو! تم اللہ کے عذاب کا شکار ہو جاؤ گے۔

تعلیمِ کتاب وحکمت

آنحضرت کا دوسرا فرضِ منصبی، تعلیمِ کتاب وحکمت ہے۔ تعلیم تلاوت سے ایک بالکل مختلف اور زائد چیز ہے۔ تلاوتِ آیات کا مطلب تو یہ ہے کہ اللہ کا رسول لوگوں کو وہ آیات پڑھ کر سنا دیتا ہے جو اس پر نازل ہوئیں۔ پڑھنے کا طریقہ ان پر واضح کر دیتا ہے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو آداب سے آگاہ کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بات کہ اس کا معنی اور مفہوم کیا ہے۔ اس کا تعلق تلاوت سے نہیں تعلیم سے ہے۔ ایک معلم کا کام یہ ہے کہ وہ کسی بھی کتاب کے پڑھنے والے کو پہلے الفاظ کے معنی سمجھائے پھر ان کی مراد واضح کرے، پھر اس میں اگر کوئی مشکلات ہوں تو انھیں آسان کرے، اگر اس میں کوئی اجمال ہے تو اس کی تشریح کرے، ابہام ہے تو وضاحت کرے۔ اگر بین السطور کوئی اعتراض، کوئی اشکال، مقدر ہے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اگر کوئی چیز مضمر ہے تو اسے کھولے، اگر کسی آیت کا تعلق احکام سے ہے تو احکام کا معنی اور مفہوم واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس کی عملی صورت کو بھی واضح کرے۔ یعنی تھیوری کو پریکٹس میں لا کر دکھائے اور اگر ضرورت مخاطب کی ذہنی تربیت کی ہو تو سوالات کی صورت میں ذہن کو جلا دینے کی کوشش کرے۔ غرضیکہ جن جن باتوں سے افہام وتفہیم میں آسانی ہو، فکر وتدبر کی صلاحیت بڑھے اور کتابِ الٰہی پر غور کرنے کی استعداد میں اضافہ ہو وہ سب کچھ کرنا ایک معلم کی تعلیمی ذمہ داری ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کو تعلیم دیتے ہوئے ان تمام چیزوں کا خیال رکھا اور ان تمام ضرورتوں کو پورا فرمایا بلکہ آپ کی تعلیم کی جو امتیازی خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان تمام ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی عمل سے صرف عمل کا نمونہ ہی پیش نہیں فرمایا بلکہ عمل کی آمادگی کے لیے جن احساسات، محرکات اور

Marfat.com

کیفیتوں کی ضرورت ہوتی ہے ان میں سے ایک ایک چیز کو آپ نے تعلیم کا حصہ بنا لیا۔ یہاں یہ بات یاد رہے کہ تلاوتِ کتاب کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ آپ پر قرآن کی صورت میں نازل ہوا وہ آپ نے پڑھ کر سنا دیا لیکن ان آیات کی تعلیم دیتے ہوئے آپ نے جو کچھ فرمایا جو وضاحتیں فرمائیں، جو شرح و تفسیر کی، جو تفصیلات مہیا فرمائیں، جو عمل کر کے دکھایا، یہ سب کچھ یقیناً تلاوتِ کتاب سے ایک زائد چیز ہے۔ یہی وہ زائد چیز ہے جو تعلیم کا لازمی حصہ ہے اس کے بغیر تعلیم کا کوئی تصور ہی پیدا نہیں ہوتا۔ صرف کسی کتاب کو پڑھ کر سنا دینا تو تعلیم نہیں تعلیم تو جیسے پہلے عرض کیا اس سے ایک زائد چیز ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلبا اپنے پاس اپنے اساتذہ کے تشریحی نوٹس محفوظ رکھتے ہیں، انھیں کی مدد سے وہ کتاب کو سمجھتے ہیں اور انھیں کی مدد سے وہ امتحان کی تیاری کرتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی ان سے یہ کہے کہ تمھارے پاس اصل ٹیکسٹ بک یعنی نصابی کتاب موجود ہے تو تمھیں ان تشریحی نوٹس کی کیا ضرورت ہے؟ تو وہ کہنے والے کی جہالت پر ہنسیں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ معلم کی ضرورت اسی لیے تو ہے کہ وہ کتاب کی تعلیم دے اور یہ تشریحی نوٹس اسی تعلیم کا ثمرہ ہی تو ہیں۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کی تعلیم کے نتیجے میں احادیث اور سنت وجود میں آئی ہیں، کتاب اللہ کو ان کے بغیر سمجھنا ناممکن ہے۔ تشریح اور تفسیر کے حوالے سے قدم قدم پر حدیث و سنت کی ضرورت پڑتی ہے اور کتاب اللہ کے احکام کا تو تمام تر دارومدار حدیث اور سنت پر ہے ورنہ ان کی کوئی سی شکل متعین کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ یہی وہ بیان ہے جس کی ذمہ داری لیتے ہوئے پروردگار نے فرمایا:

اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَه ''اس کتاب کا بیان کرنا ہمارے ذمہ ہے''۔

حکمت کیا ہے؟

تعلیم کتاب میں ہم نے یہ جو عرض کیا کہ قرآن سیکھنے والوں میں فکر و تدبر کی صلاحیت پیدا کرنا اور قرآنِ کریم میں غور و فکر کی استعداد پیدا کرنا یہ بھی تعلیم کا ایک حصہ اور معلم کی ذمہ داری ہے۔ درحقیقت عام ضروریات سے آگے بڑھ کر قرآن پاک کا ایسا ادراک پیدا کر دینا کہ جس سے استنباط اور استنتاج کی صلاحیت پیدا ہو جائے اور عبارت کے ساتھ ساتھ کتاب کے اشارات اور اس کی دلالات کو سمجھنے کا ملکہ بھی پیدا ہو جائے اور پھر دل میں ایک ایسی لگن پیدا ہو جائے جس سے کتاب سمجھنے کے ساتھ ساتھ اس کے حقوق ادا کرنے کی امنگ بھی کروٹ لینے

Marfat.com

لگے۔ تو یہی وہ چیز ہے جس کو حکمت کہا جا سکتا ہے اور یہ چیز قرآن کریم کے ساتھ ساتھ حدیث اور سنت کے سائے میں رہنے سے ملتی ہے۔ اہلِ علم نے اگرچہ حکمت کے مختلف مفہوم مراد لیے ہیں۔ کہیں اس کو علم صحیح کہا گیا ہے، کہیں نیک عمل، کہیں عدل وانصاف، کہیں قولِ صادق، لیکن حضرت شیخ الہند نے اس کا ترجمہ تہہ کی باتوں سے کیا ہے اور یہی وہ تہہ کی بات ہے جو آنحضرت ﷺ کی حدیث اور سنت سے ملتی ہے۔ جو سرتاپا قرآنِ کریم ہی سے ماخوذ اور مستنبط ہوتی ہے۔

تزکیۂ نفوس کا مفہوم

آنحضرت ﷺ کا تیسرا فرضِ منصبی تزکیۂ نفوس ہے۔ تزکیہ کا معنی ہے ''صاف ستھرا بنانا'' اس میں دو مفہوم شامل ہیں، ایک ہے ظاہری اور باطنی نجاسات سے پاک کرنا۔ ظاہری نجاسات سے تو سب واقف ہیں باطنی نجاسات سے مراد کفر، شرک، غیر اللہ پر اعتمادِ کلی اور اعتقادِ فاسد نیز تکبر وحسد، بغض، حبِ دنیا وغیرہ ہیں۔ ان تمام نجاستوں سے پاک کرنا بھی تزکیہ میں شامل ہے۔ دوسرا مفہوم جو اس میں شامل ہے وہ ہے نشوونما دینا۔ درحقیقت یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں۔ اسے مثال سے یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک کاشت کار زمین میں کوئی فصل پیدا کرنے سے پہلے زمین کا تزکیہ کرتا ہے۔ اس میں اگر جڑی بوٹیاں پھیلی ہوئی ہیں تو وہ انھیں اکھاڑ پھینکتا ہے زمین میں اگر کھائیاں ہیں تو وہ انھیں پاٹتا ہے۔ کہیں ٹیلے ہیں تو انھیں زمین کے برابر کر دیتا ہے پھر زمین میں ہل چلا کر، سہاگہ دے کر زمین کو بھربھری بناتا ہے یعنی وہ تمام علائق اور موانع جو کاشتکاری میں رکاوٹ ہو سکتے ہیں ان میں سے ایک ایک چیز کو ختم کرتا ہے۔ اس طرح سے زمین جب کاشتکاری یا تخم قبول کرنے کے قابل ہو جاتی ہے تو تب وہ تخم کاشت کرتا ہے۔ یہ تزکیہ کا پہلا مرحلہ ہے۔ پھر جب وہ تخم کاشت کر دیتا ہے، تو اب دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اب ضروری ہے کہ جس چیز کو کاشت کیا گیا ہے، اسے کھاد کے ذریعے اور مسلسل نگرانی سے اس قابل بنایا جائے کہ ہواؤں کے جھونکے اسے جڑ سے نہ اکھاڑ سکیں۔ آبیاری کا ایسا سامان ہو کہ دھوپ کی تمازت اسے جلانے میں ناکام رہے۔ اسے ہر ممکن طریقے سے اس قابل بنایا جائے کہ اس میں استقلال اور استقامت کی کیفیت پیدا ہو جائے۔ ان دونوں مراحل کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ تزکیہ کا عمل مکمل ہو گیا ہے۔ بالکل یہی حال انسانی

Marfat.com

نفوس اور انسانی طبائع کا ہے۔ سب سے پہلے تزکیہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ جس کا تزکیہ کرنا مقصود ہو اس کے افکار کی حالت کو دیکھا جائے اگر اس میں فکری جمود ہے تو اسے توڑا جائے اور اگر اس کے دل و دماغ میں غلط قسم کے افکار جگہ بنا چکے ہیں تو انھیں نکالنے کی تدبیر کی جائے۔ اگر خواہشات مقاصد کا درجہ حاصل کر چکی ہیں تو ان کے لیے صحیح نہج اختیار کی جائے اور اگر ضروریات پوری زندگی پر غالب آچکی ہیں تو زندگی کا حقیقی شعور پیدا کیا جائے اور اس کے مقاصد کا صحیح تعین کیا جائے۔ فکری نہج کو درست کرنے کے بعد اخلاقی حالت کو دیکھا جائے، اگر حسنِ اخلاق کے بجائے اخلاقِ فاسدہ طبیعت میں راسخ ہو چکے ہیں تو ان کے ازالے یا امالے کی کوشش کی جائے اور اگر بلند انسانی اقدار کی جگہ حیوانی خصوصیات نے جگہ لے لی ہے تو انھیں انسانی اقدار سے بدلنے کی کوشش کی جائے۔ اس طرح سے جب تزکیہ کا طالب تمام موانع سے آزاد ہو جائے تو اب اس کے اندر اللہ اور رسول کی محبت، دین سے والہیت، اللہ کا خوف اور فکر آخرت کے اثرات گہرے کرنے کی کوشش کی جائے اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تزکیہ کے طالب میں استقلال اور استقامت کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوگی جس کے نتیجے میں افکارِ باطلہ، اخلاقِ فاسدہ اور ہوائے نفس اس پر حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ وہ بڑی توانائی اور ثابت قدمی سے ان میں سے ایک ایک چیز کا مقابلہ کر سکے گا۔ رفتہ رفتہ اس میں یہ قوت پیدا ہو جائے گی کہ وہ دوسروں سے متاثر ہونے کی بجائے دوسروں پر اثر انداز ہوگا اس کا ہر عمل متعدی ہوگا جس سے دوسرے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ جس طرح پانی مختلف اثرات سے جم کر جب برف بن جاتا ہے، تو پھر وہ صرف پانی نہیں رہتا بلکہ دوسروں کو ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ جو بھی اسے ہاتھ لگاتا ہے ٹھنڈک محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا اور جس ماحول میں اسے رکھا جائے گا وہ ماحول برودت کے اثرات قبول کیئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ اس تفصیل سے آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ تزکیہ تعلیم سے ایک مشکل کام ہے جس کے لیے نہائت دیدہ ریزی، مشقت اور صبر و ریاض کی ضرورت ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کے لیے تزکیہ کرنے والے کو اپنی شخصیت پگھلانی پڑتی ہے۔ اسی کی شخصیت کے اثرات ہیں جن سے دوسری صالح شخصیتیں وجود میں آتیں اور آہستہ آہستہ ایک چمن کھِل اٹھتا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کا تزکیہ ایسی ہی کاوشوں اور ایسے ہی احساسات کے ساتھ فرمایا تھا۔ جس کا نتیجہ تاریخ کے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ وہ لوگ جو علم کے لحاظ سے جاہل، اخلاق کے لحاظ سے بدقماش اور انسانیت کے

Marfat.com

لحاظ سے پرلے درجے کے حیوان تھے، اس تزکیہ کے عمل نے پہلے انھیں ہر طرح کی کج روی اور برائی سے نکالا اور اس کے بعد مسلسل محنت سے اس طرح انھیں نشوونما دیا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ، صدیق ہوگئے، عمر رضی اللہ عنہ، فاروقِ اعظم بن گئے، عثمان رضی اللہ عنہ، صاحب الحیاء کہلائے اور علی رضی اللہ عنہ، حیدرِ کرار ہوگئے، خالد رضی اللہ عنہ، سیف اللہ بن گئے، ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ، امین الامت بن گئے، غرضیکہ ایک ایک صحابی چرخِ ہدایت کا ایسا ستارہ بن کے چمکا کہ جس نے باطل کی ہر ظلمت کو کافور کردیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تزکیہ نے صحابہ میں جو حیرت انگیز صفات پیدا کیں اقبال نے ان میں سے چند کا ذکر بڑی خوبصورتی سے مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔

خاکی و نوری نہاد بندۂ مولا صفات
ہر دوجہاں سے غنی اس کا دلِ بے نیاز
اس کی امیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگہ دلنواز
نرم دمِ گفتگو گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز
اس کے زمانے عجیب اس کے فسانے غریب
عہدِ کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل
ساقیِ اربابِ ذوق فارسِ میدانِ شوق
بادہ ہے اس کا رحیق تیغ ہے اس کی اصیل

تزکیہ کی حقیقت کو جتنی گہری نظر سے دیکھنے کی کوشش کی جائے اتنی ہی اس کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک تزکیہ کرنے والا ایک طرف تو علمی طور پر تزکیہ کے طالب کو ایک ایک عقیدۂ فاسد، ایک ایک فکری کج روی، ایک ایک بداخلاقی، ایک ایک عادتِ بد اور ایک ایک گندے تصور سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر مسلسل تربیت سے ان چیزوں سے اسے پاک بھی کرتا ہے۔ لیکن انسان کی اس کمزوری کا کیا علاج کیا جائے کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک چیز کے غلط ہونے کو جانتا ہے، وہ علمی طور پر خوب واقف ہے کہ فلاں چیز میرے دین کیلیے مہلک ہے اور اچھے ماحول میں رہ کر یا زور دینے پر وہ بری چیزوں سے بچنے کی کوشش بھی کرتا ہے، لیکن اس کے اندر وہ قوت پیدا نہیں ہوتی جو اسے بری چیزوں کے قریب نہ جانے دے اور وہ امنگ اس کے اندر نہیں اٹھتی جو اسے ہر اچھی بات کا دیوانہ بنا دے۔ غالب کا مشہور شعر ہے۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

Marfat.com

تزکیہ کے لیے صحبتِ صالح ضروری ہے

مقصود تو طبیعت کو اطاعت و زہد کی طرف لانا ہے اگر وہ اطاعت و زہد کے ثواب کو جان کر بھی ادھر نہیں آتی تو پھر جاننے کا کیا فائدہ؟ یہی وہ مرحلہ ہے، جو انسانی تربیت کے لیے سب سے مشکل ہے۔ ہم تعلیم کے زور سے بہتر سے بہتر کتابیں پڑھا کر لٹریچر کا مطالعہ کرا کے تربیت کی کوشش کرتے ہیں لیکن دیکھنے میں یہ آتا ہے کہ اس سے کیفیت وہی پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر غالب نے کیا ہے۔ کہ ان کاوشوں سے علمی آگاہی میں تو ضرور اضافہ ہوتا ہے لیکن عمل کی مطلوب کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اللہ کے نبی اور ان کے راستوں پر چلنے والے علمی آگاہی کے ساتھ ساتھ یہ قوت بھی تزکیہ کے نتیجہ میں پیدا کرتے ہیں۔ وہ صرف یہی نہیں بتاتے کہ تمھیں مسلمان کی حیثیت سے کیا کرنا چاہیے بلکہ وہ طبیعتوں میں نیکی کی آمادگی بھی پیدا کرتے ہیں۔ جس طرح ایک مہذب آدمی کو صاف ستھرا رہنے کے لیے سمجھانا نہیں پڑتا علم کے رسیا کو مطالعے کے لیے ترغیب نہیں دینا پڑتی۔ ایک کھلاڑی کو سٹیڈیم کا راستہ نہیں دکھانا پڑتا کیونکہ ان کے اندر ان تمام کاموں کے لیے ایک آمادگی، رغبت یا ان کا احساس پہلے سے موجود ہے۔ یہی احساس اگر نیکی کو جاننے والے کے اندر پیدا کر دیا جائے تو پھر اسے نیکی کی ترغیب دینے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ شاید اسی لیے آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کے لیے نیکی کی تعریف یہ فرمائی تھی کہ نیکی وہ ہے جو تجھے خوش کرے اور برائی وہ ہے جو تیرے دل کی پھانس بن جائے۔ لیکن یہ اس صاحبِ ایمان کے لیے ہے جس کے اندر نیکی کا حقیقی شعور پیدا ہو چکا ہو اور یہ حقیقی شعور محض علم سے پیدا نہیں ہوتا نہ اس کے لیے کتابیں کفایت کرتی ہیں بلکہ اس کے لیے ایسے لوگوں کی صحبت اور تربیت ضروری ہے جن کے اندر نیکی ایک متعدی عمل بن چکا ہو اور جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آتا ہو اور جن کی صحبت میں بیٹھ کر دنیا کی محبت کم ہوتی ہو اور آخرت کی محبت بڑھتی ہو۔ کتابوں سے تو علم میں اضافہ ہوتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی صحبت حقیقت میں شخصیت ساز ثابت ہوتی ہے۔ اکبر مرحوم نے ٹھیک کہا تھا۔

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی آدمی بناتے ہیں

Marfat.com

کیفیت سے کیفیت پیدا ہوتی ہے

جب ہم کسی ایسے اللہ والے کی صحبت میں بیٹھتے ہیں کہ جب وہ جنت کی نعمتوں کا ذکر کرتا ہے تو اس کے منہ میں پانی بھر بھر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس نے جنت کی نعمتیں چکھ کر دیکھی ہیں اور جب وہ جہنم کے عذاب کا ذکر کرتا ہے تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ جاتا ہے اور اس کے جسم پر کپکپی چھوٹ جاتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی ہولناکیوں کو دیکھ چکا ہے۔ اندازہ فرمایئے! جنت اور جہنم کا حقیقی احساس آپ کو جنت اور جہنم کی تفصیلات پڑھ کر ہوگا یا ایسے اللہ والے کی اس طرح کی کیفیات دیکھ کر۔ اس طرح کی کیفیتیں جب دوسرے کی طرف منتقل ہوتی ہیں تو ان کے نتیجے میں شخصیت سے شخصیت بننے کا عمل شروع ہو جاتا ہے۔ جیسے جیسے یہ صحبتیں دراز ہوتی جاتی ہیں ویسے ویسے شخصیت کی تعمیر تکمیل پذیر ہوتی جاتی ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نے قرآنِ کریم میں یہ ضرور پڑھا کہ نماز خشوع خضوع سے ادا کرنی چاہیے۔ لیکن یہ خشوع و خضوع ہمارے اندر اس وقت پیدا ہوا اور اس کا صحیح تاثر ہمیں اس وقت نصیب ہوا جب ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامِ لیل میں دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور اللہ کے خوف اور اس کی محبت سے آپ کے سینے سے اس طرح آواز نکلتی ہے جیسے ہنڈیا ابلنے سے نکلتی ہے۔

ہم نے دنیا سے بے رغبتی اور زہد کے بارے میں بہت کچھ پڑھا بھی اور سنا بھی لیکن ہمارے اندر اس کی حقیقت اس وقت جلوہ گر ہوئی جب ہم نے حضور کے شکمِ مبارک پر پتھر بندھے ہوئے دیکھے اور جب ایک دفعہ بستر پر چند اشرفیاں پڑی رہ گئیں تو آپ نماز کے بعد فوراً گھر کی طرف لپکے اور اس وقت چین آیا جب آپ نے اشرفیوں کو خیرات کر دیا اور فرمایا کہ "محمد" اس حال میں اللہ سے ملے گا کہ اس کے گھر میں دنیا کا مال پڑا ہوگا۔

تزکیہ کا یہ مرحلہ جس کا تعلق تمام تر اہل اللہ کی صحبت سے ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے امت کو منتقل ہوا ہے اور قرآن پاک میں کئی جگہ اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ﴾

"مسلمانو! اللہ سے ڈرو اور سچے لوگوں کی صحبت میں رہو۔"

تزکیہ اور اصلاح کے لیے بنیادی چیز اللہ کا تقویٰ ہے اور وہ اس وقت تک پیدا نہیں

Marfat.com

ہوسکتا جب تک علمِ صحیح کے ساتھ ساتھ سچوں یعنی اللہ والوں کی صحبت اختیار نہ کی جائے۔

آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بارے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا اور پھر آپ کے فرائضِ نبوت کے بیان کرنے کے بعد آخر آیت میں اللہ نے اپنی دو صفتوں کا ذکر فرمایا ہے۔ "عزیز اور حکیم "۔"عزیز "کا معنی "غالب اور عزت اور قوت والے" کے ہیں۔ یعنی وہ ذات جو پوری قوت و ہیبت، شان وشکوہ اور اختیار اور اقتدار کے ساتھ کائنات پر حکمرانی کر رہی ہے۔"حکیم "کا معنی ہے "وہ ذات جس کے ہر کام میں حکمت، مصلحت اور مقصد وغایت ہو" ان دو صفتوں کے لانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید ہمیں یہ سمجھایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات پر پوری قوت اور پورے غلبے کے ساتھ حکومت کررہا ہے۔ اس کی قوت اور غلبے میں کوئی کمی نہیں اور کسی کی مجال نہیں جو اس کی حکومت کو چیلنج کر سکے۔ وہ ہر چیز پر پوری طرح حاوی اور متصرف ہے۔ لیکن اس کی حکومت اور اقتدار کا یہ معنی نہیں کہ وہ اپنی قوت وزور سے جو چاہے کر ڈالے بلکہ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے حکمت اور مصلحت کے ساتھ کرتا ہے کیونکہ وہ عزیز ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہے اس کا کوئی کام بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ وہ چونکہ عزیز ہے، اس لیے اس نے اپنی قوت سے اس کائنات کو پیدا کیا ہے، لیکن وہ عزیز ہونے کے ساتھ ساتھ حکیم بھی ہے، اس لیے اس نے اپنی پیدا کی ہوئی اس مملکت میں اپنے سفیر اور پیغمبر بھی بھیجے تاکہ وہ اس کی رعیت کو اس کے احکام اور قوانین سے آگاہ کریں۔ چنانچہ اس کے سفیروں اور پیغمبروں میں سے سب سے آخری سفیر اور پیغمبر "محمد ﷺ" کو بھیجا جارہا ہے تاکہ قیامت تک کے لیے اس مملکت میں بسنے والے انسانوں کو اللہ کے احکام اور قوانین سے آگاہ کریں اور زندگی کو اس طرح گزارنے کا طریقہ سکھائیں جس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔

Marfat.com

14- صبر اور نماز سے استعانت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلوٰةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ
﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلوٰةِ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرة:۱۵۳)

(اے ایمان والو! ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو، بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے)

اس آیتِ کریمہ کا صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا پس منظر پیش منظر اور تہہ منظر بھی سمجھا جائے۔ اس کا پس منظر اور تہہ منظر یہ ہے کہ یہ آیتِ کریمہ مدینہ طیبہ میں نازل ہوئی ہے اور مدینہ طیبہ میں آپ کے مخاطب اوس وخزرج کے علاوہ یہود کے تین قبیلے ہیں۔ مکہ معظمہ سے اگرچہ آپ ہجرت فرما چکے ہیں۔ لیکن وہ پس منظر میں رہ کر ابھی تک اسلام اور مسلمانوں کے لیے مسائل پیدا کر رہے ہیں۔ جہاں تک یہود کا تعلق ہے ان کی اسلام اور آنحضرت ﷺ سے دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ وہ بری طرح حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔ جس مذہبی سیادت اور منصبِ مشیخیت پر وہ فائز تھے اور جس کی وجہ سے ان کے لیے فتوحات کا دروازہ کھلا ہوا تھا، آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اپنے اس منصب کو ہلتا ہوا محسوس کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ نبی آخر الزماں قریش میں تشریف لا چکے ہیں۔ بیت اللہ کو ان کا الگ قبلہ بنا کر اللہ نے ان کو انفرادیت دے دی ہے اور اس سے ان کا قومی تشخص ابھر کر سامنے آگیا ہے۔ روز بروز مسلمانون کی تعداد بڑھ رہی ہے اور اسلامی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وہ اس بڑھتی ہوئی قوت کو اپنی قومی سیادت کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہمیں اللہ کی جانب سے امامت وقیادت کے منصب سے معزول کر کے نبی آخر الزماں کی امت کو فائز کیا جا رہا ہے۔ اب اگر یہ امت سیاسی طور پر بھی

Marfat.com

مستحکم ہوجاتی ہے تو ہمارے لیے جزیرۂ عرب میں کوئی جگہ باقی نہیں رہے گی۔ اس پوری صورتحال نے انھیں غیظ وغضب کی انتہا تک پہنچا دیا تھا۔ دشمنی میں وہ پہلے بھی کم نہ تھے لیکن مسلمانوں کا بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنا ان کو امید دلاتا تھا کہ شائد یہ ایک نقطۂ اشتراک مزید اشتراکات میں تبدیل ہوجائے۔ لیکن تحویلِ قبلہ کا حکم آنے کے بعد وہ دشمنی کے سوا ہر جذبے سے محروم ہوگئے۔ اب انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ جس طرح بھی ہوسکے اس نوزائیدہ تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے یا کم از کم ان کے لیے زیادہ سے زیادہ مشکلات پیدا کی جائیں۔ اس طرح سے مسلمانوں کے لیے مدینہ طیبہ، جس کے وسائل پر بہت حد تک یہود قابض تھے اور عوام کے اندر ان کا بے پناہ اثر رسوخ پایا جاتا تھا، ایک ایسی بستی میں تبدیل ہوگیا جس میں ان کے لیے ہر طرف خطرات کے ناگ لہراتے ہوئے نظر آتے تھے اور آئندہ انھیں اس سے بھی بڑے خطرات کا اندیشہ تھا۔

دوسری طرف قریش تھے۔ جنھوں نے مسلسل مسلمانوں کو اذیتیں پہنچا کر مکہ سے نکلنے پر مجبور کردیا تھا۔ آنحضرت ﷺ کو بظاہر بے بس اور تنہا پا کر قتل کردینے کا منصوبہ بنا چکے تھے کہ اللہ نے محض اپنے فضل وکرم سے آنحضرت ﷺ کو نہایت حفاظت کے ساتھ مدینہ پہنچا دیا۔ اس سے اگرچہ قریش کو بڑا دھچکا لگا لیکن پھر بھی وہ یہ سمجھنے لگے کہ ان کی مسلمانوں سے جان چھوٹ گئی۔ اب مدینے کا اجنبی ماحول اور یہود جیسے خطرناک دشمنوں کی دشمنی مسلمانوں کو ختم کردینے کے لیے کافی ہوگی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مسلمان تو روز بروز بڑھتے جارہے ہیں ان کی طاقت میں بھی اضافہ ہوتا جارہا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اللہ نے بیتِ ابراہیمی کو ان کا قبلہ مقرر کردیا ہے اور وہ یہ دعویٰ کرنے لگے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو اللہ نے ملتِ ابراہیم پر مبعوث کیا ہے اس لیے آپ اور آپ کی امت بیت اللہ کے صحیح اور جائز وارث ہیں۔ اس صورتحال نے ان کے اندر بھی ایک آگ لگادی تھی اور وہ یہ محسوس کرنے لگے کہ اگر مسلمانوں کو ختم کرنے یا روکنے کی بروقت کوشش نہ کی گئی تو مسلمان آگے بڑھ کر خانہ کعبہ کو واگزار کرانے کی کوشش کریں گے تاکہ وہ خانہ کعبہ کو مرکز بنا کر اسلامی تحریک کو تیزی سے آگے بڑھا سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مکہ ان کے سامنے سرنگوں ہوجائے گا اور عرب کی طاقت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے گی اور پھر قریش ان کے رحم وکرم پر ہوں گے۔

Marfat.com

آیت کا پیش منظر

قریش اور یہود کے ان اندیشوں نے آہستہ آہستہ فتنے کی شکل اختیار کرنا شروع کردی اور دونوں نے مسلمانوں کے استیصال کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرنے کے وعدے کرلیے۔ مسلمان اگرچہ ان حالات سے پوری طرح باخبر نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب ہیں وہ تو ہر طرح سے ان حالات کو جانتے تھے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ اور اگلی آیات میں مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے متنبہ کیا اور ساتھ ہی ان خطرات سے عہدہ برآ ہونے کا حل بھی تجویز فرمایا۔ اس آیتِ کریمہ میں اگرچہ خطرات کا ذکر نہیں لیکن ایک تو اس کے بعد کی آیات میں خطرات کی طرف واضح اشارے موجود ہیں اور دوسرا اس آیت میں جس طرح مدد چاہنے اور پھر اس کے لیے صبر اختیار کرنے کا حکم دیا جارہا ہے اس میں جس طرح خطرات کی طرف اشارہ موجود ہے جسے ہر معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے۔ آپ کسی فرد یا گروہ سے کہیے کہ تم اللہ سے مدد مانگو اور اس کے لیے صبر اور نماز کو اختیار کرو تو جو شخص بھی اپنے ماحول سے واقف ہے اور اپنے فرائض کی مشکلات سے بھی باخبر ہے اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ مجھے درحقیقت کیا کہا جارہا ہے۔ چنانچہ مسلمان بھی اس سے پوری طرح باخبر ہوگئے کہ ہمارے سامنے خطرات کی گھٹائیں اٹھنے والی ہیں اس لیے ہمیں اس کے لیے تیاری شروع کردینی چاہیے۔ چنانچہ تیاری کے لیے جو نسخہ تجویز ہوا، اس کے دو اجزا ہیں۔ ایک صبر، دوسرا نماز۔

خطرات اور مشکلات کا علاج

نظریاتی قوتیں جب کبھی ناموافق صورتحال سے دوچار ہوتی ہیں تو ان کے لیے سب سے بڑا سہارا ان کی اپنے نظریات سے کمٹمنٹ، وابستگی اور ان پر استقامت ہوتی ہے۔ یہی چیز ہے جو قوموں کو مشکل سے مشکل حالات میں حوصلہ مند بناتی اور مشکلات سے لڑنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ دشمن کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ انھیں بے حوصلہ کرکے ان کا مورال توڑ ڈالا جائے تاکہ یہ اپنے سائے سے بھی ڈرنے لگیں۔ ہر اٹھتی ہوئی آواز کو کوندتی ہوئی بجلی تصور کریں اور ہر چھوٹے بڑے خطرے کو دیکھ کر کمپرومائز کرنے پر تیار ہوجائیں۔ کسی قوم میں اگر واقعی ایسی کمزوریاں داخل ہوجائیں تو انھیں تباہ کرنے کے لیے

Marfat.com

دشمن کو زیادہ کوشش نہیں کرنا پڑتی کیونکہ جس طرح مدافعت کی قوتیں باہر سے کام کرتی ہیں، اس سے بڑھ کر اندر سے کام کرتی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہاتھ اور سہمے ہوئے دماغ اور سراسیمہ قلوب کبھی بھی حالات کا سامنا نہیں کر سکتے۔ اس لیے سب سے پہلے اسی بنیادی حقیقت کی طرف توجہ دلائی کہ تم اپنے اندر صبر کی قوت پیدا کرو، اپنے نظریات پر اڑ جاؤ، ہر قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاؤ، ڈرنے اور سہمنے کی بجائے جرأت اور استقامت کو اپنا ہتھیار بناؤ۔ لیکن قربان جایئے قرآنِ کریم کی بلاغت پر کہ اس نے صبر کا لفظ استعمال کیا جو اپنے اندر بڑی معنوی وسعت رکھتا ہے۔ جو کچھ ہم نے عرض کیا اس کے ساتھ ساتھ صبر کے مفہوم میں تین اور باتیں بھی شامل ہیں، جسے اہلِ علم صبر کی تین قسمیں شمار کرتے ہیں۔

۱۔ صبر علی الطاعات

۲۔ صبر عن المعصیات

۳۔ صبر علی المصائب

۱۔ صبر علی الطاعات کا مطلب ہے اپنے نفس کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا پابند کر دینا، نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنا دینا، نفس کو اس قابل بنا دینا کہ خواہشات اسے اپنے راستے پر چلنے کے لیے آمادہ نہ کر سکیں۔ امیدیں اور آرزوئیں نفس کو مجبور نہ کر سکیں کہ وہ شریعت کے حکم کو چھوڑ کر امیدوں اور آرزوؤں کی پیروی کرنے لگے۔ اللہ اور رسول کی اطاعت دل و دماغ اور نفس کے لیے مرغوب ہو جائے اور گناہ اور نافرمانی ان کے لیے مکروہ بن جائے۔

۲۔ صبر عن المعصیات اس کا معنی ہے معصیتوں اور نافرمانیوں سے صبر۔ یعنی آدمی اپنے آپ کو اس طرح مضبوط بنا دے کہ کوئی نافرمانی اس سے سرزد نہ ہونے پائے۔ نافرمانی کے مقابلے میں وہ اڑ جائے۔ اس کے لیے اسے کیسی ہی قربانی دینی پڑے اس سے کبھی دریغ نہ کرے۔

۳۔ صبر علی المصائب مصیبتوں پر صبر۔ نیکی کے راستے میں مصیبتوں کا آنا ایک ایسی اٹل سنت ہے جسے بدلا نہیں جا سکتا۔ جو آدمی حق کی علمبرداری کرتا ہے، باطل قوتیں اسے کبھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں اور جو شخص نیکی کو اپنا رویہ بنا لیتا ہے، برائی کی قوتیں اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کرتی یا اسے بہکانے کی کوشش کرتی ہیں۔ شریعت کی پابندی کرتے

Marfat.com

ہوئے جو شخص رزقِ حلال پر اصرار کرتا ہے گھر سے لے کر اس کے دفتر تک کتنے لوگ ہیں جو اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔ دوست احباب کی مجلس میں جو دوست اپنے دوستوں کے برے ارادوں کا ساتھ نہیں دیتا ان کی بری مجالس کی رونق نہیں بنتا ان کی خواہشات کی تائید نہیں کرتا، ایسے دوست کو کبھی برداشت نہیں کیا جاتا۔ ایسی ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنا اور پیش آمدہ مشکلات کو برداشت کرنا صبر علی المصائب ہے۔

یہ صبر کی مختلف قسمیں ہیں، جس میں قدرِ مشترک صرف ایک ہے۔ وہ ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی اطاعت اور اللہ کی رضا کا حصول یہ وہ عملی وابستگی ہے جو نظریاتی وابستگی سے مل کر انسانی عزم کو مضبوط بناتی ہے۔ جس کے نتیجے میں زندگی کے ہر شعبے میں باطل سے مقابلہ کرنے کی ایک ایسی قوت پیدا ہو جاتی ہے جو حق و باطل کے معرکے میں اصل مطلوب ہے۔ جو آدمی بھی یہ چاہتا ہے کہ میں حق و باطل کی آویزش میں اپنی ذمہ داریاں ادا کروں تو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی قوت پیدا کرنی چاہیے۔ یہ ایک ایسا سبق ہے جو نظریاتی پختگی کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے اور عملی طہارت اور پاکیزگی کا بھی۔ اس کے بغیر کبھی آدمی باطل کے مقابلے میں کھڑا نہیں رہ سکتا۔

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

دوسری چیز جس سے حق و باطل کے معرکے میں مدد طلب کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ نماز ہے۔

صبر کے سلسلے میں ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اگر اسے پیشِ نظر رکھا جائے تو دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حق و باطل کے معرکے میں پامردی، استقلال، اور استقامت شرطِ اول ہے۔ اور دوسری یہ چیز کہ صبر کا تعلق جس طرح ثابت قدمی سے ہے اسی طرح نفس کو معصیت سے بچانے اور نفس کو اطاعت کی زنجیر پہنانے سے بھی ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں صرف غنیم اور فریقِ مخالف پر بالا دستی اور برتری مقصود نہیں ہوتی بلکہ باطل کی سرکوبی اور حق کی سربلندی بھی مقصود ہوتی ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جبکہ اس معرکے کا ہر سپاہی اس حق کا پیکر، اطاعت گزار اور علمبردار ہو جس کے لیے وہ اس معرکے میں اترا ہے اور اس کی زندگی کے کسی شعبے میں بھی اس باطل کی پرچھائیں بھی نہ پڑے جس کو وہ ختم کرنا چاہتا ہے۔

Marfat.com

ایسے معرکے میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ آدمی جس حق کے لیے معرکہ آرا ہے اس حق کے ساتھ وابستگی بلکہ غائیت درجہ والہانہ تعلق میں کمی نہ آنے پائے بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا جائے اور دوسری یہ بات کہ چونکہ باطل کا ایک رنگ نہیں وہ ہزار رنگوں میں زندگی کے بیشتر شعبوں میں پھیلا ہوا ہے۔ اس کی سرکوبی کرنا یا اس کا مقابلہ کرنا آدمی کے اپنے وسائل سے ممکن نہیں کیونکہ ہر باطل کے پیچھے شیطانی قوتیں اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ اس کے مقابلے کے لیے ایسے بڑے سہارے اور پشت پناہ کی ضرورت ہے، جس کی مدد میسر آجائے تو شیطانی قوتیں اس کا سامنا نہ کر سکیں۔

نماز سے مدد

یہ دونوں قوتیں صرف نماز سے میسر آتی ہیں۔ نماز کے ذریعے آدمی کا اس ذات سے براہِ راست والہانہ تعلق پیدا ہو جاتا ہے جو حق کی سرچشمہ اور منبع ہے۔ جو خود حق ہے اور حق اس سے ظہور پذیر ہوتا ہے اور وہی ذات ہے جس کی مدد اور پشت پناہی کمزوروں کو مضبوط بناتی اور مغلوب کا غالب کر دیتی ہے۔ ایک بندۂ خدا جب نماز کے ارادے سے ہاتھ اٹھاتا ہے تو وہ سوائے اللہ کے تعلق کے باقی ہر تعلق کو پسِ پشت ڈال دیتا ہے۔ ان سے اظہارِ لاتعلقی کرتے ہوئے کانوں تک ہاتھ اٹھا کر غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ لیتا ہے۔ اس طرح سے وہ اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ میں اللہ کے سوا ہر آستانے پر جھکنے سے انکار کرتا ہوں اور ہر بڑائی اور آقائی کے دعویدار کی غلامی سے نفرت کا اظہار کرتا ہوں۔ اس کے بعد وہ اپنے آقا کی مدح وثنا میں ڈوب جاتا ہے۔ اسی کی پناہ چاہتا ہے، اسی کے نام سے ہر کام کا آغاز کرتا ہے۔ پھر اسی کی ذات کو مختلف صفات سے پکارتا ہے اور پھر اپنی عبدیت کا اظہار کرتے ہوئے عبدیت کے تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے اسی سے مدد کا خواستگار ہوتا ہے۔ فکر وعمل کی مختلف پگڈنڈیوں میں اسی سے صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرتا ہے۔ پھر اسی کی محبت اور اطاعت میں کبھی جھکتا ہے کبھی قیام کرتا ہے، کبھی غلاموں کی طرح بیٹھتا ہے، حتیٰ کہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ پھر اسی اظہارِ بندگی کے دوران وہ گھنٹوں اس کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے، جو اسے زندگی گزارنے کا طریقہ سکھاتی ہیں۔ اس کی آیاتِ رحمت پر رحمت کا طلبگار ہوتا ہے اور اس کی آیاتِ عذاب پر اس کے عذاب سے پناہ مانگتا ہے۔ شب وروز میں پانچ مرتبہ اسی عمل کو

Marfat.com

دہراتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے دل و دماغ میں اللہ کی کبریائی اس سے وفاداری، اپنی عاجزی اور اس کی بندگی کا تصور ایک مضبوط ایمان بن کر اس کے دل کی دھڑکن اور اس کے دل کی روشنی بن جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے اللہ کو حاضر و ناظر جانتا ہے۔ کوئی سا کام بھی کرے اسے یقین ہوتا ہے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ کسی حال میں بھی ہو وہ جانتا ہے کہ میں اللہ کی نگاہوں میں ہوں۔ میں تنہا بے بس اور بے کس نہیں ہوں۔ جو ذات میرے دل میں مکیں ہے وہی میرے گرد و پیش میں بھی ہے، میں اس کے حصار میں ہوں۔ دنیا کی کوئی قوت اس کے مقابلے میں میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ وہ جب تک مجھے زندہ رکھنا چاہے کوئی مجھے مار نہیں سکتا اور جب مارنا چاہے کوئی بچا نہیں سکتا۔ میری زندگی کا رویہ اس کی اطاعت اور اس کی بندگی ہے اور میری زندگی کا سب سے بڑا ہدف اس کے نام، اس کی حرمت اور اس کے دین پر اپنے آپ کو قربان کر دینا ہے۔ اس طرح نماز اسے اللہ کی بندگی کا پیکر بھی بناتی ہے اور ساتھ ہی اسے ایک ایسی توانائی اور قوت سے بھی بہرہ ور کرتی ہے جس کی موجودگی میں وہ نہ اس آستانے سے لاتعلق ہوتا ہے اور نہ کبھی کسی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ حق و باطل کے معرکے میں وہ یکہ و تنہا بھی ہو تو وہ اپنے آپ کو تنہا نہیں سمجھتا کیونکہ اس کا اللہ اس کے ساتھ ہے۔ اگر وہ زندہ رہے تو حق کا خادم بن کر زندہ رہتا ہے اور اگر اسے موت اپنی طرف بلائے تو وہ شہادت کا طلب گار بن کر سب سے آگے بڑھ جاتا ہے۔

حق و باطل کے معرکے میں چونکہ یہی دو قوتیں اساسی رول ادا کرتی ہیں، اس لیے بطورِ خاص ان کا حکم دیا کہ مسلمانو! تم جن نازک حالات سے گزر رہے ہو اس میں ضروری ہے کہ صبر اور نماز سے مدد چاہو کیونکہ یہی دونوں چیزیں تمھیں حق کے ساتھ وابستہ بھی رکھیں گی اور باطل کے مقابلے میں تمھیں پامردی اور استقامت بھی دیں گی۔ آیت کے آخر میں فرمایا گیا: اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ''بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ بظاہر یہاں اللہ کی معیت کی بشارت صبر کرنے والوں کو دی گئی ہے، نماز کا کوئی ذکر نہیں۔ لیکن جیسا کہ آپ نے مندرجہ بالا گزارشات میں دیکھا کہ صبر نماز سے الگ کوئی چیز نہیں ہے اور نماز ہی دراصل صبر کی قوت بھی عطا کرتی ہے۔ اس لیے صابرین میں یہ دونوں ہی شامل ہیں۔ لیکن بعض اہلِ علم نے اسے اس طرح بھی سلجھایا ہے کہ نماز میں تو یقیناً اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے کیونکہ نماز کے دوران جتنا آدمی اللہ کے قریب ہوتا ہے، اتنا کسی اور حالت میں نہیں ہوتا۔ اسی لیے نماز کو''

Marfat.com

معراج المومنین‘‘ کہا گیا ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ نماز واقعی نماز ہو، محض بیگار ٹالنے کی کوشش نہ ہو۔ مزید یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ جس نماز کا یہاں ذکر کیا گیا ہے جو مشکلات و مسائل میں آدمی کے لیے سہارا بنتی ہے وہ صرف پنجوقتہ فرض نماز نہیں بلکہ اس میں تہجد اور تمام نفل نمازیں بھی شامل ہیں کیونکہ نفل نمازیں بالخصوص رات کی نمازیں جبکہ دیکھنے والا کوئی نہ ہو، ایک مومن میں حقیقی روح اور زندگی پیدا کرتی ہیں اور انھیں سے اللہ کے ساتھ وہ مضبوط تعلق پیدا ہوتا ہے ، جو کسی سخت سے سخت آزمائش میں بھی شکست نہیں کھاتا اور انھیں سے مومن کے دل میں وہ محبت اور خشیت پیدا ہوتی ہے، جو اللہ کے ساتھ اس کا حقیقی تعلق پیدا کرتی ہے۔

اندازہ فرمایے! جن خوش نصیبوں کو اللہ کی معیت کا وعدہ مل جائے ان کی خوش نصیبی کا کیا ٹھکانہ ہے اور پھر حق و باطل کے معرکے میں ان کی کمزوری کا وہم بھی نہیں کیا جاسکتا کیونکہ کمزور تو وہ ہوتا ہے جو تنہا ہو یا جس کا ساتھ دینے والے کمزور ہوں۔ جس کے ساتھ اللہ ہو اس کے یہاں کمزوری کا کیا سوال؟ وہ بظاہر کمزور دکھائی بھی دیتا ہو، لیکن حقیقت میں وہ سب سے زیادہ طاقتور ہے کیونکہ اسے طاقتور کی معیت حاصل ہے لیکن اس کا حقیقی احساس اس وقت ہوتا ہے جب آدمی حق و باطل کی کشمکش میں شریک ہو اور اسے انتہائی ناموافق حالات سے گزرنا پڑ رہا ہو اور رہا وہ شخص جو نمازیں تو پڑھتا ہے لیکن باطل سے مقابلہ کا کبھی کوئی تصور اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا اس کے لیے نماز ایک تسکین کا باعث تو بن سکتی ہے قوت کا باعث نہیں بنتی۔

Marfat.com

15- اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا مفہوم اور اس کے تقاضے (حصہ اول)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِیّٖنَ وَاٰتَی الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ذَوِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰكِیْنَ وَابْنَ السَّبِیْلِ وَالسَّآئِلِیْنَ وَفِی الرِّقَابِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَی الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ﴾

(اللہ کے ساتھ وفاداری محض یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف رخ کرلو بلکہ وفاداری ان کی وفاداری ہے جو اللہ پر، یومِ آخرت پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور نبیوں پر صدقِ دل سے ایمان لائیں اور اپنے مال اس کی محبت کے باوجود قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، سائلوں اور گردنیں چھڑانے پر خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب معاہدہ کر بیٹھیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں۔ خاص کروہ لوگ جو فقر وفاقہ، تکالیفِ جسمانی اور جنگ کے اوقات میں ثابت قدم رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جنھوں نے راست بازی دکھائی اور یہی لوگ ہیں جو سچے متقی ہیں) (البقرہ: ۱۷۷)

Marfat.com

گزشتہ رکوع میں عربوں اور مسلمانوں کو توحید کی تعلیم دی گئی۔ توحید کے خلاف عربوں میں اور بنی اسرائیل میں جو جو تصورات پائے جاتے تھے اور جس جس طرح اللہ کی صفات میں بعض قوتوں کو شریک کیا گیا تھا ایک ایک کر کے ان سب پر تنقید کی گئی۔ اس ضمن میں مسلمانوں کو توحید کے ہمہ جہت تصور کو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس طرح سے توحید کو بنیاد بنا کر اللہ سے وابستگی اور اس سے وفاداری کی بنیادیں مستحکم کی گئیں۔ انسانی زندگی کا حادثہ یہ ہے کہ انسان بعض دفعہ فکری طور پر جس سے وابستہ ہوتا ہے ضروری نہیں ہے کہ وہ عملی لحاظ سے بھی اپنی وابستگی میں کامل ہو۔ بعض دفعہ فکری کاوشوں اور دماغی تصورات میں کوئی کمزوری نہیں ہوتی لیکن عمل سے الگ رہنے کی وجہ سے دماغی تصورات محض دماغ کی عیاشی ہو کر رہ جاتے ہیں۔ جب کبھی عمل کی کسوٹی پر پرکھنے کا موقع آتا ہے تو اصولی بات کو چھوڑ کر فروعی باتوں کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل ایک عبرتناک مثال کی حیثیت سے نگاہوں کے سامنے تھے۔ انھیں نشانہ بنا کر تعریض کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جارہا ہے کہ اللہ سے وفاداری کے تقاضے چند فروعی باتوں پر عمل کرنے سے ادا نہیں ہوتے جب تک اس کے لوازم و مراسم کی فکر نہیں کی جاتی اور ان کے حصول کو دینی زندگی کا حاصل سمجھ کر ہمہ تن کوشش نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اس حقیقت کو پیشِ نظر آیت کریمہ میں پوری طرح کھول کر بیان کیا گیا ہے۔

البر کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں البر کا لفظ اس طرح استعمال کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ نہ صرف یہ کہ اس آیت کا اصل مفہوم اور عنوان ہے بلکہ اسلامی زندگی کی اگر کوئی غرض وغائیت مقرر کی جاسکتی ہے تو وہ یہی لفظ ہے۔ عام تراجم میں اس لفظ کا ترجمہ ''نیکی یا اطاعت'' کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بالکل صحیح ہے لیکن اس ترجمہ سے اس لفظ کا حق ادا نہیں ہوتا۔ اس لفظ کے مفہوم میں جتنی وسعت ہے کسی زبان میں بھی ایسا لفظ موجود نہیں جو اس کا حق ادا کر سکے اور معنی ومفہوم کی ساری وسعتوں کو سمیٹ سکے۔ البتہ! ایک ایسا لفظ بعض اہلِ علم نے ترجمے کے طور پر اختیار کیا ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اس کے مفہوم کو ادا کرتا ہے۔ وہ ہے ''وفاداری یا Commitment'' کیونکہ عربی لغت میں اس کا اصل مفہوم ''کسی کے حق کو پورا کرنا'' ہے اور حق میں کوئی تخصیص نہیں۔ ایک مومن پر اللہ کا بھی حق ہے، ماں

Marfat.com

باپ کا بھی، مخلوقِ خدا کا بھی اور اپنی ذات کا بھی۔ ان تمام حقوق کو ادا کرنا اس لفظ کے مفہوم میں شامل ہے۔ حقوق کی ادائیگی اور حقوق کا ایفا اس لفظ کی اصل روح ہے۔ ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں شامل ہے، جو معاہدات، قول و قرار، حلف وولا، عقو اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں، جو عدل یا احسان کے تحت آ سکتی ہیں۔ براور بار اس لفظ کے صیغے ہیں، برٌّ ابوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہیں گے جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق پورے پورے ادا کرنے والا ہو۔ مختصر یہ کہ جتنے حقوق وواجبات ہیں اور جتنی نیکیاں اور بھلائیاں ہیں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ اس قدر وسیع المعنی اور وسیع الاطراف مفہوم کو واضح کرنے کے لیے یقیناً کوئی ایک لفظ ناکافی ہوگا جو پوری طرح اس کے مفہوم کو ادا کر سکے۔ عربی زبان چونکہ اپنے اندر بے پناہ وسعت رکھتی ہے اس میں ایسے الفاظ کا ہونا تو چنداں بعید نہیں اور پھر قرآنِ کریم کا انتخاب بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ لیکن ایسے الفاظ کا دوسری کسی زبان میں ترجمہ یقیناً بہت مشکل ہے۔ اس لیے اس لفظ کے مفہوم کا بھی پوری طرح احاطہ کرنا کسی لفظ سے تو ممکن نہیں۔ ہاں! بعض اہلِ علم نے وفاداری سے جو اس کا ترجمہ کیا ہے وہ ایک حد تک اس لفظ کی روح کو ادا کر دیتا ہے۔

وفاداری کے ایفاء کے لیے تین ناگزیر باتیں

کوئی آدمی یا کوئی قوم جب کسی کو اپنا آقا بنا لیتی ہے تو آقا کے ساتھ اپنی وفاداری کے تعلق کو پختہ کرنے اور اس حق کی ادائیگی کے لیے تین کام کرنا ناگزیر ہوتے ہیں۔ پہلا کام تو یہ ہوتا ہے کہ اپنے آقا سے متعلق تصورات اور آقا کی صفات کو پوری طرح دل و دماغ کا حصہ بنا لیا جائے، جب بھی آقا کا خیال آئے تو وہ تصورات اور وہ صفات اس کی ذات کے ساتھ ضم ہو کر رہ جائیں اس کے دل و دماغ کبھی ان تصورات سے بے گانہ نہ ہوں اور دوسری یہ بات کہ اس کا طرزِ عمل خود بولتا ہو کہ اس کا آقا کون ہے اور یہ واقعی اپنے آقا کا وفادار ہے۔ جس طرح اس کی فکر اس کی عقیدت میں ڈوبی ہوئی ہو اسی طرح اس کا ایک ایک عمل اس کی اطاعت کا آئینہ دار ہو اور تیسری چیز یہ کہ وہ اپنے زبان و قلم اور اپنے جذبات سے ہمیشہ وفاداری کے اس تعلق کا اظہار بھی کرتا رہے۔ اس اظہار کے لیے اسے کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے وہ کبھی دریغ نہ کرے۔ ان تینوں چیزوں میں پہلی چیز کی حیثیت بنیاد کی ہے، دوسری چیز کی حیثیت عمارت کی، اگر بنیاد

Marfat.com

مضبوط بنے گی تو عمارت بھی مضبوط ہوگی اور اگر بنیاد میں کمزوری ہے یا اس میں دراڑیں ہیں تو پھر عمارت کی ایک ایک دیوار کو شکست وریخت سے نہیں بچایا جاسکتا۔ رہی تیسری چیز تو اگر یہ دونوں چیزیں اپنی تمام تر صفات کے ساتھ موجود ہیں تو وہ چیز اس کی خوبصورتی اور اس کے ابلاغ کا ذریعہ بنتی ہے اور اگر پہلی دونوں چیزوں میں کمزوری ہے یا سرے سے موجود ہی نہیں تو پھر تیسری چیز پہلی دونوں چیزوں پر پردہ ڈالے رکھتی ہے اور ایک وقت آتا ہے جب دنیا اصل حقیقت سے باخبر ہوجاتی ہے اور یہ قوم ایک تماشہ بن کر رہ جاتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت اہلِ کتاب پہلی دونوں باتوں یعنی ایمان اور حسنِ عمل کی دولت سے محروم ہوچکے تھے۔ البتہ! اس کمزوری کو چھپانے اور دوسروں کو دھوکہ دینے کے لیے انھوں نے چند فروعی باتوں کو اصل قرار دے کر اپنی قوم کی تمام تر توجہ اسی پر مبذول کر رکھی تھی اور انہی فروعی باتوں کو بحث ومجادلہ کا ذریعہ بنا کر مذہب کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قرآنِ کریم ان کو اصل حقیقت کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ بندے کا اپنے رب سے تعلق بندگی کا تعلق ہے۔ اس کا رب اس کا آقا ہے اور بندہ اس کا غلام ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ اللہ سے یہ تعلق بندے کا کہاں تک قائم ہے ، یہ دیکھا جائے گا کہ اس تعلق کے بقاء اور استحکام کے لیے جن جن حقائق پر دل ودماغ کو یکسو کرنے کی ضرورت ہے کیا وہ یکسوئی میسر ہے یا نھیں؟ اور مزید یہ کہ کیا زندگی کا طرزِ عمل دل ودماغ کی یکسوئی کے مطابق ہے یا نہیں؟ لیکن اگر یہ رویہ اختیار کرلیا جائے کہ اس بات کی تو بالکل پرواہ نہ کی جائے کہ دل ودماغ کی ایمانی کیفیت کا حال کیا ہے اور پوری زندگی کس راستے پر چل رہی ہے؟ البتہ چند فروعی باتوں پر جھگڑے کا بازار گرم رہے تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ایسے افراد اور ایسی قوم کا اللہ کے یہاں کیا انجام ہوگا؟ اور دنیا میں ان کا کیا مقام ہوگا؟ چنانچہ اسی بنیادی حقیقت کی طرف متوجہ کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ کسی بھی قوم کا قبلہ اس کے دینی تعلق کے اظہار کی ایک علامت ہے۔ اگر تمام دینی مقاصد اور دینی تقاضوں سے صرفِ نظر کرکے صرف اسی ایک بات پر تمام دینی صلاحیتیں مرکوز کردی جائیں کہ ہمارا قبلہ مشرق ہے یا مغرب؟ تو اس سے ایک قوم کا جھوٹا بھرم تو باقی رہ سکتا ہے لیکن اس کی حقیقی زندگی کو موت سے کوئی نہیں بچاسکتا۔ یہود نے اپنے دینی بھرم کو باقی رکھنے کے لیے مسلمانوں کے ساتھ لڑائی شروع کر رکھی تھی کہ تحویلِ قبلہ کے نتیجے میں تم نے جو اپنے لیے نیا قبلہ تجویز کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور اسی ایک نقطہ پر ایک ہنگامہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اللہ فرماتا ہے کہ اللہ سے وفاداری کا

Marfat.com

صرف یہی تقاضا نہیں یا صرف یہی علامت نہیں کہ تم مشرق کی طرف منہ کرتے ہو یا مغرب کی طرف بلکہ اصل بات تو دیکھنے کی یہ ہے کہ تمھارے ایمان و عمل کا حال کیا ہے اور پھر اس کے بعد ایمانیات اور اعمال کی ایک تفصیل دی گئی ہے اور اس سے مسلمانوں کو بھی توجہ دلائی جا رہی ہے کہ دیکھنا تم بھی یہود کی طرح فروعی مسائل میں اپنا وقت ضائع مت کرنا اور ان کی طرح فروعی باتوں میں الجھ کر اصل دین سے دستبردار نہ ہو جانا۔ اپنے قومی مزاج کو اس طرح کا نہ بنا لینا کہ بے دینی اور بدعملی کے اونٹ نگلتے ہوئے بھی تمھیں کبھی خیال نہ آئے۔ لیکن فوائد کے حصول کے لیے حقوق کے مچھر چھاننے پڑیں تو اس سے بھی دریغ نہ کرو۔ لیکن اسی کے ضمن میں یہود پر تعریض بھی کی کہ تمھیں دینداری کے بہت دعوے ہیں لیکن قبلہ کے بارے میں تمھارا طرزِ عمل کیا رہا ہے کہ تم نے بھی دنیا کی اصلاح کرنے کی بجائے دنیا کی گمراہ قوموں کی طرح مشرق و مغرب کو اپنا قبلہ بنا لیا۔ یہ سراسر دنیا کی مشرک قوموں سے ان کے ربط و ضبط کا نتیجہ تھا۔ عجیب بات یہ ہے کہ کہاں ان کے یہ دعوے کہ ہم اللہ کے دین کے وارث ہیں اور اس لحاظ سے ہمیں تمام دنیا پر فضیلت حاصل ہے اور کہاں ان کا یہ حال کہ وہ بھی دیگر گمراہ قوموں کی طرح سمت پرستی میں مبتلا ہو گئے۔ حضور کی بعثت سے پہلے بیشمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی یہ سمت پرستی تھی اور مختلف جاہل قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں متعین جہت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی جہت پرستی پر چوٹ لگائی کیونکہ اہلِ کتاب اس میں ملوث ہو چکے تھے اور ارشاد فرمایا کہ مشرق اور مغرب میں کوئی تقدیس نہیں اور اللہ سے وفاداری کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام نے اگرچہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا لیکن نماز کے لیے کوئی سمت بحیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی۔ اس نے صرف ایک متعین مکان یعنی خانہ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اسے قبلۂ توجہ ٹھہرایا ہے خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے۔ چنانچہ دیکھ لیجیے! کہ بیت اللہ مصر، طرابلس وحبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے۔ ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں، شام و فلسطین اور مدینہ سے جنوب میں اور یمن اور بحرِ قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں۔

المشرق ''سورج دیوتا'' دنیائے شرک کا معبودِ اعظم رہا ہے۔ مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی ہے اور یہ چونکہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اس لیے عموماً جاہل قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا ہے اور عبادت کے لیے مشرق کی طرف رخ پھیر لیا۔

Marfat.com

یہود ونصاریٰ نے بھی انہی مشرک قوموں کی طرح بیت المقدس کے مشرق ومغرب کو اپنے درمیان تقسیم کرلیا اور بیت المقدس کے باہر مشرق ومغرب کی جہت ہی ان کے لیے قبلہ بن گئی۔ اس مشرکانہ ذہنیت کی تردید کے بعد فرمایا کہ اللہ سے وفاداری اور Commitment یہ نہیں ہے کہ تم سمت پرستی کا ارتکاب کرو اور مشرق ومغرب کے نام سے ہنگامے کھڑے کرو بلکہ اس کی وفاداری کا تقاضا تو یہ ہے کہ سب سے پہلے اپنے دل ودماغ کے قبلے درست کرو۔ ولکن البر کے بعد مضاف محذوف ہے اصل عبارت اس طرح ہوگی ولکن البر بر من امن "لیکن وفاداری اس شخص کی وفاداری ہے جو ایمان لائے۔" پھر ایمانیات کی تفصیل بیان کی گئی ہے کیونکہ اصل مقصود تو سیرت وکردار کی تعمیر ہے اور سیرت وکردار کی عمارت وجود میں نہیں آتی تاوقتیکہ اس کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم نہ ہو اور وہ مضبوط بنیاد دل ودماغ میں ان تصورات کے راسخ کرنے سے اٹھائی جاتی ہے جنھیں ایمانیات کہا جاتا ہے کیونکہ جب تک آدمی میں ان بنیادی تصورات کا استحضار نہیں ہوتا اس وقت تک اس کے اعمال کے لیے کوئی محرک وجود میں نہیں آتا جو قوت ارادی کے لیے تحریک پیدا کرسکے اور خیر وشر میں تمیز پیدا کرسکے اور پھر اس کے نتیجے میں اعمال ظہور پذیر ہوں۔ یہی وہ چیز ہے جس کو عقائد کا نام دیا جاتا ہے۔ اقبال نے ٹھیک کہا ؎

دین ہو فلسفہ ہو فقر ہو سلطانی ہو
ہوتے ہیں یہ پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز عمل خوار و زبوں
ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اس آیتِ کریمہ میں اللہ سے وفاداری اور حقیقی تعلق کے لیے جن ایمانیات کو ذکر کیا گیا ہے ہم اس کو نہایت اختصار کے ساتھ ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

۱:۔ اللہ پر ایمان: یعنی اللہ کے ایک ہونے اور اس کے ذات وصفات اور حقوق میں ہر طرح کے شرک یا شائبہ شرک سے بھی پاک ہونے پر ایمان اور اس بات پر ایمان کہ اس کی اطاعت سب پر غالب اور اس کا دیا ہوا ضابطۂ حیات سب سے بالا اور سب کے لیے لازم ہے۔

۲:۔ آخرت پر ایمان: یعنی اس بات کا یقین کہ مرنے کے بعد جی کر اٹھنا ہے' اپنے ہر قول وفعل کی اللہ کے سامنے جواب دہی کرنی ہے اور آخرت ہی کی کامیابی اصل کامیابی ہے۔ دنیا دار العمل اور مہلتِ عمل ہے اور آخرت دار الجزا اور تا ابد قرار گاہ ہے۔

Marfat.com

۳:۔ فرشتوں پر ایمان: یعنی فرشتے اللہ کی مخلوق ہیں۔ وہ اپنی ایک ہستی رکھتے ہیں اللہ نے ان کو معصوم اور قدسی صفت بنایا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ہدایت لانے والے امین اور معتمد ہیں۔ قضاء وقدر کے فیصلوں کی تنفیذ انھیں کے واسطے سے ہوتی ہے۔ یہ اللہ اور پیغمبروں کے درمیان وحی لانے کے لیے واسطہ ہیں۔ اگر ان کے معصوم ہونے کا یقین نہ ہوتو وحی کے محفوظ ہونے کا تصور بے معنی ہو جاتا ہے۔ ان کے سردار جبریل امین ہیں جو تمام فرشتوں کے مطاع ہیں۔ اللہ کے یہاں ان کا بڑا مقام ومرتبہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ پر وحی لے کر اترتے رہے۔ امین ان کا مستقل خطاب ہے کیونکہ وہ حقِ امانت میں نہ خیانت کرتے ہیں نہ خطا۔ انھیں قرآنِ کریم نے قوت والا قرار دیا ہے کوئی دوسری قوت ان کے سامنے ٹھہر نہیں سکتی۔ کوئی شیطانی قوت ان کے کام میں دخل انداز نہیں ہو سکتی۔

۴:۔ انبیاء ورسل پر ایمان: وہ چونکہ ایک ہی سرچشمۂ علم وہدایت کے فیض یافتہ ہوتے ہیں اس لیے ان میں تفریق نہیں کی جاسکتی کہ کسی ایک کو مانا جائے اور کسی ایک کا انکار کر دیا جائے۔ اللہ کی طرف سے مامور ہونے اور اس کے نمائندہ ہونے کی وجہ سے تمام انبیاء یکساں احترام کے مستحق ہیں اور سب پر ایمان لانا کہ وہ اپنے اپنے وقتوں میں اللہ کے پیغمبر بن کر آئے تھے اور انھوں نے نوعِ انسانی کو ہدایت کا راستہ دکھایا تھا یہ ہمارے لیے ازبس ضروری ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انبیاء اور رسولوں کی تعلیم اور ہدایت مرورِ زمانہ کے ساتھ تحریف وترمیم کا شکار ہوتی رہی اور قوموں نے اسے طاقِ نسیاں کی نذر کر دیا۔ اسی وجہ سے بار بار اللہ کی طرف سے نبی اور رسول آتے رہے اور ان پر کتابیں اترتی رہیں، حتیٰ کہ آخری رسول کی بعثت کا فیصلہ اس وقت ہوا جب تمام دنیا اللہ کے نبیوں کی لائی ہوئی تعلیم سے یا تو بے بہرہ ہو چکی تھی اور یا اس میں ترمیم اور تحریف کے ذریعے اسے کچھ سے کچھ بنا دیا گیا تھا۔ اب ضرورت تھی کہ ایک ایسا آفتابِ ہدایت طلوع ہو جو انسانوں پر چھائی ہوئی گمراہیوں اور ظلمتوں کی تاریکی کو ہدایت کے نور سے بدل دے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اس شان سے آفتابِ ہدایت بن کر تشریف لائے کہ علم وہدایت کے تمام دعوے ان کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ سابقہ شریعتیں ماند پڑ گئیں، جس طرح تاریکیوں نے اپنی صف لپیٹی اسی طرح چھوٹی موٹی رہنمائی کی شمعیں بھی گل ہوتی چلی گئیں۔

صحنِ چمن کو اپنی بہاروں پہ ناز تھا
وہ آگئے تو ساری بہاروں پہ چھا گئے

Marfat.com

16- حُبِّ دُنیا میں بے اعتدالی بہت سی خرابیوں کا باعث ہے (حصہ دوم)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِىَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

ایمانیات کی تکمیل سے دل و دماغ کو توانا اور فکری قوتوں کو جلا دینے کے بعد ضروری تھا کہ انسانی زندگی کے اس رشتے کی طرف توجہ دی جاتی جس کے بگڑ جانے سے انسانی معاملات، انسانی تعلقات اور روئے زمین کا امن تباہ ہو جاتا ہے۔ نظری اور فکری ہدایت انسانی زندگی کے لیے صحیح سمت مقرر کر دیتی ہے۔ لیکن انسانی ضروریات کی الجھنیں اور انسانی تعلقات کی بے اعتدالی وہ نہ صرف انسانی تعلقات کو بگاڑتی ہے بلکہ نظریاتی سچائی کو بھی گہنا کر رکھ دیتی ہے۔ چنانچہ وَاٰتَى الْمَالَ سے اسی ضرورت کو پورا فرمایا جا رہا ہے۔ دل و دماغ کی یکسوئی کے لیے اللہ اس کا رسول اور اس کے دین سے گہری وابستگی اور محبت یقیناً پہلی ضرورت ہے۔ لیکن اس محبت کو جو چیز سب سے زیادہ نقصان پہنچاتی ہے اور جس میں اعتدال نہ ہونے کی وجہ سے تمام رشتوں میں بے اعتدالی پیدا ہو جاتی ہے وہ حبِّ دنیا ہے۔ جب آدمی مال و دولت سے اس طرح پیار کرے کہ مال و دولت اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی متاع بن جائے اور وہ تمام تعلقات اور رشتوں کو اس پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر باقی تمام رشتے اس کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔ کوئی بھی سمجھدار اور شائستہ آدمی کبھی اس الزام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا کہ میں مال و دولت سے سب سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مال کے لیے ایمان چھوڑ دینا، دیانت چھوڑ دینا، رحم و مروت کے جذبات سے دستبردار ہو جانا اور اگر تصادم ہو جائے تو مال و دولت یا اس سے متعلقہ اشیاء کے حصول کے لیے خون بہا دینا، جان لے لینا اور کچھ نہیں تو ہر طرح کا دجل و فریب کر گزرنا یہ تو ہمارا قومی رویہ بن چکا ہے۔ مساجد تک اس سے محفوظ نہیں۔ خانقاہیں جو

Marfat.com

ذکر اللہ کا مرکز ہونی چاہئیں وہاں بھی یہی کاروبار ہوتا ہے۔خون کے رشتے دنیا کی محبت پر قربان کردیے جاتے ہیں۔چند مرلے زمین، چند لاکھ روپیہ، چند دنوں کی شہرت، چند دنوں کا منصب، یہ ہوس کی مختلف صورتیں ہیں۔جس پر ہم اپنے عزیز ترین رشتے قربان کردیتے ہیں۔چھوٹے لوگ اگر اس کے لیے اپنی سطح کے مطابق دجل وفریب اور لڑائی دنگا کرگزرتے ہیں تو بڑے لوگ ملکوں اور قوموں کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں اور اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ملک وقوم کو بھی بیچنا پڑے تو دریغ نہیں کرتے۔یہاں اللہ سے وفاداری کے تقاضوں کو پورا کرنے اور تمام حقوق کی ادائیگی کے لیے جس طرح ایمانیات پر زور دیا جاتا ہے، اسی طرح خالقِ فطرت نے مال سے تعلق کو بھی اس راستے پر ڈالنے کی تعلیم دی ہے جو راستہ اختیار کرکے بندگی اور انسانیت کے رشتے باقی رہتے ہیں اور اگر یہ راستہ اختیار نہ کیا جائے تو پھر کچھ بھی نہیں بچتا۔آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی جو مسلمانوں کے لیے سب سے زیادہ رؤف اور رحیم ہے اور جن کے لیے مسلمانوں کی کوئی تکلیف بھی قابلِ برداشت نہیں جو اپنے دل میں اس امت کے لیے والدین سے بڑھ کر شفقت رکھتے ہیں۔

آنحضرت ﷺ کی پریشانی کا حقیقی سبب

قرآن وسنت کا مطالعہ کرجایئے آپ کہیں نہیں دیکھیں گے کہ جن باتوں سے ماں باپ پریشان ہوتے ہیں حضور کبھی ان باتوں پر پریشان ہوئے ہوں۔ بیٹے کی مالی حالت اگر اچھی نہیں یا وہ برسرِ روزگار نہیں تو ماں باپ کی پریشانی دیکھی نہیں جاتی۔لیکن حضور نے اپنی امت کے لیے اس حوالے سے کبھی پریشانی کا اظہار نہیں فرمایا بلکہ پریشانی کا اظہار فرمایا تو اس سے برعکس باتوں پر۔آپ نے فرمایا:

مَاالفَقْرُ اَخشٰی عَلَیْکُم وَلٰکِنِّی اَخشٰی اَنْ تُبْسَطَ عَلَیکُمُ الدُّنْیَا کَمَابُسِطَتْ عَلٰی مَنْ کَانَ قَبلَکُم فَتَنَافَسُوھَا کَمَاتَنَافَسُوھَا فَتُھْلِکُکُم کَمَا اَھْلَکَتْھُمْ۔

"میں تم پر غربت سے نہیں لڑتا لیکن میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ تم پر دنیا وسیع کردی جائے جیسے پہلے لوگوں پر وسیع کی گئی پھر تم ایک دوسرے سے دنیا طلبی میں آگے نکلنے کی کوشش میں لگ جاؤ جیسے پہلے لوگ اسی تنافس اور دوڑ میں لگے رہے یہ صورتحال تمھیں اسی طرح تباہ کردے گی

Marfat.com

جیسے پہلے لوگوں کو تباہ کیا۔''

اندازہ کیجیے! آنحضرت ﷺ ہماری غربت سے پریشان نہیں بلکہ مال و دولت کی فراوانی سے پریشان ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مال و دولت کی فراوانی اپنی ذات میں پریشان کرنے والی چیز نہیں یہ اس وقت پریشان کن ثابت ہوتی ہے جب آدمی اس کی محبت کا اسیر ہو کر اسے اپنا مقصدِ زندگی بنالیتا ہے۔ اسے ضرورت کے وقت اور ضرورت کے مطابق نہیں کماتا بلکہ اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہنا اس کی دھن بن جاتی ہے۔ وہ اس بات سے پریشان نہیں ہوتا کہ میرے پاس کیا نہیں جسے میں حاصل کرلوں بلکہ اس کی پریشانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے پاس کیا کیا ہے تاکہ اس سے بہتر میں اپنے لیے حاصل کروں اور پھر وہ ایسی جوع البقر میں مبتلا ہوتا ہے کہ جسے کسی سطح پر جا کر بھی سیری کا احساس نہیں ہوتا بلکہ جیسے جیسے دولت بڑھتی جاتی ہے ویسے ویسے اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ چنانچہ دنیا کے مسائل اور مصائب کو دیکھا جائے تو اس کا سبب بھوک یا وسائل کی کمی نہیں بلکہ اس کا حقیقی سبب ہر دنیا دار کی ہوس ہے۔ اسے اپنی ہوس کے مطابق دنیا چاہیے اور ہوس اس کی اتنی وسیع ہے کہ تمام وسائل رزق پر قابض ہو کر بھی شائد اسے سکون نہ ملے۔ اس لیے وہ اسلامی زندگی جو ادائے حقوق اور ایفائے حقوق سے عبارت ہے اور جس کے نتیجے میں اللہ سے وفاداری کا حق ادا ہوتا ہے اسے حاصل کرنے کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ آدمی مال کی ہوس سے نکلے، وہ اسے کمائے ضرور، اس سے اپنی ضروریات بھی پوری کرے اور اپنے کاروبار کو جتنا بڑھا سکتا ہے بڑھائے لیکن اصل فکر صرف یہ ہو کہ میں دولت دولت کے لیے نہیں کما رہا بلکہ اس لیے کما رہا ہوں تاکہ میں اس میں اللہ اور بندوں کے حقوق ادا کرسکوں۔ اسے میں خیر کا ذریعہ اور خیر کی قوت بناؤں کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دولت ایک بہت بڑی قوت ہے اور اپنی ذات میں یہ خیر کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے اسے الخیر کے نام سے یاد فرمایا ہے۔ بلکہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمہ اللہ کے کہنے کے مطابق مال و دولتِ دنیا پانی کی مانند ہے اور انسانی زندگی ایک کشتی کی مانند ہے۔ کشتی کا بوجھ اٹھانے والی اور اسے کہیں سے کہیں لے جانے والی چیز پانی ہے۔ یہی اس کشتی کی اصل قوت ہے اس کے بغیر کشتی اپنی جگہ سے سرک بھی نہیں سکتی۔ لیکن یہ قوت اس وقت تک ہے جب تک یہ کشتی کے نیچے ہے۔ اگر کہیں یہ کشتی کے اندر داخل ہو جائے تو پھر کشتی کی تباہی و ہلاکت میں کوئی دیر نہیں ہوتی۔ یہ پانی کشتی کے نیچے اس وقت تک رہتا ہے جب تک دولت

Marfat.com

آدمی کے ہاتھ کی چھڑی ہو یا جیب کی گھڑی رہے لیکن اگر یہ دل کا محبوب بن جائے تو پھر سمجھ لیجیے کہ اب اس کشتی کے ڈوبنے میں کوئی دیر نہیں کیونکہ دل کا محبوب بن جانے کے بعد پھر آدمی اسی کی پوجا کرتا ہے اس سے حقوق ادا نہیں کرتا۔ لوگ اس کے سامنے تڑپ کر مر جائیں' انسانیت پر قیامت گزر جائے' اللہ کا دین یتیم ہو جائے' ایک دولتمند آدمی پر اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس لیے قرآن کریم نے انسان کی دکھتی رگ کو پکڑا اور بتایا کہ اللہ سے وفاداری کا حق ادا کرنے والے وہ لوگ ہیں جو مال سے محبت کے باوجود اسے اللہ کی راہ میں ہر اس جگہ خرچ کرتے ہیں جس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ لیکن مال خرچ کرنے اور مال دینے کے حوالے سے علیٰ حبہ کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے کہ وہ مال دیتے ہیں اس کی محبت میں۔

علیٰ حُبِّہٖ کا مفہوم

سوال یہ ہے کہ حبہ کی ضمیر کا مرجع کیا ہے؟ یعنی وہ کس کی محبت میں مال خرچ کرتے ہیں۔ بعض اہلِ علم کا خیال ہے کہ اس کا مرجع اللہ کی ذاتِ گرامی ہے' لیکن بعض اہلِ علم اس طرف گئے ہیں کہ اس کا مرجع خود مال ہے۔ لیکن عاجز کا ناقص گمان یہ ہے کہ دونوں ہی اس کا مرجع ہیں۔ مال اس کا مرجع ہے مال کی صفت کے اعتبار سے اور اللہ کی ذات اس کا مرجع ہے منتہا و مقصود کے اعتبار سے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ بر یعنی اللہ سے وفاداری کے مقام کو وہ لوگ پہنچ سکتے ہیں جو اللہ کی راہ میں ایسا مال خرچ کریں جو نہایت قیمتی بھی ہو اور انھیں عزیز بھی ہو اور اس کا ہاتھ سے دینا آسان نہ ہو۔ چنانچہ ایک جگہ قرآنِ کریم نے واضح طور پر اسے بیان فرمایا: ارشاد فرمایا:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾

''تم ہرگز البر کو نہیں پا سکو گے جب تک تم وہ خرچ نہ کرو جسے تم خود پسند کرتے ہو۔''

یا پھر آدمی ایسی چیز کو اللہ کی راہ میں خرچ کرے جس کا وہ خود انتہائی ضرورت مند ہو۔ وہ مالی پریشانیوں یا قحط اور گرانی کی وجہ سے خرچ کرنے کی ہمت نہ پا رہا ہو اس کی آمدنی میں گھر کی ضرورتیں بھی بمشکل پوری ہو رہی ہوں۔ چنانچہ قرآنِ کریم نے اس کا بھی ذکر فرمایا: ارشاد فرمایا:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾

''اور وہ اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں اگرچہ وہ بھوک سے ہوں۔''

Marfat.com

حدیث میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس کچھ مہمان آئے آپ نے اپنے سب گھروں میں ایک ایک کر کے کہلا بھیجا کہ کچھ کھانے کو ہو تو مہمانوں کے لیے بھیجو۔ لیکن تمام ازواجِ مطہرات کی طرف سے جواب ملا کہ گھر میں اللہ کے نام کے سوا کچھ نہیں۔ غالباً حضرت طلحہؓ یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے انھوں نے عرض کیا حضور اجازت دیں تو میں ان مہمانوں کی میزبانی کروں۔ آپ نے اجازت دے دی۔ وہ اپنے ساتھ مہمانوں کو لے گئے۔ بیوی کو جا کر بتایا کہ میرے ساتھ مہمان آئے ہیں۔ انھوں نے کہا گھر میں سوائے بچوں کے کھانے کے کچھ نہیں ہے۔ حضرت طلحہؓ نے کہا کہ بچوں کو کسی طرح بہلا پھسلا کر سلا دو اور جب میں مہمانوں کے ساتھ کھانے کے لیے بیٹھوں تو کسی بہانے دیا بجھا دینا۔ چنانچہ مہمانوں نے تاریکی میں کھانا کھایا اور انھیں اندازہ نہ ہو سکا کہ طلحہؓ ان کے ساتھ کھانے میں شریک ہیں یا نہیں وہ یہی سمجھتے رہے کہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ چنانچہ اس پر قرآنِ کریم کی یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو ایثار کا مستقل درس دے گئی کہ اللہ کے راستے میں انفاق اس طرح بھی ہوتا ہے کہ خود بھوکے رہو اور دوسروں کو کھانا کھلاؤ۔ آنحضرت ﷺ نے مختلف مواقع پر اسی کی تائید میں ارشادات فرمائے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ سب سے افضل صدقہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا: ایک بے مایہ شخص اپنی محنت کی کمائی میں سے ایک ایسے عزیز پر خرچ کرے جو اس کے خلاف اپنے دل میں عداوت رکھتا ہو۔ ان باتوں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لیے کس طرح کے ایثار اور کس طرح کے جذبات کی ضرورت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بات یاد رکھنا ازبس ضروری ہے کہ بڑے سے بڑا ایثار اور بڑی سے بڑی نیکی اس وقت تک اللہ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہوتی جب تک اس نیکی کا مقصد اللہ کی رضا کا حصول نہ ہو اور جب تک اللہ کی محبت دنیا کی محبت پر غالب نہ آئے۔ ایسے احساسات کے ساتھ اللہ کی راہ میں جب خرچ کیا جائے تو اس کے مصارف کی ایک ترتیب ہے جسے یہاں ذکر فرمایا گیا ہے کہ سب سے پہلے اپنے قرابت داروں کا جائزہ لو۔ ان میں سے اگر کوئی شخص ضرورتمند اور تمھاری مدد کا محتاج ہے تو تمھیں دوسروں کی نسبت سب سے پہلے اس کی مدد کرنا چاہیے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ البر تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنا مال قرابتداروں پر خرچ کرے۔

Marfat.com

قرابتداروں پر خرچ کرنا

قرابتدار چاہے ددھیالی رشتے کے ہوں یا ننھیالی رشتے کے، چاہے قریب کے ہوں چاہے دور کے، چاہے وہ اس سے مخلصانہ تعلق رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں، قرابت دار ہونے کی وجہ سے ان کا حق سب پر فائق ہے۔ اس بات پر اگر تھوڑا سا غور کرلیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کس طرح نہایت سادہ لیکن نہایت موثر طریقہ اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ ایک ملک میں رہنے والوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنا اور حصول معاش کے لیے مواقع اور ذرائع فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے اسی لیے اسلامی مملکتیں رفاہی مملکتیں ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ حکومت کی۔ تمام مخلصانہ مساعی کے باوجود سو فیصد یہ ذمہ داری ادا نہیں ہوتی۔ اس لیے اسلام نے تمام خوشحال لوگوں کو اس میں شریک کردیا کیونکہ غربت کے علاج کے لیے جہاں یہ بات بہت ضروری ہے کہ حکومت اپنے تمام وسائل بروئے کار لائے وہیں یہ بات بھی انتہائی اہم ہے کہ مسلمانوں میں ایک دوسرے کی ضرورتوں کا گہرا احساس پیدا ہو کوئی مسلمان اپنے آپ کو بے بس اور بے کس محسوس نہ کرے۔ ہر مسلمان اپنی حیثیت کے مطابق دوسرے کی فکر کرنے کا مکلّف بنایا گیا ہے اور پھر یہ ذمہ داری درجہ بدرجہ تمام معاشرے تک پھیلا دی گئی ہے۔ ہر آدمی کو اپنے قرابتداروں کے حوالے سے ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے، ہمسائے کو محلے بھر کی ہمسائیگی کا احساس دلایا گیا ہے اور پھر جیسے جیسے تعلقات کی نوعیتیں بدلتی ہیں ویسے ویسے اس ذمہ داری کی نوعیت بھی بدلتی ہے۔ لیکن آغاز اس کا سب سے پہلے قرابت داروں سے کیا گیا ہے۔ اندازہ فرمایئے! جس معاشرے کا ہر خوشحال فرد دوسروں کی ضرورتوں کی وجہ سے پریشان رہنے لگے اس معاشرے میں بھوک کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ بھوک تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل پر جو تمام کی ضروریات کے لیے کافی ہیں چند لوگ قابض ہو جاتے ہیں۔ اگر اس قبضے کا راستہ روک دیا جائے اور ہر ایک کے دل میں دوسرے کی فکر پیدا کردی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بھوک اور غربت کا علاج نہ ہو۔ علامہ اسد جو نو مسلم جرمن اخبار نویس تھے وہ اپنی کتاب Road to Mecca میں لکھتے ہیں:

(میں جن دنوں اسلام کو سمجھنے کے لیے عرب ملکوں کی سیاحت کر رہا تھا

Marfat.com

تو میں نے ایک دن ٹرین میں دیکھا کہ جب دوپہر کے کھانے کا وقت ہوا تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے لوگوں نے اپنے اپنے ٹفن کھولے یا کینٹین سے کھانا منگوایا تو میں نے ایک عرب کو دیکھا جس نے اپنے تھیلے سے ایک روٹی نکالی اور اس کے دو حصے کیے ایک حصہ خود رکھ لیا اور دوسرا سامنے بیٹھے ہوئے عرب بھائی کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اگرچہ لینے سے انکار کیا لیکن اس کے اصرار پر لے لیا دونوں نے ایک روٹی سے پیٹ بھر لیا۔ علامہ لکھتے ہیں کہ مجھے تب اندازہ ہوا کہ خیرالقرون میں مسلمانوں کی آسودگی کا اصل سبب یہی تھا کہ وہ نہایت سیر چشم تھے سادہ زندگی بسر کرتے تھے اور ہر آدمی دوسرے کے لیے فکر مند رہتا تھا۔ جس کے پاس ایک بھی روٹی تھی وہ دوسروں کے ساتھ بانٹ کر کھاتا تھا۔)

یتیموں مسکینوں کی دیکھ بھال

یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ سب سے پہلے قرابت داروں کو دیکھا جائے اور اس کے بعد مسلمان معاشرے میں سب سے پہلے ان بچوں پر نظر پڑنی چاہیے جو سایۂ پدری سے محروم ہو چکے ہیں، جن کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی قریبی عزیز بھی باقی نہیں۔ اب یہ اسلامی معاشرہ کی ذمہ داری ہے کہ وہ یتیموں کی دیکھ بھال کا انتظام کرے۔ یتیم وہ نادار بچہ ہے جس کے باپ کا سایہ بلوغ سے پہلے اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اب جب تک وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوتا یعنی وہ بالغ نہیں ہوتا اس وقت تک اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کی ضروریات اور اس کی تعلیم کا بندوبست کرے اور اگر وہ بالغ ہونے کے بعد بھی اپنی ضروریات کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں ہوا تو ایسے شخص کو مسکین کہا جاتا ہے۔ تو یہ مسکین بھی اسلامی معاشرے کی ذمہ داری ہے۔

مسافر کی مدد

بعض دفعہ ایک کھاتا پیتا خوشحال آدمی بھی دورانِ سفر کسی حادثے کا شکار ہو کر ضرورتمند بن جاتا ہے تو ایسے مسافر کی مدد کرنا مسلمانوں کے لیے ضروری ہے۔ اس کے

Marfat.com

بارے میں تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس شخص کے مالی حالات کیسے ہیں؟ اگر سفر نے اسے محتاج کر دیا ہے تو اس کی ہر صورت میں مدد ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی ذات میں محتاج اور نادار ہوتا تو مسکینوں میں شامل ہوتا۔ اس کا الگ ذکر کرنے کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا کھوج کرید کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ سفر میں وہ جس مصیبت سے دوچار ہے اس میں اس کی مدد کرنا ازبس ضروری ہے۔

السائلین

اس کے بعد والسائلین، سوال کرنے والے بھی مال دیئے جانے کے مستحق ہیں۔ یہاں بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے ان کا ذکر بھی چونکہ الگ سے کیا گیا ہے اس لیے ان کے بارے میں بھی تحقیق کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ جس نے بھی سوال کے لیے ہاتھ پھیلا دیا ہے اس نے گویا عزتِ نفس کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ اس لیے اب اس کی مدد کرنا ضروری ہو گیا۔ لیکن یہ بات بھولنا نہیں چاہیے کہ جب یہ آیات نازل ہو رہی تھیں اس وقت مسلمان کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا بڑے شرم کی بات سمجھتے تھے۔ عربوں میں خودداری ہمیشہ سے رہی ہے اور اسلام نے انھیں توحید کا درس دے کر ہر ایک سے بے نیاز کر دیا تھا۔ اس لیے ایسے لوگوں میں سے اگر کوئی شخص سوال کر ہی بیٹھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ انتہائی ضرورت مند ہے۔ لیکن آج کے دور میں جبکہ بھیک مانگنا ایک پیشہ بن گیا ہے اور بڑے بڑے گینگ مختلف طریقوں سے یہ دھندا کرتے ہیں اور بعض تو ایسے گروپ بھی بن چکے ہیں جو دوسروں ملکوں میں اسی غرض کے لیے جاتے ہیں۔ ایسی صورتحال میں ہر ایک کو دے دینا شائد مناسب نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ گرانی اور وسائلِ معاش کی کمیابی نے سفید پوشوں کو بھی بعض دفعہ سوال کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معاملہ بڑی احتیاط کا طالب ہے۔ زیادہ تجسس کرنا تو ہرگز مناسب نہیں لیکن کسی نہ کسی حد تک دیکھ بھال کر لینا اور صحیح حاجت مند کو پہچاننے کی کوشش کرنا یہ بھی ضروری ہے۔

وَفِی الرِّقَاب

وَفِی الرِّقَاب: اسی سلسلے کا یہ آخری مصرف ہے۔ رقاب، رقبہ کی جمع ہے ''گردن'' کو کہتے ہیں۔ رقاب سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ فك الرقاب کا معنی ہے

Marfat.com

''گردنوں کا آزاد کرانا۔'' گردنوں سے غلاموں کی گردنیں مراد ہیں۔ اللہ سے وفاداری کا حق ادا کرنے اور اس کی رضا کو حاصل کرنے کے لیے جن بڑے بڑے اعمال کا ذکر فرمایا گیا ہے ان میں غلاموں کی آزادی کے لیے کوشش کرنا شامل فرمایا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام کی نگاہ میں ایک غلام کو طوقِ غلامی سے آزاد کرانا اور اسے آزاد انسانوں کی سطح پر لاکر اپنے شعور اور ارادے کے مطابق زندگی گزارنے کا حق دینا اللہ کے یہاں کس قدر محبوب عمل ہے اور اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ غلامی اسلام کے نظام کا کوئی حصہ نہیں بلکہ اس کے اہداف سے سراسر متصادم ہے۔ حضرت ربعی ابن عامر جب مسلمانوں کے نمائندہ بن کر ایرانی سپہ سالار رستم سے ملے اس نے آپ سے پوچھا کہ تم لوگ کس غرض سے ایران پر حملہ آور ہوئے ہو آخر تمھاری اس فوج کشی کا مقصود کیا ہے؟ تو آپ نے اس سے تین باتیں ارشاد فرمائی تھیں۔ جن میں سب سے پہلی بات یہ تھی کہ ہم اس لیے اپنے وطن سے نکلے ہیں تاکہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دلائیں انسان نے مختلف شکلوں میں انسان کو غلام بنا رکھا ہے۔ کہیں دولت کے زور پر، کہیں حکومت کے زور پر اور کہیں طاقت کے زور پر، اسلام ایسی ہر زنجیر کاٹ دینا چاہتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دین جو انسان کی بیڑیاں کاٹنے کے لیے آیا ہے اس کے حریم میں طوقِ غلامی کا تصور کیسے داخل ہوسکتا ہے؟ یہ تو اس وقت کے بین الاقوامی قانونِ جنگ کی مجبوری تھی جس نے مسلمان کو مجبور کیا کہ وہ وقتی طور پر غلامی کو گوارا کرلیں۔ لیکن اسلام نے اسے جس طرح ختم کیا اور جس طرح غلاموں کو گھروں میں جگہ دے کر اسلام کی نشر و اشاعت اور غلاموں کی تربیت کے مواقع پیدا کیے وہ مسلمانوں کی تاریخ کے ایسے واقعات ہیں جس پر مسلمان ہمیشہ فخر کرسکتے ہیں۔ اس نے نہ تو رومیوں کی تاریخ دہرائی، نہ اس نے ایرانیوں کے ظلم کا راستہ کھلنے دیا، نہ اس نے جدید دور کے مسولینی اور ہٹلر کا طرزِ فکر اپنایا اور نہ اس نے یورپ اور امریکہ کے ہتھکنڈوں کا استعمال کیا اس نے انسانی سطح پر انسانی احساسات کو اجاگر کیا۔ انسانی محرومیوں کا مداویٰ کیا اور غلامی کی زنجیریں توڑنے کو عبادت کا درجہ دے دیا گیا۔ چنانچہ مسلمان حکمرانوں سے لے کر عام مسلمانوں تک اس نیکی کے اثرات دیکھنے میں آئے، ایک محدود وقت میں غلامی کے اثرات محدود سے محدود تر ہوگئے اور تربیت کے عمل نے انھیں غلاموں میں سے جوہرِ قابل کو نمایاں کیا اور ان میں ایسے افراد تیار ہوئے جنھیں ہم محدثین، مفسرین، متکلمین اور مجاہدین کی قابلِ

Marfat.com

عزت صفوں میں نمایاں مقام کے حامل دیکھتے ہیں اور یہ بھی تاریخِ انسانی کا ایک عجیب واقعہ رہے گا کہ انھیں غلاموں میں حکمران اٹھے جنھوں نے آزادوں پر حکومت کی اور ان کی قربانیوں نے تاتاریوں جیسے وحشیوں کا راستہ روکا، ٹھیک کہا کسی نے

غلاموں کو سریرِ سلطنت پر جس نے بٹھلایا
غلاموں کے سروں پر کر دیا اقبال کا سایہ

ایک ہندو شاعر کہتا ہے

کس کی حکمت نے یتیموں کو کیا درِ یتیم
اور غلاموں کو زمانے بھر کا مولا کر دیا

یہ اسلام کا اعجاز اور مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ آج غلامی قانوناً ختم ہو چکی ہے لیکن ظالم انسانوں اور خدا بیزار تہذیب نے غلامی کی نئی شکلیں ایجاد کر لی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اب انسان منڈیوں میں نہیں بکتے، لیکن آج قوموں کی معاشی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر انھیں معاشی قرضوں کی زنجیروں میں اس طرح جکڑا جاتا ہے کہ وہاں پیدا ہونے والا ہر بچہ سرمایہ دار ملکوں کا غلام ہوتا ہے۔ یہ تو وہ غلامی ہے جو بین الاقوامی سطح پر ہو رہی ہے اور جہاں تک ہر ملک کے اندر پلنے والی غلامی کا تعلق ہے اسے آپ ہر ترقی پذیر پسماندہ ملک میں دیکھ سکتے ہیں۔ کتنے لوگ ہیں جو سودی قرضوں کے باعث جیلوں میں بند ہیں، کتنے ایسے ہاری اور مضارع ہیں جو اپنے جاگیردار یا زمیندار سے لیے ہوئے قرضوں کے باعث اپنی اولاد تک کو گروی رکھ دیتے ہیں اور کتنے ایسے لوگ ہیں جو محض اپنی سادگی کے باعث قانون کی زد میں آگئے اور اب وہ برسوں سے جیلوں میں سڑ رہے ہیں اور اگر کہیں ضمانت ہو جاتی ہے تو زرِ ضمانت ادا نہ کر سکنے کے باعث جیل کی خاک بن جاتے ہیں۔ یہ غلامی کی مختلف شکلیں ہیں نام ان کے کچھ بھی ہوں لیکن حقیقت ایک ہی ہے ایسے تمام مظلوموں، بے کسوں اور مجبور لوگوں کو ظلم کے ان شکنجوں سے آزادی دلانا انشاء اللہ تعالیٰ فك رقبة کی نیکی کا حصہ ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو بڑھ چڑھ کر اس میں حصہ لینا چاہیے۔

وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ: اسلام کا مزاج ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جن باتوں کو دل و دماغ میں اتارنا چاہتا ہے اور جن صفات کو مزاج اور کردار کا حصہ بنانا چاہتا ہے اس کے لیے حکم بھی دیتا ہے، ترغیب بھی دیتا ہے، لیکن ساتھ ساتھ اس کی بار بار یاددہانی کا انتظام بھی

Marfat.com

کرتا ہے۔اسلامی سیرت کا دارومدار ایمانیات کی پختگی پر ہے۔جب تک اللہ سے حقیقی تعلق پیدا نہیں ہوتا، اللہ کا خوف دل میں راسخ نہیں ہو جاتا، اللہ کی ذات وصفات کا استحضار نصیب نہیں ہوتا اور اللہ سے قلبی وابستگی پیدا نہیں ہوتی اس وقت تک انسانی فکر اور انسانی اعمال میں کبھی تطہیر نہیں ہو سکتی۔قلب ونگاہ کی پاکیزگی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب آدمی کو یقین ہو جاتا ہے کہ کوئی ذات ہے جو علیم بذات الصدور ہے کوئی ہے جو میرے احساسات کو جاننے والا ہے کوئی ہے جو میرے ہر عمل کو پرکھنے والا ہے۔اسی طرح مال ودولت کے حوالے سے ایک مال دار اس وقت تک اعتدال پیدا نہیں کر سکتا جب تک وہ یہ نہیں سمجھتا کہ میں اپنے پاس موجود مال ودولت کا مالک نہیں امین ہوں۔جو اس کا مالک ہے وہ ایک دن مجھ سے اس کا حساب مانگے گا کہ تم نے میری دی ہوئی امانت کو خرچ کیا تھا یا نہیں اور اگر کیا تھا تو کیا انھیں مصارف میں خرچ کیا تھا جن کا میں نے حکم دیا تھا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ قلب ونگاہ کی پاکیزگی اور علائق دینوی کی شائستگی اور بالیدگی کا دارومدار ان تصورات کے رسوخ پر ہے جن کا اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے اس لیے پروردگار نے اس بات کا اہتمام فرمایا کہ ان بنیادی تصورات کو اس طرح بار بار یاد دلایا جائے کہ آخر وہ سیرت وکردار کا حصہ بن جائیں یا سیرت وکردار اس کے زیر اثر تشکیل پذیر ہوں۔اس لیے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا۔کیونکہ دن میں پانچ وقت نماز کی ادائیگی اس قدر موثر نسخہ ہے کہ اگر نماز پڑھنے والا شعور سے نماز پڑھے اور اس کی طبیعت اثر پذیری کے احساس سے محروم نہ ہو چکی ہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ نماز کے ذریعے ایمانیات کو دل ودماغ میں نفوذ پیدا کرنے کا موقعہ نہ ملے۔کیونکہ نماز اصلاً ایمان کی عظیم حقیقت کا مظہر ہے۔نمازی جب نماز کی نیت کرتا ہے تو وہ اللہ کی الوہیت، اس کی کبریائی اور اپنی بندگی اور عاجزی کے تصور کو زندہ کرتا ہے۔جب وہ ہاتھ اٹھا کر اللہ اکبر کہتا ہے تو دنیا کی ساری بڑائیاں اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔صرف ایک بڑائی اور عظمت اللہ کی ہے جس کا وہ اقرار کرتا ہے اور اس کے سامنے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔پھر وہ اسی کی ثنا کرتا ہے' اس سے پناہ چاہتا ہے' اسی کے گن گاتا ہے' اسی کی حمد کے زمزمے الاپتا ہے' اسی کی بندگی کا اقرار کرتا ہے' اسی سے مدد کا طالب ہوتا ہے پھر اسی سے ہدایت مانگتا ہے' اپنی ہر آزادی سے دستبردار ہو کر اسی کی بندگی اور اطاعت کا عہد کرتا ہے اور ان تصورات کو عملی شکل دیتے ہوئے وہ کبھی جھکتا ہے' کبھی اٹھتا ہے' کبھی سجدہ ریز ہوتا ہے' کبھی دوزانو بیٹھتا ہے' دل اللہ کے خوف سے لرزتا ہے' آنکھوں سے آنسو جاری ہوتے

Marfat.com

ہیں، دن میں پانچ دفعہ وہ امید و بیم کی کشمکش سے گزرتا ہے۔ اس طرح کے بار بار عمل سے اس کی زندگی کے تمام اعمال ایک نہج اختیار کر لیتے ہیں اس کا ذہن ایک منزل کا تعین کر لیتا ہے۔

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ دولتِ دنیا سے اعتدال سے بڑھا ہوا تعلق بہت سارے مفاسد کا سبب بنتا ہے۔ انفاق کا حکم دے کر ذہنی تصورات کو درست کرنا اور انسانی معاملات کو مفاسد سے بچانا مقصود ہے۔ چنانچہ انفاق کے بنیادی تصور کو سیرت و کردار کا حصہ بنانے اور اس تصور کی یاددہانی کے لیے زکوٰۃ کو قانونی حیثیت دی گئی اور اسے انفاق کا قانونی مظہر بنا دیا گیا۔ سال کے بعد جب اپنے پورے مال کا جائزہ لے کر آدمی زکوٰۃ ادا کرتا ہے اور یہ سمجھ کر ادا کرتا ہے کہ اس کا ادا کرنا میرے لیے فرض ہے تو اسے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ اگر یہ مال بندوں کی ملکیت ہوتا تو اس میں سے ایک حصہ ادا کرنا فرض نہ ہوتا اور اسی طرح یہ بات بھی ذہن میں تازہ ہو جاتی ہے کہ مال میں قرابتداروں، یتیموں، مسکینوں اور دوسرے ضرورت مندوں کا بھی حصہ ہے۔ تم مال دار ہو کر بھی غریب اور مسکین مسلمانوں سے الگ حیثیت کے مالک نہیں ہو، تمھاری ایک انسانی برادری ہے جس کے تم فرد ہو اور تمھارے ایک دوسرے کے حوالے سے حقوق و فرائض ہیں۔ انھیں حقوق و فرائض سے عہدہ برآ ہونا اسلامی زندگی ہے اسی اسلامی زندگی کی یاددہانی نماز سے بھی کرائی جاتی ہے اور زکوٰۃ سے بھی۔ اور زکوٰۃ کے سلسلے میں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ضرورت مندوں کے حوالے سے جو ذمہ داریاں مالداروں پر عائد ہوتی ہیں وہ صرف زکوٰۃ ادا کرنے سے ادا نہیں ہو جاتیں اور جس انفاق کا ابھی ذکر کیا گیا ہے وہ صرف زکوٰۃ تک محدود نہیں بلکہ جس بر و تقویٰ کے حاصل کرنے کی یہاں بات ہو رہی ہے اس کے حصول کے لیے ادائے زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ اس طرح فیاضانہ خرچ کرنا بھی ضروری ہے کہ جس میں اخفا بھی ہو اور ضرورت کے مطابق اظہار بھی۔

اس کے بعد وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ سے ایفائے عہد کی صفت کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ لیکن اسلوبِ کلام بدل گیا ہے اوپر انفاق، نماز اور زکوٰۃ کا ذکر فعل کی شکل میں آیا ہے لیکن یہ اسم فاعل اور صفت کی صورت میں ہے۔ عربی میں فعل کے صیغے صرف کسی فعل کے وقوع کو ظاہر کرتے ہیں لیکن صفت کے صیغے کسی مستقل صفت کسی خصلت اور کسی کردار کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ان کے اندر ایک عزم و جزم کی روح بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اللہ سے بر و تقویٰ کا تعلق رکھنے والے اہلِ ایمان ایسے نہیں کہ ایفائے عہد ان کے لیے کسی وقت وقوع پذیر ہونے

Marfat.com

والا کوئی واقعہ ہو بلکہ جس طرح سورج سے روشنی، آگ سے تپش، موتی سے آب اور دریا سے بہاؤ الگ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اہلِ ایمان کے لیے ایفائے عہد ایک خصلت اور ایک کردار ہے جو ان سے منفک نہیں ہوسکتا۔ یہ ان کی پہچان اور شناخت ہے جو ان سے الگ نہیں ہوسکتی۔

اس کے بعد صبر واستقلال کو الصابرین کے لفظ سے ذکر فرمایا اور اس میں لفظی طور پر دو نزاکتیں رکھیں۔ ایک تو یہ کہ الصابرین بھی الموفون کی طرح صفت کی صورت میں ہے جس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ صبر واستقلال بھی ایفائے عہد کی طرح ان کی لازمی خصلت ہے اور دوسری یہ بات کہ الصابرین کو بغیر کسی ظاہری سبب کے حالت نصب میں لایا گیا ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے اہلِ نحو کی اصطلاح میں علی سبیل المدح یا علی سبیل الاختصاص سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان جو بر وتقویٰ کے راستے کے مسافر ہیں ان میں بطور خاص دیکھو گے کہ صبر واستقلال اور استقامت ان کا ایک ایسا نمایاں جوہر ہے جو زندگی کے کٹھن سے کٹھن حالات میں بھی ان سے جدا نہیں ہوتا۔ چاہے وہ حالت فقر وفاقہ کی ہو، یا جسمانی عوارض سے پیش آنے والی تکالیف کی اور چاہے وہ حالتِ جنگ کی شدت اور ہولناکی کی ہو تم کبھی ان کے عزم کو شکست ہوتا، کبھی ان کے حوصلوں کو پست ہوتا نہیں دیکھو گے۔

الموفون اور الصابرین کی وضاحت میں آپ نے دو باتیں محسوس کی ہوں گی۔ ایک تو یہ بات کہ اسلام کی نگاہ میں عقائد اور عبادات کی بڑی اہم حیثیت ہے۔ لیکن ان کا ذکر سیدھے سادے فعل کے صیغوں سے کیا گیا ہے۔ لیکن ایفائے عہد اور صبر کے لیے بالکل اسلوب بدل دیا گیا ہے اور اسے صفت کے صیغوں کے ساتھ بڑے اہتمام اور اختصاص کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان دونوں باتوں کا تعلق سیرت وکردار سے ہے اور سیرت وکردار کا معاملہ بڑا محنت طلب، جان مارنے والا، نہایت ریاضت اور تربیت کا محتاج اور عزم وجزم کا طالب ہوتا ہے کیونکہ کسی بڑی سے بڑی صداقت کا اقرار اور دل ودماغ سے اس کی تصدیق اگرچہ ایک مشکل کام ہے لیکن اتنا مشکل نہیں جتنا اس کے مطابق ایک مزاج تیار کرنا مشکل ہے۔ مزاج تیار ہونے کے بعد سیرت وکردار کو ایک شکل ملتی ہے۔ اس کے لیے بنیاد یقیناً عقائد اور عبادات ہیں' لیکن اس پر اٹھنے والی عمارت یقیناً نہایت اہتمام کی متقاضی ہے۔ اسی لیے آپ دیکھتے ہیں کہ کتنے نیک لوگ نمازوں کے پابند لیکن معاملات کے کھوٹے نکلتے ہیں۔ ایفائے عہد میں نہایت کمزور ثابت ہوتے ہیں اور اگر کبھی معاملہ استقامت کا طالب ہو اور

Marfat.com

حوصلہ مندی کا امتحان شروع ہو جائے تو سب نیکیاں دھری رہ جاتی ہیں۔اس کا سبب صرف یہ ہوتا ہے کہ زبانی جمع خرچ اور عادۃً نماز پڑھ لینے کو کافی سمجھ لیا گیا ہے،لیکن اس پر کردار کی جو عمارت تعمیر ہونا چاہیے تھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا گیا۔

دوسری بات جو آپ کو اس میں محسوس ہو گی وہ یہ ہے کہ سیرت و کردار کے حوالے سے صرف دو ہی باتوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ایفائے عہد اور صبر۔حالانکہ اور بھی بہت سی چیزیں سیرت و کردار سے تعلق رکھتی ہیں۔اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایفائے عہد وہ خوبی ہے جو باقی تمام اسلامی اور ایمانی خوبیوں کو ایک لڑی میں پرو کر رکھتی ہے۔معاملہ حقوق اللہ کا ہو یا حقوق العباد کا،معاہدات چاہے اللہ سے ہوں یا بندوں سے،اور بندوں کی وسیع برادری میں چاہے امیر سے ہوں یا غریب سے،اپنوں سے ہوں یا بیگانوں سے ان کی حیثیت معاشرتی ہو معاشی ہو یا سیاسی ان سب چیزوں کا تعلق عہد و پیمان سے ہے اور ان تمام عہد و پیمان اور حقوق و فرائض کا ادا کرنا براور تقویٰ کا تقاضا ہے۔اس لحاظ سے غور فرمایئے! ایفائے عہد کی ایک صفت پیدا ہو جانے سے اللہ تعالیٰ اور بندوں کو تمام حقوق کی ادائیگی کی ضمانت مل جاتی ہے اور یہی البر کا تقاضا بھی ہے۔

اللہ کے حقوق ہوں یا مخلوقِ خدا کے،ان کی ادائیگی کبھی آسان نہیں ہوتی۔ان کے راستے میں ہزاروں رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ان رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان حقوق کا ادا کرنا دینی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونا،ملک وملت کی ضرورتوں کو پورا کرنا نہایت صبر آزما کام ہے۔کبھی اسلامی زندگی کے راستے میں فقر و فاقہ کے مراحل آتے ہیں کبھی جسمانی عوارض راستہ روک لیتے ہیں۔کبھی جنگی حالات پوری قومی زندگی کو تلپٹ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ایسی تمام حالتوں میں موقف حق پر قائم رہنا اور بر و تقویٰ کے تقاضوں کو نقصان نہ پہنچنے دینا اور بہرصورت اپنی ذمہ داریوں کو ادا کرنا صبر ہے۔اللہ کی اطاعت پر جم جانا بھی صبر ہے۔معصیت کے تمام راستوں کو بند کرنے کی کوشش کرنا یا اپنے آپ کو اس سے دور رکھنے کے لیے اڑ جانا یہ بھی صبر ہے۔آپ اندازہ فرمایئے! اگر آدمی میں ایفائے عہد کا کردار جنم لے لیتا ہے اور صبر کی قوت پیدا ہو جاتی ہے تو پھر اس کے لیے بر و تقویٰ کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے؟ اس لیے آخر میں فرمایا:

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾

''یہی لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ وفاداری میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو حقیقت میں متقی ہیں۔''

Marfat.com

اس طرح پروردگار نے ایک سراپا تشکیل فرما کر اس کے خدوخال ہمارے سامنے واضح فرما دیئے۔ جس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ البر اور تقویٰ کوئی مبہم اصطلاح یا کسی موہوم آدرش کا نام نہیں بلکہ وہ ایک سیرت و کردار کا نام ہے جس کے حامل کی یہاں تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ ایک آئینہ ہے جو امتِ مسلمہ کے ہاتھ میں دے دیا گیا ہے تاکہ وہ اس سے تقابل کر کے اپنی اصل شکل پہچاننے کی کوشش کریں۔ وہ اپنی قریبی تاریخ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کریں کہ انھوں ایفائے عہد کے حوالے سے کیسی تاریخ رقم کی ہے؟ پاکستان بناتے ہوئے جو اللہ سے عہد کیا گیا تھا ہم نے اس کا کس طرح ایک ایک بند توڑا ہے۔ قبائلی علاقوں سے ہمارے قائد نے جو وعدے کیے اور جو انھیں تحفظات دیے تھے ہم نے کس طرح ان پر خطِ تنسیخ کھینچا ہے۔ ہم نے اپنے پڑوسی ملک کے ساتھ کیا کیا وعدے کیے ہمارے وعدوں پر اعتبار کر کے جو لوگ اپنی آرام دہ زندگی اور اپنے وطن مالوف کو چھوڑ کر کفن بردوش ہمارے پاس آئے تھے ہم نے انھیں وعدوں پر اعتبار کرنے کی کیا سزا دی؟ اور پھر جب ہم پر سخت وقت آیا اور بڑی قوتوں نے ہمیں دھمکایا تو ہم نے جس طرح بے صبری کی تاریخ رقم کی اور جس طرح اپنے مسلمان بھائیوں کا خون بہایا او راسلام اور مسلمان دشمنوں کو جس طرح اپنی زمین اور اپنا کندھا پیش کیا ان میں سے ہر واقعہ ایک سلگتا ہوا زخم ہے جو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کب چنگاری بن کر لو دینے لگے اور ہمیں اس کے نتیجے میں کیسی فصل کاٹنی پڑے۔ اندیشے دراز ہوتے جا رہے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے، آمین۔

وہ معاشرہ جس کی بنیادیں بر و تقویٰ پر اٹھائی جاتی ہیں اور جس کی تصویر ہم نے اس آیتِ کریمہ میں دیکھی ہے، اسے معاشرتی اور سماجی سطح پر سب سے زیادہ نقصان دو باتوں سے پہنچتا ہے۔ ایک یہ کہ اس معاشرے میں حرمتِ جاں کا تصور کمزور ہونے لگے اور دوسرا یہ کہ وہ معاشرہ حبِ مال میں مبتلا ہو کر باہمی حقوق کو نظر انداز کر دے۔ چنانچہ اگلی آیاتِ کریمہ میں انھیں دونوں باتوں کے حوالے سے مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔

Marfat.com

17- اپنے آپ کو ہمہ تن دین کے سپرد کرنے کا نام ایمان ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً
وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ ؕ اِنَّہٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ﴾
(اے ایمان والو اللہ کی اطاعت میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو، وہ تمھارا کھلا دشمن ہے)۔

سِلْم کا مفہوم

سِلْم اور سَلْم دونوں قرأتیں ہیں دونوں کا معنی سر تسلیم خم کرنا اور غیر مشروط اطاعت کرنا ہے۔ بعض اہل علم نے اس کا معنی اسلام کیا ہے۔ دونوں معنوں میں کوئی تضاد نہیں، محض ظاہر کا فرق ہے۔ کیونکہ اسلام کی اصل حقیقت بھی اللہ اور رسول کی اطاعت ہی ہے۔ کَآفَّۃً کا معنی جمیعاً ہے۔ اسے جماعت کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ حال ہے اس کا ذوالحال ادْخُلُوْا میں ضمیر مستتر، انتم بھی ہو سکتی ہے اور السلم بھی ہو سکتا ہے۔

منافقین کو مخلصانہ اطاعت کی دعوت

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا کا خطاب اگرچہ الفاظ کے لحاظ سے عام ہے لیکن سیاق کلام کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جن کا ذکر سابقہ آیات میں

Marfat.com

گزرا ہے۔ ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تمھاری منافقت کا اصل سبب یہ ہے کہ تمھاری اطاعت کا اصل رشتہ صرف اللہ سے نہیں بلکہ تم نے اس اطاعت کو مختلف آستانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ تم اللہ سے اطاعت کا دم بھی بھرتے ہو لیکن ساتھ ساتھ اسلام کے مخالفین سے بھی تمھارے اطاعت کے رشتے قائم ہیں۔ اسلام کے آنے سے پہلے اوس وخزرج کے لوگ بھی اور مدینہ کے گردونواح میں رہنے والے قبائل بھی یہود سے حلیفانہ تعلق رکھتے تھے اور جن کا تعلق حلیفانہ سطح تک نہیں پہنچا تھا' وہ بھی مختلف کاروباری رشتوں میں منسلک تھے۔ جب اسلام آیا تو ایمان لانے والوں میں اکثریت تو مخلص مسلمانوں کی تھی لیکن کچھ لوگ عبداللہ اور ان کے ساتھیوں جیسے ایسے ضرور موجود رہے جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے تھے لیکن یہود سے تعلقات سے دستبردار بھی نہیں ہوتے تھے بلکہ بعض دفعہ مسلمانوں کی خبریں انہیں پہنچاتے تھے اور ان کی مفادات کی نگرانی کرتے تھے۔ مدینہ کے اطراف وجوانب میں رہنے والے قبائل کے بعض لوگوں کا حال ان سے بھی بدتر تھا۔ وہ آ کر اسلام کا اظہار کرتے تھے لیکن درپردہ یہود سے اخلاص کا رشتہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۃ محمد میں ارشاد فرمایا گیا ہے: ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَسْرَارَهُمْ۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ منافقین نے ان لوگوں سے جنھوں نے اللہ کی اتاری ہوئی چیز کا برا منایا' یہ کہا کہ ہم بعض معاملات میں آپ ہی لوگوں کی اطاعت کریں گے۔ اللہ ان کی اس رازداری کو خوب جانتا ہے۔

یہاں لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا سے اشارہ یہود اور مشرکین کے لیڈروں ہی کی طرف ہو سکتا ہے۔ سورۃ نساء میں ان کی اس منافقانہ روش کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿الم تر الى الذين يزعمون انهم اٰمنوا بما انزل اليك وما انزل من قبلك يريدون ان يتحاكموا الى الطاغوت وقد امروا ان يكفروا به ويريدالشيطان ان يضلهم ضلالاً بعيداًO واذا قيل لهم تعالوا الى ما انزل الله والى الرسول رأيت المنافقين يصدون عنك صدوداً﴾

(ذرا ان لوگوں کو دیکھو جو مدعی ہیں' کہ وہ اس چیز پر ایمان لائے ہیں جو تم پر اتری ہے اور اس چیز پر بھی جو تم سے پہلے اتری ہے۔ یہ چاہتے

Marfat.com

ہیں کہ اپنے معاملات فیصلہ کے لیے طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس کا انکار کریں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بڑی ہی دور کی گمراہی میں پھینک دے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی طرف آؤ جو اللہ نے اتاری ہے اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو دیکھتے ہو کہ وہ طرح طرح سے گریز کی راہیں اختیار کرتے ہیں)

طاغوت سے مراد

یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ یہود نے اپنی کتاب میں ترمیم و تحریف کے ذریعے بہت سے احکام اپنی خواہشات کے مطابق کر دیے تھے اور مزید یہ کہ ان کی عدالتوں میں ہماری عدالتوں کی طرح رشوت کا کاروبار چلتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ وہاں انصاف بکتا تھا۔ اس لیے جب کبھی ایسے لوگوں کو کوئی معاملہ پیش آتا جس کے لیے عدالت میں جانے کی ضرورت ہوتی، تو وہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود آنحضرت ﷺ کی عدالت میں آنے کی بجائے یہود کی عدالت کا رخ کرتے تھے تاکہ وہ رشوت کے ذریعے یا ان کے قانون کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو جائیں اور جب ان سے یہ کہا جاتا کہ تم ایمان و اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود یہود کی عدالتوں میں کیوں جاتے ہو۔ کیا تمھارا ایمان تمہیں اس کی اجازت دیتا ہے تو مختلف حیلوں بہانوں سے اپنی روش کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔ وفاداری کی یہ تقسیم جس نے منافقین کو دو کشتیوں کا سوار بنا دیا تھا اس آیت کریمہ میں اسی بات سے روکا جا رہا ہے کہ تم اگر واقعی مومن ہو اور تمھاری اسلام سے وابستگی کا دعویٰ سچا ہے تو پھر تمھارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

کَآفَّۃً کا مفہوم

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ کَآفَّۃً حال ہے اور اس کا ذوالحال اُدْخُلُوْا کی ضمیر خطاب بھی ہو سکتی ہے اور السلم بھی ہو سکتا ہے۔ اگر اسے اُدْخُلُوْا کی ضمیر سے حال مانیں

Marfat.com

تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم مکمل طور پر اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ تمھارا کوئی رشتہ بھی اسلام کے سوا کسی اور سے نہیں ہونا چاہیے۔ تم جس طرح ایک مسلمان کی حیثیت سے نماز پڑھتے ہو اور تمھارا جسم اللہ کے سامنے جھکتا ہے' اسی طرح تمھارے دل و دماغ کی قوتوں کو بھی اللہ کے سامنے جھکنا چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تم نماز تو اللہ کے لیے پڑھو لیکن تمھارا دماغ اس کے دیے ہوئے شرعی احکام سے مطمئن نہ ہو۔ کبھی تمھیں اسلامی تہذیب پر اعتراض ہو کبھی اسلامی تمدن پر کبھی اسلامی ثقافت پر' کبھی اس کے دیے ہوئے آئین پر' کبھی اس کی قانونی دفعات پر۔ مختصر یہ کہ تمھارے جسم کے ایک ایک عضو کے ساتھ ساتھ تمھارے دل و دماغ کی ایک ایک صلاحیت اور ایک ایک احساس اسلام سے وابستہ ہونا چاہیے۔ تم ایک مسلمان کی طرح زندگی گزارو اور ایک مسلمان کی طرح سوچو۔

اور اگر ہم کَآفَّۃً کو السلم سے حال بنائیں تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح تمھاری پوری شخصیت کو اسلام کی تصویر بننا چاہیے۔ اسی طرح مکمل اسلام کو تمھارا عقیدہ اور تمھارے عمل کی روح بننا چاہیے۔ تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میں اسلام کے نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کو تو مانتا ہوں لیکن اس کی معاشرت' اس کی معیشت' اس کی تہذیب' اس کی سیاست' اس کے آئین اور اس کے طرز حکومت کو نہیں مانتا۔ ان چیزوں کا کوئی تعلق اسلام سے نہیں۔ اسلام چند عقائد اور چند عبادات کی رسموں کا نام ہے۔ مولویوں نے بلاوجہ اسے ایک مکمل نظام بنا دیا ہے۔ اس میں فوجداری' مالیاتی اور عائلی قوانین کا کوئی تصور نہیں۔ ہمارے ملک کے ایک مشہور ماہر قانون گزرے ہیں جن کا تعلق سندھ سے تھا اور وہ وزیر قانون بھی رہے۔ وہ عالمی شہرت کے قانون دان ہونے کے باوجود ہمیشہ یہ کہتے تھے کہ اسلام میں کوئی نظام نہیں اور نہ اس کا اپنا کوئی آئین ہے۔ تفہیم القرآن مکمل ہونے پر جو تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں انھوں نے خود تسلیم کیا کہ میں اسلام کو ایک نظام زندگی ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا لیکن اتفاق یہ ہوا کہ اس سلسلے میں مولانا مودودی مرحوم سے میری مراسلت ہوئی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ یہ قرآن کریم سے میری بے خبری ہے' جس کی وجہ سے میں اتنی بڑی گمراہی کا شکار تھا۔ قدرت اللہ شہاب صاحب کی وفات پر غالباً مدیر تکبیر جناب صلاح الدین مرحوم کا ایک مضمون چھپا تھا' جس میں انھوں نے اسلام آباد میں شہاب صاحب سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا۔ جس میں جناب نعیم صدیقی صاحب مرحوم بھی موجود تھے' اس میں شہاب صاحب نے تسلیم کیا کہ ہم لوگ تو ساری عمر فائلوں کی ورق گردانی میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی اسلام کا گہرا مطالعہ نہیں کیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے طور پر

Marfat.com

اسلام کے بارے میں ایک رائے قائم کر لیتے ہیں پھر اس پر جمے رہتے ہیں۔ انھوں نے صلاح الدین صاحب سے کہا کہ اگر میں آپ کا مضمون نہ پڑھتا جو آپ نے مولانا مودودی رحمۃ اللہ پر لکھا اور میرے بعض خیالات پر تنقید کی تو میں ہمیشہ یہی سمجھتا رہتا کہ واقعی اسلام نے ہمیں کوئی نظام نہیں دیا۔ اس کے بعد میں نے خود قرآن حکیم کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے یقین آیا کہ میں واقعی غلطی پر ہوں۔ یہ میں نے آپ کے سامنے دو صالح دانشوروں کے واقعات ذکر کیے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ لوگوں کا اصل مسئلہ کیا ہے اور کس طرح ان کی وفاداریاں مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ عہد نبوت کے منافقین تو اپنی منقسم وفاداریوں کے باعث منافق کہلائے لیکن آج کے مسلمان کو نہ جانے کیا نام دیا جائے کہ اس نے اپنی شخصیت کو بھی مختلف حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور اسلام کا بھی ایک من پسند سیٹ اپ یا قالب تیار کر رکھا ہے، جس میں وہ قرآن وسنت کی وضاحتوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جس نے ایک مصور سے اپنے بازو پر شیر کی تصویر گودنے کے لیے کہا تھا۔ مصور نے جب بازو سے ماس نکال کر رنگ بھرنے کا آغاز کیا تو اس نے پوچھا کہ کیا بنا رہے ہو۔ کہا دم بنا رہا ہوں۔ کہنے لگا دم بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ کون سا سچ مچ کا شیر ہے۔ پھر اس نے سوئی چبھوئی۔ تکلیف ہوئی۔ پوچھا اب کیا بنا رہے ہو۔ کہا ٹانگیں بنانے لگا ہوں۔ کہنے لگا کہ یہ کوئی سچ مچ کا شیر ہے جو کہیں بھاگ کر جائے گا۔ غرضیکہ وہ جس عضو کو بنانے کے لیے سوئی چبھوتا' تصویر بنوانے والا تکلیف کی شدت کی وجہ سے اسے روک دیتا۔ مصور نے تنگ آ کر پرکار زمین پر رکھ دی اور کہا اللہ نے تو ایسا شیر پیدا نہیں کیا۔ جس کا کوئی عضو نہ ہو اور وہ پھر بھی شیر ہو۔ ہمارا آج کے دانشور' سیاست دان اور حکمران ایسے ہی اسلام کی تصویر چاہتے ہیں۔ جس میں سوائے چند رسوم کی پابندی کے اور کچھ بھی نہ ہو اور باقی ان کی پوری زندگی پر غیر اللہ کی حکومت ہو۔ جس طرح عہد نبوت کا منافق اپنی منقسم وفاداری کے باعث اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں تھا اور اسے حکم دیا گیا تھا کہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ آج کے مسلمان کو بھی حکم دیا جا رہا ہے کہ اللہ کی وفاداری کو تقسیم کرنا' اس کے اسلام میں غیر اسلام کو داخل کرنا یہ شرک ہے' جسے پروردگار کبھی برداشت نہیں کرتا۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

Marfat.com

اسلام مکمل نظام حیات ہے

اسلام جس طرح اپنے عقائد رکھتا ہے۔اسی طرح اپنا ایک نظام زندگی بھی رکھتا ہے۔ توحید‘ رسالت اور آخرت اس کے عطا کردہ عقائد ہیں۔ان میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔اسی طرح اس کی معاشرت‘ معیشت‘ اخلاق‘ معاملات‘ سیاست‘ آئین اور آداب زندگی میں بھی کوئی تبدیلی اور قلم کاری قابل برداشت نہیں۔یہ وہ خالص راستہ ہے جس پر چلنا ایمان کا اولین تقاضا ہے۔اس کے علاوہ جتنے راستے ہیں‘ وہ شیطان کے راستے ہیں اور ان پر چلنا شیطان کا اتباع کرنا ہے۔اس لیے فرمایا کہ شیطان کا اتباع مت کرو۔اور تمہیں خوب معلوم ہے کہ شیطان تمھارا کھلا کھلا دشمن ہے۔اس نے تمھارے باپ آدم کو جنت سے نکلوانے کی کوشش کی۔اس نے آدم کے سامنے جھکنے سے انکار کیا اور اللہ کے حکم سے سرتابی کی اور جب اسے وہاں سے نکال دیا گیا تو اس نے چیلنج کیا کہ میں آدم کی اولاد کو اللہ کے راستے پر چلنے نہیں دوں گا۔میں ہر طرح سے انھیں گمراہ کروں گا۔فکری راستے سے بھی حملہ کروں گا اور تہذیبی اور تمدنی راستے سے بھی۔تعلیم کے ذریعے سے میں ان کے تصورات بگاڑ دوں گا۔میں ان کے سامنے آرزوؤں اور اُمیدوں کے ایسے جال پھیلاؤں گا جس کی وجہ سے یہ اسلام کے راستے پر ثابت قدم نہیں رہ سکیں گے۔قرآن کریم نے اس کی ان تمام باتوں کو دہرایا تاکہ مسلمان اس کی دشمنی کو اچھی طرح سمجھ لے اور اس کی گمراہ کن کوششوں سے بچنے کی کوشش کرے۔لیکن دکھ کی بات یہ ہے کہ انسان قدم قدم پر اس کا اتباع کرتا ہے اور پھر اسے گالی بھی دیتا ہے۔وہ جن راستوں پر چلانا چاہتا ہے بڑی آمادگی سے انہی راستوں پر چلتا ہے لیکن وہ اسے احساس ہی نہیں ہونے دیتا کہ تم شیطان کے راستے پر چل رہے ہو۔

Marfat.com

18- تیسری طلاق کے احکام

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ م بَعْدُ حَتّٰی تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ﴾

گزشتہ آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ طلاق دو مرتبہ ہے۔ یعنی تمھیں اگر طلاق ضرور ہی دینا ہے تو دو مرتبہ سے زیادہ طلاق مت دو۔ کیونکہ دو مرتبہ طلاق کی صورت میں تم عدت کے دوران رجوع بھی کر سکتے ہو۔ اور عدت کے بعد دوبارہ نکاح بھی کر سکتے ہو۔ اور مکمل علیحدگی مطلوب ہے تو عدت گزرنے سے علیحدگی بھی ہو جائے گی۔ پھر تیسری طلاق کے تکلف کے کیا ضرورت ہے۔ وہ تو اپنے ہاتھ پاؤں توڑ دینے کے مترادف ہے۔ کیونکہ حالات میں تبدیلی انسانی فطرت ہے۔ مزاج میں بھی تبدیلی عادات کا حصہ ہے۔ اگر علیحدگی کے بعد بھی دوبارہ یکجائی کی ضرورت کا احساس ہو جائے تو دو طلاقوں کی موجودگی میں ہی اس کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس لیے تیسری طلاق کو پسند نہیں فرمایا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم نے نفع وضرر کے پیمانے توڑ کر اور مزاجِ شریعت کو نظر انداز کرتے ہوئے تیسری طلاق بھی دے ڈالی تو اب تمھیں آگاہ رہنا چاہیے کہ اب تمھاری بیوی تمھاری بیوی نہیں رہی۔ نہ تم اس سے رجوع کر سکتے ہو اور نہ دوبارہ نکاح کر سکتے ہو۔ یکجائی کی تمام صورتیں ختم ہو گئیں۔ اب اگر کبھی تمھیں حالات کے دباؤ میں آ کر یا کسی اور وجہ سے دوبارہ نکاح کی ضرورت کا احساس ہو جائے تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ تمھاری مطلقہ بیوی عدت گزرنے کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرے۔ اور نکاح کے لفظ میں چونکہ زندگی بھر کے نباہ کا تصور گندھا ہوا ہے اس لیے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی بھر کے نباہ کے ارادے سے نکاح کرے۔ لیکن زندگی کے اس نئے سفر میں کہیں اختلافات ایسی شدت اختیار کر جائیں کہ علیحدگی تک نوبت پہنچ جائے اور وہ بیوی کو طلاق دے دے تو پھر خاتون عدت گزارنے کے بعد پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی

Marfat.com

ہے۔ یہ سارا پراسس بالکل اسی طریقے پر فطری انداز میں ہونا چاہیے جیسے عام نکاح میں ہوتا ہے۔ لیکن اگر اسے سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق بروئے کار لایا جائے کہ ایک شخص کو ڈھونڈھا جائے' اسے اعتماد میں لے کر یہ کہا جائے کہ آپ اس خاتون سے نکاح کرلیں' اور نکاح کے فوراً بعد اسے طلاق دے دیں۔ یعنی محض ایک کاغذی کارروائی سے حرام کو حلال بنالیا جائے اس میں پہلی بات تو یہ ہے کہ نکاح کے تصور میں میاں بیوی کی تنہائی' خلوت اور انتہائی قربت کا تصور شامل ہے۔ کسی بھی شخص سے پوچھ کر دیکھ لیجئے کہ تم ایک ایسی خاتون سے نکاح کرنا پسند کرو گے جس کے قریب جانے کی تمھیں اجازت نہیں۔ وہ حیران ہوکر پوچھے گا کہ پھر نکاح کس لیے کرنا ہے؟ تو ہر شخص سمجھتا ہے کہ نکاح کے معنی میں یہ بات شامل ہے اور مزید یہ کہ آنحضرت ﷺ نے خود اس کی وضاحت فرمائی۔ جب ایک ایسے شخص کے متعلق پوچھا گیا جس نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی تھیں۔ پھر اس عورت نے ایک دوسرے شخص سے نکاح کرلیا۔ اور اس دوسرے شوہر نے بھی مباشرت سے پہلے طلاق دے دی۔ کہ کیا یہ عورت اپنے شوہر کے لیے حلال ہے یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا لا حتی یذوق عسیلتها کما ذاقها الاول "نہیں جب تک دوسرا شوہر اس سے ہم بستری کر کے لطف اندوز نہ ہو جائے جس طرح پہلے شوہر نے کیا تھا اس وقت تک طلاق دینے سے پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔" اور دوسری بات یہ کہ اگر اس دوسرے شوہر نے نکاح اور مباشرت کے بعد منصوبے کے مطابق طلاق دے دی تو تب بھی پہلے شوہر کے لیے حلال نہیں ہوگی۔ کیونکہ کسی مرد اور عورت کا وقت مقرر کے لیے ایک منصوبے کے تحت نکاح کرنا اسے نکاح نہیں کہتے بلکہ متعہ کہتے ہیں یا نکاحِ موقت کہتے ہیں اور یہ دونوں اسلام میں حرام ہیں۔ نکاح زندگی بھر کے سنجوگ کا نام ہے۔ اگر اسے ایک محدود مدت کے لیے منعقد کیا جائے اور مدت گزرنے کے بعد طلاق دے دی جائے تو اسے نکاح نہیں کہتے۔ اس میں اور زنا میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ایسا کرنے اور کرانے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جسے ہمارے معاشرہ میں حلالہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور ایسے کرنے والے کو آنحضرت ﷺ نے "تیسٌ مستعارٌ" (کرائے کا سانڈ) قرار دیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں کتنے لوگ ہیں جو نہایت پردہ داری سے اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔ انھیں شاید اندازہ نہیں کہ وہ شاید اسے نیکی سمجھتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اللہ کے رسول کی لعنت کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

Marfat.com

پہلے شوہر سے نکاح کے حلال ہونے کے لیے یہ جو اتنی بڑی شرط لگائی ہے اس میں اگر آپ غور کریں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ اتنا بڑا پہاڑ جو راستے میں حائل کر دیا گیا ہے یہ اس لیے ہے تا کہ لوگ نکاح کی اہمیت اور طلاق کی حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں اور وہ طلاق دیتے ہوئے اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ طلاق کا فیصلہ کرنا ایک ایسا خطرناک اقدام ہے کہ اگر اس میں ذرا سی بے احتیاطی ہوگئی تو گھر کے اجڑنے میں دیر نہیں لگے گی۔

ایک ساتھ تین طلاق دینا سخت گناہ ہے

متذکرہ بالا تفصیلات سے آپ کو یہ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ طلاق کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ہر طہر میں ایک طلاق دی جائے۔ اس طرح تیسری طلاق تیسرے طہر میں ہوگی۔ جس کے بعد یکجائی کے تمام امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ہر طہر میں ایک طلاق دینے کی پابندی نہیں کرتا بلکہ وہ یک لخت تین طلاقیں دے دیتا ہے تو اس سلسلے میں دو باتیں پوری طرح ذہن نشین کر لینی چاہییں۔ ایک تو یہ بات کہ تین طلاقوں کا بیک وقت دینا اللہ کے رسول ﷺ کے نزدیک انتہائی سخت برہمی کا باعث ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے امام نسائی نے محمود بن لبید کی روایت سے اس حدیث کو نقل کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے بارے میں خبر دی گئی کہ اس نے اپنی بیوی کو ایک ساتھ تین طلاقیں دے دی ہیں۔ آپ ﷺ غضبناک ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور ارشاد فرمایا اَ یُلْعَبُ بِکِتَابِ اللّٰهِ وَ اَنَا بَیْنَ اَظْهُرِکُمْ "کیا کتاب اللہ کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں" آپ ﷺ کی اس حالت غضب کو دیکھتے ہوئے ایک آدمی کھڑا ہوگیا اور کہنے لگا "اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا میں اس شخص کو قتل نہ کردوں؟" اس حدیث سے آپ اندازہ کیجیے کہ ایک ساتھ تین طلاقیں دینا کتنا بڑا گناہ ہے، جس سے رحمۃ اللعالمین سرتاپا حِلم، بردبار اور رحمت ہونے کے باوجود سراپا غضب بن جاتے ہیں۔

ایک ساتھ تین طلاقیں بھی تین ہی واقع ہوتی ہیں

دوسری بات جس کا یاد رکھنا انتہائی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک ساتھ تین طلاقوں پر آنحضرت ﷺ کی برہمی کا ذکر تو آپ سن چکے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت

Marfat.com

ہے کہ آنحضرت ﷺ نے اس برہمی کے باوجود ان تین طلاقوں کو مسترد نہیں فرمایا اور طلاق دینے والے کو یہ کہہ کر اس کی بیوی سپرد نہیں فرمائی کہ یہ طلاقیں چونکہ واقع نہیں ہوئیں یا ایک واقع ہوئی ہے اور تم اس سے رجوع کر لو بلکہ آپ ﷺ نے ان تین طلاقوں کو واقع فرمایا۔ کیونکہ قاضی ابو بکر ابن عربی نے متذکرہ بالا محمود بن لبید کی حدیث کے متعلق یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت عویمر کی تین طلاقوں کی طرح اس کی بھی تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

فلم یرده النبی صلی الله علیه وسلم بل امضاه کما فی حدیث عویمر العجلانی فی اللعان حیث امضی طلاقه الثلاث و لم یرده۔

(رسول کریم ﷺ نے اسے رد نہیں کیا بلکہ اسے نافذ فرما دیا جیسا کہ عویمر العجلانی کی لعان والی حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان کی تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا تھا اور رد نہیں کیا تھا)

(تہذیب سنن ابی داؤد طبع مصر صفحہ ۱۲۹ ج ۲)

حضرت عویمر العجلانی نے اپنی بیوی سے لعان کیا تھا' جب لعان کی کارروائی مکمل ہو گئی اور جانبین نے قسمیں کھا لیں تو حضرت عویمر نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کذبت علیها یارسول الله ان امسکتها فطلقها ثلاثا قبل ان یأمره النبی صلی الله علیه وسلم ''اے اللہ کے رسول اب اگر میں اپنی بیوی کو اپنے پاس رکھوں تو پھر اس میں قسم کھانے میں جھوٹا ہوں گا یہ کہہ کر حضرت عویمر نے اسے تین طلاقیں دے دیں اس سے پہلے کہ نبی کریم ﷺ انھیں حکم دیتے'' اور احادیث میں آیا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان تین طلاقوں کو نافذ فرما دیا اور میاں بیوی میں علیحدگی کر دی۔ ایسی ہی بعض دوسری روایات سے یہ ثابت ہوتا ہے اگر کسی شخص نے ایک ساتھ تین طلاقیں دیں اور وہ معاملہ آنحضرت ﷺ کے سامنے آیا تو آپ ﷺ نے ناخوشی کا اظہار فرمانے کے ساتھ ساتھ تین طلاقوں کو واقع بھی فرمایا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تین طلاقوں کو تین قرار دینا خود آنحضرت ﷺ کا فیصلہ ہے اور اسی وجہ سے بجز اہلِ حدیث حضرات کے امت میں کسی قابلِ ذکر امام' مجتہد' فقیہ یا عالم نے اس سے اختلاف نہیں کیا۔ مسائل میں فقہاء میں اختلاف ایک معمول کی بات ہے لیکن تین طلاقوں کا تین ہی واقع ہونا ایسا

Marfat.com

مسئلہ ہے جس میں امام ابو حنیفہ، امام شافعی، امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ تعالیٰ سب یکساں رائے رکھتے ہیں اور سب کے نزدیک ایک ساتھ تین طلاقوں سے عورت حرام ہو جاتی ہے جس سے دوسرے نکاح کے لیے بجز اس کے کوئی صورت باقی نہیں رہتی کہ وہ کسی اور جگہ نکاح کرے اور پھر اتفاق سے طلاق ہو جائے۔ اس لیے حافظِ حدیث امام ابن عبدالبر مالکی نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

لیکن اس سلسلے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے ایک غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جسے بعض لوگوں نے دلیل بنالیا۔ اس روایت کے الفاظ یہ ہیں:

عن ابن عباس رضی اللہ عنه قال كان الطلاق على عهد رسول الله صلى الله عليه وسلم و ابى بكر و سنتين من خلافة عمر طلاق الثلاث واحدة فقال عمر بن الخطاب ان الناس قد استعجلوا فى امر كانت لهم فيه اناة فلو امضينا عليهم فامضاه عليهم۔

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اور حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دو سالوں میں طلاق کا یہ طریقہ تھا کہ تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لیے مہلت تھی تو مناسب رہے گا ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان پر نافذ کر دیا۔''

اس روایت کو پیش نظر رکھیں اور پھر چند نکات پر غور فرمائیں:

۱۔ فاروقِ اعظم مسلمانوں کے خلیفہ ثانی ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کے مطابق آپ رضی اللہ عنہ فاروق ہیں اور حق اللہ نے آپ رضی اللہ عنہ کی زبان پر کھول دیا تھا۔ ایک عام مومن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے سے انحراف کا تصور نہیں کرسکتا چہ جائے کہ خلیفہ ثانی کے بارے میں ایسا گمان کیا جائے۔

Marfat.com

۲۔ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ فیصلہ اپنے حاکمانہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے کسی سرکلر کی شکل میں نہیں کیا' بلکہ آپ رضی اللہ عنہ نے صحابہ اور تابعین کے مجمع عام میں خطبہ جمعہ میں اس کا اعلان فرمایا جس میں بڑے بڑے فقہاء صحابہ موجود تھے۔ لیکن کسی نے اس پر انکار نہیں کیا۔ حالانکہ اسلامی احکام کے بارے میں خلافتِ راشدہ میں جو آزادی حاصل تھی اس کا اس ایک واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے خطبہ جمعہ میں ارشاد فرمایا کہ لوگ مہر میں بڑی بڑی رقمیں باندھنے لگے ہیں اس سے غرباء کے لیے مشکل پیدا ہو رہی ہے۔ اگر بڑی بڑی رقمیں مہر میں دینا کوئی عزت کی بات ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی بیویوں کو زیادہ سے زیادہ مہر دیتے۔ اس لیے میں لوگوں کو ہدایت کرتا ہوں کہ زیادہ مہر باندھنا بند کر دیں۔ یہ سن کر نمازیوں کی صفوں میں سے پچھلی صف سے ایک خاتون اٹھیں انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: اتق اللہ یا عمر ''اے عمر اللہ سے ڈر'' قرآن کریم کہتا ہے وَاٰتَیْتُمْ اِحْدٰھُنَّ قِنْطَاراً فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَیْئاً ''تم اپنی بیویوں اگر خزانہ بھی دے چکے ہو تو علیحدگی کے بعد ان سے واپس نہ لینا'' خزانے کی واپسی سے روکا جا رہا ہے۔ اگر خزانہ دینے کی ممانعت ہوتی تو واپسی سے کیوں روکا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مہر میں بیوی کو خزانہ بھی دیا جا سکتا ہے تو عمر رضی اللہ عنہ آپ پابندی لگانے والے کون ہوتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہیبت اور جلال ایک مشہور بات ہے لیکن اس خاتون نے جس جرأت سے بات کی وہ اسلام کی عطا کردہ ہے۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس بردباری سے سنا وہ بھی اسلام کا حکم ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے خاتون کی بات سنتے ہی سر جھکا لیا اور فرمایا ''اصابت امراۃ و اخطأ عمر'' (خاتون نے ٹھیک کہا اور عمر نے غلطی کی) غور فرمایئے جہاں آزادیِ رائے کا یہ حال ہو وہاں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس خطبے کو سن کر تمام فقہاءِ صحابہ کا خاموش رہنا بلکہ اسے قبول کر لینا کیا معنی رکھتا ہے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امامِ طحاوی نے شرح معانی الآثار میں ارشاد فرمایا جس کا ترجمہ یہ ہے ''پس حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے ساتھ لوگوں کو مخاطب فرمایا اور ان لوگوں میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ صحابہ بھی تھے جن کو اس سے پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے طریقے کا علم تھا۔ تو ان میں سے کسی انکار کرنے والے نے انکار نہ کیا اور کسی رد کرنے والے نے اس کو رد نہیں کیا)۔ ان نکات پر غور کرنے سے ایک ساتھ تین طلاقوں کے بارے میں تو حکم بالکل واضح ہو جاتا ہے اور اسی لیے صحابہ اور تابعین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ تین طلاقیں بیک وقت دینا اگرچہ غیر مستحسن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

کی ناراضگی کا سبب ہے مگر اس کے باوجود جس نے اس غلطی کا ارتکاب کیا اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور بغیر کسی دوسرے شخص کے طلاق و نکاح کے اس کے لیے حلال نہ ہو گی۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے علمی اور نظری طور پر یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ ہم معارف القرآن سے استفادہ کرتے ہوئے اس کی تفصیل یہاں نقل کرتے ہیں:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت سے پیدا ہونے والے دو سوال اور ان کا جواب

اول تو یہ کہ سابقہ تحریر میں متعدد روایاتِ حدیث کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تین طلاق بیک وقت دینے والے پر خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاق کو نافذ فرمایا ہے۔ اس کو رجعت یا نکاحِ جدید کی اجازت نہیں دی۔ پھر اس واقعہ میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس کلام کا کیا مطلب ہو گا کہ عہدِ رسالت میں اور عہد صدیقی میں اور دو سال تک عہد فاروقی میں تین طلاق کو ایک ہی مانا جاتا تھا' لیکن فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے تین طلاق کا فیصلہ فرمایا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر واقعہ اس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ عہد رسالت' عہد صدیقی میں تین طلاق کو ایک مانا جاتا تھا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس فیصلہ کو کیسے بدل دیا اور بالفرض ان سے کوئی غلطی بھی ہو گئی تھی تو تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کو کیسے تسلیم کر لیا؟

ان دونوں سوالوں کے حضرات فقہاء و محدثین نے مختلف جوابات دیے ہیں۔ ان میں صاف اور بے تکلف جواب وہ ہے جس کو امام نووی رحمہ اللہ نے شرح مسلم میں اصح کہہ کر نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ فرمان اور اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اجماع طلاق ثلاث کی ایک خاص صورت کے متعلق قرار دیا جائے' وہ یہ کہ کوئی شخص تین مرتبہ تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق تجھ کو طلاق کہے یا میں نے طلاق دی طلاق دی طلاق دی کہے۔

یہ صورت ایسی ہے کہ اس کے معنی میں دو احتمال ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ کہنے والے نے تین طلاق دینے کی نیت سے یہ الفاظ کہے ہوں۔ دوسرے یہ کہ تین مرتبہ محض تاکید کے لیے مکرر کہا ہو' تین طلاق کی نیت نہ ہو اور یہ ظاہر ہے کہ نیت کا علم کہنے والے ہی

Marfat.com

کے اقرار سے ہوسکتا ہے۔ رسول کریم ﷺ کے عہد مبارک میں صدق و دیانت عام اور غالب تھی، اگر ایسے الفاظ کہنے کے بعد کسی نے یہ بیان کیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ محض تاکید کے لیے یہ الفاظ مکرر بولے تھے تو آپ ﷺ اس کے حلفی بیان کی تصدیق فرمادیتے اوراس کوایک ہی طلاق قرار دیتے تھے۔

اس کی تصدیق حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی حدیث سے ہوتی ہے جس میں مذکور ہے کہ انھوں نے اپنی بیوی کولفظ البتة کے ساتھ طلاق دیدی تھی۔ یہ لفظ عرب کے عرفِ عام میں تین طلاق کے لیے بولا جاتا تھا، مگر تین اس کا مفہوم صریح نہیں تھا اور حضرت رکانہ نے کہا کہ میری نیت تو اس لفظ سے تین طلاق کی نہیں تھی، بلکہ ایک طلاق دینے کا قصد تھا، آنحضرت ﷺ نے ان کو قسم دی، انھوں نے اس پر حلف کرلیا، تو آپ ﷺ نے ایک ہی طلاق قرار دیدی۔

یہ حدیث ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی، میں مختلف سندوں اور مختلف الفاظ کے ساتھ منقول ہے۔ بعض الفاظ میں یہ بھی ہے کہ حضرت رکانہ نے اپنی بیوی کوتین طلاق دیدی تھیں۔ مگرابوداؤد نے ترجیح اس کو دی ہے کہ دراصل رکانہ رضی اللہ عنہ نے لفظ البتة سے طلاق دی تھی۔ یہ لفظ چونکہ عام طور پرتین طلاق کے لیے بولا جاتا تھا، اس لیے کسی راوی نے اس کوتین طلاق سے تعبیر کردیا ہے۔

بہرحال اس حدیث سے یہ بات بالاتفاق ثابت ہے کہ حضرت رکانہ رضی اللہ عنہ کی طلاق کو رسول اللہ ﷺ نے ایک اس وقت قرار دیا جب کہ انھوں نے حلف کے ساتھ بیان دیا کہ میری نیت تین طلاق کی نہیں تھی۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے تین طلاق کے الفاظ صریح اور صاف نہیں کہے تھے ورنہ پھر تین کی نیت نہ کرنے کا کوئی احتمال ہی نہ رہتا، نہ ان سے سوال کی کوئی ضرورت رہتی۔

اس واقعہ نے یہ بات واضح کردی کہ جن الفاظ میں یہ احتمال ہو کہ تین کی نیت کی ہے یا ایک ہی کی تاکید کی ہے، ان میں آپ ﷺ نے حلفی بیان پر ایک قرار دیدیا، کیونکہ زمانہ صدق و دیانت کا تھا۔ اس کا احتمال بہت بعید تھا کہ کوئی شخص جھوٹی قسم کھالے۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے عہد میں اور فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں دو سال تک یہی طریقہ جاری رہا۔ پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانے میں یہ محسوس کیا کہ اب

Marfat.com

صدق و دیانت کا معیار گھٹ رہا ہے اور آئندہ حدیث کی پیشنگوئی کے مطابق اور گھٹ جائے گا' دوسری طرف ایسے واقعات کی کثرت ہوگئی کہ تین مرتبہ الفاظِ طلاق کہنے والے اپنی نیت صرف ایک طلاق کی بیان کرنے لگے تو یہ محسوس کیا گیا کہ اگر آئندہ اسی طرح طلاق دینے والے کے بیان سے نیت کی تصدیق کر کے ایک طلاق قرار دی جاتی رہی تو بعید نہیں کہ لوگ شریعت کی دی ہوئی اس سہولت کو بے جا استعمال کرنے لگیں اور بیوی کو واپس لینے کے لیے جھوٹ کہہ دیں کہ نیت ایک ہی کی تھی۔ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی فراست اور انتظامِ دین میں دور بینی کو سبھی صحابہ رضی اللہ عنہم نے درست سمجھ کر اتفاق کیا۔ یہ حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ انھوں نے سمجھا کہ اگر ہمارے اس دور میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہوتے تو یقیناً وہ بھی اب دلوں کی مخفی نیت اور صاحبِ معاملہ کے بیان پر مدار رکھ کر فیصلہ نہ فرماتے۔ اس لیے قانون یہ بنا دیا کہ اب جو شخص تین مرتبہ لفظ طلاق کا تکرار کرے گا اس کی تین ہی طلاقیں قرار دی جائینگی۔ اس کی یہ بات نہ سنی جائے گی کہ اس نے نیت صرف ایک طلاق کی کی تھی۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے مذکورہ الصدر واقعہ میں جو الفاظ منقول ہیں وہ بھی اسی مضمون کی شہادت دیتے ہیں' انھوں نے فرمایا:

"ان الناس قد اسعتجلوا فی امر کانت لھم فیہ اناۃ فلو امضینا علیم۔"

"لوگ جلدی کرنے لگے ہیں ایک ایسے معاملہ میں جس میں ان کے لیے مہلت تھی' تو مناسب رہے گا کہ ہم اس کو ان پر نافذ کر دیں۔"

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے اس فرمان اور اس پر صحابہ کرام کے اجماع کی یہ توجیہہ جو بیان کی گئی ہے اس کی تصدیق روایات سے بھی ہوتی ہے اور اس سے ان دونوں سوالوں کا خود بخود حل نکل آتا ہے کہ روایات حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تین طلاق کو تین ہی قرار دے کر نافذ کرنا متعدد واقعات سے ثابت ہے۔ تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ فرمانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ عہد رسالت میں تین کو ایک ہی مانا جاتا تھا۔ کیونکہ معلوم ہوا کہ ایسی طلاق جو تین کے لفظ سے دی گئی یا تکرارِ طلاق تین کی نیت سے کیا گیا اس میں عہد رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں بھی تین ہی قرار دی جاتی تھیں۔ ایک قرار دینے کا تعلق ایسی طلاق سے ہے جس میں ثلاث کی تصریح نہ ہو

Marfat.com

یا تین طلاق دینے کا اقرار نہ ہو' بلکہ تین بطور تاکید کے کہنے کا دعویٰ ہو۔

اور یہ سوال بھی ختم ہو جاتا ہے کہ جب آنحضرت ﷺ نے تین کو ایک قرار دیا تھا تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے اس کی مخالفت کیوں کی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس سے اتفاق کیسے کر لیا۔ کیونکہ اس صورت میں فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی سہولت کے بے جا استعمال سے روکا ہے۔ معاذ اللہ آپ ﷺ کے کسی فیصلہ کے خلاف کا یہاں کوئی شائبہ نہیں۔

Marfat.com

19- آیت الکرسی بیانِ توحید کا شاہکار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ لَـہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ یَعْلَمُ مَابَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّـہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا یَــُٔوْدُہٗ حِفْظُھُمَا وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ﴾

(اللہ ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ ہے سب کا قائم رکھنے والا ہے، نہ اسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند، اسی کی ملکیت ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، کون ہے جو سفارش کرے اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر؟ وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے، اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے، حاوی ہے اس کا اقتدار آسمانوں پر اور زمین پر، اور نہیں تھکاتی ہے اسے ان دونوں کی حفاظت، اور وہ بلند ہے اور عظیم ہے) (۲۵۵)

سب سے پہلی بات جو اس آیتِ کریمہ میں فرمائی گئی ہے وہ اللہ کا تعارف اور اس کی اصل حیثیت کی وضاحت ہے۔ مشرکین عرب اپنی ساری گمراہیوں کے باوجود اللہ کو تسلیم کرتے تھے اور اہلِ کتاب تو اللہ اور اس کے رسولوں پر بھی ایمان رکھتے تھے اس لیے اللہ کا اقرار اور اس کا ایمان دنیا کی ایک مسلمہ بات تھی۔ البتہ گمراہی کی ابتدا اس بات سے ہوتی تھی کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ ہے یا نہیں؟ یہود نے اللہ کو اِلٰہ قرار دینے کے باوجود شرک کی مختلف صورتیں پیدا کر رکھی تھیں اور نصاریٰ نے تو اس قدر غلو سے کام لیا کہ انھوں نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو اللہ بنا

Marfat.com

ڈالا۔ یہ اگرچہ تمام نصاریٰ کا عقیدہ نہ تھا البتہ ان میں ایک قابل ذکر تعداد لوگوں کی ایسی موجود تھی جن کے بارے میں قرآنِ کریم نے کہا لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم (تحقیق ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے کہا مسیح ابن مریم اللہ ہے) لیکن مشرکین عرب اللہ کو ایک ماننے کے ساتھ ساتھ اس کی الوہیت میں نہ جانے کس کس کو شریک بناتے تھے۔ قرآنِ کریم نے مختلف جگہوں میں الوہیت کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ اور سورۃ الفاتحہ کی پہلی آیت کی وضاحت کے سلسلے میں ہم اس پر معروضات پیش کر چکے ہیں۔ اس میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ الٰہ' معبود کو بھی کہتے ہیں اور حاکم حقیقی کو بھی۔ اور وہ ذات بھی اِلٰہ ہے جس کی محبت عبودیت کا عنوان بن جائے۔ اور وہ بھی اِلٰہ ہے جسے حضور و غیاب میں پکارا جائے اور استمداد کی جائے۔ لیکن قرآنِ کریم نے ان تمام حوالوں سے صرف اللہ ہی کو الٰہ قرار دیا کہ ''وہی تمھارا معبود ہے' وہی تمھارا حاکم حقیقی ہے' وہی ہے جس کی محبت سے دل آباد رہنا چاہیے' وہی ہے جس کا خوف اور جس کی ناراضگی کا اندیشہ زندگی میں سب سے موثر عامل ہونا چاہیے' وہی ہے جس کے سامنے دست سوال پھیلنا چاہیے اور وہی ہے جس سے تنہائیوں میں عجز و نیاز کی مناجات ہونی چاہیے۔ مولانا حالی نے بڑی خوبصورتی سے بعض احادیث کا ترجمہ کرتے ہوئے اس کی وضاحت کی ہے۔

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرمان اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

Marfat.com

بنائے نزاع یہ بنیادی حقیقت ہے کہ دنیا میں تمام عظمتوں کا حقیقی مالک کون ہے؟ کون ہے جس کے سامنے سر بھی جھکنے چاہئیں اور اسی کی غیر مشروط اطاعت بھی ہونی چاہیے؟ اسی کو غیر مشروط طور پر آئین اور قانون دینے کا حق ہے؟ وہی ہے جس کی عظمت تمام عظمتوں کا آستانہ ہے۔ اسی پر دنیا ہمیشہ آپس میں اختلاف کرتی رہی۔ جو لوگ یہ تمام حقوق اللہ کے لیے سمجھتے ہیں ان کے لیے کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ کسی بادشاہ' کسی آمر مطلق کے سامنے سر جھکا دیں۔ وہ کسی پارلیمنٹ کے بارہ میں بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا دیا ہوا آئین و قانون اس صورت میں بھی واجب الاطاعت ہے جبکہ وہ اللہ کے آئین کے توڑ پر تیار کیا گیا ہو۔ اللہ ہی کی الوہیت کا یہ لازمی نقطہ ہے کہ حکم صرف اسی کو زیب دیتا ہے۔ اسی کی بات حرف آخر ہوتی ہے' وہی ہے جس کی کسی بات کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ دنیا میں ہر اس حاکم کی حکومت قابلِ تسلیم ہوگی اور اس پارلیمنٹ کے فیصلے احترام کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے جس میں اللہ کے احکام کی اطاعت کو اولین حیثیت دی گئی ہو' جن کی تمام تر قانون سازی صرف اس دائرے میں ہو جہاں اللہ کی شریعت خاموش ہو اور جن کی سوچ کے تمام دھارے اسلامی شریعت کی سوچ سے ہم آہنگ ہوں۔ جب کوئی شخص' کوئی پارلیمنٹ اللہ کی عظمت کو نظر انداز کر کے اپنی عظمت منوانے لگتی ہے یا اس کے آئین کو بائی پاس کرنے کی کوشش کرتی ہے تو یہیں سے اللہ کے ماننے والوں کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دیں یا کم از کم اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیں۔ کیونکہ

سروری زیبا فقط اس ذاتِ ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ

اس کے بعد اس آیتِ کریمہ میں اللہ کی چند بنیادی صفات کو ذکر فرمایا گیا ہے جن میں اللہ کا تعارف بھی ہے اور اس بات کی دلیل بھی کہ اللہ کے سوا کوئی اور اِلٰہ نہیں ہو سکتا۔ سب سے پہلی صفت جو بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ وہ ہے جو اَلْحَیُّ ہے یعنی وہ ازل سے ابد تک زندہ ہے۔ جسے کبھی موت نہیں آ سکتی۔ کیونکہ موت کا خالق بھی وہی ہے۔ موت آنا مخلوق کی صفت ہے۔ اللہ مخلوق نہیں خالق ہے۔ اور دوسری صفت بیان فرمائی کہ وہ قیوم ہے قیوم اس ذات کو کہتے ہیں جو خود اپنے بل پر قائم ہو اور دوسروں کے قیام و بقا کا واسطہ و

Marfat.com

ذریعہ ہو اسے اپنے قیام کے لیے کسی کی احتیاج نہ ہو اور دوسری کائنات کی ہر شے اپنی زندگی اور بقا کے لیے اس کی محتاج ہو۔ جسے وہ وجود دے وہ وجود پائے' جسے وہ ختم کردے وہ ختم ہو جائے۔ جس کے وجود پانے کے بعد اگر اس کے زندہ رہنے کے امکانات وہ مہیا نہ کرے تو وہ موت کی شکار ہو جائے۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو آپ سے آپ وجود میں آسکتی ہو اور پھر وجود میں آنے کے بعد اللہ کے دیے ہوئے امکانات کو نظر انداز کر کے باقی اور قائم رہ سکتی ہو۔ یہ دو بنیادی صفات اللہ کی الوہیت کے لیے دلیل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ایک طرح کا چیلنج بھی ہیں کہ دنیا بھر کے مشرکوں نے جن قوتوں کو اللہ کی الوہیت میں شریک کر رکھا ہے وہ بتائیں کہ ان میں کون ہے جو ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گا اور کون ایسا ہے جس کی زندگی اپنے بل پر قائم ہے۔ اور ایسا کون ہے کہ پوری کائنات اس کی وجہ سے وجود میں آئی ہو اور اس کی وجہ سے قائم اور باقی ہو۔ دنیا بھر کے مشرکین اس چیلنج کا سامنا نہیں کرسکتے۔ اور جب یہ اعتراف موجود ہے کہ واقعی ایسی کوئی اور ذات نہیں تو پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اللہ کی الوہیت میں دوسروں کو شریک کیا جاتا ہے۔

سِنَةٌ ...... نَوْمٌ

ان دو مثبت صفات کے بعد کچھ ایسی سلبی صفات یا نقائص بیان کیے جارہے ہیں جن سے اللہ پاک اور منزہ ہے۔ جو متذکرہ بالا صفات کے بالکل برعکس ہیں۔ ان میں سے دو چیزوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک کو سنۃ کہا گیا ہے اور دوسری کو نوم کا نام دیا گیا ہے۔ سنۃ اونگھ کو کہتے ہیں اور نوم کے معنی نیند کے ہیں۔ نیند کا آغاز اونگھ سے ہوتا ہے اور اس کی انتہاء نوم کہلاتی ہے۔ یہ دونوں غفلت کی دو صورتیں ہیں۔ ان دونوں کے ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غفلت کے تمام اثرات سے منزہ ہے۔ وہ چونکہ اپنی ذات میں حی اور قیوم ہے تو جو ذات حی اور قیوم ہو اور جس کی وجہ سے تمام دنیا زندہ اور قائم ہو اسے اونگھ یا نیند کیسے آسکتی ہے۔ وہ کسی طرح کی غفلت کا کیسے شکار ہوسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے اونگھ جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کی زندگی جس سے وابستہ ہے وہ سرچشمہ خاموش ہو گیا۔ اور اس کے سو جانے کا معنی یہ ہوگا کہ دنیا اپنی حفاظت سے محروم ہوگئی۔ دنیا میں حشرات الارض سے لے کر بڑے سے بڑے سیارے تک اور معمولی مخلوق سے لے کر حضرت جبریل امین تک اپنی زندگی اور

Marfat.com

بقا کی بھیک اللہ سے مانگنے پر مجبور ہیں۔ اوران کی زندگی اس وقت تک باقی ہے جب تک اللہ کی حفاظت میسر ہے۔ تو اگر اسے اونگھ آ جائے یا وہ سو جائے تو اندازہ لگایئے کہ کائنات کی ایک ایک مخلوق کی زندگی کی حفاظت کون کرے گا؟ ہوائی جہاز کا اڑانے والا پائلٹ اور ٹرین یا گاڑی چلانے والا ڈرائیور اگر اونگھ جائے تو سینکڑوں انسانوں کی جان خطرے میں آ جاتی ہے۔ کیونکہ جہاز اور گاڑی کے مسافر اس ڈرائیور کی حفاظت میں ہیں تو یہ کائنات کی گاڑی صرف اللہ کی حفاظت میں محفوظ اور اللہ کے حکم سے رواں دواں ہے۔ اسی گاڑی کی حفاظت کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف ایک ہی کے قبضے میں اور ایک ہی کی دسترس میں ہے۔ اسے اگر اونگھ آ جائے یا نیند آ جائے تو اس کائنات کی تباہی اور بربادی میں کوئی تاخیر نہیں ہو سکتی۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ کائنات نہ جانے کب سے اپنے سفر پر رواں ہے۔ اس کا ایک ایک کرہ اپنے محور میں محو گردش ہے۔ ہر کرہ کی حرکت' اس کی رفتار' اس کی منزلیں' اس کا راستہ اربوں سال گزرنے پر بھی کسی تغیر کا شکار نہیں ہوا' آسمان کی وسعتوں میں بے شمار سیارے ثوابت اور ستارے ہر طرح کے خلل سے محفوظ ہیں۔ ان کی حفاظت اور ان کا ہر خلل سے محفوظ رہنا یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کائنات کا الٰہ ایک ہے' وہ حی و قیوم ہے اور اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے۔

لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (اسی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے) وہ ذات کبریا اور خالق ارض و سما' جس کا حکم ساری کائنات پر جاری و ساری ہے اور جس کی حفاظت اور نگرانی کی وجہ سے تمام کائنات زندگی کے مزے لوٹ رہی ہے اور بے دریغ اپنے معمولات انجام دے رہی ہے' اسی کو یہ بات زیب دیتی ہے اور اس صورتِ حال کا منطقی تقاضا بھی ہے کہ کائنات کی ایک ایک مخلوق اسی کی مملوک ہو۔ وہی سب کا مالک' سب کا آقا' سب کا حکمران' سب کا ملجا و ماویٰ' سب کا محبوب' سب کا مطلوب اور مرجع و منزل ٹھہرے اور اس عظیم و جلیل ذات کے سامنے کسی کو دم مارنے کی مجال نہ ہو۔ اس کا فیصلہ قطعی و آخری اور اس کا حکم اٹل اور حرفِ آخر ہو۔ ان حقائق کو تسلیم کرنے سے بالبداہت دو اور دو چار کی طرح ایک اور حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس ذات عظیم کی شان اور مرتبہ یہ ہے کس طرح ممکن ہے کہ کوئی شخص اپنی مرضی سے اس کا فیصلہ تبدیل کرانے کی جسارت کرے۔ اور لوگ اپنی حماقت سے اس بات کی امید رکھیں کہ جنھیں ہم نے اللہ کا شریک بنا رکھا ہے وہ اگر چاہیں گے تو اللہ سے اپنی بات منوا کر ہمارے حق میں فیصلہ کروا دیں گے۔ اس لیے فرمایا:

Marfat.com

شفاعت کی وضاحت

مَنْ ذَاالَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ (کون ہے جو اس کے حضور اس کی اجازت کے بغیر کسی کی سفارش کر سکے) کیونکہ کائنات کی ایک ایک مخلوق اس کی مملوک ومحکوم ہے۔اوراس کے ہر حکم کو ماننے کی پابند ہے۔وہ سب کا مطاع مطلق ہے۔ایسی صورت میں کسی کی کیا مجال ہوسکتی ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لیے زبان کھولنے کی جرأت کرے۔اس سے منطقی انداز میں یہ بات تو بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ کی مرضی کے مقابلے میں کسی کی مرضی نہیں چل سکتی۔اوراس کی اجازت کے بغیر کوئی زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔بلکہ اگر وہ حوصلہ نہ دے تو کسی کی یہ مجال بھی نہیں کہ اس کا سامنا کر سکے۔لیکن یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے اس اصول سے استثناء کرتے ہوئے الا باذنہ فرمایا۔ یعنی اس کی عظمت اور کبریائی کو دیکھتے ہوئے تو کسی کے لیے شفاعت کی کوئی گنجائش نہیں' لیکن اگر وہ خود چاہے تو کسی کو اس کی اجازت دے سکتا ہے۔شفاعت کے جس تصور نے قوموں کو تباہ کیا ہے وہ یہی من مرضی کا تصور ہے۔وہ یہ سمجھتے تھے اور آج بھی کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ زندگی عطا فرمایا ہے اگر کوئی شخص یا کوئی قوم اس کی مخالفت میں زندگی گزارتی ہے' اسے ماننے سے انکار کرتی ہے یا مانتی ہے لیکن عمل کے لیے تیار نہیں اور اپنی خواہشات کے اتباع میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعمیر پر مصر ہے۔جب انھیں ان کی اس معصیت اور نافرمانی پر توجہ دلائی جاتی ہے تو ان کے نزدیک شفاعت کا غلط تصور ایک سہارا بن جاتا ہے۔وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اللہ کے مقابلے میں جن شریکوں کو پوجتے' ان کے نام کی دہائی دیتے' ان کیلیے چڑھاوے چڑھاتے اور ان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے ہیں چاہے وہ مظاہرِ قدرت ہوں یا مظاہرِ فطرت' اجرامِ فلکی ہوں یا اجسامِ ارضی' پتھر کے تراشیدہ بت ہوں یا نام نہاد احبار و رہبان' ان کے بھروسے پر وہ ہر برائی کر گزرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔اس خطرناک تصور نے انھیں حسن عمل سے بالکل محروم کر دیا ہے۔آج کے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی ایسی ہی شفاعت کے غلط تصور پر اعتماد کر کے زندگی گزار رہی ہے۔جو آدمی کسی کا دامن گرفتہ ہے وہ اسی کو اپنا نجات دہندہ سمجھتا ہے۔بعض لوگوں نے تو خود آنحضرت ﷺ کو ایسا ہی شفیع سمجھ رکھا ہے کہ وہ اللہ کے بڑے سے بڑے نافرمان کو بھی اصرار کر کے چھڑا لیں گے۔ایسے نادان یہ سمجھتے ہیں کہ

Marfat.com

جس ایمان و عمل کی دعوت کے لیے آنحضرت ﷺ نے ساری زندگی کھپائی اور زندگی کا ہر دکھ اٹھایا اور جس طرز زندگی اور ضابطۂ حیات کو اپنانے پر ہمیشہ زور دیا اور اسی پر آخرت کی نجات کا دارومدار رکھا، کس قدر حیرت کی بات ہے کہ وہ اس شخص کی شفاعت فرمائیں گے جس نے آنحضرت ﷺ کی زندگی بھر کی کاوشوں کو درخورِ اعتنا سمجھنے کی زحمت نہیں کی۔ وہ اللہ کے ایک ایک حکم کو توڑتا رہا، جس کے لیے حضور ﷺ نے لامتناہی قربانیاں دی تھیں اور آپ ﷺ کی ایک ایک سنت کو پامال کرتا رہا اور پھر آپ ﷺ ہی سے امید رکھتا ہے کہ آپ میری شفاعت فرمائیں گے۔ آپ ﷺ نے ایک موقع پر اپنے اعزہ و اقرباء کو سمجھاتے ہوئے اپنی پھوپھی محترمہ اور اپنی لختِ جگر کو خطاب کر کے فرمایا تھا کہ ''تم ایمان و عمل کا سرمایہ لے کر ساتھ جانا اور اگر تم نے نافرمانی کی زندگی گزاری تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔'' لیکن اس غلط تصور کے مقابل قرآنِ کریم اور آنحضرت ﷺ نے صحیح تصور بھی عطا فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض مقرب بندوں کو شفاعت کی عزت بخشیں گے، جن میں انبیاءِ کرام بھی ہوں گے اور اولیاء کرام بھی اور صالحین عظام بھی۔ لیکن یہ صرف اس شخص کی سفارش کریں گے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت عطا فرمائے گا کیونکہ اس کی اجازت کے بغیر کوئی اس کے سامنے زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ مشرکین عرب جیسے پہلے عرض کیا جا چکا کہ وہ فرشتوں سے شفاعت کی امید رکھتے تھے اور انھیں اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، پروردگار نے اس حوالے سے فرمایا:

﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ﴾

''مشرکین کہتے ہیں کہ خدا کی اولاد ہے اللہ ان چیزوں سے پاک اور برتر ہے فرشتے خدا کی اولاد نہیں بلکہ اس کے باعزت بندے ہیں وہ اس کے آگے بات کرنے میں سبقت نہیں کرتے وہ بس اس کے حکم ہی کی تعمیل کرتے ہیں۔''

مزید اس کی وضاحت فرماتے ہوئے قرآنِ کریم کہتا ہے:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا﴾

''اور اس دن کسی کو کسی کی شفاعت کچھ نفع نہیں پہنچائے گی مگر جس کے لیے

Marfat.com

خدائے رحمان اجازت دے اور اس کے لیے کوئی بات کہنے کو پسند کرے۔"

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو شفاعت کی اجازت تو دے گا لیکن وہ اللہ سے ڈرتے ہوئے وہی بات زبان سے نکالیں گے جو بالکل حق ہو گی۔ اور اسی کے لیے شفاعت فرمائیں گے جس کے لیے اللہ اجازت عطا فرمائیں گے۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آدمی ایمان و عمل سے بے نیاز ہو کر چند بزرگ شخصیتوں پر بھروسہ کر کے بیٹھ جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل چیز تو اللہ کی رضا ہے جو ایمان و عمل سے نصیب ہو گی جس آدمی نے اپنے اعمال صالحہ اور اپنی دعاؤں سے اپنے رب کو راضی کر لیا اس کے اعمال میں بخشش کے لیے اگر کوئی کمی ہو گی تو پروردگار اپنے کسی برگزیدہ بندے کو اجازت عطا فرمائے گا کہ میرے اس بندے کے لیے سفارش کرو۔ اس سے مقصود اپنے برگزیدہ بندوں کی عزت افزائی ہو گی اور اپنے گناہ گار بندے کی بخشش کا سامان ہو گا۔ شفاعت کے اس تصور سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شفاعت بھی صرف اللہ کی مرضی اور اس کے حکم سے میسر آئے گی۔ اس لیے ایک مومن کو اپنی بخشش کے لیے اللہ کی رضا کا سامان کرنا چاہیے اور آنحضرت ﷺ کی سنت پر عمل اور آپ ﷺ پر کثرت سے درود پڑھنا چاہیے تاکہ آپ ﷺ اللہ کی اجازت سے اپنے گناہ گار امتیوں کی سفارش فرمائیں۔

شفاعتِ کبریٰ

شفاعت کے حوالے سے سب سے بڑا مقام شفاعتِ کبریٰ ہے۔ محشر میں جب تمام لوگ حساب کتاب کے انتظار میں کھڑے ہوں گے اور ہر شخص اپنے اعمال کے اعتبار سے پسینے میں ڈوبا ہوا ہو گا' انتہائی ہولناک وقت' سراسیمگی اور بے چینی کی کیفیت اپنے عروج پر ہو گی اور ایک نفسا نفسی کا عالم ہو گا' لوگ اپنے انجام کو جاننے کے لیے بے قرار ہوں گے' لیکن حساب کتاب شروع ہونے کے کوئی آثار نظر نہیں آتے ہوں گے' لوگ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک اولوالعزم رسولوں کے پاس جائیں گے کہ آپ اللہ سے دعا کریں تاکہ حساب کتاب شروع ہو اور ہم اس ناقابلِ برداشت انتظار کی اذیت سے نکل سکیں۔ لیکن کوئی بڑے سے بڑا رسول بھی اس کے لیے تیار نہ ہو گا۔ سب اللہ کے جلال سے پناہ مانگتے ہوں گے آخر میں لوگ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پہنچیں گے۔ حضور فرماتے ہیں کہ میں لوگوں کی

Marfat.com

درخواست مان کر سر سجدے میں رکھ دوں گا اور اللہ کو ان صفات اور کلمات سے پکاروں گا جو اس وقت مجھے عطا کیے جائیں گے۔ میں نہیں جانتا کب تک میں سجدہ ریز رہوں گا' پھر اللہ کی طرف سے آواز آئے گی اے محمد (ﷺ) اپنا سر سجدے سے اٹھا لو جو مانگو گے دیا جائے گا۔ تب رسول اللہ ﷺ تمام امتوں کا حساب کتاب کرنے کے لیے اللہ سے درخواست کریں گے۔ اس طرح سے لوگوں کا حساب شروع ہوگا اور آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے لوگ انتظار کی اذیت سے نجات پائیں گے۔ غور فرمائیے آنحضرت ﷺ تمام لوگوں کے لیے پہلے پروردگار سے شفاعت کی اجازت مانگیں گے۔ اجازت ملے گی تو پھر آپ ﷺ شفاعت فرمائیں گے۔ ایک امتی کو ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے بہرہ ور ہونے کے لیے دعائیں مانگنی چاہئیں لیکن اعمال حسنہ سے کبھی غافل نہیں ہونا چاہیے۔

مشرکین نے جس طرح شفاعت کا ایک تصور بنا رکھا تھا اس کے ابطال کے لیے ایک ایسی دلیل دی جا رہی ہے جو نہایت سادہ ہے لیکن براہِ راست عقل کو اپیل کرتی اور دل میں جا اترتی ہے۔ وہ آیت کا اگلا جملہ ہے۔

شفاعت کا غلط تصور اور اس کی تردید

يَعْلَمُ مَابَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَاخَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ (وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے اور وہ اس کی معلومات میں سے کسی چیز کا بھی احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے) اسے سمجھنے کے لیے نہایت سادہ انداز میں لوگوں کے ذہنوں میں شفاعت اور سفارش کا جو تصور ہے وہ سمجھ لیجئے۔ کوئی آدمی یا کوئی ملازم کسی خلافِ قانون حرکت پہ پکڑا جاتا ہے یا اس کے خلاف کسی رپورٹ پر اس کی گرفت ہوتی ہے تو وہ سفارشی تلاش کرتا ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ سفارشی ایسا ہونا چاہیے کہ جس افسر کے پاس میرا کیس ہے اس پر وہ اثر رکھتا ہو۔ اولاً تو سفارشی کی حیثیت اس افسر سے بڑی ہوتا کہ وہ اس کی سفارش کو رد نہ کر سکے اور یا پھر اس سے ایسی دوستی ہو کہ وہ اسے ناراض نہ کر سکتا ہو اور یا پھر سفارشی کی ایسی حیثیت ہو کہ افسر کو بھی اس سے کام پڑ سکتے ہوں تو وہ اس کی بات مان لینے پر اس لیے مجبور ہوگا کہ آج میں نے اگر اس کا کام نہ کیا تو کل کو یہ میرا کام بھی نہیں

Marfat.com

کرے گا۔ اور آخری بات یہ کہ سفارشی اس افسر کے پاس جا کر یہ یقین دلائے کہ جس شخص کو سزا دی جا رہی ہے اسے آپ نہیں جانتے اور میں اسے پوری طرح جانتا ہوں۔ آپ کے علم میں جو باتیں لائی گئی ہیں وہ غلط ہیں اور میں آپ کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کرتا ہوں کیونکہ آپ کے پاس براہِ راست جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ جہاں تک پہلی باتوں کا تعلق ہے وہ تو بالبداہت غلط ہیں۔ کوئی شخص بھی اللہ کی ذات سے بڑھ کر نہیں۔ کسی کی اس سے ایسی دوستی نہیں کہ وہ اس کی ناراضگی سے ڈر جائے' اسے کسی سے کوئی کام نہیں پڑتا تمام مخلوق اس کی محتاج ہے وہ کسی کا محتاج نہیں۔ اور جہاں تک آخری بات کا تعلق ہے اس کے بارے میں اس جملے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ سفارش کرنے والا اللہ کے علم میں کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر آدمی کے ماله وما علیه سے واقف ہے۔ جو کچھ سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو پیچھے ہے وہ اس سے بھی باخبر ہے۔ یعنی اس کے لیے زمانے کی کوئی تقسیم نہیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ظاہر و باطن کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس لیے کوئی سفارش کرنے والا اسے یہ نہیں کہہ سکتا کہ آپ اس کیس کو پوری طرح نہیں جانتے میں جانتا ہوں اس لیے میں اس کی وضاحت کرنے آیا ہوں۔ ہر شخص کا علم ناقص اور محدود ہے۔ وہ ظاہر کو جانتا ہے باطن سے بے خبر ہے۔ وہ جس کی سفارش کر رہا ہے وہ اگر کوئی بات اس سے چھپا لے یا اسے غلط بتائے تو اس کے پاس صحیح جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں' لیکن اللہ کا علم کامل' حدود سے ماورا' ہر طرح کی غلطی اور نقص سے پاک۔ تو پھر کس بنیاد پر آخر اس سے سفارش کی جائے۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور برگزیدہ بندوں کو اس کی اجازت دیں گے۔ اور ہمارے رسول پاک ﷺ کی شفاعت ہمارے لیے بہت بڑے حوصلے کا سامان ہے۔ اور وہ شفاعت برحق ہے۔ لیکن وہ سراسر اللہ کی دین' اس کا عطیہ' اس کی عزت افزائی اور اس کا کرم ہے۔ اس لیے ہمیں آنحضرت ﷺ کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کے لیے بھی اسی سے دعائیں کرنی ہے' اسی پر ہمیشہ بھروسہ رکھنا ہے' کسی دوسرے بھروسے پر ایمان و عمل سے غفلت سے کی کوئی گنجائش نہیں۔ مزید ارشاد فرمایا:

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ج وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔

''اس کا اقتدار آسمانوں اور زمین سب پر حاوی ہے۔ اور ان کی حفاظت اس پر ذرا بھی گراں نہیں۔''

Marfat.com

کرسی کا مفہوم

"الکرسی" اس کی تفسیر میں متعدد اقوال نقل کیے جاتے ہیں۔ علامہ ابن جریر نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول ترجیح کے لائق سمجھا ہے کہ "کرسی" سے مراد اس کا علم ہے۔ اور ابن جریر نے یہ بھی فرمایا کہ اسی سے کراسۃ ماخوذ ہے جس کے معنی اس دفتر کے ہیں جس میں علم منضبط کیا جاتا ہے اور عربی میں علماء کو "کراسی" بھی کہا جاتا ہے۔

لغت میں "کرس" کسی چیز کی جمی جمائی تہہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے کرسی کا لفظ بنا۔ اس لیے کرسی بیٹھنے کی جگہ یا تخت وغیرہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔ اور جب یہ بیٹھنے کی جگہ صاحب اقتدار کے لیے خاص ہو تو وہ اس کے اقتدار کا مرکز ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے اہل علم نے کرسی کا لفظ اقتدار کی تعبیر کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس جملے میں بھی یہی معنی ہوگا کہ اللہ کی کرسی سے مراد اس کا اقتدار ہے۔ البتہ یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ یہاں تو یقیناً کرسی کا معنی اس کا اقتدار ہی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اللہ کی جلیل القدر مخلوقات میں سے کرسی بھی اس کی مخلوق ہے۔ جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

یا اباذر ماالسموات السبع مع الکرسی الا کحلقة ملقاة فی ارض فلاة۔

"کرسی کی وسعت و فراخی کے سامنے سات آسمان یوں معلوم ہوتے ہیں جیسے ایک صحرا میں ایک مندری پڑی ہے۔"

جس پروردگارِ عالم نے زمین و آسمان پیدا کیے ہیں اس کے لیے کوئی مشکل نہیں کہ وہ اتنی بڑی کرسی کو پیدا کر دے۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ پروردگار اس کرسی پر فروکش نہیں ہوتا کیونکہ کوئی مقام بھی اللہ کی ذات کو اپنے اندر سما نہیں سکتا۔ مزید یہ بات بھی کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جسم سے پاک ہے اس لیے اسے کسی کرسی، کسی تخت یا کسی مکان کی احتیاج نہیں۔ رہی یہ بات کہ یہ کرسی کیوں بنائی گئی تو اللہ کی صفات کی طرح اس کی بعض مخلوقات کی حقیقت کو بھی ہم نہیں جانتے۔ ہم تو آج تک یہ نہیں سمجھ سکے کہ سر کے بال کہاں سے آتے ہیں؟ ناخن کیسے لمبے ہوتے ہیں؟ بیلیں کیسے پھیلتی ہیں؟ مختلف توجیہات کی جاتی ہیں لیکن حقیقت ہم سے کوسوں دور ہے۔ فرشتے غیر مرئی مخلوق ہیں، ہم اللہ کے نبیوں کے

Marfat.com

بتانے کی وجہ سے ان پر یقین رکھتے ہیں لیکن وہ کیسے ہیں؟ ہم ان کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟ اسی طرح کرسی بھی ان مخلوقات میں سے ہے جس کا علم ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمایا ہے لیکن اس کی حقیقت سے ہم بے خبر ہیں اور اس کی حقیقت جاننے کے در پے ہونا بجائے خود ایک گمراہی ہے جس سے روکا گیا ہے۔

اقتدارِ الٰہی کی ہمہ گیری

مشرکینِ عرب کا یہ گمان تھا کہ کائنات کی وسعتوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ جس طرح ایک بادشاہ اپنے ملک کے دور دراز گوشوں کا انتظام خود نہیں کر سکتا' اس کے لیے وہ مختلف عہدیدار مقرر کرتا ہے تاکہ ان دور دراز گوشوں کا انتظام درست رکھا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ تنہا اتنی بڑی کائنات کا انتظام چلا سکے۔ وہ یقیناً اس کا انتظام چلانے میں ایسی قوتوں کا محتاج ہے جنھیں وہ اپنا شریک بنا سکے تاکہ اس کائنات کے نظام چلانے میں وہ اس کے مدد و معاون ہوں۔ ان لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے کہ اللہ کا اقتدار آسمانوں اور زمین پر حاوی ہے۔ اور وہ زمین و آسمان کے نظام کو چلانے میں اور اس کی نگرانی میں کوئی گرانی اور تھکاوٹ محسوس نہیں کرتا۔ وہ یہود کی طرح یہ نہیں کہتا کہ اللہ تعالیٰ نے چھ دن میں کائنات پیدا کی اور ساتویں دن اس نے آرام کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وما مسنا من لغوب (ہمیں تھکاوٹ نہیں ہوتی) اور یہاں فرمایا کہ ہمیں اس کائنات کی نگرانی گراں نہیں گزرتی۔ ہمارے لیے اس کا انتظام و انصرام چلانا بوجھ ثابت نہیں ہوتا۔ اس لیے ہمیں کسی معاون کی ضرورت نہیں پڑتی۔ کیونکہ ہمارا علم غیر محدود' ہماری قدرت بے انتہا اور ہماری قوتِ تصرف تصور و خیال سے بالا ہے۔

وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ (وہ بلند ہے اور عظیم ہے) اس کی قدرتوں کی وسعتوں اور اس کے علم کی لامحدودیت کو اپنے محدود علم اور عقل کے پیمانوں سے نہ ناپو۔ وہ تمھاری قوت احساس سے بھی بلند ہے اور تمھارے تصور و ادراک سے بھی عظیم ہے۔ جب تک اس کی عظمتوں کا صحیح تصور اپنے اندر پیدا نہیں کرو گے اس وقت تک شرک کے کانٹے پھوٹتے رہیں گے۔ جب تک اس کی ذات کو ظن و قیاس اور تشبیہ و تمثیل کی خیال آرائیوں سے بلند نہیں سمجھو گے اس وقت تک کوئی نہ کوئی شیطان تمھیں وسوسوں کی گمراہی میں مبتلا کرتا رہے گا۔

Marfat.com

20- بنی اسرائیل کی منصبِ امامت سے معزولی اور امتِ مسلمہ کا تقرر

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ؕ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

(تم بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے نکالا گیا ہے۔ معروف کا حکم دیتے ہو منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہلِ کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا، ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں) (۱۱۰)

سیاقِ کلام دیکھتے ہوئے یہ بات پورے اطمینان سے کہی جاسکتی ہے کہ اہلِ کتاب کو حاملِ دعوت امت ہونے اور دنیا کی امامت کے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ ان کی فکری کجرویوں، نیتوں کے فسادات، گروہوں کی عصبیتوں اور اعمال کی خرابیوں کو ایک ایک کر کے اس طرح نمایاں کیا گیا ہے، جس سے خود بخود یہ بات واضح ہوتی چلی جاتی ہے کہ یہ امت جسے کبھی تمام جہان پر فضیلت دی گئی تھی اور جسے توحید کا علمبردار بنایا گیا تھا اور جسے ہدایت کا سرچشمہ قرار دے کر اللہ کے انعامات کا مورد بنا دیا گیا تھا۔ اب اس کا زوال اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے اور اب اس سے وہ عزتیں اور وجاہتیں واپس لی جا رہی ہیں جس کا اسے حامل بنایا گیا تھا۔ اس کے طور اطوار اور معاملات نے نہ صرف اپنی حیثیت کو خراب کیا بلکہ وہ اللہ کے دین کی رسوائی کا بھی باعث بنے۔ جب باغبان ہی باغ کو اجاڑنے لگے، جب گھر کا پاسبان ہی گھر کی

Marfat.com

دیواریں توڑنے لگے اور جب قلعہ دار ہی دشمنوں کے لیے قلعے کے مورچے کھول دے تو ایسے لوگوں پر تو غداری اور بے وفائی کا مقدمہ چلنا چاہیے نہ کہ انھیں اصل منصب پر بحال رکھنا چاہیے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران میں جا بجا اس حقیقت کو نمایاں ہوتے دکھایا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کا قاری اہلِ کتاب کے کرتوت پڑھ کر انتظار کرنے لگتا ہے کہ کب یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچتے ہیں اور قدرت کب ان کے لیے سزا کا اعلان کرتی ہے۔ چنانچہ چند رکوع پیشتر قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ...... الخ کی دعا کے ضمن میں واضح اشارہ دیا گیا تھا کہ کاتبِ تقدیر فیصلہ لکھنے ہی والا ہے۔ چنانچہ یہاں تک وہ پہنچ کر تقدیر کا فیصلہ لکھا جا چکا اور اب پیشِ نظر آیتِ کریمہ سے امتِ مسلمہ کو اس عظیم منصب پر فائز کیا جا رہا ہے جس پر کبھی حضرت ابراہیم علیہ السلام فائز ہوئے تھے اور جن کی جانشینی امت بنی اسرائیل کو دی گئی تھی۔

امتِ مسلمہ کی صفات

اس آیتِ کریمہ میں براہِ راست امتِ مسلمہ کو خطاب ہے۔ خطاب میں نہ صرف ان کے ٹائٹل اور انعام کا ذکر فرمایا گیا ہے بلکہ ان صفات کا بھی ذکر کر دیا گیا جو اتنے بڑے منصب پر فائز ہونے کے بعد مسلمانوں کے اندر نظر آنی چاہئیں۔ ٹائٹل اور منصب کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تم سب سے بہتر امت ہو۔ دنیا میں امتوں کی کمی نہیں۔ روئے زمین پر جا بجا امتیں بکھری ہوئی ہیں۔ لیکن انھوں نے اپنی اصل حیثیت کو نہ پہچان کر اپنی دوسری شناختیں مقرر کر رکھی ہیں۔ اپنی زندگی کے وظائف وہ ٹھہرا لیے ہیں جس کی وجہ سے وہ اصل امتیاز سے محروم ہو گئے ہیں۔ انھوں نے انسانی زندگی اور حیوانی زندگی میں بہت کم فرق رہنے دیا ہے۔ اس لیے اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ ایک ایسی امت کو اٹھایا جاتا جو انسان کی اس بنیادی ضرورت کی امین بنتی۔ اس کی ذات اسی کی مبلغ و منادہوتی۔ اس کی زندگی کے فیصلے خود بخود بولتے کہ اس کی اصل حیثیت کیا ہے؟ چنانچہ امت بنی اسرائیل کو صدیوں تک اسی کام کے لیے مصروفِ عمل رکھا گیا۔ لیکن ان کی نااہلی اور معزولی کے بعد اب یہ ضروری ہو گیا کہ کسی نئی امت کو اس عظیم اور کٹھن ذمہ داری پر فائز کیا جائے کیونکہ اللہ کی زمین ایسے لوگوں کے سپرد نہیں کی جا سکتی جو اسے درندوں کا بھٹ بنا دیں۔ جس میں ظلم اور بربریت کے سوا اور کسی چیز کو ترجیح ملتی نظر نہ آئے۔ چنانچہ اللہ نے انسانوں پر رحم فرمایا اور اس امت کو اس عظیم منصب پر فائز فرما کر انسانوں کی

Marfat.com

اصل ضرورت کو پورا کر دیا۔ اس عظیم منصب پر فائز ہونے والی چونکہ ہر امت اسی لقب سے ملقب ہوتی رہی ہے اس لیے اس امت کو بھی یہی لقب دیا گیا کہ تم سب سے بہترین امت ہو اور سورۂ بقرہ میں اسی منصب کا اعلان دوسرے لفظوں سے کیا گیا ہے وَكَذَالِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطًا (چنانچہ ہم نے تمھیں ایک امتِ وسط بنایا ہے) اس کا معنی بھی بہترین امت ہے کیونکہ خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَوْسَطُهَا (بہترین اموران کے اوسط ہوتے ہیں) ہر اہم چیز کو وسط میں جگہ ملتی ہے۔ صدارت کی کرسی ہمیشہ درمیان میں رکھی جاتی ہے۔ تخلیقی اور تکوینی طور پر اعتدال اور میانہ روی سب سے اہم صفت ہے۔ جس کا تعلق کمالِ اخلاق وصفات سے ہے۔

أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کا مفہوم

لیکن ساتھ ہی فرمایا کہ خیر امت ہونے کا لقب یا اعزاز محض ایک عہدہ و منصب نہیں بلکہ ایک ذمہ داری ہے اور یہ ذمہ داری ایسی ہے جو امت کو انفرادیت دینے کے لیے کافی ہے کہ تم وہ بہترین امت ہو جنھیں لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے مقرر کیا گیا ہے۔ یعنی تمھاری بعثت تمھاری قدر و منزلت اور تمھارے منصب کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی فکر بعد میں کرو دوسروں کی فکر پہلے کرو حالانکہ انسانی سرشت اور فطرت اس کے بالکل برعکس ہے۔ انسان سب سے پہلے اپنی فکر کرتا ہے، پھر اپنے بچوں کی کرتا ہے، پھر اپنے عزیز و اقارب کی کرتا ہے، پھر اپنی قوم کی کرتا ہے، پھر اپنے ملک کی کرتا ہے۔ اس میں غور فرمایئے کہ انسانی ترجیحات اور اس کی فکرمندیوں میں سب سے بڑا جو امتیاز ہے وہ اپنا ہے۔ یعنی وہ ہر وہ کام کرتا ہے جس کے ساتھ اپنا ہونے کی صفت لگی ہوئی ہے۔ اگر وہ بڑوں کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنے اپنے بڑوں کی۔ بچوں کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنوں بچوں کی۔ قرابت کی فکر کرے گا تو سب سے پہلے اپنے قرابت داروں کی۔ قوم اور وطن کے بارے میں سوچے گا تو سب سے پہلے اپنی قوم اور اپنے وطن کے بارے میں، لیکن اس امت کو مبعوث کرتے ہوئے جو بات کہی گئی ہے وہ اس رویے کے بالکل خلاف ہے۔ کہ تمھیں اس لیے اٹھایا جا رہا ہے تا کہ تم اپنی اور اپنے بچوں کی فکر کرنے کی بجائے دوسروں کی فکر کرو۔ تمھیں بھوک لگی ہو تو خود کھانا کھانے کی بجائے پہلے اسے کھلاؤ جو تم سے زیادہ بھوکا ہے۔ اسے کپڑا پہناؤ جو تم سے کم وسائل رکھتا ہے۔ اس کا علاج کرو جو تم سے زیادہ تکلیف میں ہے۔ ایسا ہونا بظاہر مشکل محسوس ہوتا ہے، لیکن اگر ہم ایک خاص پہلو

Marfat.com

سے اس پر غور کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ دنیا میں عزت ونجابت اور فضیلت ووجاہت اگر ملتی ہے تو صرف اسے جس کا زندگی گزارنے کا طریقہ یہی ہو۔ کہ وہ اپنی بجائے دوسروں کی فکر کرتا ہو۔ اور اپنے اوپر دوسروں کو ترجیح دیتا ہو۔

دنیا میں ہر پیشہ ور آدمی اور ہر مزدوری کرنے والا شخص صرف روٹی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے موچی جوتا گانٹھتا ہے، مزدور مزدوری کرتا ہے، کاشت کار ہل جوتتا ہے، نان بائی روٹی پکاتا ہے، مقصد سب کا ایک ہے کہ اپنی ضرورتیں پوری کی جاسکیں اور اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک کا علاج کیا جاسکے۔ صرف پیشہ ور لوگ نہیں، بلکہ جو لوگ دماغی محنت سے کام لیتے ہیں مختلف صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہیں، ان کا مقصود بھی معاش پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ البتہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو نوکری کرتے ہیں، جان کھپاتے ہیں، بلکہ بعض دفعہ جان قربان بھی کر دیتے ہیں، ہر طرح کی صعوبتیں اٹھاتے ہیں، لیکن ان کا مقصودِ حقیقی روٹی کمانا یعنی معاش پیدا کرنا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ ان کی ضروریات نہیں ہوتیں یا وہ غذا سے بے نیاز ہوتے ہیں یا ان کے بچوں کو تعلیم کی ضرورت نہیں ہوتی یا انھیں رہنے کے لیے چھت نہیں چاہیے، وہ یہ سب ضرورتیں رکھتے ہوئے بھی ان ضرورتوں کی خاطر جان نہیں کھپاتے۔

فوج ہر ملک کی ضرورت ہے۔ ملک کا وقار فوج سے ہے۔ ملک کا دفاع فوج کی ذمہ داری ہے۔ فوج کے بغیر کوئی ملک محفوظ نہیں رہ سکتا۔ فوج میں بھرتی ہونے والا یا کمیشن لینے والا کوئی شخص بھی تنخواہ کی خاطر فوج میں نہیں جاتا۔ یہ الگ بات ہے کہ انھیں تنخواہ بھی ملتی ہے۔ قوم ان کی ضروریات کو پورا بھی کرتی ہے، لیکن خود ایک سپاہی سے لے کر جرنیل تک تنخواہ کے لیے کام کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ انھیں کمیشن دیتے ہوئے یہ بات واضح کر دی جاتی ہے کہ تم یہاں نوکری کے لیے نہیں بلکہ ایک مقصد کے لیے آئے ہو۔ مقصد یہ ہے کہ تم قوم اور ملک کی حفاظت کرو۔ تم اس لیے جاگو تاکہ قوم اطمینان کی نیند سو سکے۔ تم اس لیے ملک کی سرحدوں پر پہرہ دو تاکہ ملک کا ایک ایک باسی اپنے جان و مال اور عزت و آبرو کو محفوظ سمجھے۔ تم اس لیے زندہ رہو تاکہ قوم کی زندگی پر آنچ نہ آئے۔ لیکن اگر کبھی ایسا وقت آجائے کہ تمھیں مر کر قوم کو زندگی دینا پڑے تو پھر تمھارا اصل ہدف اور اصل کام مرنا ہے جینا نہیں۔ ہر فوجی کے دل و دماغ کو اسی حقیقت سے آشنا کیا جاتا ہے اور اسی حقیقت کے ساتھ ہر فوجی اپنی ذمہ داریاں ادا کرتا ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی فوج صرف تنخواہ لینے اور کمانے کے لیے فوج کی نوکری کرے اور فوجی ذمہ

Marfat.com

داریاں ادا کرے تو ایسی کرائے کی فوج ملک وقوم کے لیے بوجھ تو ہوسکتی ہے، ملک کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔

جانور جنھیں اللہ تعالیٰ نے صرف احساسات کی دولت بخشی ہے جوہر عقل سے نہیں نوازا اور خیر وشر کی تمیز تو ان کا موضوع ہی نہیں۔ با ایں ہمہ! ہم دیکھتے ہیں کہ جانور بھی سب یکساں نہیں۔ جانوروں میں بیشتر انواع ایسی ہیں جنھیں صرف اپنی ضروریات کے حصول کی فکر ہوتی ہے۔ انھیں روٹی کا ٹکڑا یا دانہ دنکا ملنا چاہیے چاہے کسی بچے کے ہاتھ سے چھیننا پڑے۔ وہ ہر وقت پلٹنے جھپٹنے میں رہتے ہیں تاکہ کہیں سے بھی اپنی ضرورت پوری کی جاسکے۔ لیکن انھیں میں سے ایک جانور شاہین بھی ہے۔ وہ اپنی پرواز کی قوت اور اڑان کی بلندی میں اپنا ثانی نہیں رکھتا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی قوتوں سے نوازا ہے لیکن اس کے باوجود وہ کبھی کسی مردار پہ نہیں اترتا۔ کبھی کسی کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا نہیں چھینتا۔ کبھی کسی کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔ وہ سب سے زیادہ پلٹتا جھپٹتا ہے، لیکن ضروریات رکھتے ہوئے بھی پلٹنے جھپٹنے کا مقصد ضروریات کا حصول نہیں ہوتا۔ وہ بالکل ایک مردِ مومن کی طرح زندگی گزارتا ہے۔ ہمارے قومی شاعر اقبال نے اس کے اندر مومنانہ صفات دیکھی ہیں۔ اسی لیے اسی کی زبان سے اس نے کہلوایا؂

کیا میں نے اس خاکداں سے کنارہ
جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
جھپٹنا پلٹنا پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب یہ پچھّم چکوروں کی دنیا
مرا نیلگوں آسماں بے کرانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

اس امت کو بھی ایسی ہی صفات دے کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کے ایک ایک فرد کو بھی بھوک لگتی ہے۔ اسے بھی تن پوشی کے لیے کپڑا چاہیے، اسے بھی موسم کی شدت سے بچنے کے

Marfat.com

لیے وسائل درکار ہیں، اسے بھی اپنے سر کے لیے گھر کی چھت کی ضرورت ہے، اس کے بچے بھی تعلیم کے محتاج ہیں، انھیں بھی دوسرے بچوں کی طرح تمام ضرورتیں ملنی چاہئیں۔ لیکن یہ تمام چیزیں اس کا مقصد نہیں۔ اس کا مقصد بھی فوج کی طرح دوسروں کے لیے جینا ہے۔ یہ زندگی کی ضروریات پر محنت سے زیادہ اپنے منصبی مشاغل پر محنت کرتا ہے۔ اس کے سامنے لوگوں کی اصلاح و ہدایت ہے۔ جس طرح ایک دنیا دار ایک ایک روپے کی طلب میں جان کھپاتا ہے یہ ایک ایک شخص کی ہدایت کے لیے محنت کرتا ہے۔ اس کی نگاہ میں درہم و دینار اور سونا چاندی کے ڈھیروں کی وہ قیمت نہیں جو ایک انسان کی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس زمین کی خوشحالی اور زمین پر رہنے والے انسانوں کی آسودگی خود انسان کے اصلاح یافتہ ہونے میں ہے۔ انسان میں اگر محنت کا جذبہ ہے تو وسائل فراہم ہوتے دیر نہیں لگتی۔ اگر اس میں اللہ کا خوف اور تقویٰ ہے تو وسائل کو انسانی فلاح و صلاح میں خرچ کرتے ہوئے کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ اگر انسان کے اندر شکر کی صفت پائی جاتی ہو تو وہ جہاں اللہ کی نعمتوں کا قدردان ہوگا وہیں انسانوں کی خدمتوں کا قدردان بھی ہوگا۔ اگر اس کے اندر صبر کی قوت پائی جائے گی تو وہ ہوس زر میں کبھی مبتلا نہیں ہوگا اور بڑی سے بڑی مشکل کو بھی برداشت کر لینے میں اسے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ آپ مثال کے طور پر ایک ایسے گھر کا تصور کیجیے جس میں میاں بیوی ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کے پاسدار ہوں۔ وہ اللہ سے ڈرنے والے اور اپنی اولاد کے لیے سرتاپا شفیق ہوں اور ان کی اولاد اسلامی تربیت سے آراستہ ماں باپ کی فرمانبردار ہو اور اگر گھر میں اور افراد بھی ہیں تو ہر فرد دوسرے کے حقوق کی ادائیگی کے لیے بے چین ہو۔ اندازہ فرمائیے! اس گھر سے بڑھ کر خوش قسمت اور سعادت مند گھر اور کونسا ہوگا؟ لیکن اس کے برخلاف اگر ایک گھر میں دولت کی ریل پیل ہے، لیکن میاں بیوی دونوں ایک دوسرے سے خیانت کرتے ہیں، شرم و حیا گھر سے رخصت ہو چکے ہیں، اولاد ماں باپ کی شفقت سے محروم اور ماں باپ اولاد کی محبت اور خدمت سے بیگانہ ہیں۔ غور فرمائیے! کہنے کو تو یہ گھر بڑا خوبصورت گھر ہوگا لیکن حقیقت میں یہ گھر نہیں بلکہ حیوانوں کا باڑا ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ تم بہترین امت ہو اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمھیں خود سے زیادہ دوسروں کی ہدایت و فلاح کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔ تمھاری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔ تمھاری بھی باقی قوموں کے افراد کی طرح یقیناً یہ خواہش

Marfat.com

ہو گی کہ ہمارے ملک میں وسائل کی فراوانی ہو، سڑکیں صاف ستھری، مکانات خوبصورت اور آرام وراحت کا ہر ذریعہ میسر ہو، ہمارے کارخانوں کی چمنیاں دھواں اگلتی ہوں، ہمارے کھیت سونا اگلتے ہوں، ہر طرف دولت کی ریل پیل ہو۔ ان میں سے کوئی خواہش بھی بری نہیں۔ لیکن یہی تمام خواہشیں اور یہی تمام وسائل عذاب بن جاتے ہیں جب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے پر عمل نہیں ہوتا۔ مال لٹتا ہے، عزتیں اچھلتی ہیں، انصاف بے وقار ہوتا ہے، عدالتیں بکنے لگتی ہیں، احتسابی اداروں کی قیمتیں لگنے لگتی ہیں، حکمران حکومت کے نشے میں اندھے ہو جاتے ہیں تو اولاً تو یہ وسائل مہیا نہیں ہو سکتے اور اگر ہو جائیں تو آسودگی کی بجائے تباہی کا سبب بنتے ہیں جیسے آج ساری دنیا میں ہو رہا ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا کہ تمھیں اس لیے اٹھایا گیا ہے کہ تم دنیا میں معروف کو سربلند رکھنے کی کوشش کرو۔ برائی کو کبھی سر چڑھنے نہ دو۔ دنیا میں ان دونوں کا شعور عام کر دو اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دو کہ تمھارا اصل سرمایہ نیکی کا فروغ اور بدی کا زوال ہے۔ اسی میں تمھاری زندگی ہے اور اسی میں انسانی وقار ہے۔ باقی ساری امتیں وہ بے شک دنیا طلبی میں اندھی ہوتی رہیں لیکن تم اپنی اس بنیادی خصوصیت کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دینا۔ تمھاری فکر مندی بہتر سے بہتر وسائل کے لیے نہیں ہونی چاہیے بلکہ تمھاری فکر مندی اور پریشانی ایک ایک نیکی کے فروغ کے لیے، ایک ایک فرض کی ادائیگی کے لیے، ایک ایک حق کی بجا آوری کے لیے اور ایک ایک بھلائی کی سربلندی کے لیے ہونی چاہیے۔ لیکن یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو یعنی تمھارا دل و دماغ کبھی اس تصور سے خالی نہ ہونے پائے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو تمھارا اللہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ تمھارا ہر کام اس کی نگاہوں میں ہے۔ تم اسی کے عائد کردہ فرائض کی پابندی میں اسی کی رضا کی خاطر لگے ہوئے ہو۔ تمھاری رات کی تنہائیاں بھی اسی کی یاد اور اسی کے خوف سے آباد رہیں کیونکہ اللہ کی ذات اور اس کی صفات کا استحضار وہ دولت ہے جو انسان کو ہر برے تصور سے محفوظ رکھتی ہے۔ اگر یہ دولت آدمی کو نصیب نہ ہو تو نیکی بھی برائی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ بظاہر نیکی کا وعظ کہا جاتا ہے لیکن اس کا اثر اس لیے نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے ایمان کا نور نہیں ہوتا۔ جگر مراد آبادی نے ٹھیک کہا

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا تقریر بہت دلچسپ مگر
آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں چہرے پہ یقیں کا نور نہیں

Marfat.com

ایسی صورت میں خالی باتیں انسان کی قسمت بناتی نہیں بلکہ بگاڑتی ہیں۔

امتِ مسلمہ کی عزت افزائی اور ان کی حقیقی قدر و منزلت کو بیان کرنے کے بعد ایک عجیب بات ارشاد فرمائی۔ دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی نااہل کو اس کی نااہلی کی وجہ سے کسی عظیم منصب سے معزول کیا جاتا ہے تو پھر اسے کسی رحم یا مہربانی کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اہلِ کتاب کو سینکڑے سالوں کی نااہلی کے بعد اس عظیم منصب سے معزول کیا گیا۔ اب ان کی اصل جگہ سوائے جہنم کے اور کہیں نہیں۔ لیکن قربان جایئے اللہ کی کریمی کے کہ آخری آیت میں فرمایا:

﴿وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ﴾

''اگر اہلِ کتاب اپنی تمام تر بداعمالیوں اور چیرہ دستیوں کے باوجود اب بھی ایمان لے آئیں تو ان کے لیے بہتر ہوگا۔''

گزشتہ صدیوں کا ان سے حساب نہیں لیا جائے گا۔ وہ ایمان لا کر نئی زندگی کا آغاز کریں گے اور اپنے صدق و اخلاص سے اپنے لیے جو مقام پیدا کریں گے وہی ان کا حقیقی مقام ہوگا۔ گزشتہ حوالوں سے کسی بات کا ان سے تذکرہ نہیں ہوگا۔ اس قدر مروت و رحمدلی کے باوجود افسوس یہ ہے کہ ان میں ایمان لانے والے بہت کم ہیں زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو اللہ کے نافرمان اور حد سے گزر جانے والے ہیں۔

Marfat.com

21- سود کی حقیقت، نقصانات حرمت اور دیگر تفصیلات (حصہ اول)

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿اَلَّذِیْنَ یَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

(جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ نہیں اٹھیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چھو کر باؤلا کر دیا ہو۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے کہا کہ بیع بھی تو سود ہی کی مانند ہے۔ حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال ٹھہرایا ہے اور سود کو حرام۔ تو جس شخص کو اس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ باز آ گیا تو جو کچھ وہ لے چکا وہ اس کے لیے ہے اور اس کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ اور جو پھر اس کا ارادہ کریں تو وہی لوگ جہنمی ہیں اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) سورۃ البقرۃ (۲۷۵)

ربطِ کلام

اس سے پہلے دو رکوعوں میں انفاق کی ترغیب دی، فضیلت بیان کی، ضرورت کا احساس دلایا، جن قباحتوں سے انفاق کے مقصد کو نقصان پہنچتا ہے ان کا ذکر فرمایا، اللہ کے

Marfat.com

راستے میں جن چیزوں کا انفاق کرنا چاہیے ان کی پہچان بتائی اور پھر یہ بھی واضح فرمایا کہ انفاق جس طرح مسلمان معاشرے میں غربا اور ملک وملت کی ضرورتوں کی طلب ہے اسی طرح انفاق مسلمانوں کی تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ جن محرکات سے انسان بگڑتا اور برائی پھیلتی ہے ان محرکات میں سے ایک اہم محرک ہوسِ زر اور حبِّ زر بھی ہے۔ جب تک اس محبت کا امالہ نہ کیا جائے یعنی اس کا رخ خیر' مقاصد خیر اور اللہ کی طرف نہ موڑا جائے اس وقت تک اس کی برائی سے معاشرے کو بچانا ناممکن ہے۔ اور پھر اسی مضمون کی اختتامی آیت میں انفاق کے حوالے سے ان مسلمانوں کو اسوہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو جذبۂ انفاق سے وجود میں آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وہ اسی دنیا کے رہنے والے' انہی مسائل سے دوچار اور طبیعت کے انہی جذبات سے بہرہ ور جس سے معاشرے کے باقی افراد سروکار رکھتے ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کو رات اور دن خفیہ اور علانیہ یعنی ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کی رضا کے حصول اور بندوں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آمادہ رہتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو مسلمان معاشرے کا سرمایہ اور اسلامی تربیت کا نمونہ ہیں۔ انہی سے معاشرے کی آب و تاب اور اسلامی جذبات کی صحیح عکاسی ہوتی ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کا پیدا کرنا اسلام کا مقصد ہے۔

تُعْرَفُ الْاَشْيَآءُ بِاَضْدَادِهَا

انسانی فطرت یہ ہے کہ اسے کسی بات کا صحیح احساس اور مکمل شعور اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے سامنے اس چیز کی ضد اور مقابل کو لایا جاتا ہے۔ آدمی کو اس وقت تک حسن کا احساس مکمل نہیں ہوتا جب تک بدصورتی اس کے سامنے نہیں آتی۔ اندھیرے کا شعور روشنی سے اور روشنی کا احساس اندھیرے سے ہوتا ہے۔ راحت کی قدر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک آدمی مصیبت میں گرفتار نہیں ہوتا' ضدین کا وجود ایک دوسرے کے تعارف کے لیے مدو معاون ثابت ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم کا اسلوب انسانی فطرت کا عکاس ہے۔ اس لیے وہ کسی کو سمجھانے کے لیے عموماً اس کی ضد کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ جنت کے ساتھ جہنم' خیر کے ساتھ شر' روشنی کے ساتھ تاریکی' نعمت کے ساتھ سختی یا اس کے برعکس ضدین کا ذکر اس کا خاص اسلوب ہے تاکہ مخاطب کو بات سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ اسی اسلوب کے مطابق انفاق اور اس کے تمام لوازمات کو ذکر کرنے کے بعد اب اس کی سب سے بڑی ضد ربا یعنی سود کا ذکر کیا جارہا ہے۔

Marfat.com

سود کھانے والوں کا انجام

سب سے پہلی بات جو ارشاد فرمائی گئی ہے وہ سودی کاروبار کرنے والوں کا انجام ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں یعنی سودی کاروبار کرتے ہیں یا سود سے کسی طرح بھی متعلق ہیں' ان میں سے کچھ تو وہ لوگ ہیں جو کسی سخت مجبوری کے باعث سود میں ملوث ہو گئے' لیکن ان کے دلوں میں سود کے بارے میں نفرت اور کراہت موجود ہے اور وہ اس کا یقین رکھتے ہیں کہ سود کو واقعی اللہ نے حرام کیا ہے۔ تو ایسے لوگ اگر سود سے بچنے کے لیے اللہ سے توفیق مانگیں گے تو امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کبھی نہ کبھی اس سے نکلنے کا راستہ پیدا فرما دیں گے۔ اور اگر وہ اسے حرام سمجھتے ہوئے ساری عمر اس میں ملوث بھی رہے تو قیامت کے دن اس کی سزا پا لینے کے بعد کبھی نہ کبھی جنت میں بھیج دیے جائیں گے۔ لیکن جن لوگوں نے سود کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا، سودی کاروبار یا سودی ملازمت کو نہایت آسودگی کے ساتھ زندگی کا ہدف بنائے رکھا اور اسی پر خوش رہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سود کی محبت ان کے دلوں میں اتر جاتی ہے۔ اس کی حرمت اور اس سے نفرت کا احساس دل سے مٹ جاتا ہے۔ دل و دماغ اسی کے تصورات سے معمور اور اعضاء و جوارح اسی کے حصول اور ترقی میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جس کو قرآنِ کریم برائی کے احاطہ کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور اسی طرح وہ لوگ جو سرے سے اس کو حرام ہی نہیں سمجھتے ان کی عقل کا فیصلہ یہ ہے کہ جس طرح تجارت میں اپنے مال سے نفع کمایا جاتا ہے اسی طرح سود بھی آدمی کے اپنے مال کا نفع ہے۔ تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک نفع حلال ہو اور دوسرا حرام ہو۔ ان لوگوں نے چونکہ اپنے دل و دماغ میں سود کی افادیت اور محبت کو بسا لیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ رفتہ رفتہ دونوں کا فرق بھی ان کے احساس سے اتر گیا ہے۔ ایسے لوگوں کا انجام دنیا میں یہ ہوتا ہے کہ جس طرح ایک پاگل اور دیوانہ اپنی دیوانگی میں ایسی حرکتیں کرتا ہے کہ جسے وہ اپنے تئیں ضروری اور مفید سمجھتا ہے لیکن انسانی معاشرے اور انسانیت کے لیے وہ تباہ کن اور اذیت کا باعث ہوتی ہیں' لیکن اسے اس کا بالکل احساس نہیں ہوتا۔ اس کا گھر اخلاقی لحاظ سے دیوالیہ ہو جائے' اس کے اپنے اندر سے اور اس کے اہلِ خانہ سے غیرت و حمیت نکل جائے' اپنے اعزہ و اقرباء سے تعلقات ختم ہو جائیں' اس کے احباب مایوس ہو کر اس کے پاس آنا جانا چھوڑ دیں' لیکن اسے کسی بات کی بھی پرواہ ہوتی ہے نہ ہوش۔ اس کے سامنے دیوانوں کی طرح

Marfat.com

صرف ایک ہی ہدف ہوتا ہے کہ وہ مال و دولت کی دیوانگی میں جس طرح منہ اٹھائے بھاگا چلا جا رہا ہے بس اس کے اس راستے میں کسی چیز کو حائل نہیں ہونا چاہیے۔ ہر رشتۂ خیر کی محبت اس کے دل سے نکل جائے اسے پروا نہیں۔ کیونکہ اسے اب ایک ہی رشتہ عزیز ہے وہ ہے مال و دولت کا رشتہ حب زر ہر چیز کی محبت پر غالب آ جاتی ہے۔ دنیا میں اس دیوانگی کو اب اس لیے زیادہ محسوس نہیں کیا جاتا کہ ایسے دیوانوں کی اکثریت ہو گئی ہے۔ بلکہ اب اس شخص کو محسوس کیا جاتا ہے، جس میں مال و دولت کی محبت کم ہو جاتی ہے اور اقدارِ انسانیت کی محبت بڑھ جاتی ہے۔ انہی احساسات کا نتیجہ اس کی زندگی کے اعمال اور مصروفیات پر بھی پڑتا ہے۔ اب اس کا وقت نیکی کے کاموں میں اور نیکی کے مراکز میں زیادہ صرف ہوتا ہے تو دنیا کے دیوانے اسے دیوانہ سمجھنے لگتے ہیں۔ بالکل اس شخص کی طرح جو نک کٹوں کے ہجوم میں ایک ہی ناک والا ہو تو تمام ناک سے محروم اسے ناک والا ناک والا کہہ کر چھیڑتے ہیں۔ اکثریت ہمیشہ اپنے آپ کو برحق سمجھتی ہے۔ آج چونکہ ایسے ہی دیوانوں کی اکثریت ہے تو انھیں کون بتائے کہ تمھاری ناک کٹ چکی ہے۔ لیکن جب کبھی انسانیت اور انسانیت کی قدریں اور اللہ کی معرفت کا احساس ایک زندہ حقیقت تھی تو اس دیوانگی کو بڑی شدت سے محسوس کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہی دیوانے جب قیامت کو اٹھیں گے تو ان کو اس ہیئت کذائی میں اٹھایا جائے گا جو ان کی اصلی حالت کا نمونہ ہوگی۔ یہاں اس آیتِ کریمہ میں ان کی اسی اصل حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے کہ جس طرح کسی شخص کو آسیب لاحق ہو جائے یعنی جن اسے چھو جائے تو وہ دیوانوں کی طرح حرکتیں کرتا ہے (آسیب زدہ آدمی کو دیوانوں کی طرح حرکتیں کرتے اکثر دیکھا گیا ہے) اللہ نے جن کے دلوں میں نورِ ایمان رکھا ہے اور جن کا نیکی سے رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ شریعت کے احکام کے مطابق زندگی گزارتے ہیں کسی جن کی چھوت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی بجز اس کے کہ وہ انھیں کسی بیماری یا تکلیف میں مبتلا کر دے۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس کی ابلیس اور اس کی ذریت کو مہلت ملی ہوئی ہے۔ لیکن جن لوگوں کے دل پہلے ہی شیطان کے قبضے میں ہوں اور وہ شریعت کی مخالفت کی وجہ سے پہلے ہی اپنے آپ کو شیطان کے حوالے کر چکے ہوں تو شیطان کے لیے انھیں پاگل اور باؤلا کر دینا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ تو قیامت کے دن یہ اپنی اسی صحیح شکل و صورت میں اٹھیں گے اور دیکھنے والوں کو اس وقت احساس ہوگا کہ دنیا میں بھی ان کی دیوانگی کی یہی کیفیت تھی، لیکن اس وقت اس کا پوری طرح ادراک نہیں ہو سکا۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ

Marfat.com

آدمی اپنے عقیدہ و عمل سے جس طرح زندگی گزارتا ہے اسی طرح کی زندگی اسے قیامت کے دن ملے گی۔ وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی (جو دنیا میں عقل اور دل کا اندھا ہوگا وہ آخرت میں بھی اندھا ہی اٹھے گا) لیکن میرا ناقص گمان یہ ہے کہ آخرت میں وہ آنکھوں سے بھی اندھا ہوگا تاکہ لوگوں کو اندازہ ہوسکے کہ دنیا میں یہ دل سے اندھا تھا لیکن ہم اسے آنکھوں سے بینا ہونے کی وجہ سے پہچان نہ سکے لیکن آج اس کی پہچان مکمل ہوچکی ہے۔ کیونکہ اصل بینائی تو دل کی بینائی ہے' آنکھوں سے تو حیوانات بھی بینا ہیں' اسی لیے اقبال نے کہا ؂

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

انفاق سے دلوں کو زندگی ملتی ہے تَثْبِیْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سے یہی مراد ہے اور سود خوری سے دلوں کی زندگی مرجاتی ہے اور انسان باؤلا ہوجاتا ہے اور قیامت کے دن اسی کا اظہار ہوگا اور اس دن ان کا جرم بھی کھول کر بیان کردیا جائے گا کہ یہ سزا ان کو اس بات کی ملی ہے کہ یہ کہتے تھے کہ تجارت تو سود کی مانند ہے۔ تو تجارت حلال ہے تو سود کیسے حرام ہوسکتا ہے؟ حالانکہ انھیں یہ خوب معلوم تھا کہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ اور جس آدمی کی عقل موت کا شکار نہیں ہوئی اسے اور کچھ نہیں تو یہ بات سمجھنے میں تو کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیے کہ حلت و حرمت کا حق اللہ کے سوا کسی اور کو نہیں۔ وہ جس چیز کو چاہے حلال کردے اور جسے چاہے حرام کردے۔ اس کے حکم کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں یہ اس کا ذاتی اختیار ہے جس میں کسی بحث کی گنجائش نہیں۔ تو جب اس نے سود کو حرام کیا تو وہ حلال نہیں ہوسکتا۔ اور جب اس نے تجارت کو حلال کیا تو وہ حرام نہیں ہوسکتی۔ قطع نظر دوسری بحثوں کے جو شخص اس بنیادی بات کو نہیں مانتا یقیناً اس کی عقل پر شیطان کا غلبہ ہوگیا ہے اور ویسے بھی دیکھا جائے تو تجارت اور سود میں آخر کیا مماثلت ہے؟ لیکن اس کی وضاحت سے پہلے ضروری ہے کہ سود کی تعریف کے بارے میں کچھ عرض کردیا جائے۔

سود اور ربا کا مفہوم

جامع صغیر میں آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد منقول ہے جسے ماہرین حدیث نے حسن قرار دیا ہے۔ کل قرضٍ جرَّ نفعاً فھو ربا (جو قرض نفع حاصل کرے وہ ربا ہے)

Marfat.com

ابن عربی نے احکام القرآن میں اس کی تعریف کرتے ہوئے کہا الربوٰ فی اللغة الرباوة والمراد به فی الاٰية كل زيادة لا يقابلها عوض (یعنی ربا کے معنی اصل لغت میں زیادتی کے ہیں۔ اور آیت میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلہ میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض ادھار اور اس کی میعاد ہو) اور امام جصاص نے احکام القرآن میں ربا کے معنی بیان کرتے ہوئے کہا هوالقرض المشروط فيه الاجل و زيادةً مالٍ علی المستقرض (وہ قرض ہے جس میں کسی میعاد کے لیے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرض دار اس کو اصل مال سے زائد کچھ رقم دے گا) آنحضرت ﷺ کے ارشاد اور ابن عربی اور امام جصاص کی وضاحت سے ربا کی تعریف یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد وہ معین اضافہ ہے جو ایک قرض دینے والا مجرد مہلت کے عوض اپنے مقروض سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ اسلام سے پہلے بھی اور اسلام میں بھی یہ اصطلاح اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتی رہی ہے اور آج بھی اسی کو سود کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت سودی معاملات کی دو شکلیں رائج تھیں جنھیں اہل عرب ربا کے لفظ سے تعبیر کرتے تھے۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کے ہاتھ کوئی چیز فروخت کرتا اور ادائے قیمت کے لیے ایک مدت مقرر کر دیتا۔ اگر وہ مدت گزر جاتی اور قیمت ادا نہ ہوتی تو پھر وہ مزید مہلت دیتا اور قیمت میں اضافہ کر دیتا اور دوسری صورت یہ تھی کہ ایک شخص دوسرے شخص کو قرض دیتا اور اس سے طے کر لیتا کہ اتنی مدت میں اتنی رقم اصل سے زائد ادا کرنی ہوگی۔ اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ قرض خواہ اور قرض دار کے درمیان ایک خاص مدت کے لیے ایک شرح طے ہو جاتی تھی اور اگر اس مدت میں اصل رقم مع اضافہ کے ادا نہ ہوتی تو مزید مہلت پہلے سے زائد شرح پر دی جاتی تھی۔ لیکن تمام صورتوں میں اصل حقیقت ایک ہی تھی کہ قرض دینے والا قرض دار سے معین شرح پر صرف اس حق کی بنا پر اپنے دیے ہوئے روپے کا منافع وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپے کے استعمال کی اجازت دی ہے۔ اور اس بات کو اس حقیقت کے تعین میں کوئی دخل نہیں تھا کہ قرض کسی غریب و نادار کو دیا گیا ہے یا کسی امیر و تاجدار کو اور نہ اس بات سے اس میں کوئی فرق واقع ہوتا تھا کہ قرض کسی میت کی تجہیز و تکفین کے لیے دیا گیا ہے یا کسی رفاہی اسکیم کے لیے دیا گیا ہے' یا تجارت' زراعت اور صناعت کے کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبے کے لیے دیا گیا ہے۔ جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ قرض لینے والا

Marfat.com

امیر ہے یا غریب اور دینے والا کاروبار کے لیے دے رہا ہے یا ذاتی ضرورت کے لیے۔ جس قرض پر یہ ایک متعین اضافہ طے کیا گیا ہے اسے جاہلیت میں بھی اور اسلام میں بھی ربا کہا گیا ہے۔ لیکن ہمارے یہاں نہ جانے آج تک یہ بحث کیوں جاری ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں جس سود کو حرام قرار دیا گیا تھا وہ دراصل مہاجنی سود تھا جو ایک ضرورتمند اپنی انتہائی ضرورت پورا کرنے کے لیے کسی ساہوکار سے قرض لیتا تھا اور کسی کی ضرورت سے اس طرح فائدہ اٹھانا کہ اصل زر سے زائد وصول کرنا اور اگر وہ وقت پر ادا نہ کرے تو شرح سود کو بڑھاتے جانا یہ یقیناً ایک ایسا ظلم ہے جسے کوئی معاشرہ بھی پسند نہیں کرتا۔ لیکن کاش سود کی وکالت کرنے والے اس کی طرف توجہ دے سکیں کہ تم بینکوں اور کاروباری سود کو حلال کرنے کے لیے جو اس طرح کی موشگافیاں کرتے ہو اس کے نتیجے میں سود کی حرمت کا تصور ہی دماغوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کیونکہ جب اصل حرمت ہی باقی نہ رہی تو پھر کون اس بکھیڑے میں پڑے کہ کونسا سود ظلم ہے اور کونسا نہیں۔ چنانچہ آج بھی کاروباری سود کے ساتھ ساتھ مہاجنی سود بھی پوری طرح ان معاشروں میں جاری وساری ہے جن میں سود کی حرمت کا احساس مر چکا ہے۔

عہد نبوت کو سمجھنے میں کوتاہی

خرابی کی بنیاد یہ ہے کہ کچھ دانشوروں نے عہد نبوت کو سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ وہ زمانہ انتہائی پسماندگی کا زمانہ تھا۔ عرب صحرانشین تھے، انتہائی سادہ اور معمولی زندگی گزارتے تھے۔ گلہ بانی پر ان کا گزارہ تھا۔ اگر کہیں کوئی تجارت ہوتی بھی تھی تو گندم اور جو وغیرہ کی۔ یہ جنسیں ایک دوسرے کے تبادلے میں بکتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان میں تجارت نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی۔ تو جب ان میں تجارت ہی سرے سے مفقود تھی تو کمرشل لون یا کمرشل انٹرسٹ کا اس زمانے میں کیا تصور ہو سکتا ہے۔ حالانکہ اس زمانے کے حالات سے جو شخص کسی حد تک بھی واقف ہے وہ اس بات سے اچھی طرح آگاہ ہے کہ نہر سویز کے وجود میں آنے سے پہلے تک اور بڑے بڑے بحری جہازوں کی ایجاد سے قبل مشرق ومغرب کی تجارت خشکی کے راستے سے ہوتی تھی اور اس وقت تجارتی کاروانوں کی راہ گزر جزیرہ نما عرب تھا۔ عرب کے لوگ عموماً اور اہل مکہ خصوصاً تجارت میں خوب حصہ لیتے تھے۔ ان کے تجارتی قافلے سردیوں میں یمن وفارس کی طرف اور گرمیوں میں شام وروم کی طرف باقاعدگی

Marfat.com

سے جاتے تھے اور یہی ان کا ذریعۂ معاش تھا۔ اور تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جو قافلہ شام سے ابوسفیان کی قیادت میں مکہ واپس آ رہا تھا اور جو جنگ بدر کا سبب بنا اس میں تمام اہل مکہ کا سرمایہ تھا۔ مکہ میں کوئی گھر ایسا نہ تھا جس نے اس میں اپنا حصہ نہ ڈالا ہو۔

ہر قبیلہ جائنٹ اسٹاک کمپنی تھا

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے ''جائنٹ اسٹاک کمپنیاں جدید دور کی پیداوار ہیں اور اس سے پہلے ان کا تصور تک نہیں تھا'' یہ بالکل غلط ہے۔ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل ''جائنٹ اسٹاک کمپنی'' تھا۔ بلکہ مختلف قبائل مل کر بھی ایک کمپنی کی صورت اختیار کر لیتے تھے۔ پورے مکے والوں نے جائنٹ اسٹاک کمپنی کی طرز پر ایک ایک دینار اکٹھا کر کے ایک تجارتی کارواں تیار کیا تھا۔ جسے ابوسفیان ملک شام لے کے گئے تھے۔ اور یہ اتنا بڑا کاروان تھا کہ اس سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔ اور مقصود صرف یہ تھا کہ اس سے حاصل ہونے والے نفع سے مسلمانوں کا استیصال کیا جائے۔ اس قافلے کے علاوہ بھی عرب کا ہر قبیلہ اسی طرز پر اپنا کاروبار کرتا تھا کہ قبیلہ کے تمام لوگ مقدور بھر اپنی پونجی لا کر ایک جگہ جمع کرتے اور پھر اس سے ایک قافلۂ تجارت وجود میں آتا تھا۔ اندازہ فرمایئے کہ جس شخص کو پورا قبیلہ اپنے قرض کا امین بنا کر تجارت کے لیے بھیجتا تھا کیا وہ ایک غریب آدمی کو قرض دیتے تھے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو مستقلاً تجارت پیشہ لوگوں کو تجارت کے لیے قرض دیتے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب سود حرام کیا گیا تو بعض لوگوں کا سودی کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور یہ سارا تجارتی سود تھا۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں سود کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں آج کے دن جن جن لوگوں کا سود دوسروں کے ذمے ہے وہ ختم کرتا ہوں اور سب سے پہلے اپنے چچا عباس بن عبدالمطلب کا سود ختم کرتا ہوں۔ اور روایات میں آتا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا سود جو دوسروں کے ذمے تھا وہ دس ہزار مثقال سونا تھا۔ اور ایک مثقال تقریباً چار ماشے کا ہوتا ہے۔ اور یہ دس ہزار مثقال اصل سرمایہ نہیں تھا بلکہ یہ وہ سود تھا جو لوگوں کے ذمے اصل رقوم پر واجب الادا تھا۔ اس سے اندازہ لگایئے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار مثقال سونے کا سود لگ گیا ہو کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضروریات کے لیے لیا گیا تھا؟ یقیناً وہ قرض تجارتی مقاصد کے لیے حاصل کیا گیا تھا۔

Marfat.com

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں بینکاری کی مثال

عہد صحابہ رضی اللہ عنہم میں تو ہمیں بینکاری کی مثالیں بھی ملتی ہیں۔ حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ عشرہ مبشرہ میں سے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں اپنا حواری فرمایا تھا۔ انھوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے۔ لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لاکر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقم بطورِ قرض لیتا ہوں تاکہ اگر یہ ضائع ہو جائے تو میرے ذمے اس کی ادائیگی ضروری ہو۔ اور پھر آپ رضی اللہ عنہ اس رقم کو تجارت میں لگاتے' چنانچہ جس وقت آپ رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا حساب لگایا تو بائیس لاکھ دینار نکلے۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس زمانے میں تجارتی قرضوں کا لین دین تھا۔ اور قرآنِ کریم نے اسی پر زیادتی کو سود قرار دے کر حرام ٹھہرایا ہے۔ اس لیے سود کی حرمت سے راستہ نکالنے کے لیے اس طرح کے مفروضے قائم کرنا کہ اس زمانے میں کمرشل لون نہیں ہوتے تھے یہ سراسر ایک عذر لنگ ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کمپاؤنڈ انٹرسٹ یعنی مرکب سود تھا۔ اور قرآنِ کریم نے اسی کو حرام قرار دیا ہے۔ سود مفرد یعنی سمپل انٹرسٹ اس زمانے میں نہیں تھا اور نہ قرآنِ کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ حالانکہ آگے قرآنِ کریم میں آیت آ رہی ہے اس میں فرمایا گیا ہے کہ جو تمھارا سود باقی ہے اسے چھوڑ دو۔ اس میں کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ اور اگر تم سود سے توبہ کرلو تو تمھارا جو راس المال ہے وہ تمھارا حق ہے۔ لیکن اس کے علاوہ کوئی سی بھی زیادتی تمھارے لیے ناجائز ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ کریم نے ہر طرح کے سود کو حرام قرار دیا ہے چاہے وہ سود مفرد ہو یا مرکب' وہ ذاتی ضرورتوں کے لیے دیا جائے یا تجارتی اغراض کے لیے' سود کی حرمت پر ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بینکنگ انٹرسٹ بھی حرام ہے

جہاں تک بینکنگ انٹرسٹ کا تعلق ہے اس کے بارہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ سالوں تک یہ بحثیں ہوتی رہی ہیں کہ جس سود کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے ان میں بینکنگ

Marfat.com

انٹرسٹ بھی شامل ہے یا نہیں؟ لیکن اب ساری دنیا کے علماء اور ماہرین معاشیات اور مسلم بینکرز بھی اس بات پر متفق ہیں کہ بینکنگ انٹرسٹ بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح عام قرض کے لین دین پر سود حرام ہوتا ہے۔ اور اب اس پر اجماع ہو چکا ہے کسی قابل ذکر شخص کا اس میں اختلاف نہیں، غالباً 1990ء یا کم وبیش جدہ میں مجمع الفقہ الاسلامی کا ایک اجتماع ہوا تھا جس میں تقریباً پینتالیس مسلم ملکوں کے دوسو جلیل القدر علماء شریک ہوئے تھے۔ سب نے بالاتفاق یہ فتویٰ دیا تھا کہ بینکنگ انٹرسٹ بالکل حرام ہے، اس کے جائز ہونے کا کوئی راستہ نہیں۔

تجارت اور سود میں فرق

اس آیت کریمہ میں بتایا گیا ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں ان کی عقلیں اس حد تک ماؤف ہو جاتی ہیں کہ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ آخر ربا میں اس کے سوا کیا چیز ہے کہ اپنے پیسے کے ذریعے آدمی دوسرے سے پیسہ کماتا ہے؟ جس طرح ایک تاجر تجارت کے ذریعے پیسہ کماتا ہے اور اپنے مال کو تجارت میں صرف کر کے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح سود لینے والا بھی اپنا مال قرض دے کر اس کے بڑھانے کی تدبیر کرتا ہے۔ آج کل بھی سود کو جائز سمجھنے والے اسی دلیل کا سہارا لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے سود کو بیع پر قیاس کرنے والوں کی نسل دنیا میں نئی ہے۔ یہ ایک دیوانگی ہے کیونکہ اگر ان پر حب دنیا دیوانگی کی شکل اختیار نہ کرے تو وہ بھی بڑی آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک تاجر اور سود خور میں آخر کیا نسبت ہے؟ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسی چیز کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی لوگوں کو طلب ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے صرف مال ہی کو حرکت میں نہیں لاتا بلکہ رات دن اس کے لیے محنت کرتا ہے، زحمت اٹھاتا ہے، دوڑ بھاگ کرتا ہے، وقت صرف کرتا اور نیندیں حرام کرتا ہے اور مسلسل محنت کے بعد لوگوں کو وہ اشیائے ضرورت فراہم کرتا ہے کہ لوگ اگر اس کو خود حاصل کرنا چاہتے تو کبھی حاصل نہ کر سکتے اور اگر حاصل کرتے تو کم از کم اس قیمت پر حاصل نہ کر سکتے جس قیمت پر ایک تاجر انھیں مہیا کرتا ہے۔ پھر اس محنت و ریاضت کے ساتھ ساتھ وہ اپنے سرمائے کو تجارت کے اتار چڑھاؤ کے سپرد کر دیتا ہے۔ وہ یقیناً اپنا مالِ تجارت بازار میں نفع کی نیت سے لاتا ہے، لیکن بازار کا اتار چڑھاؤ تو اس کے قبضہ میں نہیں ہوتا۔ اس کے نتیجے میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ سامان کی قیمتیں گر جائیں اور تاجر نقصان کا شکار ہو جائے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ قیمتیں مستقیم رہیں اور بازار ایک

Marfat.com

روش پر چلتا رہے تو تاجر اپنے مالِ تجارت سے نفع کما لے۔ لیکن اس کو ملنے والا نفع جن خطرات سے گزرتا ہے اور جس محنت کے سہارے آگے بڑھتا ہے اس کا یقیناً یہ صلہ ہونا چاہیے کہ تاجر کو یہ نفع ملے اور وہ بجا طور پر جائز سمجھا جائے۔ لیکن اس کے بالمقابل سود پر قرض دینے والا اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا کہ وہ اپنے مال کو حرکت میں لاتا ہے اور طے شدہ نفع پر مال کسی شخص یا کسی پارٹی کے حوالے کرتا ہے۔ اگر یہ مال کسی کی ذاتی ضرورت کے لیے دیا جاتا ہے تو پھر تو اس پر سود لینے کی شناعت اور کراہت میں کلام ہی نہیں کہ مریض اپنے علاج میں اس مال کو صرف کرتا ہے، بھوکا اپنے طعام میں، ننگا اپنے کپڑوں، بے مکان مکان بنانے میں، لیکن یہ شخص آرام سے اپنے گھر میں بیٹھا صرف اصل زر نہیں بلکہ اس کا سود بھی وصول کرتا ہے۔ اور بعض دفعہ ضرورت مند وقت پر مال ادا نہیں کر سکتا تو اس کا سود بڑھتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ قرض دار کا گھر در، اس کے اثاث البیت اور اس کے زن و فرزند ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اور خاندان کے خاندان کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ قرض لینے والے پر قیامت گزر جائے سود لینے والے کی ایک دمڑی کم نہیں ہوتی۔ اسے نہ بازار کے اتار چڑھاؤ سے واسطہ پڑتا ہے، نہ اسے کوئی زحمت اٹھانا پڑتی ہے، ہر صورت میں اس کا نفع مستحکم ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کے لیے حکومت امراء سے قرض لیتی ہے اور یہ قرض بھی سود پہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً ملک میں سیلاب آ گیا۔ اب سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے حکومت ضروری انتظامات کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لیے حکومت کے خزانے میں گنجائش نہیں۔ تو ملک کے امراء سے قرض لیتی ہے۔ ابھی سیلاب کی تباہ کاریوں سے بچنے کے لیے بند بنائے جا رہے تھے، پلوں کی مرمت ہو رہی تھی، کنارے دریاؤں کے اونچے کیے جا رہے تھے اور ضروری انتظامات کا سلسلہ جاری تھا کہ بارشیں شروع ہو گئیں اور بارشوں کی شدت سے دریاؤں میں سیلاب آ گیا۔ جتنا کام ہوا تھا وہ سب سیلاب کی نذر ہو گیا لیکن جو اس کام کے لیے قرض لیا گیا تھا اس کی ادائیگی سود سمیت حکومت کے ذمے لازم ہے۔ اور یہ قرض دینے والے اسی ملک کے رہنے والے ہیں جس کی منصوبہ بندی پر یہ خرچ ہو رہا تھا، لیکن اس نقصان کی تلافی کا بوجھ پورے ملک کے امیروں اور غریبوں پر پڑے گا۔ لیکن یہ قرض دینے والے، قرض چھوڑنا تو دور کی بات ہے اپنی سود کی معین شرح میں کوئی کمی کرنا بھی گوارا نہیں کریں گے اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا سود بڑھتا چلا جائے گا۔

Marfat.com

اندازہ فرمائیے کہ ایسے سودی کاروبار کا تجارتی کاروبار سے کیا مقابلہ؟ اور ان کی آپس میں کیا مشابہت؟ دنیا میں ہر کاروبار محنت چاہتا ہے اور ہر سرمایہ نقصان کے خطرے سے دوچار ہوتا ہے اور کسی بھی کاروبار میں حتمی منافع کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی' لیکن ایک قرض دینے والا ایسا کاروباری ہے کہ جس کے سرمائے کی حفاظت یقینی ہے اور جس کا متعین نفع کبھی نقصان سے دوچار نہیں ہوتا۔ اگر دنیا میں انصاف کی کوئی رمق بھی باقی ہے تو انھیں خود سوچنا چاہیے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت' اپنی محنت' اپنی قابلیت اور اپنا سرمایہ رات دن کھپا رہے ہیں اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بار آور ہونا موقوف ہے' ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو' بلکہ نقصان کا سارا خطرہ بالکل انھی کے سر پر ہو' مگر جس نے صرف اپنا روپیہ انھیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے' آخر کس عقل' کس منطق' کس اصول انصاف اور کس اصولِ معاشیات کی رو سے درست ہے؟

تجارت اور سود کے درمیان اصولی فرق کی وجوہ

صاحب تفہیم القرآن نے تجارت اور سود کے اصولی فرق کے حوالے سے چار بنیادی باتیں کہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان سے استفادہ کیا جائے:

(۱) تجارت میں بائع اور مشتری کے درمیان منافع کا مساویانہ تبادلہ ہوتا ہے' کیونکہ مشتری اس چیز سے نفع اٹھاتا ہے جو اس نے بائع سے خریدی ہے اور بائع اپنی اس محنت' ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے' جس کو اس نے مشتری کے لیے وہ چیز مہیا کرنے میں صرف کیا ہے۔ بخلاف اس کے سودی لین دین میں منافع کا تبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا۔ سود لینے والا تو مال کی ایک مقرر مقدار لے لیتا ہے' جو اس کے لیے بالیقین نفع بخش ہے' لیکن اس کے مقابلے میں سود دینے والے کو صرف مہلت ملتی ہے' جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر اس نے سرمایہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کرنے کے لیے لیا ہے تب تو ظاہر ہے کہ مہلت اس کے لے قطعی نافع نہیں ہے۔ اور اگر وہ تجارت یا زراعت یا صنعت و حرفت میں لگانے کے لیے سرمایہ لیتا ہے تب بھی مہلت میں جس طرح اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی امکان ہے۔ پس سود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے

Marfat.com

کے نقصان پر ہوتا ہے' یا ایک کے یقینی اور متعین فائدے اور دوسرے کے غیر یقینی اور غیر متعین فائدے پر۔

(۲) تجارت میں بائع مشتری سے خواہ کتنا ہی زائد منافع لے' بہرحال وہ جو کچھ لیتا ہے' ایک ہی بار لیتا ہے۔ لیکن سود کے معاملے میں مال دینے والا اپنے مال پر مسلسل منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خوہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو' بہرطور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا۔ مگر دائن اس فائدے کے بدلے میں جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مدیون کی پوری کمائی' اس کے تمام وسائل معیشت' حتیٰ کہ اس کے تن کے کپڑے اور گھر کے برتن تک ہضم کرلے اور پھر بھی اس کا مطالبہ باقی رہ جائے۔

(۳) تجارت میں شے اور اس کی قیمت کا تبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد مشتری کو کوئی چیز بائع کو واپس دینی نہیں ہوتی۔ مکان یا زمین یا سامان کے کرائے میں اصل شے' جس کے استعمال کا معاوضہ دیا جاتا ہے' صرف نہیں ہوتی' بلکہ برقرار رہتی ہے اور بجنسہ مالکِ جائیداد کو واپس دے دی جاتی ہے۔ لیکن سود کے معاملے میں قرض دار سرمایہ کو صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ مال دوبارہ پیدا کر کے اضافے کے ساتھ واپس دینا ہوتا ہے۔

(۴) تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت' ذہانت اور وقت صرف کر کے اس کا فائدہ لیتا ہے۔ مگر سودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت کے دوسرے کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی ''شریک'' کی نہیں ہوتی جو نفع اور نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے' بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظِ تناسبِ نفع اپنے طے شدہ منافع کا دعوے دار ہوتا ہے۔''

ان وجوہ سے تجارت کی معاشی حیثیت اور سود کی معاشی حیثیت میں اتنا عظیم الشان فرق ہو جاتا ہے کہ تجارت انسانی تمدن کی تعمیر کرنے والی قوت بن جاتی ہے اور اس

Marfat.com

کے برعکس سود اس کی تخریب کرنے کا موجب بنتا ہے۔ پھر اخلاقی حیثیت سے یہ سود کی عین فطرت ہے کہ وہ افراد میں بخل، خودغرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے اور ہمدردی و امداد باہمی کی روح کو فنا کر دیتا ہے۔ اس بنا پر سود معاشی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے نوع انسانی کے لیے تباہ کن ہے۔

(ماخوذ از: تفہیم القرآن)

Marfat.com

22- سود کے نقصانات (حصہ دوم)

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
﴿یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰوا وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ﴾
(اللہ سود کا مٹھ مارتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے)

بعض لوگ مسلمان کہلاتے ہوئے بھی جو صرف عقل سے سوچتے ہیں اور عقل ہی کے ترازو میں مذہب کو بھی تولتے ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ صحیح ہے کہ تجارت اور سود یکساں نہیں، ہر لحاظ سے ان میں بڑا فرق ہے' لیکن اگر ایک شخص کسی کو اپنا سرمایہ قرض پر دے کر اسے کاروبار کرنے کی سہولت مہیا کرتا ہے اور وہ اس سے ڈھیروں کماتا ہے' اس میں سے سرمائے کا مالک اگر ایک متعین حصہ لے لیتا ہے تو اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟ گزارش یہ ہے کہ اس میں سب سے بڑا حرج تو یہ ہے کہ یہ اللہ کے احکام کی صریح نافرمانی ہے۔ حلت وحرمت کا اختیار اور جائز و ناجائز کی اتھارٹی سراسر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا حکم آخری حکم ہے۔ جس میں اس کا رسول بھی تبدیلی نہیں کرسکتا۔ سود کو چونکہ وہ حرام کرچکا ہے اور جان بوجھ کر اس کی نافرمانی کرنے والے کو جہنم میں بھیجنے کی دھمکی دیتا ہے تو جو شخص اپنا سرمایہ کسی بھی سودی کاروبار میں لگاتا ہے وہ اللہ کے حکم کو توڑتا ہے اور اس کا نقصان یہ ہے کہ ایسا شخص جہنم کا ایندھن بنے گا۔ لیکن محض سمجھانے کے لیے میں عرض کرتا ہوں کہ اسلام کا نقطۂ نگاہ بالکل واضح ہے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ جب تم کسی شخص کو قرض دیتے ہو تو تمھاری نیت کیا ہے؟ تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر اس پر معاوضہ کیسا؟ مدد کی صورت میں عوض اور معاوضہ بے معنی چیز ہے۔ اور اگر تم اسے قرض دے کر کاروبار میں شریک ہونا چاہتے ہو تو پھر تمھیں معقولیت اور سیدھے طریقے سے کاروبار میں شریک ہونا چاہیے۔ کاروبار میں شریک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ تمھارا ہو اور محنت دوسرے کی اور نفع میں تم دونوں طے شدہ تناسب سے شرکت کرو۔ یہ وہ معقول بات ہے جس کی طرف اسلام دعوت دیتا ہے۔ لیکن

Marfat.com

اسے وہ غور کے قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ایک شخص دوسرے کو کاروبار کے لیے سرمایہ دیتا ہے اور پھر اسے یہ کہتا ہے کہ میں اتنے فیصد تم سے نفع لوں گا۔ اسے اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اسے کاروبار میں نفع ہوتا ہے یا نقصان۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سرمایہ دینے ولا اپنا سرمایہ اور اس پر متعین نفع تو محفوظ رکھنا چاہتا ہے لیکن محنت کرنے والا اور جان مارنے والا جس کی روزی کا دارومدار ہی اس کاروبار پر ہے اس کے لیے کوئی ضمانت نہیں۔ اگر وہ گھاٹے کا شکار ہو جاتا ہے تو نقصان سارا اس کی گردن پر ہوگا۔ یہ وہ ظلم ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔

ایک اور بات بھی قابل توجہ ہے کہ آج کل جوائنٹ سٹاک کا نظام رائج ہے اس میں آپ جانتے ہیں کہ ایک متعین شرح سود پر کاروبار کے لیے بینک قرض دیتا ہے۔ فرض کیجیے بینک نے اسے ایک کروڑ روپیہ قرض دیا۔ ذرا غور کیجیے یہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے آیا؟ یہ ایک کروڑ روپیہ بینک کا نہیں بلکہ ڈیپازیٹرس کا ہے۔ یعنی قوم کے ان افراد کا ہے جنھوں نے بینک میں اپنے اکاؤنٹس کھلوا رکھے ہیں۔ کاروبار کرنے والے کو سو فیصد نفع ہو گیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ایک کروڑ پر ایک کروڑ کمایا۔ اس نے بینک سے پندرہ فیصد شرح سود سے قرض لیا تھا۔ چنانچہ اس نے پندرہ لاکھ بینک کو ادا کیا اور پچاسی لاکھ کا اسے فائدہ ہوا۔ بینک نے اس میں سے اپنے اخراجات نکال کر باقی سات فیصد یا دس فیصد ڈیپازیٹرس کو دیا۔ یعنی جن لوگوں کے سرمائے سے یہ کاروبار کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کاروبار کرنے والے نے تو سو فیصد فائدہ اٹھایا اور کھاتہ دار کے حصے میں دس فیصد آیا۔ لیکن وہ سو میں سے دس روپے لے کر بھی خوش ہے کہ مجھے دس روپے نفع ہوا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کے پیسوں سے سو فیصد کمایا گیا اور اسے دس فیصد پر ٹرخا دیا گیا ہے۔ اس پر بھی مزید ستم ظریفی یہ ہے کہ بعض دفعہ یہ دس روپے جو نفع میں دیے گئے ہیں قرض لینے والا یہ بھی وصول کر لیتا ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ قرض لینے والا ان دس روپوں کو پیداواری اخراجات یعنی کاسٹ آف پروڈکشن میں شامل کر لیتا ہے۔ فرض کیجیے اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر ایک فیکٹری لگائی یا کوئی چیز تیار کی۔ تو تیاری کے مصارف میں پندرہ فیصد بھی شامل کر دیے جو اس نے بینک کو ادا کیے تھے۔ تو اب جو چیز تیار ہوگی اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی لہٰذا ڈیپازیٹر جسے ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے جب وہ بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہوگی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے پندرہ فیصد وصول کر لیا گیا۔

Marfat.com

ڈیپازیٹر بچارہ خوش ہے کہ مجھے سو کے ایک سو دس روپے مل گئے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کو سو روپے کے بدلے پچانوے روپے ملے۔ اس لیے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کاسٹ میں چلے گئے۔ اور دوسری طرف پچاسی فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلا گیا۔ اگر یہ سارا کاروبار شرکت کی بنیاد پر ہوتا اور یہ پہلے سے طے کرلیا جاتا کہ پچاس فیصد نفع سرمایہ لگانے والے کا ہوگا اور پچاس فیصد کام کرنیوالے کا تو اس صورت میں کھاتہ داروں کو پندرہ فیصد کی بجائے پچاس فیصد نفع ملتا۔ اس ایک مثال سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کھاتہ دار ہر صورت میں نقصان میں رہتا ہے۔ لیکن بظاہر اسے سود کے نام پر دھوکا دیا جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ بینکنگ سسٹم کے تحت ہو رہا ہے۔ اور اسی پر بس نہیں بعض دفعہ تو یہ ظلم اس انتہا کو پہنچ جاتا ہے کہ فرض کیجیے کہ کسی نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر تجارت کی۔ اس تجارت میں اس کو نقصان ہو گیا۔ اور بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہو گیا۔ غور کیجیے بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں روپیہ کس کا گیا۔ ظاہر ہے کہ وہ ڈیپازیٹرس یعنی عوام کا روپیہ تھا، نقصان ہونے کی صورت میں وہ سارا روپیہ ڈوب گیا۔ کس قدر اندھیر نگری ہے کہ اگر نفع ہے تو سارے کا سارا قرض لینے والے کا اور اگر نقصان ہے تو سارے کے سارا ڈیپازیٹرس یعنی عوام کا۔

مشارکت

اس لیے اسلام بالکل سیدھی بات کہتا ہے کہ تم کاروبار کو کاروبار کے طریقے سے کرو۔ سود کے حامیوں نے یہ بھی سمجھ رکھا ہے کہ آج کے دور میں کاروبار شاید سود کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لیکن اسلام نے اس کے متبادل بھی تجویز کیے ہیں۔ یہ اگرچہ تفصیل طلب بحث ہے اور نہایت ٹیکنیکل بھی۔ اس لیے ہم صرف نام کی حد تک اس کے ذکر پر اکتفاء کرتے ہیں کہ انٹرسٹ کا اصل متبادل جسے کاروبار کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے وہ مشارکت ہے۔ یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لیے قرض لے رہا ہے تو قرض دینے والا یہ کہے کہ میں تمھیں قرض حسنہ نہیں دے رہا اور نہ تمھیں سود پر قرض دوں گا۔ بلکہ میں تمھارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمھیں نفع ہوگا تو میں اس نفع میں شریک ہوں گا اور اگر نقصان ہوگا تو میں نقصان میں بھی شامل ہوں گا۔ اس طرح کاروبار کے نفع اور نقصان میں شرکت پر مبنی کاروبار مشارکت کہلاتا ہے۔ یہی سب سے بہتر متبادل ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر آج دنیا میں سو سے زیادہ بینک اور سرمایہ داری کے ادارے قائم ہو چکے ہیں اور

Marfat.com

وہ نہایت کامیابی سے چل رہے ہیں۔ اور بعض جگہ مذہبی نگران کمیٹیاں بن چکی ہیں جن میں اقتصادی ماہرین کے ساتھ ساتھ علماء بھی موجود ہیں جو باقاعدہ اس کاروبار کی نگرانی کرتے ہیں۔ اس میں اگرچہ عملی دشواریاں ہیں لیکن اگر کوئی ملک پوری کمٹمنٹ کے ساتھ اس طریقے کو اپنا لے تو بڑی آسانی سے ان دشواریوں پر قابو پا سکتا ہے۔

اجارہ

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اصل متبادل تو مشارکت ہی ہے لیکن وقتی طور پر اجارہ یعنی لیزنگ کو بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک اور طریقہ مرابحہ یعنی فائینانسنگ بھی ہے۔ اجارہ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص نے بینک سے قرض مانگا ہے تو بینک نے اس سے پوچھا کہ آپ کی ضرورت کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ میں اپنے کارخانے کے لیے باہر سے مشینری منگوانا چاہتا ہوں۔ تو بینک اگر اسے پیسے دینے کی بجائے مشینری خرید کر اسے کرایہ پر دے دے تو اسے اجارہ یا لیزنگ کہتے ہیں۔

مرابحہ

اسی طرح کوئی شخص بینک سے اس لیے قرض لینا چاہتا ہے کہ وہ خام مال خریدنا چاہتا ہے تو بینک اس کو خام مال خریدنے کے لیے پیسے دینے کی بجائے خود خام مال خرید کر اسے نفع پر بیچ دے اسے مرابحہ کہتے ہیں اور شریعت نے اسے جائز رکھا ہے۔ کیونکہ شریعت کے قانون کے مطابق روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جا سکتا اور اسی طرح روپیہ پر منافع بھی نہیں لیا جا سکتا' لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مال تجارت آ جائے اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کرے اس کو شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ مرابحہ کے اندر بھی درمیان میں مال آ جاتا ہے۔ اس لیے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا جائز ہے۔

امرہ الی اللّٰہ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا کہ جس شخص کے پاس یہ نصیحت پہنچ گئی اور کلام کے تیور دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ موعظۃ کا لفظ تنبیہ یا وارننگ کے معنی میں ہے۔ تو اس

Marfat.com

نے اب تک جو سودی کاروبار کیا' جو سود لیا' جو سود کھایا اور جتنا اس سے فائدہ اٹھایا وہ اس کے لیے ہے' یعنی اس پر قانونی گرفت نہیں ہوگی۔ اسلامی حکومت اس سے نہیں پوچھے گی کہ تم اپنے پچھلے کھاتے ہمیں دکھاؤ اور جن جن لوگوں سے تم نے سود لیا ان کا حساب دو تا کہ ان کی لی ہوئی رقمیں انھیں واپس دلائی جاسکیں۔ اگر ایسا ہوتا تو لامتناہی مقدمات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اس لیے اسلام نے اس قانونی رعایت کا احترام کرتے ہوئے اس حکم کے بعد نئی کاروباری زندگی کے آغاز کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سود لینے والے کو اطمینان سے بیٹھ جانا چاہیے۔ اب اس کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت سے تم چھوٹ گئے لیکن اب تمھارا معاملہ جس کے ساتھ ہے وہ تمھارے ایک ایک عمل سے واقف ہے۔ اس لیے اس کے سامنے جوابدہی کی تیاری کرو۔ اس کے سامنے جوابدہی کے لیے کم سے کم تیاری یہ ہے کہ اپنا معاشی اور اخلاقی نقطۂ نظر پوری طرح اسلام کے مطابق ڈھال لو۔ اور اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا اس کے اثرات جہاں تک ختم کیے جاسکتے ہیں انھیں ختم کرنے کی کوشش کرو۔ یعنی حرام ذرائع کی آمدنی کو اپنی ذات اور اپنے بچوں پر خرچ کرنے سے گریز کرو۔ اور جن جن لوگوں سے یہ حرام سرمایہ حاصل کیا گیا تھا اگر وہ مل جائیں تو انھیں واپس کرو۔ اور اگر اس کے مستحقین نہ ملیں تو کسی اجتماعی فلاح و بہبود پر اسے صرف کرو۔ اس سے امید ہے کہ اللہ کے یہاں جواب دہی آسان ہو جائے گی۔

اس کے بعد آخری وارننگ دیتے ہوئے فرمایا کہ سود کی حرمت کے نازل ہو جانے کے بعد اور اسلامی حکومت کی طرف سے پوری طرح اس کی تبلیغ و اشاعت کے بعد اب بھی اگر کسی نے اس حرام فعل کا اعادہ کیا اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے سودی کاروبار میں ملوث رہا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس کی سزا جہنم ہے۔ اور یہ وہ وقتی سزا نہیں بلکہ اس جرم کے نتیجے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں رہنا پڑے گا۔ جس آدمی کے دل میں ایمان کی کچھ رمق بھی باقی ہے اسے اس سزا کے سن لینے کے بعد کبھی جرم کا تصور بھی نہیں کرنا چاہیے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ﴾

''اللہ سود کو گھٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ ناشکروں اور حق تلفی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (۲۷۶)

اس آیتِ کریمہ میں اللہ نے ایک ایسی بات ارشاد فرمائی ہے جو نظر بہ ظاہر خلاف

Marfat.com

عقل معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں ربا کے مقابلے میں صدقات کا لفظ آیا ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ صدقات صدقہ کی جمع ہے اور صدقہ اپنے مال میں سے ایک حصہ یا اپنی اشیاء میں سے کوئی چیز اللہ کے راستے میں دینے کا نام ہے۔ اور ربا اپنے مال پر نفع لینے کا نام ہے۔ اصل راس المال محفوظ رہے اور اس کے ساتھ منافع بھی وصول ہو تو صاف نظر آتا ہے کہ مال بڑھ رہا ہے۔ لیکن اگر اصل مال میں سے بھی کچھ حصہ اللہ کے راستے میں خرچ کیا جائے تو یقیناً اصل مال میں کمی آجائے گی۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں اس کے برعکس ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ تم جسے اضافہ کا باعث سمجھتے ہو وہ کمی کا باعث ہے۔ اور جسے تم کمی کا سبب جانتے ہو وہ برکت اور اضافے کا سبب ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے گہری نگاہ کی ضرورت ہے۔ ایک بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ پروردگار جب کسی مال کے بارے میں فرما رہے ہیں کہ وہ بڑھتا ہے اور دوسرے کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ گھٹتا ہے اور پھر ایسا بھی نہیں کہ مال خود بخود گھٹتا یا بڑھتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ایک مال کو بڑھاتے ہیں اور ایک مال کو گھٹاتے ہیں تو اسے دیکھتے ہوئے ایک مسلمان اس بات میں تو شبہ نہیں کر سکتا کہ پروردگار کا یہ ارشاد غلط بھی ہو سکتا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ہمیں سمجھنے میں دشواری پیش آئے یا ہماری عقل نارسا ثابت ہو لیکن اس حقیقت کے صحیح ہونے میں کسی شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ کا یہ ارشاد اپنے اندر کیا معنویت رکھتا ہے۔

صدقات کے بڑھنے اور سود کے گھٹنے کا مفہوم

بعض اہل علم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ یہ گھٹنا اور بڑھنا دنیوی زندگی کے محدود تصور کے لحاظ سے نہیں ہے، بلکہ دنیا اور آخرت دونوں کی مجموعی زندگی کے لحاظ سے ہے۔ کیونکہ دنیا کی زندگی ہی حقیقی اور مکمل زندگی نہیں بلکہ اس زندگی کی تکمیل قیامت کو ہوگی۔ اور دوسرا یہ کہ یہ زندگی تو چند روزہ اور فانی ہے اور دوسری زندگی حقیقی اور ابدی ہے۔ یہاں کسی فائدے کا مل جانا ایسے ہی ہے جیسے کسی آدمی کو چار دن کی چاندنی مل جائے اور اس کے بعد اسے لمبی رات سے واسطہ پڑے۔ لیکن اگر کسی شخص کو دوسری اور اخروی زندگی میں کوئی نعمت نصیب ہوتی ہے تو درحقیقت وہ نعمت ہے جو ہمیشہ رہے گی اور جو قابل ذکر بھی ہے اور قابل فخر بھی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو دنیوی زندگی کا خاتمہ ایسا ہی ہے جیسے آدمی سو جاتا ہے اور اخروی زندگی کا طلوع ایسے ہی ہے جیسے آدمی نیند سے بیدار ہو جاتا ہے۔ ایک سودی کاروبار کرنے والا جب اخروی زندگی کے ظہور

Marfat.com

کے بعد اپنی نیند سے بیدار ہوگا تو اس کے ذہن میں یقیناً یہ تصور موجود ہوگا کہ بنکوں میں میرا لاکھوں کا سرمایہ موجود ہے، لیکن جیسے ہی حقیقت اس کے سامنے ظاہر ہوگی تو وہ دیکھے گا کہ خدا کے بنک میں اس کی ایک کوڑی بھی نہیں۔ لیکن اس کے مقابل جب اللہ کے راستے میں انفاق کرنے والا اخروی زندگی میں اٹھے گا تو وہ دیکھے گا کہ اس نے جو اپنی بساط کے مطابق اللہ کے راستے میں ایک محدود مال خرچ کیا تھا اس کے بدلے میں ابدی قدر و قیمت رکھنے والے جواہرات کے انبار اس کے انتظار میں ہیں۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہوگا کہ اس کے خزف ریزے آخرت میں موتیوں کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سود لینے والے کا مال نہ صرف اللہ کم کرتا ہے بلکہ آخرت میں بالکل تباہ کر دیا جائے گا۔ البتہ اس کا اثر سود خور کے انجام پر یہ پڑے گا کہ وہ صدیوں تک اس کی سزا بھگتے گا۔ لیکن اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والا اللہ کی طرف سے بیش بہا اجر و ثواب سے نوازا جائے گا۔ اسی لیے سورۂ روم کی آیت ۳۹ میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِي اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا اٰتَيْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِيْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ ﴾

”جو مال تم سود کے لیے دیتے ہو تاکہ وہ لوگوں کے مال میں پل کے بڑھے تو وہ اللہ کے ہاں نہیں بڑھتا اور یہ جو تم زکوۃ دیتے ہو اس کی رضا طلبی میں تو یہی لوگ خدا کے ہاں بڑھانے والے ہیں۔“

آنحضرت ﷺ ایک ارشادِ گرامی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ صدقہ کو قبول کرتا ہے اور اس کو اپنے داہنے ہاتھ سے لیتا ہے اور پھر وہ اس کی تمھارے لیے اس طرح پرورش کرتا ہے جس طرح تم میں سے کوئی اپنے بچھیرے کی پرورش کرتا ہے۔ یہاں تک کہ تمھارا دیا ہوا ایک لقمہ خدا کے ہاں احد پہاڑ کی مانند بن جائے گا۔“

سود کے مضر اثرات مختلف پہلوؤں سے

جہاں تک آخرت میں اللہ کے بندوں کو دیا ہوا قرض اور اللہ کے راستے میں دیے گئے صدقات کا تعلق ہے اس کے بڑھنے میں تو کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دنیا میں سود سے کمایا ہوا مال و دولت اور سودی کاروبار اپنے حقیقی نتائج کے

Marfat.com

اعتبار سے بڑھتا نہیں بلکہ کم ہوتا ہے۔ البتہ ہمیں اسے سمجھنے کے لیے اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنا ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جن لوگوں کی نگاہ مال و دولت کے اعتبار سے صرف اعداد و شمار پر رہتی ہے وہ تو یقیناً اسی نقطہ نگاہ سے قوم کی ترقی اور ملک کے وسائل کی افزائش کو جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ ان کا معیار صرف یہ ہوتا ہے کہ ملک میں لگائے گئے ٹیکسوں سے کتنی آمدنی ہوئی، سی بی آر نے کتنا کسٹم اکٹھا کیا، ہمارے کھیتوں نے کتنا غلہ اگلا، ہمارا زرمبادلہ کس سطح تک پہنچ گیا ہے، ان کے لیے یہ بات سمجھنا تو واقعی مشکل ہے۔ البتہ جو لوگ دولت کو اخلاق اور تمدن سے الگ رکھ کر نہیں بلکہ اس کے خادم کے طور پر دیکھتے ہیں وہ سب سے پہلے اس بات پر غور کرتے ہیں کہ ہم نے جو کچھ کمایا اس کے ملک و ملت پر کیا اثرات پڑے؟ ہماری قوم کے افراد میں کس طرح کی ذہنیت پیدا ہوئی؟ اس مال و دولت کی وجہ سے کس طرح کے اخلاق وجود میں آئے؟ کیونکہ مال افراد اور قوم کی ضرورت کے تحت وجود میں آیا ہے بجائے خود اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ ملک کا زرمبادلہ بڑھتا جائے لیکن ساتھ ساتھ غریب کے جھونپڑے میں چراغ کی لو مدھم پڑتی جائے تو اسے بڑھنا نہیں گھٹنا کہتے ہیں۔ مال و دولت میں وسعت آئے لیکن طبیعتوں میں بخل، سنگدلی، خودغرضی جیسی صفات پیدا ہو جائیں تو دولت کے ان خزف ریزوں کو کس چیز سے تعبیر کیا جائے گا؟ اس لیے جو دولت اور جو کمائی اخلاق کے زوال تمدن میں انتشار اور باہمی تعلقات کے بگاڑ کا سبب بنے، اسے بڑھنا نہیں گھٹنا کہنا چاہیے۔ اس لحاظ سے اگر آپ دیکھیں تو آپ اتفاق کریں گے کہ صدقات انفاق فی سبیل اللہ اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ افراد میں فیاضی، ہمدردی، فراخدلی اور عالی ظرفی جیسی صفات پیدا کرتے ہیں۔ اور جیسے جیسے یہ بے غرض لین دین بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے افراد ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے ہیں اور قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتی ہے۔ لیکن اس کے برعکس سود انسانوں میں بالکل دوسری طرح کی صفات پیدا کرتا ہے۔ سود کمانے والا شخص کبھی فیاض نہیں ہو سکتا۔ دوسرے کی مصیبت دیکھ کر اس کے دل میں کبھی رحمدلی کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ اتنا تنگ دل اور سنگدل واقع ہوتا ہے کہ ملک و ملت کی بڑی سے بڑی ضرورت، اس کی تجوری کا دروازہ نہیں کھول سکتی۔ اسے انسانوں سے نہیں اپنی دولت سے واسطہ ہوتا ہے۔ ملک کدھر جا رہا ہے؟ ملک کے حالات کیسے ہیں؟ غربت کہاں تک پہنچ گئی ہے؟ خود اس کے ہمسائے کس حال

Marfat.com

میں ہیں؟ یہ باتیں اس کے لیے اجنبی ہوتی ہیں۔ وہ رات دن اپنی دولت کونشوونما دینے کی سوچ میں ڈوبا رہتا ہے۔ ایسے لوگ اگر سوسائٹی میں ایک بڑی تعداد میں پھیل جائیں اور معاشرہ انہی افراد کے زیر اثر پرورش پائے تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس قوم کے تمدن کا کیا بنے گا۔ ایسی قوم میں طبقات میں اضافے کو کوئی نہیں روک سکتا۔ مالدار طبقہ روز بروز مالدار ہو گا اور غریب طبقہ میں غربت بڑھتی چلی جائے گی۔ دونوں کے درمیان پہلے تعلقات ٹوٹیں گے' پھر اس کی جگہ نفرتیں لیں گی۔ افراد میں آپس کی محبت کی بجائے باہمی بغض وحسد اور بے دردی و بے تعلقی نشوونما پائے گی۔ اس معاشرے کے افراد کسی بھی وقت باہمی تصادم کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہو تو خدا نہ کرے کہ اس قوم پر باہر سے حملہ ہو جائے تو ملک کی اکثریت مالداروں کے ظلم میں پسنے اور ریاست کی بے تعلقی کے باعث ریاست سے بے تعلق ہو جائے گی اور وہ اپنے ملک کی حفاظت کے لیے ہاتھ ہلانا بھی گوارا نہ کرے گی۔ ملک کی سالمیت تباہ ہو جائے گی اور قوم انسانوں کی بھیڑ بن کے رہ جائے گی۔ اندازہ فرمایئے ایسی صورتِ حال میں کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ سودی کاروبار میں اضافہ ہوا۔ اور وہ اضافہ ملک کے لیے خیر و برکت کا باعث بنا۔

جس قوم کی کوئی اخلاقی اقدار نہ ہوں' روحانی تصورات نہ ہوں' اور اس کے پاس کوئی منزل من اللہ دین نہ ہو اس کی اخلاقیات اور اس کی اقدار کاروبار کے نشیب وفراز سے وجود میں آتی ہیں۔ اور وہ قوم از اول تا آخر ایک کاروباری قوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں سودی کاروبار ایک عرصے تک پھل پھول سکتا ہے' لیکن دیرپا کبھی نہیں ہو سکتا۔ وہ بھی اپنے سارے وسائل کے باوجود غربت کا علاج کرنے سے قاصر رہتی ہیں اور مجموعی طور پر ایسی قومیں دوسری قوموں کے لیے عذاب بن جاتی ہیں۔ آج دنیا کی بالا دست قومیں اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ لیکن جس قوم کا ایک روحانی نظام ہو' اس کے خاص تصورات ہوں' اس کی اخلاقی اقدار ہوں' وہ ایک منزل من اللہ دین رکھتی ہو' وہ کبھی اپنے احساسات' اپنے مقاصد' اپنی اقدار اور اپنے تصورات سے ہٹ کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کے یہاں کاروبار' ان تصورات سے الگ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ کاروبار کا جو طریقہ ان تصورات کو نقصان پہنچاتا ہے وہ تصادم کو جنم دیتا اور قوم کی وحدت کو تباہ کرتا ہے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ ربا اور سود قومی وحدت کو توڑنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ اگر امت مسلمہ کو اپنی وحدت عزیز ہے تو اسے اس طرح کی ہر اسکیم' ہر کاروبار اور ہر کوشش کو قبول کرنے سے انکار کر دینا چاہیے۔

Marfat.com

معاشی نقطۂ نظر سے

معاشی نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے تو سودی کاروبار ترقی اور اضافے کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ نقصان اور تنزل کا باعث ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشیات کے نقطۂ نگاہ سے سودی قرض کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ قرض جو ضرورت مند اور حاجت مند لوگ اپنی ذاتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ساہوکاروں سے لیتے ہیں۔ اور دوسرا وہ قرض جو تجارت' صنعت وحرفت اور زراعت وغیرہ کاموں پر لگانے کے لیے پیشہ ور لوگ لیتے ہیں۔ جہاں تک پہلی قسم کے قرض کا تعلق ہے اس سے تو شاید کسی کو اختلاف نہ ہو کہ یہ ایک تباہ کن قرض ہے جس میں قرض دینے والے ادارے پلتے' بڑھتے اور ترقی پاتے ہیں۔ لیکن قرض لینے والے غریب' مزدور' کاشتکار اور بے وسیلہ لوگ تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اصل قرض ادا کرنا ہی مقروض کے لیے آسان نہیں ہوتا چہ جائیکہ اس پر سود کا بوجھ لاد دیا جائے۔ اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سود کی رقم میں اضافہ بھی ہوتا جائے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا کہ مقروض اپنی ہمت سے بڑھ کر محنت کرتا ہے' اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر قرض ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی صحت روز بروز گرتی چلی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جب وہ صحت کی توانائی کے ساتھ قرض ادا نہ کر سکا اور سود ادا کرتے کرتے اس کی کمر ٹوٹ گئی تو اب وہ کمزور صحت اور علاج کے اخراجات کے بوجھ سمیت کس طرح سودی قرض ادا کر سکے گا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کہ محنت سے روزی کمانے والوں کی ہر معاشرے میں اکثریت ہوتی ہے جب وہ اس طرح کی مصیبتوں میں ڈوب کر صحت کھو دیتے ہیں تو محنت کرنے والے ہاتھ روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں۔ ہاتھوں کی کمی کے باعث ملکی معیشت تنزل کا شکار ہو جاتی ہے۔ غیر جانبداری سے غور فرمایئے کہ ملکی معیشت کے تنزل کا سبب کون بنا؟ اگر اس معاشرے میں صدقات کا چلن ہوتا' ہمدردی اور خیر خواہی ہوتی' ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ ہوتا' بلا سود قرض ملنے کے امکانات ہوتے تو غریب لوگ اپنی حالت بہتر بنانے کے امکانات سے مایوس نہ ہوتے۔ ان کے کام کی صلاحیت میں کمی نہ آتی۔ ان کی صحتیں ضرورت سے زیادہ محنت کے کام نہ آتیں۔ سرمایہ بہت سے ہاتھوں میں پھیل کر ملکی معیشت میں ترقی کا باعث ہوتا' لیکن جب اس کے بالکل برعکس ہم نے ان لوگوں کو سود کے حوالے کر دیا تو اس کا نتیجہ تنزل کی شکل

Marfat.com

میں نکلا۔ اور بعض دفعہ تو صورتِ حال اور بھی خطرناک ہو جاتی ہے کہ اگر کبھی ایسے ملک میں کسی انقلاب کی فضا پیدا ہو جائے تو دولت مندوں کے ہاتھوں ستائے ہوئے لوگ اپنی محرومیوں کا حساب ان دولت مندوں سے لیتے ہیں۔ پھر کوئی محل کھڑا نہیں رہتا' کوئی تجوری سلامت نہیں رہتی' سڑکوں پہ خون بہتا ہے۔ یہ انجام ہوتا ہے غریب معاشرے میں سود اور سودی ذہنیت کے عام ہونے کا۔

جہاں تک دوسری قسم کے سود کا تعلق ہے جو تجارت' صنعت و حرفت اور زراعت وغیرہ پر دیا جاتا ہے' اس کی صورتِ حال بھی بہت دلچسپ ہے۔ سود دینے والے ادارے سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ سود پر قرض لینے والا ہمارا سرمایہ کس طرح کے منصوبے پر خرچ کرنا چاہتا ہے؟ اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ جس منصوبے کے لیے قرض مانگا جا رہا ہے وہ ملک و ملت کے لیے چاہے جتنا بھی ضروری ہو لیکن منافع کے نقطۂ نگاہ سے اس میں افزائش کے امکانات بہت کم ہیں تو وہ ایسے کام کے لیے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ وہ تو ایسے کاموں پر قرض دیتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ منافع لا سکتے ہیں' چاہے ان کی ملک کو ضرورت ہو یا نہ ہو؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے تمام مالی وسائل کا بہاؤ ایسے کاموں کی طرف ہو جاتا ہے جو اجتماعی حیثیت سے انتہائی نقصان دہ ہوتے ہیں۔ یا کم از کم مفید نہیں ہوتے۔ آپ خود اندازہ فرمائیے کہ ایسے سودی قرض کے نتیجے میں یہ تو ہو سکتا ہے کہ قرض دینے والوں کو فائدہ پہنچے اور قرض لینے والے بھی ذاتی طور پر کچھ کما لیں لیکن اگر ملکی معیشت چند افراد کا نہیں پوری ملک کی نسبت سے دیکھی جاتی ہے تو غیر ضروری کاموں پر خرچ ہونے والا سرمایہ نہ صرف کہ ملکی معیشت کو کوئی سنبھالا نہیں دیتا بلکہ ملک کو ترقی دینے والے کام اور اجتماعی ضرورتیں دیکھتی رہ جائیں گی اور سرمایہ کسی اور طرف نکل جائے گا۔ اس لیے جب ملکی حیثیت سے دیکھا جائے گا تو صاف معلوم ہوگا کہ سودی ذہنیت اور سودی قرض نے اس ملک کی معیشت کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔

اس کا ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ کہ سود پر قرض دینے والا شخص یا ادارہ کاروبار کے نفع نقصان سے زیادہ اپنے سود کی حفاظت کی فکر کرتا ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ قرض لینے والوں نے سرمایہ ایک ایسے کاروبار پر لگایا ہے جس میں کساد بازاری کا حملہ ہونے والا ہے تو وہ صرف اس اندیشے سے ہی اپنا روپیہ کھینچنے کی فکر کرنے لگتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی خود غرضی کے باعث تجارت کی دنیا پر واقعی کساد بازاری کا حملہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کہیں کسی دوسرے

Marfat.com

سبب سے کساد بازاری آ گئی ہے ہوتو سرمایہ دار کی خود غرضی اس کو بڑھا کر نہائی تباہ کن حد تک پہنچا دیتی ہے۔ اندازہ فرمایئے کہ ایسی صورتِ حال میں معیشت میں اضافہ ہوگا یا دھچکا لگے گا اور سرمایہ بڑھے گا یا کم ہوگا۔

ان میں سب سے زیادہ سہل اور آسان بات یہ ہے کہ بعض دفعہ سودی سرمایہ خود بخود ہلاک ہو جاتا ہے اور پچھلے مال کو بھی ساتھ لے ڈوبتا ہے' جس طرح ربا اور سٹہ کے بازاروں میں ہمیشہ دیکھنے میں آتا ہے کہ بڑے بڑے کروڑ پتی اور سرمایہ دار دیکھتے دیکھتے دیوالیہ اور فقیر ہو گئے۔ بلا سود تجارت میں بھی اگر چہ نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے اور بعض دفعہ نقصان ہو بھی جاتا ہے لیکن ایسا نقصان کبھی نہیں ہوتا کہ کل کروڑ پتی تھا اور آج ایک ایک پیسہ کا محتاج ہو جائے۔ یہ صرف سود اور سٹہ کے بازاروں میں ہوتا ہے۔ حضرت معمر رحمۃ اللہ نے فرمایا کہ ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ سود خور پر چالیس سال گزرنے نہیں پاتے کہ اس کے مال پر تباہی آ جاتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ سود بظاہر ایک منافع کا نام ہے۔ سرمایہ دار اپنے سرمائے پر ایک متعین شرح سے سود لے کر اپنے سرمائے میں اضافہ کرتا ہے لیکن حقیقت میں اس کے پیچھے ایک ذہنیت کارفرما ہے۔ جس ذہنیت کے پیدا ہو جانے کے بعد سرمایہ انسان کی ضرورت نہیں رہتا' بلکہ مقصد زندگی بن جاتا ہے۔ اور مقصد زندگی بھی ایسا جس کی پوجا کی جاتی ہے' جس کے سامنے ایمان کو قربان کر دیا جاتا ہے۔ تمام انسانی رشتے اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں' اخلاقی اقدار اس کے سامنے دم توڑ جاتی ہیں' ایک فرد فرد سے غیر متعلق ہو جاتا ہے اور قوم قوم سے رشتہ توڑ لیتی ہے' دو دوست آپس میں اس وقت تک دوست رہتے ہیں جب تک ان میں مالی ضرورت پیدا ہونے کے باعث قرض لینے یا دینے کی نوبت نہیں آتی۔

قومیں اگر فضائل اخلاق سے زندہ رہتی ہیں اور مال ان کی ضرورتیں پوری کرتا ہے اور مقاصد کو جلا دیتا ہے اور معاشرتی رشتے اگر معاشرتی اخلاق سے وجود پذیر ہوتے اور باقی رہتے ہیں اور انسان انسانوں کے کام آنے کی وجہ سے انسان کہلاتا ہے تو پھر جو قوم بھی ان بنیادی احساسات کی حامل ہے کہ وہ اپنا ایک مقصد زندگی رکھتی ہے اس کے یہاں حقوق و فرائض کا ایک سلسلہ ہے اور اسے زندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے بعد آخرت میں اللہ کے حضور حاضر بھی ہونا ہے اور وہ یہ بھی جانتی ہے کہ مال و دولت کا بڑھنا' اس میں برکت کا پیدا ہونا اور لوگوں کو اس مال و دولت سے حقیقی فائدہ پہنچنا اور مال و دولت کے حقیقی مقاصد سے بہرہ ور

Marfat.com

ہونا یہ سب کچھ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ چاہے تو دلوں کو غربت میں بھی سکون عطا فرما دیتا ہے اور نہ چاہے تو مال و دولت کی فراوانی بھی زندگی میں راحت کا سامان نہیں بن سکتی' ایسی قوم سب کچھ ہو سکتی ہے لیکن وہ سودی ذہنیت کو قبول نہیں کر سکتی۔ اور اگر اس کے افراد اس میں ملوث ہوتے ہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ قوم تنزل کی راہ پر چل نکلی ہے۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتی جائے گی ویسے ویسے فضائل اخلاق سے دور ہوتی جائے گی اور ویسے ویسے اس کے قومی شعور کو گھن لگتا جائے گا۔ اور اس کے اجتماعی جسد میں دراڑیں آنا شروع ہو جائیں گی۔ اس کی عظیم قومی عمارت تباہی کے خطرے سے دوچار ہونے کے قریب پہنچ جائے گی' یہ وہ خطرناک نتائج ہیں جس سے بچانے کے لیے پروردگار نے سود کی ہر صورت کو ناقابل برداشت قرار دیا۔ اور اس کے ارتکاب کو فوجداری جرم قرار دے دیا۔ اگلی آیتِ کریمہ میں اسی حقیقت کے پیشِ نظر کلام کے تیور بھی تیکھے ہو گئے ہیں اور اللہ کا کلام اسلامی ریاست کی زبان بن کر پورے جلال کا اظہار کر رہا ہے۔

Marfat.com

23- رسولوں کی عزت وحرمت اور اللہ کی غیرت
اس معاملے میں اہلِ کتاب کا رویہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِی الدِّیْنِ ط وَلَوْ اَنَّهُمْ قَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانْظُرْنَا لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ وَاَقْوَمَ لا وَلٰكِنْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا یُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِیْلًا﴾

''یہود میں سے ایک گروہ زبان کو توڑ مروڑ کر اور دین پر طعن کرتے ہوئے الفاظ کو ان کے موقع ومحل سے ہٹادیتا ہے اور سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا، اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا کہتا ہے اور اگر وہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا، اِسْمَعْ اور انْظُرْنَا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا اور بات برمحل ہوتی۔ لیکن اللہ نے ان کے کفر کے سبب سے ان پر لعنت کردی ہے اس وجہ سے وہ شاذ ہی ایمان لائیں گے۔'' (النسآء : ۴۶)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں پروردگار نے ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو تم سے زیادہ جانتے ہیں۔ لیکن اس میں گھبرانے کی بات نہیں تمہارے سر پر اللہ کی رحمت کا سایہ ہے وہ تمہارا ولی بھی ہے نصیر بھی۔ اس آیت کریمہ کو پڑھتے ہوئے سب سے پہلے تو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ یہود کے مختلف گروہ تھے اور ان کی گمراہیاں اور ان کی خباثتیں قدرِ مشترک رکھتے ہوئے الگ الگ بھی تھیں۔ ان میں سے وہ گروہ جو آنحضرت ﷺ کی مجلسِ مبارک میں

Marfat.com

آتا جاتا تھا۔ وہ جس طرح زبان آوری کے پردے میں اور الفاظ کا چکمہ دے کر اور لہجہ اور پیرایہ بدل کر اپنی خباثتِ نفس کا اظہار کرتا اور اس طرح سے آنحضرت ﷺ کے مقام و مرتبہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس آیتِ کریمہ میں ان کا چہرہ بے نقاب کیا ہے۔ مسلمان چونکہ اپنی شرافتِ نفس سے ان کے باقاعدہ آنحضرت کی مجالس میں آنے کے باعث خوش فہمی کا شکار تھے اور اگر کوئی بات کھٹکتی بھی تھی تو خود ہی اس کی تاویل بھی کر لیتے تھے اور یا ان کی طرف سے تاویلات پر اعتماد کر لیتے تھے۔ آنحضرت ﷺ جو ان باتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے کیونکہ آپ کی ذہانت اور ژرف نگاہی کے ساتھ ساتھ نبوت کا نور بھی کارفرما تھا آپ کو یقیناً معلوم تھا کہ وہ دبی دبی زبان میں کیا حرکتیں کرتے ہیں۔ لیکن آپ اپنے علوِ مرتبت، کرامتِ نفس اور اعلیٰ اخلاقی تحمل کے باعث ان کی باتوں کا نوٹس لینے پر بھی تیار نہیں ہوتے تھے بلکہ مسلسل نظر انداز فرما رہے تھے پروردگار نے اپنے علمِ کامل کی وجہ سے ایک تو ان کی نام نہاد شرافت کا پردہ چاک کیا اور دوسرا اپنے ولی اور نصیر ہونے کا اس طرح ثبوت دیا کہ ان کی ان خباثتوں پر گرفت فرمائی جن سے حضور برابر غضِ بصر سے کام لے رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی عزت و حرمت کے معاملے میں نہایت متحمل ثابت ہوئے تھے۔ اسی وجہ سے حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے اپنی ذات کا انتقام کبھی کسی سے نہیں لیا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی سنت یہ معلوم ہوتی ہے کہ جہاں اس کے پیغمبر خاموش رہتے ہیں وہ خود مداخلت فرما کر پیغمبر کی عزت کی حفاظت فرماتا ہے۔ اور ان لوگوں پر لعنت فرماتا ہے جو اللہ کے نبی کی عزت کو نقصان پہچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری جگہ میں قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ﴾

”جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا پہنچاتے ہیں جیسے یہود اپنی زبانی خباثت سے پہنچاتے تھے اللہ نے ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت فرمائی ہے۔“

چنانچہ یہاں بھی اللہ کی غیرت و حمیت اپنا کام کرتی دکھائی دیتی ہے۔

یہود کی قومی شخصیت کی شناخت

دوسری بات جو اس آیتِ کریمہ کو پڑھتے ہوئے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جیسے جیسے آدمی اس آیت پر غور کرتا ہے ویسے ویسے اس کے سامنے یہود کی قومی شخصیت کی تہیں کھلتی

Marfat.com

جاتی ہیں۔ اندازہ فرمایئے! یہود مدینے کا وہ گروہ ہے جو مدینہ کو Dominate کر رہا ہے۔ وہ مالی اعتبار سے مدینہ کی ساری آبادی پر چھایا ہوا ہے۔ بازاروں پر اس کا تسلط ہے، کاروبار اس کے ہاتھ میں ہے، بہت سے باغات اس کے قبضے میں ہیں، اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے عرب قبائل پر اس کا علمی رعب ہے، ان میں بڑے بڑے علما اور مشائخ ایسے موجود ہیں جن کی علمی وجاہت بھی مسلم ہے اور بزرگی کی دھوم بھی ہے۔ ان کے اپنے تعلیمی ادارے ''مِدراس'' کے نام سے جابجا کام کررہے ہیں، اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھیں دنیوی وجاہت بھی حاصل ہے اور دینی عزت اور حرمت بھی۔ ایسے گروہ سے جن کا پس منظر کتاب سے رشتہ اور پیغمبروں سے انتساب ہے کسی طرح بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اللہ کے آخری پیغمبر کی مجلس میں جسے وہ اپنی کتابوں کی گواہی کی وجہ سے اچھی طرح پہچانتے بھی ہیں کمینی حرکتوں کا ارتکاب کریں گے۔ دنیوی اعتبار سے مہذب اور تعلیم یافتہ آدمی کسی بھی بڑے آدمی کی مجلس میں جائے اور وہ ہر چند اس سے ہزار اختلاف رکھتا ہو لیکن وہ کبھی بھی یہ حرکت نہیں کرے گا کہ باتوں باتوں میں الفاظ بگاڑ کر یا لہجہ بدل کر اس کی توہین کرنے کی کوشش کرے یا اس کے پیروکاروں کو اس سے گمراہ کرنے اور دور کرنے کی سعی کرے۔ ہاں! وہ شخص کہ تہذیب اور تعلیم جس کے پاس نہیں پھٹکی اور وہ اپنے معاشرے کا ایک آوارہ اور بدچلن آدمی ہے اس سے آپ یہ ضرور توقع کرسکتے ہیں کہ وہ جہاں بھی جائے گا ایسی حرکت ضرور کرے گا یا اس طرح کی گری ہوئی حرکتیں وہ شخص یا وہ گروہ کرسکتا ہے جو اپنی خود ساختہ عصبیتوں میں اندھا ہو چکا ہو۔ ان باتوں کو اگر ذہن میں رکھیں تو یہود کے بارے میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ بیشک دنیوی وجاہت کے مالک تھے اور اپنے پاس علم بھی رکھتے تھے بااِیں ہمہ! اخلاقی قدروں سے ان کا رشتہ ٹوٹ چکا تھا اور وہ اپنے تعصّبات کا اس بری طرح شکار تھے کہ ان کے لیے بری سے بری حرکت کرنا بھی کوئی مشکل بات نہ تھی۔ یہ ان کی ایسی قومی خصلت ہے جس نے آج تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا اور معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبیوں کی توہین کرنا اپنے مخالف کے حوالے سے ہر کمینی حرکت کر گزرنا اور ہمیشہ کسی نہ کسی سازش میں لگے رہنا، یہ ان کی وہ شناخت ہے جس سے وہ اپنی تاریخ کے اولین عہد میں بھی پہچانے جاتے تھے اور ہر دور میں برابر اس کے شواہد ملتے ہیں اور آج کے دور میں بھی، جب کہ تہذیب اور مجلسی آداب کو ترقی کرنے کا بہت زعم ہے، ان کے اندر اپنی اس شناخت کے اعتبار سے کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

Marfat.com

پیغمبروں کی توہین یہود کے ملی مقاصد میں شامل ہے

میں آگے بڑھنے سے پہلے یہاں ایک اور حقیقت کا اظہار کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اللہ کے نبیوں اور اس کے نیک بندوں سے طبعی تنفر، ان کی توہین کرنے کی کوشش اور دنیا میں ہر خیر کے سرچشمے کو ناکام کر دینے کا جذبہ جس طرح ہم یہود میں دیکھتے ہیں اسی طرح عیسائیت میں بھی نظر آتا ہے۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے تو یہ کہنا چاہیے کہ یہ خصائلِ بد یہودیت کی شناخت نہیں بلکہ یہ کفر کے آثار ہیں جو ہمیں یہود میں بھی نظر آتے ہیں اور عیسائیوں میں بھی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انھیں بار بار اس بات سے تشویش لاحق ہوتی ہے اور وہ اسے بدلنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں کہ پاکستان میں پیغمبروں کی عزت کے تحفظ کا جو قانون بن چکا ہے اسے کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے۔ انھیں کے زیرِ اثر ہمارے وہ دانشور اور وہ حکمران جو سراسر مغرب کے پروردہ ہیں اور امریکہ کے زلہ خوار ہیں وہ بھی انھیں کی جگالی کرنے لگتے ہیں حالانکہ نہایت سادہ سی بات ہے کہ ہم اگر اپنے رسولِ پاک کی عزت و حرمت پر کسی طرح کا غبار آنا بھی برداشت نہیں کرتے بلکہ ہم تمام انبیاء کرام کی عزت و حرمت کے پاسبان ہیں تو اس میں آخر ان کا کیا نقصان ہے؟ انبیاء و رسل کی حفاظت یا ان کی عزت کرنے سے ان کا کیا بگڑ جاتا ہے؟ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہم انھیں اس کی کھلی چھٹی دے دیں کہ یہ ہمارے رسول پاک کے بارے میں جو چاہیں یاوہ گوئی کریں؟ مسلمان تو اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ اس کے ایمان اور اس کی غیرت کا تقاضا ہے۔ بفرضِ محال اگر انھیں اس کی آزادی مل جائے تو انھیں اس سے آخر ملے گا کیا؟ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کا قومی نفسیاتی مسئلہ بن گیا ہے۔ جس طرح بچھو کسی کو ڈسے بغیر نہیں رہ سکتا اسی طرح یہ لوگ جب تک اللہ کے نبیوں کی توہین نہ کرلیں ان کے خبثِ باطن کو تسکین نہیں ملتی۔

عیسائی بھی یہود کے ہمنوا ہیں

لیکن سوال یہ ہے کہ یہود کی تو یہ فطرت بن چکی ہے لیکن عیسائی اس معاملے میں ان کے ہمنوا کیوں ہیں؟ جس آدمی کی نظر عیسائیت کی تاریخ پر ہو اس کے لیے یہ بات سمجھنا بہت آسان ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام پر بڑی محدود تعداد میں لوگ ایمان لائے۔ آپ نے اپنے بارہ حواریوں

Marfat.com

کو دینی ذمہ داریاں سونپیں۔ یہی لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی علمی اور دینی وارثت کے امین اور جانشین ٹھہرے۔ لیکن عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کے بعد جس شخص نے حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو عیسائیت کی شکل دے دی جبکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام عیسائیت نہیں اسلام لے کر آئے تھے، وہ وہ تھا جو عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں سینٹ پال کے نام سے جانا جاتا تھا۔ یہ ایک یہودی عالم تھا اور اپنے مذہبی خیالات میں نہایت متعصب تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام جب تک دنیا میں اپنی دعوت پیش کرتے رہے اس شخص نے اس دعوت کو ناکام کرنے کے لیے عیسیٰ علیہ السلام کی سب سے زیادہ مخالفت کی۔ لیکن جیسے ہی عیسیٰ علیہ السلام آسمان پر اٹھا لیے گئے یا یہود اور نصاریٰ کے عقیدہ کے مطابق انھیں سولی پر چڑھا دیا گیا تو اس کے تھوڑے عرصے بعد اس شخص نے ایک ڈھونگ رچایا کہ میں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بادلوں میں دیکھا ہے میں ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا ہوں اور انھوں نے مجھے اپنا جانشین قرار دیا ہے چونکہ آدمی نہایت ہوشیار، پڑھا لکھا اور بااثر تھا اس لیے تمام حواریوں پر غالب آ گیا۔ وہ بچارے چیختے ہی رہے لیکن اس نے یہودیت ہی کو ایک نئی شکل دے کر عیسائیت کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس منظم طریقے سے اس کا پرچار کیا کہ لوگوں نے اسی کو حقیقت جانا اور بعد میں ایمان لانے والے اسی پر ایمان لاتے رہے اور حواریوں کی جو مرتب کردہ انجیلیں ان کے تصورات کے خلاف تھیں ان کو مٹا دیا گیا۔ اس طرح سے یہودیت، عیسائیت کے نام پر عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے دل و دماغ میں اتار دی گئی اور آج تک عیسائی اسی عیسائیت پر چل رہے ہیں۔ لیکن یہ عیسائیت وہ مذہب یا وہ دین نہیں جسے سیدنا مسیح علیہ السلام لے کر آئے تھے۔ ان کا عقیدہ تثلیث، ان کا کفارہ کا عقیدہ، دین و دنیا میں جدائی وغیرہ وہ تصورات ہیں جو انھوں نے یہودیت سے لیے اور بعض محققین کے مطابق ہندو مت سے لیے اور انھیں عیسائیت میں شامل کر لیا اور یہ سب کچھ ایک یہودی نے کیا جس نے عیسائی ہونے کا لبادہ اوڑھا ہوا تھا۔ اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ یہودیت اور عیسائیت میں باوجود الگ الگ مذہب ہونے کے مسلمانوں کے معاملے میں یک رنگی کیوں ہے؟ اور کیوں اللہ کے نبیوں کے بارے میں دونوں ہی دشمنی کا رویہ رکھتے ہیں؟ اور انھیں ایسا ہر قانون کھٹکتا ہے جس میں اللہ کے نبیوں کی عزت کا تحفظ کیا گیا ہو۔ میں نے جو بات عرض کی ہے اگر اس حقیقت کو قبول نہ کیا جائے تو پھر بعض باتوں کا جواب ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مثلاً عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں کیونکہ کوئی مرد ان کا باپ نہیں۔ لیکن یہود ان کے

Marfat.com

نسب پر طعن کرتے ہیں اور نہ صرف کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ایک بے نسب آدمی سمجھتے ہیں بلکہ ان کی والدہ کو بھی نعوذ باللہ من ذلک بدچلن عورت خیال کرتے ہیں۔ یہ اتنا بڑا الزام اور اس قدر تکلیف دہ بات ہے کہ کوئی بھی غیرت رکھنے والی قوم اس طرح کے الزام لگانے والوں سے کوئی تعلق رکھنے کی روادار نہیں ہوسکتی۔ لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ قرآنِ کریم جس نے آکر عیسیٰ علیہ السلام کی عزت وحرمت واضح کی ان کو اللہ کا نبی ثابت کیا، ان کے حیرت انگیز معجزات کا ذکر کیا اور ان کی والدہ محترمہ کو عفت مآب اور صدیقہ قرار دیا۔ لیکن عیسائی مسلمانوں کے اس احسان کے باوجود جب بھی کوئی تعلق قائم کرتے اور رشتہ جوڑتے ہیں تو وہ یہود سے جوڑتے ہیں اور دونوں ملکر مسلمانوں سے دشمنی کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہودیت اور نصرانیت اصل میں ایک ہی شجرِ خبیث سے نکلنے والی شاخیں ہیں۔ مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ یہودیت اور عیسائیت کے اس رشتے کو سمجھیں اور اپنی خارجہ پالیسی طے کرتے ہوئے اس نقطے کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھیں۔

یہود کی طرف سے مجلسی الفاظ کا غلط استعمال

اب اس آیتِ کریمہ کے الفاظ کے آئینہ میں دیکھنے کی کوشش کیجیے اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اپنے باطنی بغض اور مخفی کینے کا اظہار کرنے میں کس چابک دستی کا ثبوت دیا تھا۔ سیدھے سادے اور معصوم مجلسی الفاظ کو اس طرح توڑ مروڑ کر ادا کرتے تھے کہ سننے والا بڑی مشکل سے محسوس کرسکتا تھا کہ یہ بدباطن ان سادہ سے الفاظ سے کیا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ ہر زبان میں الفاظ کو اچھے یا برے مقاصد میں استعمال کرنے کے لیے نیت اور ارادہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک ہی طرح کے الفاظ نیت میں خرابی آنے کے باعث برائی کے پیغامبر بن جاتے ہیں اور نیت میں اصلاح ہونے کی وجہ سے محبت اور نیکی کی علامت ٹھہرتے ہیں۔ عربوں کی مجالس میں بولے جانے والے الفاظ ان کے روزمرہ کی حیثیت رکھتے تھے اور ہر آدمی سمجھتا تھا کہ اس کا مفہوم کیا ہے۔ مثلاً جب ان میں سے کوئی بڑا آدمی یا ان کا سردار چھوٹے لوگوں کو یا اپنے ماتحتوں کو کسی بات کا حکم دیتا تو سننے والے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ ہم اس حکم کے لیے آمادۂ عمل ہیں اور آپ ہماری اطاعت میں انشاء اللہ کوئی کمی نہیں دیکھیں گے۔ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہتے کہ "ہم نے سنا اور ہم نے اطاعت کی"۔ لیکن ان بدبخت یہود نے یہ

Marfat.com

رو یہ اختیار کر رکھا تھا کہ جب حضور کی مجلس میں آتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے آگے بڑھ کر سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا کہتے تا کہ مسلمانوں کو ان کے اخلاص کا یقین آجائے۔ لیکن اپنے خبثِ باطن کی تسکین کے لیے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کی بجائے سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا کہتے۔ لب و لہجہ کو اس طرح بدلتے کہ سننے والے کو دونوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں اس وجہ سے اس تحریف میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اسی طرح جب حضور کی مجلس میں سے کوئی صاحب آنحضرت سے کوئی بات کہنا چاہتے تو وہ کہتے اِسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ جس کا معنی یہ ہے "آپ میری بات سنئے اور آپ ایسے محترم ہیں کہ آپ کو کوئی بات خلافِ مرضی نہیں سنائی جاسکتی"۔ لیکن یہود جب اس جملے کو استعمال کرتے تو وہ اس سے یہ مراد لیتے کہ "ہماری بات سنئے اور تم اس قابل نہیں ہو کہ تمھیں کوئی کچھ سنائے" اور دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ "خدا کرے تم بہرے ہو جاؤ"۔ بعض اہلِ علم نے اس کا اور مفہوم بھی بیان کیا ہے کہ اس فقرے کا لفظی معنی یہ ہے کہ "سنئے وہ بات جو اس سے پہلے سنائی نہیں گئی۔" جب کسی خطیب یا متکلم کو یہ فقرہ کوئی مخاطب کہتا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ نے ایک ایسی بلند بات کہی ہے جو اس سے پہلے کبھی سنائی نہیں گئی یا ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کر کے یہ فقرہ بولتا اور مقصود اس کا یہ ہوتا کہ ذرا غور سے اس بات کو سنیے ایسی دانشمندانہ اور حکیمانہ بات اس سے پہلے کبھی ہمارے کانوں نے نہیں سنی۔ اس طرح لوگ اپنے خطیبوں کو داد دیتے یا اپنی طرف سے قدردانی کا ثبوت دیتے اور دوسروں کے لیے اس طرح تشویق اور ترغیب کا سامان کرتے۔ لیکن یہود اسی خوبصورت جملے کو اپنی بدباطنی کے باعث لہجہ بدل کر تمسخر کے انداز میں اس طرح ادا کرتے جس کا مفہوم یہ ہو جاتا کہ "ذرا سنیے اس شخص کی بات جو پہلے کبھی نہیں سنی گئی۔ یعنی یہ شخص کیسی بے پر کی اڑا رہا ہے اور یہ بات اس قابل نہیں کہ اسے سنا جاسکے۔ اندازہ کیجیے کہ محض انداز اور لب و لہجہ کی تبدیلی سے کس طرح ایک معصوم لفظ کو بدباطنی کے اظہار کا ذریعہ بنا لیا گیا ہے۔ پروردگار نے اس پر حکم دیا کہ یہ سارا فساد چونکہ غَیْرَ مُسْمَعٍ سے پیدا ہوتا ہے اور یہ بدباطن یہود اسی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں اس لیے آج کے بعد کسی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ آنحضرت کی مجلس میں غَیْرَ مُسْمَعٍ کا استعمال کرے۔

عرب اپنی مجلسوں میں جب کسی بات کو سمجھنا چاہتے یا وہ کسی بات کو پوری طرح سن نہیں پائے اور وہ اس کو دوبارہ سننا چاہتے تو وہ کہتے رَاعِنَا۔ صحابہ بھی آنحضرت کے سامنے یہ

Marfat.com

لفظ بولتے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ آپ دوبارہ ارشاد فرمادیجیے، آپ ہماری رعایت فرمایے تاکہ ہمیں سمجھنے میں آسانی ہوجائے۔ لیکن ان بدبخت یہود نے رَاعِنَا کو زبان کے توڑ مروڑ کے ذریعے سے طنز کے قالب میں ڈھال دیا۔ وہ رَاعِنَا میں ''ع'' کے کسرہ کو ذرا دبا دیتے تو یہ لفظ رَاعِینَا بن جاتا۔ جس کا معنی ہے ''ہمارا چرواہا'' اتنے سے نازک فرق کو دوسرے سننے والے محسوس بھی نہیں کرسکتے تھے۔ لیکن یہود اس طرح کی حرکتوں سے اپنے طور پر خوش ہوتے تھے کہ ہم نے اپنے خبثِ باطن کے اظہار کے لیے ایک راستہ نکال لیا ہے اور اس طرح وہ اپنی بھڑاس نکالنے میں کامیاب ہوجاتے تھے۔ پروردگار نے یہود کی اس شرارت کو روکنے کے لیے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کردیا اور اس کی جگہ اُنْظُرْنَا کے استعمال کی ہدایت فرمائی۔ جس کے معنی ہیں ''ذرا ہمیں مہلت عنایت فرمایے، ذرا ہم پر توجہ فرمایے۔'' یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک رَاعِنَا کا قائم مقام ہے لیکن اس میں لہجہ کے بگاڑ سے غلط فائدہ اٹھانے کا کوئی موقع نہیں۔

اس آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا کہ اہلِ کتاب کا یہ گروہ اپنا علمی پس منظر رکھنے کے باعث آنحضرت کی مجلس میں جاکر جو کمینہ حرکتیں کرتا ہے اس کی ان سے ہرگز توقع نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسی حرکتیں تو معمولی آدمی بھی نہیں کرتا۔ لیکن یہ ساری حرکتیں اس لیے کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے کفر اور بداعمالیوں کے باعث اپنی قسمت پھوڑ لی ہے۔ پروردگار بڑے سے بڑے گناہ گاروں کو مہلت پر مہلت دیتا رہتا ہے۔ لیکن جب ان کا کفر عناد میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کفر اور گمراہی پر عصبیت کے پیکر بن جاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پیغمبر کی عزت بھی ان کے ہاتھ سے محفوظ نہیں رہتی تو پھر اللہ کا غضب بڑھکتا ہے تو ان پر لعنت کی پھٹکار ماری جاتی ہے۔ یہ لوگ بھی چونکہ آنحضرت ﷺ کی توہین تک پہنچ گئے ہیں اور یہ طریقے طریقے سے یہ حرکت کر گزرنے سے دریغ نہیں کرتے تو اللہ تعالیٰ نے اس کی پاداش میں ان پر لعنت فرمادی ہے۔ لعنت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہدایت اور رحمت سے انھیں دور کرکے ان کی محرومی کا فیصلہ کردیا ہے۔ اسی لعنت کا نتیجہ دلوں پر مہر لگ جانے کی صورت میں نکلتا ہے۔ اب ان لوگوں سے ایمان کی کوئی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ البتہ! ان میں ایک بہت معمولی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو کفر، دشمنی اور عناد کی آخری حد تک نہیں پہنچے ان کے بارے میں امید ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں ایمان کی دولت سے بہرہ ور فرمائیں گے۔

Marfat.com

نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے

اس آیتِ کریمہ میں آپ نے دیکھا ہے کہ یہود کی تمام خباثتیں اور شرارتیں نبی کریم ﷺ کو پریشان کرنے اور ان کے مقام و مرتبہ کو ہدف بنانے کے لیے تھیں۔ لیکن قرآنِ کریم نے اسے طعناً فی الرسول نہیں بلکہ طعناً فی الدین کے الفاظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ جس سے ایک بہت بڑی حقیقت سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے وہ یہ کہ نبی حقیقت میں مجسمۂ دین اور مظہرِ شریعت ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے اللہ کا قانون بولتا ہے، اس کے عمل سے شریعت کو عملی شکل ملتی ہے، اس کی سعی و کاوش سے دین کو غلبہ ملتا ہے، اسی کی دعوت و تبلیغ سے دین لوگوں تک پہنچتا ہے اور لوگ حلقہ بگوشِ دین ہوتے ہیں، اس کی ذات دین کا پیغام بھی ہے اور دین کی شناخت بھی۔ جیسے جیسے اس کی ذات سربلند ہوگی ویسے ویسے اللہ کا دین سربلند ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کوئی شخص اللہ کے نبی پر طعن توڑتا ہے اور اسے نشانہ بناتا ہے، وہ درحقیقت دین پر طعن کرتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ جب ہم سابقہ امتوں کی گمراہیوں کی تاریخ پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کی گمراہی کا آغاز اللہ کی کتاب کے مٹنے سے نہیں ہوا بلکہ سب سے پہلے اللہ کے رسول سے ان کا تعلق ٹوٹا، اس کی شخصیت سے لاتعلق ہو گئے، اس کا اسوہ اور اس کی سنت ان کی زندگیوں سے نکل گئی۔ جس کے نتیجے میں کتاب سے بھی ان کا رشتہ قائم نہ رہا، کتاب باقی رہی بھی تو انھوں نے اسے موم کی ناک بنا کر رکھ دیا۔ امتِ مسلمہ کو بھی اس بات کی شدید فکر کرنی چاہیے اور اس آیت کے آئینہ میں تو ان کا احساس مزید تیز ہو جانا چاہیے کہ وہ اگر مسلمان کی حیثیت سے دنیا کی قوموں میں اپنا کردار ادا کرنا چاہتے ہیں اور انھیں واقعی ایک آبرومندانہ زندگی عزیز ہے تو پھر انھیں آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی سے اپنے رشتے کو کمزور نہیں ہونے دینا چاہیے اور ایسی ہر کوشش کو ناکام بنا دینا چاہیے جس کے نتیجے میں سرکارِ دوعالم ﷺ کے احترام اور محبت میں کمی آتی ہو اور یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ حضور کی عزت و حرمت کا تحفظ یقیناً قوانین سے بھی ہونا چاہیے لیکن اس تحفظ کی اصل ضمانت مسلمانوں کے اس جذبے میں مضمر ہے جو جذبہ انھیں بعض دفعہ اللہ کے نبی کی عزت و حرمت کے لیے جان دینے پر اکساتا ہے۔ ظفر علی خان مرحوم نے اپنے بڑھاپے کے دنوں میں کانپتے ہوئے لہجے میں مسلمان امت کو پیغام دیتے

Marfat.com

ہوئے فی البدیہہ شعر کہے تھے

نماز اچھی روزہ اچھا و حج اچھا زکوٰۃ اچھی
مگر میں باوجود ان کے مسلماں ہو نہیں سکتا
نہ جب تک کٹ مروں میں خواجۂ یثرب کی عزت پر
خدا شاہد ہے کامل میرا ایماں ہو نہیں سکتا

Marfat.com

24- رسول کا حقیقی مقام ومرتبہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ط وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا﴾

''اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا تو اسی لیے بھیجا کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے اور اگر وہ جب کہ انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا' تمھاری خدمت میں حاضر ہوتے اور خدا سے معافی مانگتے اور رسول بھی ان کے لیے معافی چاہتا تو وہ خدا کو بڑا توبہ قبول کرنے والا اور مہربان پاتے۔'' (النسآء : ۶۴)

اس آیت کریمہ میں پروردگار نے رسول کی حیثیت وعظمت کو پوری طرح نمایاں کردیا ہے۔ ارشاد فرمایا: کہ ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے تو صرف اس لیے نہیں بھیجا کہ اسے مان لیا جائے اور اس سے عقیدت ومحبت کا اظہار کیا جائے بلکہ رسول اس لیے بھیجا جاتا ہے کہ اسے مانا بھی جائے' اس سے عقیدت بھی رکھی جائے اور اس سے محبت بھی کی جائے۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی اطاعت کی جائے کیونکہ صرف مان لینا کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اس کے ساتھ اطاعت شامل نہ ہو۔ اسی طرح وہ محبت اور عقیدت زبانی جمع خرچ کے سوا کچھ نہیں جس کے ساتھ اطاعت کی تائید شامل نہ ہو۔ ایک آدمی کسی شخصیت کی عظمت تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے احکام کی تعمیل نہیں کرتا۔ کسی سے عقیدت ومحبت کا دم بھرتا ہے لیکن اس کی پیروی نہیں کرتا تو غور فرمایئے کہ اس مان لینے اور عقیدت ومحبت کے اظہار کرنے کا آخر کیا فائدہ ہے۔ رسول تو دنیا میں اس لیے آتا ہے تاکہ یہ ساری نسبتیں اس کے ساتھ قائم ہوں۔ وہ انسان

Marfat.com

کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں مکمل تبدیلی لانے کا پابند ہوتا ہے۔ اگر اس کے احکام کی تعمیل نہ کی جائے اور اس کی کسی ہدایت کو قبول نہ کیا جائے اور اس کو ماننے والے صرف زبانی جمع خرچ کرنے والے ہوں تو ایسے لوگوں کی زندگی میں کیا تبدیلی واقع ہو سکتی ہے اور ان کے واسطے سے کیسا انقلاب برپا ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ تو ہر رسول کے ساتھ ہے۔ کہ اطاعت رسول کو ماننے کی لازمی شرط ہے۔ لیکن وہ ذات گرامی جو سید الرسل بن کے دنیا میں آئی ہے' اس کی اطاعت نہ کرنے کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن منافقین صرف یہ سمجھتے تھے کہ ایمان کا دعویٰ اور محبت وعقیدت کا اظہار بس ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہے اور بدنصیبی سے آج کا مسلمان بھی یہی سمجھتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے معاملات میں شریعت کو دخیل ہونے کا کہیں موقع نہیں دیتا۔ وہ اپنی پوری زندگی کو اس سے آزاد رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن جب اسے خیال آتا ہے کہ میں آخر ایک مسلمان بھی ہوں تو وہ چند نعتیں پڑھ کر یعنی اظہار محبت وعقیدت کر کے سمجھتا ہے کہ میں نے آخرت کا سامان کر لیا ہے۔ ایک عرب شاعر نے نہایت تعجب سے اس دوعملی پر توجہ دلائی ہے۔ وہ کہتا ہے:

تَعصِی الرَّسُولُ وَ اَنْتَ تَظْهَرُ حُبَّہ
هٰذَا لَعَمْرِی فِی الزَّمَان بَدِیع
لَوْ کَانَ حُبُّكَ صَادِقاً لَاُطَعْتَہٗ
اِنَّ المُحِبَّ لِمَنْ یَحِبُّ مُطِیع

(تو رسول کی نافرمانی کرتا ہے اور اس سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے میری بقا کی قسم زمانے میں یہ بالکل نئی بات ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو رسول کی اطاعت کرتا' کیونکہ محبت کرنے والا ہمیشہ اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے)

اسی بات کو آنحضرت ﷺ نے ایک حدیث میں بیان فرمایا:

کل امتی یدخلون الجنة الا من ابیٰ۔ قالوا: یارسول الله ومن ابیٰ؟ قال: من اطاعنی فقد دخل الجنة ومن عصانی فقد ابی ۔

(میری ساری اُمت جنت میں جائے گی' ہاں وہ نہیں جائے گا جس نے

Marfat.com

انکار کیا۔ صحابہ نے پوچھا: یا رسول اللہ کس نے انکار کیا؟ ارشاد فرمایا: جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں داخل ہوا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے مجھے ماننے سے انکار کیا)

مختصر یہ کہ رسول، اللہ کی حاکمیتِ قانونی اور تشریعی کا مظہر ہوتا ہے۔ اس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے۔ تو جو بھی اس کی نافرمانی کرتا ہے چونکہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے، اس لحاظ سے وہ شرک کا ارتکاب کرتا ہے۔ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر کسی اور عدالت میں اپنے معاملے کو فیصلے کے لیے لے کر جاتا ہے تو وہ اللہ کی حاکمیت کا انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اپنی جان پر اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اگر یہ لوگ اپنی جانوں پر ظلم کر چکے، یعنی یہود کی عدالتوں میں جا کر انھوں نے اپنے آپ پر ظلم توڑا ہے تو اب بھی بچ نکلنے کا ایک راستہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ اے پیغمبر وہ آپ کے پاس آئیں، پھر اللہ سے معافی مانگیں اور آپ بھی ان کے لیے اللہ سے استغفار کریں۔ تو یقیناً اللہ کو توبہ قبول کرنے ولا اور رحم کرنے والا پائیں گے۔ آپ کے پاس انہیں آنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ انھوں نے آپ کی عدالت میں نہ آ کر حقیقت میں آپ کی رسالت کو چیلنج بھی کیا ہے اور آپ کا دل بھی دکھایا ہے۔ اس جرم کی تلافی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک وہ سب سے پہلے آپ کے پاس آ کر آپ سے معافی نہ مانگیں اور آپ کو خوش نہ کریں۔ اور جب تک آپ ان کے لیے استغفار نہیں کریں گے، اس وقت اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں فرمائے گا۔ بعض اہل علم نے لکھا ہے کہ یہ آیت اگرچہ خاص منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن اس کے الفاظ سے ایک عام ضابطہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور آپ اس کے لیے دعائے مغفرت کر دیں، اس کی مغفرت ضرور ہو جائے گی اور آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضری جیسے آپ کی دنیوی حیات کے زمانے میں ہو سکتی تھی، اسی طرح آج بھی روضۂ اقدس پر حاضری اسی حکم میں ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کو دفن کر کے فارغ ہوئے تو اس کے تین روز بعد ایک گاؤں والا آیا اور قبر شریف کے پاس آ کر گر گیا اور زار زار روتے ہوئے آیت مذکورہ کا حوالہ دے کر عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وعدہ فرمایا ہے کہ اگر گنہگار رسول کی خدمت میں حاضر ہو جائے اور رسول اس کے لیے دعائے مغفرت کر دے تو اس کی مغفرت ہو جائے گی۔ اس لیے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں کہ

Marfat.com

آپ میرے لیے دعائے مغفرت فرمائیں۔ اس وقت جو لوگ حاضر تھے' ان کا بیان ہے کہ اس کے جواب میں روضۂ اقدس کے اندر سے آواز آئی۔ قَدْ غُفِرَ لَكَ (کہ تمھاری مغفرت کردی گئی) واللہ اعلم واحکم بالصواب۔ (بحر محیط)

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا﴾

''پس (اے پیغمبر) تیرے رب کی قسم یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ حاکم بنائیں آپ کو ہر اس جھگڑے میں جو پھوٹ پڑا ان کے درمیان۔ پھر نہ پائیں اپنے نفسوں میں تنگی اس سے جو فیصلہ آپ نے کیا اور تسلیم کرلیں دل و جان سے۔'' (النسآء : ۶۵)

وَرَبِّكَ کا معنیٰ ومفہوم

وَرَبِّكَ میں واؤ قسم کے لیے ہے۔ اس سے پہلے لا زائد کہا جاتا ہے' لیکن یہ قسم کی تاکید کے لیے آتا ہے۔ ہمارے متقدمین اس کو اسی معنی میں لیتے ہیں۔ نفیِ ایمان پر دلالت کرنے کے لیے لا نفی کو دوبار ذکر کیا۔ ایک بار قسم سے پہلے اور دوسری مرتبہ قسم کے بعد۔ اس سے قسم کے ساتھ جو بات کہی جا رہی ہے اس کی انتہائی تاکید بھی مقصود ہے اور تحسین کلام بھی۔

سابقہ آیتِ کریمہ میں رسول کی حیثیت کو بیان کیا گیا تھا۔ رسول کو مان لینا یا اس سے عقیدت کا اظہار کرنا کافی نہیں بلکہ اس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ اس آیتِ کریمہ میں اس مضمون کو پوری وسعت اور جامعیت کے ساتھ کھول دیا ہے۔ اس میں سب سے پہلے ایک قاری کی نگاہ قسم پر پڑتی ہے کہ ''اے پیغمبر! تیرے رب کی قسم ہے۔'' اور اس کے بعد منافقین کے بارے میں ان کے عدمِ ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ قسم اس وقت کھائی جاتی ہے جب مخاطب کو بات کہنے والے کی بات کا اعتبار نہ ہو۔ اور اس کے نزدیک قائل کی حیثیت ایسی معتبر نہ ہو کہ اس کی ذات کا حوالہ باقی ہر چیز سے مستغنی کردے۔ تو پھر بات کہنے والا اپنی بات کو موکد اور قابل اعتبار ٹھہرانے کے لیے قسم کا سہارا لیتا ہے۔ لیکن جس کی ذات ہر طرح کے شک وشبہ سے بالا ہو اسے ان سہاروں کی ہرگز ضرورت نہیں ہوتی۔ پروردگار کے بارے میں

Marfat.com

کوئی بدتر سے بدتر آدمی بھی تصور نہیں کر سکتا کہ اس کی کسی بات میں جھوٹ کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔ خود قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ مرتبہ یہ بات کہی ہے وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا (اللہ سے بڑھ کر کس کی بات سچی ہو سکتی ہے)۔ لیکن یہاں پروردگار بات کہنے سے پہلے قسم کھا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ قسم کے ذریعے اپنی بات کا اعتبار پیدا کر رہا ہے۔ بلکہ یہاں دو وجہ سے قسم کھائی جا رہی ہے۔ ایک تو اس وجہ سے کہ منافقین کو اس بات کا اچھی طرح یقین آ جائے کہ اللہ کے نزدیک وہ ایمان کسی طرح بھی قابلِ اعتبار نہیں جس میں اللہ کے رسول کی اطاعت اور محبت میں کمی ہو۔ وہ ہزار ایمان کے دعوے کریں لیکن ایمان کے لیے لازمی سند وہ ہے جو اس آیت کریمہ میں آگے پیش فرمائی جا رہی ہے۔ اور دوسری وجہ قسم کھانے کی شاید یہ ہے کہ اس سے پہلے آیت نمبر ۶۲ میں پروردگار نے منافقین کی قسم کا ذکر فرمایا ہے کہ وہ آپ کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے ہیں کہ ہمارے ایمان میں اور مسلمانوں کے ساتھ ہمارے رویے میں منافقت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہاں پروردگار نے منافقین کی اس جھوٹی قسم کی تردید سچی قسم کے ساتھ فرمائی ہے کہ وہ اپنا اعتبار جمانے کے لیے ہزار قسمیں کھائیں وہ سب جھوٹی ہیں۔ سچی قسم یہ ہے کہ وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ اور مزید یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ وَرَبِّكَ کے خطاب میں جس طرح پروردگار نے اپنی اضافت رسول اللہ ﷺ کی ذات کی طرف فرمائی ہے اور جس طرح التفاتِ خاص کا ثبوت دیا ہے اس سے منافقین اور قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ بات بتلانا مقصود ہے کہ جس پیغمبر کی اطاعت اور محبت کا تمھیں حکم دیا جا رہا ہے تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ اس کا مقام و مرتبہ اللہ کی نگاہ میں کیا ہے؟ قسم تو یقیناً اللہ کے نام کی ہوتی ہے اس لیے پروردگار یہ بھی فرما سکتے تھے کہ "مجھے اپنی قسم ہے" لیکن بطورِ خاص یہ فرمانا کہ "تیرے رب کی قسم ہے" اس میں آنحضرت ﷺ کی جس طرح دلنوازی اور عظمتِ شان کا اہتمام کیا گیا ہے اس کی وضاحت کے لیے تو شہپرِ جبریل چاہیے' انسانی زبان یا قلم میں اس کی طاقت نہیں کہ وہ اس کی نزاکتوں کا حق ادا کر سکے۔ اس کے بعد ایمان کے ثبوت کے لیے تین باتیں ارشاد فرمائیں:

ایمان کے ثبوت کے لیے تین شرائط

۱۔ کہ تمھارے ایمان کا اس وقت تک کوئی اعتبار نہیں جب تک تم اپنی زندگی کے تمام اختلافات میں اللہ کے رسول ﷺ کو آخری حکم' سند اور اتھارٹی نہ سمجھو۔ اس میں دو باتیں انتہائی

Marfat.com

قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ بات کہ اللہ کے رسول کی فیصلہ کن حیثیت صرف عبادات یا خالص دینی امور میں نہیں، بلکہ اعتقادات سے لے کر معاملات تک اور پھر عدالتوں سے لے کر ایوان ہائے حکومت تک، قومی معاملات سے لیکر بین الاقوامی معاملات تک تک، کسی سطح پر بھی اور کسی دائرے میں بھی کوئی معاملہ سر اٹھائے جس میں امت کے اہلِ علم یا عوام اور حکمرانوں میں یہ اختلاف ہو جائے کہ اس معاملے میں راہِ صواب اور نقطۂ اعتدال کیا ہے؟ تو اس کے فیصلے کے لیے صرف اللہ کے رسول کی طرف لوٹنا ہوگا۔ اگرچہ رجوع سب سے پہلے قرآنِ حکیم کی طرف کیا جائے گا، لیکن قرآنِ کریم کے اصولوں کی عملی تعبیر، اس کے مبہمات کی وضاحت، اس کے مجملات کی تشریح، چونکہ یہ صرف اللہ کے رسول کا کام ہے اس لیے عملی طور پر اللہ کے رسول کی ذات ہی مرجع ہوگی۔ کوئی آدمی یا کوئی گروہ صرف اعتقادات یا عبادات میں تو اللہ کے رسول کی طرف دیکھتا ہے لیکن باقی پوری زندگی میں وہ اللہ کے رسول کو حکم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ منافق ہے اور اس کے ایمان کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اور دوسری یہ بات کہ کہ اگر کوئی شخص زندگی کے ہر معاملے میں زبانی طور پر تو اللہ کے رسول کی حیثیت کو تسلیم کرتا ہے، لیکن عملی طور پر وہ اللہ کے رسول یعنی قرآن وسنت کو حقیقی اہمیت دینے اور واقعی حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ جب بھی آنحضرت ﷺ سے اظہارِ عقیدت ومحبت کا وقت آئے تو وہ سب سے پیش پیش ہو، لیکن جب اس سے اجتماعی، تہذیبی، تمدنی، حکومتی اور تعلیمی معاملات میں آنحضرت یعنی قرآن و سنت کی طرف رجوع کرنے کے لیے کہا جائے تو وہ صاف پہلو بچا کر نکل جائے تو ایسا شخص بھی اللہ کی نگاہ میں مومن نہیں۔ مختصر یہ کہ زندگی کے تمام معاملات اور اختلافی امور میں جب تک آنحضور ﷺ کی فیصلہ کن حیثیت تسلیم نہ کی جائے اس وقت تک ایمان نا قابلِ اعتبار رہتا ہے۔ اور ایسا شخص حقیقت میں مومن نہیں ہوتا۔

۲۔ دوسری بات اس آیتِ کریمہ میں ایمان کے ثبوت کے لیے یہ فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو حکم، سند اور اتھارٹی تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں، بلکہ آپ ﷺ کے فیصلوں کو جو قرآن وسنت کی شکل میں موجود ہیں اور قیامت تک کے لیے باقی رہیں گے انھیں دل و جان سے قبول کرنا بھی ضروری ہے۔ یعنی زبانی اقرار کافی نہیں بلکہ دل کی تصدیق اور دل کا میلان بھی ضروری ہے۔ جیسے ہی کسی معاملے میں یہ ثابت ہو جائے کہ اس معاملے میں آنحضرت ﷺ کی ہدایت یہ ہے تو اگر دل اسے قبول کرنے میں تنگی محسوس کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس

Marfat.com

میں نفاق موجود ہے۔ حقیقی ایمان کے لیے انشراحِ قلب اور طبیعت کا یکسو ہونا ضروری ہے۔ دنیا کے اہلِ علم اس کے بارے میں کوئی بھی رائے رکھیں، لیکن ایک مومن کے لیے اللہ کے رسول کی رائے کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دل میں اس کیفیت کا پیدا ہو جانا حقیقی ایمان ہے، جس کے بغیر اللہ کے یہاں ایمان کا اعتبار نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی بات کا حکم دیتے تھے تو صحابہ رضی اللہ عنہم فوراً سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ اٹھتے تھے اور ان کا انگ انگ اطاعت میں ڈوب جاتا تھا۔ وہ جیسے جیسے اطاعت کی کلفتوں سے گزرتے تھے ویسے ویسے ان کے دلوں کی مسرتوں میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔

۳۔ تیسری چیز حقیقت میں متذکرہ دونوں چیزوں کا نتیجہ ہے۔ جب ایک شخص اللہ کے رسول کی اصل حیثیت کو تسلیم کر لیتا ہے، پھر اللہ کے رسول کے ہر فیصلے پر وہ دل و جان سے جھک جاتا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک ایک ادا پر سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی پوری ذات کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت میں دے دیتا ہے، اپنی خواہشات سے دستبردار ہو جاتا ہے اور اپنے نفع و ضرر کے پیمانوں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے۔ اب اس کے سامنے نفع وہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نفع قرار دیں اور نقصان وہ ہے جسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نقصان قرار دیں۔ ان تین باتوں کا خلاصہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرما دیا۔ ارشاد فرمایا:

لا یؤمن احدکم حتی یکون ھواہ تبعا لما جئت بہ۔

(تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ اس کی خواہشاتِ نفس اس تعلیم اور شریعت کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کے آیا ہوں)۔

اس حدیث پر اگر غور کریں تو پوری زندگی اس میں سمٹ آتی ہے۔ گھر میں بھی حضور کی سنت حکومت کرتی نظر آتی ہے اور اجتماعی زندگی کے ہر ادارے میں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی آنحضرت یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا ڈنکا بجتا سنائی دیتا ہے۔

Marfat.com

25- سلام مسلمانوں کی ثقافت کا آئینہ دار

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْھَآ اَوْرُدُّوْھَا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ حَسِیْبًا﴾ (النسآء: ۸۶)

''اور جب تمھیں سلامتی کی کوئی دعا دی جائے تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو، اللہ ہر چیز کا حساب کرنے والا ہے۔''

''تحیة'' باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس کا اصل معنی ''کسی کو زندگی کی دعا دینا'' ہے۔ ''حیاكَ اللّٰہُ'' کا دعائیہ کلمہ اسی سے بنا ہے جس کا معنی ہے ''اللہ تمھیں زندہ رکھے'' یا ''اللہ تمھاری عمر دراز کرے''۔

گزشتہ رکوع میں ہم نے پڑھا ہے کہ منافقین کی مختلف عادات و خصوصیات کو بیان کرنے اور مسلمانوں کے خلاف ان کی درپردہ سازشوں کو بے نقاب کرنے کے بعد آنحضرت ﷺ سے کہا گیا ہے کہ آپ ان کی سازشوں کی پرواہ نہ کریں، البتہ ان سے اعراض کا رویہ اختیار کریں۔ آپ کا بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے۔ وہی آپ کا کارساز ہے، اس کی تائید و نصرت اگر میسر ہے تو پھر یہ منافقین آپ کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس لیے ان کی مخالفت سے آپ نہ اثر قبول کریں اور نہ ابھی ان کے خلاف کوئی اقدام کریں، البتہ وہ شفقت اور توجہ جس کی پھوار ہر ایک پر برستی رہتی ہے اس میں آپ کمی فرما دیں اور ان سے اعراض اور بے نیازی کا رویہ اختیار کریں تاکہ ان کو اندازہ ہو جائے کہ آپ ان کی سازشوں اور شرارتوں سے بے خبر نہیں ہیں۔

مسلمان چونکہ ہر معاملے میں آنحضرت ﷺ کی پیروی کرتے تھے اور آپ ﷺ کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا پر ان کی نظر رہتی تھی۔ وہ جیسے ہی منافقین سے آپ کو اعراض کرتے ہوئے دیکھیں گے تو انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگے گی کہ آپ یقیناً ان سے

Marfat.com

ناراض ہیں اور آپ کی ناراضگی کسی سے بھی اپنی ذات کی وجہ سے تو نہیں ہوتی بلکہ اس کا سبب غیرتِ دینی یا اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس احساس کے پیدا ہوتے ہی یقیناً اس بات کا خطرہ تھا کہ مسلمان بھی منافقین سے اپنا رویہ بدل لیں اور جو لوگ مسلمانوں میں زیادہ پرُ جوش ہیں وہ ہو سکتا ہے منافقین کے خلاف کوئی اقدام کر ڈالیں۔ ابھی حالات اس سطح تک نہیں پہنچے تھے کہ منافقین کے خلاف کوئی کارروائی کی جائے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ کے ذریعے مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی کہ منافقین کا طرزِ عمل کچھ بھی ہو تمھیں بہر حال اپنے طرزِ عمل میں سختی یا بیگانگی پیدا نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ تمھاری حیثیت ایک داعی اور مبلغ کی ہے۔ دوسروں کی طرف سے اگر تمھیں تلخیاں بھی ملیں تو تمھیں اس کا جواب تلخی سے نہیں دینا چاہیے۔ اس سے معاملات ہمیشہ بگڑتے ہیں سُدھرتے نہیں۔ اس لیے جب تم یہ دیکھو کہ کوئی تمھیں احترام کے ساتھ دعا دے رہا ہے تو تم بھی اس کی دعا کا جواب دعا سے دو۔ بلکہ تمھاری دعا میں اس کے لیے زیادہ محبت کا اظہار ہونا چاہیے اور اگر ایسا نہ کر سکو تو اسی کے دعائیہ کلمات کو دہرا دو۔

سلام مسلمان کی شناخت

اس آیتِ کریمہ میں بظاہر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اگر تمھیں کوئی دعائیہ کلمات سے سلام کرتا ہے تو تمھیں بھی ایسے ہی دعائیہ کلمات سے جواب دینا چاہیے۔ اور اس کی ضرورت اس وقت کے تلخ حالات میں مسلمانوں کو تلخی کا رویہ پیدا کرنے سے روکنا تھا۔ لیکن جمہور مفسرین کہتے ہیں کہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت اس کی ضرورت اس لیے پیدا ہوئی' لیکن درحقیقت یہ آیتِ کریمہ بنیاد ہے اس طریقِ سلام کی جسے اسلام نے مسلمانوں میں رواج دیا اور جو مسلمانوں کی قومی اور ملی شناخت کا ذریعہ بن گیا۔

دنیا میں بسنے والی تمام قوموں میں اس بات کا احساس پایا جاتا ہے کہ ان کی قوم کے دو افراد بھی جب آپس میں ملیں تو باہمی تعارف' شناخت اور اعتماد کا کوئی ایسا ذریعہ ہونا چاہیے جس سے بیگانگی دور کرنے میں مدد ملے۔ چنانچہ مختلف قوموں نے اپنے اپنے طریقے کے مطابق کچھ الفاظ اختیار کر رکھے ہیں۔ مثلاً دو انگریز جب آپس میں ملتے ہیں تو وقت کے حوالے سے ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں۔ صبح کو Good Morning کہیں گے دوپہر کو Good Noon، سہ پہر کو Good Afternoon شام کو Good Evening اور رات کو

Marfat.com

Good Night۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وقت کے بدلنے سے ان کا دعائیہ کلمہ بھی بدل جاتا ہے۔ یہی حال عربوں کا بھی تھا۔ وہ عام طور پر دعائیہ کلمہ "حيَّاكَ اللّٰه" سلام کے طور پر استعمال کرتے۔ کبھی "اَنْعَمَ اللّٰهُ بِكَ عَيْنًا" کہتے۔ کبھی "انعم صباحا" کہتے اور کبھی "انعم مساء"۔ یعنی ان کے سلام بھی صبح و شام کے فرق سے بدلتے رہتے۔ ہندوؤں میں آپ دیکھیں گے ان کے عام لوگ ''نمستے'' کہتے ہیں اور ان کے زیادہ مذہبی لوگ دوسرے سے ملتے ہوئے ''رام رام'' کہتے ہیں۔ ان مثالوں میں آپ نے دیکھا کہ ہر قوم نے باہمی تعارف اور آپس میں موانست کے اظہار کے لیے سلام کے کچھ طریقے مقرر کر رکھے ہیں جن میں دو چیزیں بڑی نمایاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ باہمی ملاقات کے وقت وہ ایک دوسرے کو دعا دیتے ہیں۔ لیکن یہ دعا وقت کے ساتھ خاص ہوتی ہے۔ اس لیے وقت بدلنے سے دعا بھی بدل جاتی ہے۔ اور دوسری یہ بات کہ بعض قوموں نے اسے اپنے مذہب کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے وہ ملاقات کے وقت اپنے مذہب کی کسی بنیادی بات کا حوالہ دیتے ہیں۔ جس سے تعارف یا موانست میں شاید کوئی مدد ملتی ہے یا نہیں ملتی البتہ مذہب کا اظہار ضرور ہو جاتا ہے۔ لیکن اسلام نے سلام کے جس طریقے کو متعارف کرایا اور مسلمانوں پر اسے لازم کیا وہ صرف ملاقات کا ہی ذریعہ نہیں بلکہ اس میں اتنی وسعت اور جامعیت پائی جاتی ہے کہ جس کا عام قوموں میں دور دور تک تصور نہیں پایا جاتا۔ اس میں بیک وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر بھی ہے، تذکیر بھی، مسلمان بھائی سے اظہارِ تعلق بھی ہے اور اس کے لیے دعا اور ضمانت بھی۔ ان تمام حوالوں سے جب ہم سلام کو دیکھتے ہیں تو اس کی جامعیت کو دیکھتے ہوئے حیرت ہونے لگتی ہے۔ اب ہم اس کی وضاحت کے لیے چند باتیں عرض کرتے ہیں۔

سلام کا مفہوم اور اس کی جامعیت

۱۔ سلام اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔ جب آدمی کسی کو سلام کہتا ہے تو وہ گویا السلام کا لفظ بول کر اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ اور اگر وہ اس کی معنویت پر غور کرے تو اس کے احساس میں مزید وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ اللہ کا ذکر آدمی میں تذکیر کا کام بھی کرتا ہے۔ یعنی اسے یاد دلاتا ہے کہ تم اللہ کے بندے ہو خودرَو یا آزاد مخلوق نہیں ہو۔ اللہ کی طرف سے جس طرح تم پر اس کے حقوق عائد کیے گئے ہیں اسی طرح بندوں کے حقوق بھی عائد کیے گئے ہیں دیکھو اللہ کا نام لے

Marfat.com

کر جب تم کسی بندے سے ہمکلام ہوتے ہو تو حقوق اللہ اور حقوق العباد کو مجروح نہ ہونے دینا۔ اور مزید یہ کہ تم اس کی معنویت پر غور کرو تو تمھیں اندازہ ہوگا کہ تم نے السلام کا لفظ بول کر کتنی بڑی ذمہ داری قبول کی ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن میں ذکر کیا ہے کہ "السلام علیکم کے معنی ہیں "الله رقیب علیکم" (اللہ تعالیٰ تمھارا محافظ ہے) جب تم نے اسے اللہ کے محافظ ہونے کی خبر دی تو پھر اگر تمھاری طرف سے اسے کوئی بھی نقصان پہنچا یا تمھاری نیت میں اس کے حوالے سے کوئی بھی فساد پیدا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اللہ کی حفاظت کو چیلنج کیا ہے۔ اس صورت میں یہ معاملہ تمھارے اور دوسرے آدمی کے درمیان نہیں رہے گا بلکہ تمھارے اور اللہ کے درمیان ہوگا۔ تم جیسے جیسے اس کی حفاظت کے حصار کو توڑو گے ویسے ویسے تم خود غیر محفوظ ہوتے جاؤ گے۔ اس لحاظ سے آپ دیکھیں کہ السلام علیکم کہہ کر آدمی کتنی بڑی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ ایک طرف اللہ کو یاد کرتا ہے اور دوسری طرف اس کے حوالے سے اپنے ملنے والے کو اپنی پناہ میں لے لیتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے مسلمان کی تعریف یہ فرمائی "المسلم من سلم المسلمون من لسانہ و یدہ" (مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں) ابن العربی نے احکام القرآن میں امام ابن عیینہ کا یہ قول نقل کیا ہے "أتدری ماالسلام؟ یقول انت آمن منی" (تم جانتے ہو کہ سلام کیا چیز ہے؟ سلام کہنے والا یہ کہتا ہے کہ تم مجھ سے مامون ہو) یعنی میں تمھیں ضمانت دیتا ہوں کہ میری طرف سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ حتی المقدور میں تمھاری حفاظت کروں گا۔

۲۔ سلام دو مسلمانوں کے درمیان اظہارِ تعارف بھی ہے۔ جب ایک مسلمان دوسرے کو السلام علیکم کہتا ہے تو وہ دراصل ایک علامت کا اظہار کرتا ہے جس سے مراد یہ ہے کہ میں مسلمان ہوں اور میرا تعلق امت مسلمہ سے ہے۔ اور جب دوسرا مسلمان وعلیکم السلام کہتا ہے تو وہ درحقیقت اس کے سلام کو قبول کر کے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح سے دونوں یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم دونوں ایک ہی امت سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارا خدا، ہمارا رسول اور ہمارا دین ایک ہے۔ ہمارے حسن و قبح کے معیارات ایک ہیں۔ ہمارے تحفظات یکساں ہیں۔ ہمارے مقاصد میں ہم آہنگی ہے۔ ہماری اجتماعی مصلحتیں یکساں ہیں۔ اس ایک لفظ سے یکسانیت اور وحدت کے تمام حوالے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ان دونوں کے درمیان سے اجنبیت کے تمام پردے اٹھ جاتے ہیں۔ وہ دشمن کے دیس میں ہوں تو محسوس کرتے ہیں کہ

Marfat.com

ہمیں ایک محفوظ پناہ مل گئی ہے اور اگر اپنوں میں ہوں تو محبت کا زمزم بہنے لگتا ہے۔

۳۔ السلام کا لفظ دعا بھی ہے۔ اور اس دعا میں بڑی وسعت ہے۔ جب ایک آدمی دوسرے کو سلام کہتا ہے تو وہ اس کے لیے دنیا و آخرت کی بھلائی کی دعا مانگتا ہے۔ اسے دنیا میں ہر دکھ اور ہر تکلیف سے محفوظ دیکھنا چاہتا ہے اور آخرت میں اسے جہنم کے عذاب سے بچانا چاہتا ہے۔ اس کی دعا صبح و شام میں محدود نہیں ہوتی بلکہ پوری زندگی پر محیط ہوتی ہے اور پھر دنیا سے آگے بڑھ کر آخرت کی بھلائیوں تک دراز ہو جاتی ہے۔ انہی تینوں حوالوں سے پروردگار نے سلام کو مسلمانوں کے لیے نہ صرف علامت بنایا بلکہ اس کو عبادت کا درجہ بھی دیا اور اسی کو ایک دوسرے کی حفاظت کی ضمانت بنا دیا اور اس کے عام کرنے اور اس کو رواج دینے کے لیے اس کی انتہائی تاکید فرمائی اور فضائل بیان فرمائے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''تم جنت میں اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتے جب تک مومن نہ ہو اور تمھارا ایمان مکمل نہیں ہو سکتا جب تک آپس میں ایک دوسرے سے محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی چیز بتاتا ہوں کہ اگر تم اس پر عمل کر لو تو تم میں آپس میں محبت قائم ہو جائے گی۔ وہ یہ ہے کہ آپس میں سلام کو عام کرو، ہر مسلمان کو سلام کرو خواہ اس سے جان پہچان ہو یا نہ ہو۔''

سلام کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے اس پر نیکیوں کی عطا و بخشش کا ذکر بھی فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عن ابی امامة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم ان اولیٰ الناس بالله من بدأ بالسلام۔

(حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں میں اللہ کے قرب اور اس کی رحمت کا زیادہ مستحق وہ بندہ ہے جو سلام کرنے میں پہل کرے)

ایک دوسری حدیث میں جو حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"البادئ بالسلام بریٔ من الکبر۔

(سلام میں پہل کرنے والا تکبر سے بری ہے۔)

سلام کو مزید موثر بنانے اور مسلمانوں کو رحمتوں سے نوازنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس میں مزید دعاؤں کا اضافہ فرمایا اور اس پر مزید اجر و ثواب کی امید دلائی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم

Marfat.com

نے اپنے عمل سے مسلمانوں کے دل و دماغ میں اسے راسخ فرمایا۔ عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا ''السلام علیکم'' آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا پھر وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''دس'' (یعنی اس بندے کے لیے اس کے سلام کی وجہ سے دس نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک اور آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ'' آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ پھر وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''بیس'' (یعنی اس کے لیے بیس نیکیاں لکھی گئیں) پھر ایک تیسرا آدمی آیا اس نے کہا ''السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ'' آپ ﷺ نے اس کے سلام کا جواب دیا اور وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا ''تیس'' (یعنی اس کے لیے تیس نیکیاں ثابت ہو گئیں) اندازہ فرمایئے کہ جیسے جیسے ایک آدمی اپنے دوسرے بھائی کے لیے دعاؤں میں اضافہ کرتا جاتا ہے ویسے ویسے اس کی اپنی نیکیوں میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی تاکید و ترغیب کا نتیجہ تھا کہ صحابہ میں سلام صرف ایک علامت بن کر نہیں رہ گیا تھا بلکہ وہ اسے نیکیوں کے حصول کا ذریعہ سمجھ کر زیادہ سے زیادہ سلام کہتے اور سلام سنتے تھے۔'' امام مالک رحمہ اللہ نے ابیُ ابن کعب رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے طفیل کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ میں حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا تھا۔ ان کا طریقہ تھا کہ وہ ہمیں ساتھ لے کر بازار جاتے تھے اور جس دکان اور جس کباڑیے اور جس فقیر و مسکین کے پاس سے گزرتے اس کو بس سلام کرتے اور کچھ خرید و فروخت کیے بغیر واپس آ جاتے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو معمول کے مطابق مجھے ساتھ لے کر بازار جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ آپ بازار جا کر کیا کریں گے؟ نہ تو آپ کسی دکان پر کھڑے ہوتے ہیں نہ کسی چیز کا سودا کرتے ہیں، نہ بھاؤ ہی کی بات کرتے ہیں اور بازار کی مجلسوں میں بھی نہیں بیٹھتے (پھر آپ بازار کس لیے جاتے ہیں؟) یہیں بیٹھیے باتیں ہوں اور ہم استفادہ کریں۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ ہم تو صرف اس غرض اور اس نیت سے بازار جاتے ہیں کہ جو سامنے پڑے اس کو سلام کریں (اور ہر سلام پر کم از کم دس نیکیاں کما کر اللہ کی رحمتیں اور بندگانِ خدا کے جوابی سلاموں کی برکتیں حاصل کریں)

یہاں ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ متذکرہ بالا حدیث میں آپ نے دیکھا کہ دعاؤں کے اضافے سے اجر و ثواب میں اضافہ ہوتا جاتا ہے لیکن ان دعاؤں میں اضافہ صرف تین کی حد تک محدود ہے یعنی وبرکاتہ تک۔ مزید اضافے کی حضور ﷺ نے اجازت

Marfat.com

نہیں دی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے عمل سے مزید اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ جب کسی نے ان کے سامنے تین دعاؤں پر اضافہ کرنے کی کوشش کی تو آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

ان السلام قد انتھی من البرکۃ۔

(سلام لفظ برکتہ پر ختم ہو جاتا ہے اس سے زیادہ کہنا مسنون نہیں)

سلام کا موقع بجائے خود اس کا تقاضا کرتا ہے کہ سلام مختصر ہونا چاہیے۔ اس میں اتنی زیادتی مناسب نہیں جو کسی کام میں مخل ہو یا سننے والے پر بوجھ بن جائے۔

جس طرح ملاقات کے وقت سلام کہنا سنت اور اس کا جواب دینا واجب ہے اور یہ مسلمانوں کے طرزِ معاشرت اور ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے اسی طرح سلام کو آنحضرت ﷺ نے بعض دوسرے مواقع کے لیے بھی مسنون بنایا ہے۔ اب ہم ایک ترتیب سے ان مواقع کا ذکر کرتے ہیں:

سلام ملاقات کے علاوہ دوسرے مقاصد کے لیے بھی

۱۔ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

یا بنی اذا دخلت علی اھلك فسلم یکون برکۃ علیك و علی اھل بیتك۔

(بیٹا جب تم اپنے گھر والوں کے پاس جاؤ تو سلام کرو یہ تمھارے لیے باعث برکت ہوگا اور تمھارے گھر والوں کے لیے)

ایک دوسری حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب گھر سے جانے لگو تو سلام کر کے نکلو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کے آداب میں یہ بھی ایک ادب ہے کہ اہل خانہ کو سلام کرو۔ اور بعض احادیث سے ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ سلام کہنے اور دعا کرنے سے گھر بہت سی آفات سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ اور جنات اس گھر میں بسیرا نہیں کر سکتے۔

۲۔ آنحضرت ﷺ نے یہ ہدایت بھی فرمائی کہ جب کسی سے ملاقات کے لیے اس کے گھر یا کسی مجلس میں جانا پڑے تو پہلے سلام کہو اور اجازت مانگو۔ سلام اور اجازت کے بغیر گھر میں داخل ہونا یا مجلس میں جا کر بیٹھ جانا آنحضرت ﷺ کے بتائے ہوئے آداب کے خلاف

Marfat.com

ہے۔کوئی آدمی چاہے گھر میں اکیلا رہتا ہو بغیر سلام اور اجازت کے گھر میں داخل ہونا اس کے لیے اذیت کا باعث ہو سکتا ہے۔ممکن ہے وہ اس وقت مناسب حالت میں نہ ہو یا اس کی مصروفیت ملنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔اس لیے حضور ﷺ نے استیذان کی پابندی کے ساتھ ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ''تین دفعہ سلام کرو اگر جواب نہ آئے تو واپس پلٹ جاؤ اور برا نہ مانو۔'' اور یہ سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا بعض مواقع پر حضور ﷺ نے اس کی نہایت تاکید فرمائی ہے اور جب کسی نے اس میں تساہل برتا تو آپ ﷺ نے اسے باہر بھیج دیا کہ دوبارہ اجازت لے کر اندر آؤ۔ فتح مکہ کے بعد حضور وادی مکہ کے بالائی حصے میں ٹھہرے ہوئے تھے کلدہ بن حنبل کہتے ہیں کہ میں صفوان بن امیہ کی جانب سے چند تحائف لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں سلام کہے اور اجازت لیے بغیر اندر داخل ہو گیا اور آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ آپ ﷺ نے فرمایا تم واپس جاؤ اور قاعدہ کے مطابق "السلام علیکم أ ادخل" کہہ کے اجازت مانگو۔کلدہ چونکہ ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے انھیں ان آداب سے آگاہی نہیں تھی اس لیے وہ حسب سابق اجازت طلب کیے بغیر حضور ﷺ کے پاس پہنچ گئے لیکن آپ ﷺ نے انھیں باہر بھیج دیا اور سلام اور اجازت کے بعد اندر داخل ہونے کا حکم دیا۔اسی مضمون کی اور بھی متعدد احادیث ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لیے سلام کہنا اور اجازت طلب کرنا مسلمانوں کی ثقافت کے بنیادی عناصر میں سے تھا اور جب کسی نے اس پر عمل میں کوتاہی کی تو آپ ﷺ نے اس پر تنبیہ فرمائی۔لیکن آج یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان معاشرے میں نیچے سے لیکر اوپر تک ان آداب سے لاپرواہی برتی جاتی ہے۔

سلام کے لیے کچھ ضوابط

۳۔ سلام کہنے کے کچھ آداب اور ضابطے بھی حضور ﷺ نے تعلیم فرمائے ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ سلام صرف ملاقات کا ذریعہ ہی نہیں' بلکہ تربیت کا ذریعہ بھی ہے۔ انسان کی بہت بڑی کمزوری جو اسے بہت سی نیکیوں سے محروم کر دیتی ہے وہ ''کبر'' ہے۔جیسے ہی طبیعت میں غرور اور نخوت کا فساد پیدا ہوتا ہے انسانیت کا احترام' انسانی اقدار کا احترام' اخلاقِ حمیدہ کا احترام اور ہمدردی' خیر خواہی' محبت اور مؤدت کے جذبات سلب ہونے لگتے ہیں۔آدمی اپنے ذات کے گنبد میں اسیر ہو کر رہ جاتا ہے۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا ''جس کے

Marfat.com

دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکے گا۔'' ہر مسلمان کو سلام کہنا اور پھر سلام میں پہل کرنا تکبر کی لعنت کو ختم کر دیتا ہے۔ اس لیے آپ ﷺ نے سلام کے آداب میں یہ بات شامل فرمائی کہ چھوٹا بڑے کو سلام کہے۔ کیونکہ یہ احترام اور اخلاق کا تقاضا ہے۔ اور جب چھوٹا بڑے کو سلام نہیں کہتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں غیر معمولی تکبر داخل ہو گیا ہے۔ مزید فرمایا کہ گزرنے والا بیٹھنے والے کو سلام کرے۔ تاکہ وہ فٹ پاتھوں پر بیٹھنے والوں کو حقیر نہ سمجھے۔ سواری پر سوار پیدل چلنے والے کو سلام کہے بشرطیکہ سواری ایسی ہو جس سے سلام کہا جا سکتا ہو۔ اس سے سوار اور سواری سے محروم لوگوں میں فرق ختم ہو جاتا ہے۔ تحقیر کے جذبات بھی مٹ جاتے ہیں اور حسد کو بھی اپنی جگہ بنانے کا موقع نہیں ملتا۔ اسی طرح چھوٹی جماعت بڑی جماعت والوں کو سلام کرے۔ کیونکہ تھوڑے لوگوں کو بڑے لوگوں کی نسبت سلام کرنے میں آسانی ہے۔

انہی آداب میں یہ بھی واضح فرمایا کہ سلام کہنا ایک بہت بڑی نیکی ہے لیکن بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں جس میں سلام کہنا مناسب نہیں ہوتا۔ تو ایسے وقت میں سلام کہنے کی اجازت نہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اگر پیشاب یا استنجا کر رہا ہو تو اسے سلام نہیں کہنا چاہیے اور اگر کوئی یہ غلطی کر گزرے تو پیشاب کرنے والے کے لیے اجازت نہیں کہ وہ اس کا جواب دے۔ کیونکہ سلام اللہ کے ناموں میں سے ایک ہے' اسے کسی ایسی جگہ استعمال کرنا جو احترام یا پاکیزگی کی جگہ نہیں وہ اس کی توہین کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح سونے والے کو سلام نہیں کہنا چاہیے تاکہ اس کی نیند نہ کھلے۔ اور اگر وہاں کچھ بیدار لوگ بھی بیٹھے ہیں تو پھر آنحضرت ﷺ کی سنت یہ ہے کہ اس طرح ہلکی آواز میں سلام کہا جائے کہ جاگنے والے سن لیں اور سونے والے کی نیند خراب نہ ہو۔ کسی نماز پڑھتے ہوئے آدمی کو سلام نہ کہا جائے اور اگر کوئی دوسرے لوگ پاس بیٹھے ہوں تو نہایت ہلکی آواز میں سلام کہا جائے۔ کسی اسلامی موضوع پر کوئی درس یا تقریر ہو رہی ہو تو سلام کہنا مناسب نہیں۔ کوئی قرآنِ کریم پڑھ رہا ہو تو سلام کہا جا سکتا ہے اور پڑھنے والا جواب بھی دے سکتا ہے لیکن اگر وہ قرآنِ پاک میں تدبر اور تفکر میں مستغرق ہو تو پھر اسے ہرگز سلام نہیں کہنا چاہیے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص لائبریری میں جائے تو ہلکی آواز میں سلام کہے جس سے پڑھنے والوں کو تکلیف نہ ہو۔ مختصر یہ کہ عبادت یا تعلیم میں مصروف یا نیند اور آرام میں مستغرق یا کسی اور اچھی مصروفیت میں کھو

Marfat.com

جانے والوں کو سلام کے ذریعے سے پریشان کرنے سے روکا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ جب گھر میں داخل ہوتے اور اگر آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ سو رہی ہوتیں تو آپ ﷺ نہایت ہلکی آواز میں سلام کہتے تاکہ سلام سے گھر میں برکت تو پیدا ہو لیکن سونے والوں کی نیند نہ کھلے۔

حاصل کلام یہ کہ سلام مسلمانوں کی پہچان، باہمی محبت اور موانست کا ذریعہ، مسلمان بھائی کی دوسرے بھائی کے لیے دعا اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے مسلمانوں کے درمیان ہم آہنگی کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس نے مسلمانوں کی تہذیب اور ثقافت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی تکمیل اگرچہ مصافحہ سے ہوتی ہے اور اس میں مزید گہرائی بعض مواقع پر معانقہ اور تقبیل سے وجود میں آتی ہے۔ لیکن ہم اس کی تفصیلات عرض کرنے سے قاصر ہیں ورنہ یہ بحث بہت دور تک پھیل جائے گی۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Marfat.com

26- بحیثیت امت مسلمہ ہماری اصل ذمہ داری

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِالْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا﴾

''اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے بنو اللہ کے لیے اس کی شہادت دیتے ہوئے اگرچہ یہ شہادت تمھارے اپنے نفسوں کے خلاف ہو یا تمھارے والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہو، کوئی امیر ہو یا غریب اللہ ہی دونوں کا سب سے زیادہ خیر خواہ ہے، پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ، اور اگر تم ہیر پھیر کرو یا منہ موڑو تو بے شک اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔'' (النسآء:۱۳۵)

مسلمانو! تم انصاف کے علمبردار بن کر کھڑے ہو جاؤ جس طرح تم اللہ کے فرمانبردار بندے بن کر صرف اسی کے سامنے جھکتے ہو اسی طرح تمھارا کام انصاف کی علمبرداری بھی ہے۔ تم اللہ کے سامنے جتنا جھکو گے اللہ تمھیں اتنا ہی سر بلند کرے گا اور تمھاری یہ سر بلندی انصاف کو دنیا میں عام کرنے کے لیے ہوگی اور یہ انصاف کو عام کرنا " لِلّٰہِ شُھَدَآءَ " اللہ کے گواہ کی حیثیت سے ہوگا کیونکہ اللہ نے ہمیں عدل کی حکمرانی کے لیے چنا ہے۔ ہم جب انصاف عام کریں گے تو گویا اللہ کی صفتِ (عدل) کی گواہی دیں گے اور یہ گواہی دیتے ہوئے اگر کبھی ہمیں سر کٹوانے تک بھی جانا پڑے تو ہم اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے اور اگر کریں گے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اس تعلق کو

Marfat.com

نبھانے کی پوزیشن میں نہیں یا نبھانا نہیں چاہتے۔ اقبال نے اس کو بڑی خوبصورت تعبیر دی ہے۔

مقامِ بندگی دیگر' مقامِ عاشقی دیگر
ز نوری سجدہ می خواہی' ز خاکی بیش ازاں خواہی

بندگی کا مقام فرشتوں کو ملا ہے اور ہم نمازیں پڑھتے ہوئے اس پر عمل کرتے ہیں۔ بندے ہم بھی ہیں' لیکن صرف بندے نہیں' ہم اجتماعی زندگی میں کچھ اور بھی ہیں۔ لیکن فرشتے صرف بندے ہیں' وہ بندگی سے انحراف کر ہی نہیں سکتے۔ ان کی کوئی اجتماعی زندگی نہیں ہے بلکہ جہاں جہاں' جس جس فرشتے کو جس عمل پر لگا دیا گیا ہے وہ صرف وہی کام کر رہا ہے' اگر وہ قیام میں ہے تو قیام میں ہی اس کی ساری زندگی گزرے گی' اگر قعود میں ہے تو قعود میں ہی اس کی ساری زندگی کٹے گی اور کسی دوسری ڈیوٹی پر ہے تو وہ تمام عمر وہیں پر لگا رہے گا۔ لیکن یہ دیکھنا کہ مجھے اجتماعی زندگی کا حصہ بن کر کیا کرنا ہے؟ کہا: تمھارا ایک مقام تو بندگی کا ہے اور دوسرا مقام یہ ہے کہ تم صرف بندے ہی نہیں ہو بلکہ تم اللہ سے عشق کا دعویٰ بھی کرتے ہو۔ لہٰذا فرشتوں سے اللہ صرف یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کی بندگی کریں' مگر تم سے اللہ کچھ اور بھی چاہتا ہے۔ مسلمانوں سے اللہ کے اس تقاضے کو اقبال یوں بیان کرتا ہے کہ:

ازاں خود را نگہ داری کہ با ایں بے نیازی ہا شہادت بر وجودِ خود ز خونِ دوستاں خواہی

کہا: وہ اپنی ساری بے نیازیوں کے باوجود چاہتا یہ ہے کہ جو اس کے دوست اور نام لیوا ہیں' جنھوں نے اس کا دین قبول کیا ہے اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہہ کر اپنا نام اس کے دوستوں کی فہرست میں لکھوالیا ہے' جو اپنے آپ کو مومن اور مسلم کہتے ہیں' ان سے اس کا تقاضا یہ ہے کہ یہ جو اب تک میرا نام لے کر مجھے یاد کرتے رہے ہیں اور لوگوں کو بتاتے رہے ہیں کہ اللہ ہے' اب میں انھیں یہ کہتا ہوں کہ اگر تمھیں خون کا آخری قطرہ بہا کر بھی یہ ثابت کرنا پڑے کہ اللہ ہے' تو تمھیں اس سے بھی دریغ نہیں کرنا۔ نوریوں سے اس کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ تم خون کا آخری قطرہ بہا ڈالو اور تم اس راستے میں اپنی جانیں دو بلکہ اس کا یہ تقاضہ خاکیوں سے ہے کہ تم سے میرا تعلق صرف آقا اور ملازم کی حد تک نہیں' اگر میرے دین کی بالا دستی کے لیے تمھیں کبھی تصادم کی حد تک بھی جانا پڑے' جس میں تمھیں اپنی جان دینی' سر کٹوانا پڑ جائے تو اللہ اس کا مطالبہ اپنے عاشقوں سے کرتا ہے کہ وہ میرے عشق میں اپنی جانوں کے نذرانے دیں۔ تو ہم سے بھی اس بات کا مطالبہ اس وقت ہو گا جب ہم دنیا میں عدل کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے

Marfat.com

اٹھیں گے۔ کہا: تمھارا کام یہ ہے کہ تم اللہ کے گواہ بن کر انصاف کی علمبرداری کے لیے اٹھو۔ تم خود تو بے انصافی کیا کرو گے' کہیں اور بھی بے انصافی کی اجازت ہرگز مت دینا۔ اگر دنیا میں کہیں بے انصافی ہوتی ہے اور تم بے انصافی کرنے والوں کے معین بن جاتے ہو تو اسکا مطلب یہ ہے کہ تم نے جو عہد کیا تھا' تم اس پر قائم نہ رہے۔ تم تو سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا بھی انکار کر رہے ہو چہ جائیکہ کہ تم عدل کی حکمرانی کے لیے اپنا فرض انجام دو۔

اس میں پہلی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ایک دوسرے پیرائے میں کہی گئی ہے' وہاں فرمایا تھا: "يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ" (النساء: 135) مسلمانو! تمھیں انصاف کا گواہ بن کر اٹھنا ہے اور انصاف کی علمبرداری قائم کرنی ہے۔ اس سلسلے میں یہ ہوسکتا ہے کہ جب تم انصاف کی گواہی دینے کے لیے اٹھو تو یہ تمھاری اپنی برادریوں اور خود تمھارے یا تمھارے والدین کے خلاف ہو۔ ہوسکتا ہے تمھارے اقرباء کے خلاف ہو' لیکن تمھیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ عدل اور انصاف کیا ہے؟ بات جس کے بھی خلاف جائے' تمھیں فیصلہ وہی کرنا ہے جو اسلام چاہتا ہے۔

دو چیزیں سب سے زیادہ عدل وانصاف کے راستے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ 1- اپنوں کے رشتے اور 2- دوسروں کی دشمنی۔ فرمایا: اگر اپنوں کے رشتے بھی راستے میں رکاوٹ بنیں تو دیکھنا! اس کی پرواہ نہیں کرنا' اگرچہ تم خود بھی اس کا ہدف کیوں نہ ہو' چاہے اس کی ضرب اپنے پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ جیسے آنحضرت ﷺ نے فاطمہ بنت قیس کے مقدمے میں فرمایا تھا' جس کی سفارش کی گئی تھی کہ یہ قیس کی نوجوان لڑکی ہے' آپ اسے چھوڑ دیں۔ اس پر حضور اکرم ﷺ نے برہم ہو کر فرمایا تھا کہ یہ تو فاطمہ بنت قیس ہے' اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔ اس لیے قرآن کریم یہ کہتا ہے: "وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ" چاہے ضرب تمھارے اپنے آپ پر' اپنے والدین پر اور اپنے عزیزوں پر کیوں نہ پڑتی ہو' تمھیں بہرحال انصاف کو نافذ کرنا ہے۔ اسی طرح اگر تم انصاف کے لیے اٹھتے ہو اور دیکھتے ہو کہ انصاف کا فائدہ میرے دشمن کو پہنچ رہا ہے' اب بھی تم انصاف کو بروئے کار لاؤ گے' چاہے دشمن کو فائدہ ہو اور تمھارے اپنوں کو نقصان پہنچے۔ یہاں فرمایا: مسلمانو! عدل کے قائم کرنے والے' اللہ کے گواہ بن کر اٹھو' یعنی تم خدائی فوجدار بن کر اٹھو کیونکہ یہ تمھارا اپنا کام نہیں بلکہ اللہ کا کام ہے۔

Marfat.com

کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو اس فریضۂ منصبی کا احساس دلایا جا رہا ہے جس پر بنی اسرائیل کی معزولی کے بعد انھیں فائز کیا گیا۔

"قَوَّامٌ" مبالغہ کا صیغہ ہے۔ "قِسْطٌ" عدل اور انصاف کو کہتے ہیں۔ یعنی صاحب حق کو ٹھیک ٹھیک اس کا حق ادا کرنا۔ اس لحاظ سے اس آیت کریمہ کے پہلے جملے کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مضبوطی سے انصاف پر قائم رہنے والے بنو۔ اور دوسرا معنی یہ کہ تم دنیا میں انصاف کے علمبردار بنو۔ اگر پہلا معنی کریں تو پھر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ معاملہ یتیموں کا ہو یا بیوگان کا' بیوی کا ہو یا کسی اور کا' مسلمانوں کو ہر صورت میں انصاف کا ترازو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے دین نے ان کی پہچان ہی یہ قائم کی ہے کہ وہ کسی معاملے اور کسی حالت میں بھی ناانصافی کبھی نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ انصاف کو مستحکم کرنے یا کسی صاحب حق کا حق دلوانے کے لیے انھیں گواہی دینے کی بھی ضرورت پڑے تو وہ یہ سمجھ کر گواہی دیتے ہیں کہ ہم یہ گواہی کسی شخص کے لیے نہیں' بلکہ اللہ کے لیے دے رہے ہیں۔ وہ ہماری گواہی کے ایک ایک لفظ کو سن رہا ہے' گواہی کے پیچھے مخفی جذبے کو جانتا ہے اور ہماری صحیح یا غلط گواہی پر قیامت کے دن ہمارے انجام کا فیصلہ ہوگا۔ اس لیے وہ کبھی بھی غلط گواہی دینے کی جرأت نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ اگر ان کی گواہی یا انصاف کا قیام ان کی اپنی ذات کے لیے نقصان کا باعث بنے یا اس کی زد والدین یا قریبی عزیزوں پر پڑے دوسرا فریق چاہے امیر ہو یا غریب وہ کسی حال میں بھی انصاف سے سرِمو انحراف نہیں کرتے اور کبھی گواہی میں جانبداری یا جھوٹ بولنے کا تصور نہیں کر سکتے۔ اس رویے کو مسلمانوں کی شناخت قرار دے کر مزید اس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

اور اگر ترجمہ دوسرا کیا جائے تو پھر اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہاں قسط سے مراد حق و عدل کی وہ میزان ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی شکل میں عطا فرمائی ہے۔ مسلمانوں کو اس کا ذمہ دار بنایا جا رہا ہے کہ ان کا کوئی قول یا عمل اس میزان سے ہٹا ہوا نہیں ہونا چاہیے۔ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اسی حق کی میزان کو جاری و ساری اور قائم و نافذ کرنے کے پابند ہیں۔ انفرادی زندگی پر بھی اسی کا غلبہ ہو اور اجتماعی زندگی پر بھی یہی حکمران ہو۔ اور پھر اسی پر بس نہیں کہ انھیں اپنی زندگیوں میں اس کتاب سے رہنمائی لینا ہے اور اسے وہ حاکمانہ حیثیت دینی

Marfat.com

ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں کا کوئی معاشرہ اس سے انحراف نہ کر سکے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ذمہ داری ہے کہ مسلمانوں سے جہاں تک ممکن ہو سکے وہ اللہ کی اس کتاب' اس دین اور اس میزان کے حق ہونے کی گواہی دیں۔ غیر مسلموں کے سامنے علمی دلائل اور اپنے اجتماعی رویے سے ثابت کر دیں کہ حقوق و معاملات میں اگر کوئی چیز انسانوں کو عدل اور انصاف پر قائم رکھتی ہے اور انسانی معاشرہ جس کی وجہ سے آسودہ زندگی گزارتا ہے اور لوگ ایک دوسرے سے دکھی ہونے اور الجھنے کے بجائے ایک دوسرے کے ہمدرد و غمگسار بن جاتے ہیں اور جرائم کا بیج تک ان کے معاشرے اور سماج میں مارا جاتا ہے تو وہ یہی کتاب اور میزانِ حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ حق و باطل کے اس میزان کو انفرادی و اجتماعی عمل کی شکل میں اگلی نسلوں تک منتقل کریں تاکہ جب ان کے پاس اللہ کے نبی کی دعوت' اس کا اسوہ اور اللہ کی کتاب پہنچے تو وہ اس خلجان میں مبتلا نہ ہوں کہ ممکن ہے آج کے دور میں اس کتاب پر عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ یہ اپنی افادیت کی عمر گزار چکی ہو' آج کی مشکلات اور مسائل کا حل اس کی وسعتوں میں ناپید ہو۔ کیونکہ جب بھی کوئی نظام تھیوری کی شکل میں کسی بھی قوم کے سپرد کیا جاتا ہے وہ اگر اس تھیوری کی صداقت پر ایمان بھی رکھتی ہے تب بھی اس کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں ہمیشہ ششں و پنج میں مبتلا رہتی ہے جب تک کہ اسے عمل کی شکل میں کامیابی سے ہمکنار ہوتے دیکھ نہیں لیتی۔ اس لیے مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس نظامِ حق پر اس طرح مخلصانہ زندگی گزاریں اور اس کے ایک ایک حکم کو انفرادی و اجتماعی زندگی کو اس طرح کامیابی سے ہمکنار کر کے دکھائیں اور زندگی کا ایک ایک شعبہ اس کی رہنمائی میں اس طرح کامیابی سے چلا کر دکھائیں کہ یہ تسلسل و تعامل جب اگلی نسل تک منتقل ہو تو انھیں اس کے قابلِ عمل ہونے میں کوئی شک و شبہ لاحق نہ ہو۔

قانون یا نظام کوئی سا بھی ہو جب تک اس کے چلانے والے ہاتھ مضبوط' غیر جانبدار اور مخلص نہ ہوں اور ان کے اندر اس کے اجراء و تنفیذ کا بے پناہ جذبہ کارفرما نہ ہو اور وہ اس رستے میں پیش آنے والے موانع پر قابو پانے کی ہمت نہ رکھتے ہوں اس وقت تک کوئی سا قانون یا نظام چل نہیں سکتا۔ اس آیتِ کریمہ میں بھی اختصار سے ان رکاوٹوں کو ذکر فرمایا گیا جو بالعموم ناکامی کا سبب بنا کرتی ہیں۔ کسی بھی گواہی اور انصاف کے کسی پہلو کے اجراء میں بھی سب سے پہلی رکاوٹ آدمی کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ وہ حق اور انصاف کے بارے میں بہت

Marfat.com

بلند آہنگ ہوتا ہے۔ لیکن جیسے ہی اس کی زد اس کی اپنی ذات' اس کی اولاد یا اس کے کسی مفاد پر پڑتی نظر آتی ہے تو پھر وہ بچ نکلنے کے راستے تلاش کرتا ہے۔ تاویلیں ڈھونڈی جاتی ہیں' چور دروازے تلاش کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اگر اس انصاف کی زد' والدین یا قریبی رشتہ داروں پر پڑتی ہو تو تب بھی آدمی کا حق پر قائم رہنا مشکل ہو جاتا ہے۔ والدین' قریبی عزیز یا احباب کا دباؤ بعض دفعہ اس قدر خطرناک صورت اختیار کر جاتا ہے کہ آدمی اس کے سامنے بالکل بے بس دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح امیر اور غریب کا فرق بھی ہر معاشرے کے ترازو کو متاثر کرنے کا ایک معمول رکھتا ہے۔ امیر اگر کوئی جرم کرتا ہے تو عموماً قانون مکڑی کا جالا بن جاتا ہے اور اگر غریب پکڑا جاتا ہے تو یہ لوہے کی زنجیر میں ڈھل جاتا ہے۔ اور بعض دفعہ غریبوں کی ناروا ہمدردیاں بھی بہت بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ جس طرح دنیا میں بااثر لوگوں نے ہر سطح پر خرابیاں پیدا کی ہیں اسی طرح کمزور طبقوں کی یونینز نے ہماری قریبی تاریخ میں بڑے بڑے مسائل پیدا کیے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا ہے کہ جب انہی کمزوروں اور مظلوموں کو اقتدار ملتا ہے تو وہ طبقہ امراء سے بھی بڑھ کر ظالم ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ اصل چیز تو اس کلمۂ حق اور میزانِ حق سے وابستگی ہے۔ جس طبقے کا تعلق بھی اس سے ٹوٹ جاتا ہے وہی طبقہ معاشرے کے لیے سوہانِ روح بن جاتا ہے۔ اقبال نے شاید اسی سے متاثر ہو کر کہا ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریقِ کوہ کن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

مقصود صرف یہ ہے کہ کسی طرح بھی ہوائے نفس کی پیروی مت کرو۔ ایسی پیروی جو تمہیں عدل اور انصاف سے منحرف کر دے۔ یہ ہے وہ حکم جو بطورِ خاص حق سے وابستگی کو باقی رکھنے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے۔ کیونکہ اتباع ہواء وہ برائی ہے جس سے باقی ساری برائیاں پھوٹتی ہیں۔ کوئی شخص یا کوئی معاشرہ جب ہوائے نفس کے اتباع میں مبتلا ہو کر حق سے پہلو تہی کرتا ہے تو اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ نظام حق کو جو اس کی کتاب اور پیغمبر کی سنت میں محفوظ ہوتا ہے بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے' ترمیم اور تحریف کا راستہ کھولا جائے' ایسی حرکتیں کی جائیں جس سے اس کی اصل شکل بدل جائے' اس کے بعد یہ مطالبہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے کہ اس حق پر قائم رہا جائے اور اللہ کے لیے اس کی گواہی دی جائے۔

اور دوسری صورت یہ ہے کہ اسے بگاڑنے کی کوشش تو نہ کی جائے' البتہ زندگی کے

Marfat.com

معاملات سے اسے خارج کر دیا جائے۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ مذہب اور دین کا ہمارے دنیوی کاموں سے کیا رشتہ؟ مذہبی معاملات، مذہبی رسوم، پوجا پاٹ اور دعا و مناجات کے طریقے تو مذہب سے لیے جائیں، لیکن نظامِ تعلیم، نظامِ عدالت، اصولِ معاشرت، طریقِ سیاست اور طریقِ حکومت کا مذہب اور دین سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ آج کے دور میں سب سے بڑا افسون جس نے دماغوں کو معطل کر کے رکھ دیا ہے وہ یہی ہے۔ پڑھے لکھے لوگ یکسو ہیں کہ ہم مذہب کی چند رسمیں اور مذہبی تہوار، مذہب کے طریقے کے مطابق مناتے ہیں بس اس کے علاوہ اور کیا چاہیے؟ عیسائیوں کے پاس چونکہ چند رسومِ عبادت کے سوا مذہب کی اور کوئی چیز موجود نہیں تھی اس لیے انھوں نے مذہب کو اجتماعی اداروں سے خارج کرنا اپنی ضرورت بھی سمجھا اور اسی سے انھوں نے مذہب کی اجتماعی گرفت سے نجات حاصل کر لی اور یہی وہ فتنہ ہے جس میں آج پورا عالمِ اسلام گرفتار ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ جس امت مسلمہ کو حق کی گواہ بنا کر نظامِ حق پر قائم رہنے کا حکم دیا گیا تھا اور جس نے یہ روشنی پوری دنیا تک پہنچائی تھی وہ اپنے گھر کا دیا بجھا کر گہری نیند سو رہی ہے اور اسے بالکل احساس نہیں کہ مجھے اللہ نے اتنا عظیم منصب عطا فرمایا تھا اس منصب سے روگردانی کرنے کے بعد ذلت و نکبت میرا مقدر بن کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ اللہ کی قانون کے نفاذ اور میزانِ حق کی پاسداری پر قرآنِ کریم کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ نے اتنا زور دیا تھا اور اپنے عمل سے جس طرح اس کی نزاکتوں کو واضح کیا تھا اس کی ایک مختصر مثال اس ایک واقعے میں ملتی ہے جسے بخاری اور مسلم دونوں نے روایت کیا ہے۔ (جب ایک مخزومیہ عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی۔ لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون ایسا شخص ہو سکتا ہے جو رسول اللہ ﷺ سے اس کی سفارش کرے۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کر سکتے ہیں۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے بڑے چہیتے ہیں۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہ رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے اس کی سفارش کی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ''اسامہ تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملے میں سفارش کرنے آئے ہو؟'' پھر آپ ﷺ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا ''لوگو! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کرتے۔ خدا کی قسم! میں ایسا نہیں کرنے کا۔ میں تو اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔'')

Marfat.com

27- صاحب ایمان لوگوں کو ایمان لانے کے حکم کا مفہوم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَ رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ط وَمَنْ یَّکْفُرْ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًام بَعِیْدًا﴾

(اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری۔ اور جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کا انکار کرے وہ بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔)

(النسآء:۱۳۶)

اس آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کو صاحب ایمان کہہ کر خطاب فرمایا گیا ہے اور اس کے بعد انھیں پھر ایمان لانے کا حکم دیا گیا ہے۔ سرسری نظر میں یہ بات بہت عجیب سے معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ پہلے ہی صاحب ایمان ہیں انھیں دوبارہ ایمان لانے کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی کپڑے پہنے کھڑا ہو اسے یہ کہا جائے کپڑے پہن کے آؤ۔ حقیقت یہ ہے یہاں جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں تعجب یا اجنبیت کی کوئی بات نہیں۔ سب سے پہلے تو لفظی حیثیت سے دیکھیے۔ عربی زبان کا یہ طریقہ ہے کہ فعل کبھی اپنے ابتدائی اور ظاہری معنی میں استعمال ہوتا ہے اور کبھی حقیقی اور کامل معنی میں۔ یہاں "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" میں "اٰمَنُوْا"

Marfat.com

ابتدائی معنی میں استعمال ہوا ہے اور اس کے بعد ''اٰمِنُوْا'' حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

معنوی حیثیت سے اگر آپ دیکھیں تو ایمان کا لفظی معنی تو ہے صرف مان لینا۔ یعنی زبان سے اقرار کر لینا۔ دل کی تصدیق، دماغ کا اطمینان اور عمل کی تائید بے شک اس میں شامل نہ ہو۔ ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول کو مانتا ہوں اور میں مسلمان ہوں۔ تو سننے والا اسے مومن سمجھے گا چاہے اس کے دل و دماغ کی کوئی بھی کیفیت ہو اور خواہ اس نے پوری زندگی اسلام کے مطابق کوئی کام نہ کیا ہو۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے جن میں منافقین بھی شامل ہیں۔ اور یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خطاب صرف منافقین سے ہو۔ وہ چونکہ اپنے آپ کو مومن کہتے تھے اور مسلمانوں میں بڑھ چڑھ کر اپنے ایمان کا یقین بھی دلاتے تھے۔ تو پروردگار نے انھیں خطاب اسی حیثیت سے کیا ہے کہ ''اے وہ لوگو جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہو تم واقعی اگر اپنے دعوے میں مخلص ہو تو پھر اس میں حقیقت بھی پیدا کرنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ محض ایمان کا دعویٰ کرنے سے ایک ایسی صورت وجود میں آجاتی ہے جو حقیقت سے خالی ہے۔ لیکن صورت بے حقیقت کا تو دنیا میں کوئی اعتبار نہیں اللہ کے ہاں کیا اعتبار ہوگا۔ بازار میں پلاسٹک کے بنے ہوئے خوبصورت پھل ملتے ہیں، دیکھنے میں ایسا لگتا ہے جیسے یہ سچ مچ کا کیلا، سیب، انگور یا نارنگی ہے، لیکن نہ اس میں خوشبو، نہ اس میں مزہ، نہ وہ کھانے کے قابل، اس سے بچے کھیل تو سکتے ہیں لیکن کوئی عقلمند آدمی انھیں پھل سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ کھلونوں کی شکل میں درندے نظر آتے ہیں، ہاتھی، چیتے، شیر، بعض دفعہ بچے انھیں دیکھ کے ڈر جاتے ہیں، لیکن سمجھدار آدمی جانتا ہے کہ یہ محض صورتیں ہیں جو حقیقت سے خالی ہیں۔ اسی پر ایمان کو قیاس کر لیجیے۔ ایمان کی ایک حقیقت ہے اور ایک صورت۔ صورت صرف مان لینے کا نام ہے اور حقیقت وہ ہے جو انسان کی شخصیت کو مکمل طور پر تبدیل کر دیتی ہے۔ انسان کی سوچ، رویہ، احساسات، محبت و نفرت کے حوالے، تعلقات کی دنیا، پسند و ناپسند، زندگی کا ایک ایک عمل، غرضیکہ ہر چیز بدل کے رہ جاتی ہے۔ وہ شخص جو صرف ذاتی غم کو جانتا ہے ایمان کی حقیقت آجانے کے بعد وہ اجتماعی غم سے آشنا ہو جاتا ہے۔ اس کی منزل دنیا نہیں آخرت بن جاتی ہے۔ اب وہ دنیا چھن جانے سے نہیں روتا، بلکہ نماز قضا ہونے سے روتا ہے۔ رات کے پچھلے پہر اسے نیند میٹھی معلوم نہیں ہوتی، بلکہ اس کی آنکھوں سے برسنے والی برکھا اس کے دل کا بوجھ ہلکا کرتی ہے۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف آنے کی دعوت دی گئی ہے کہ بے شک زبان سے

Marfat.com

ایمان کا اقرار کر چکے ہو لیکن اگر تم حقیقت میں ایمان سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو پھر ضروری ہے اللہ اس کے رسول، قرآنِ کریم اور پہلی آسمانی کتابوں پر بھی اس طرح ایمان لاؤ جس طرح ایمان لانے کا حق ہے۔ لیکن اگر زبان سے اقرار کے بعد بھی تمھارے اندر اقرار و انکار کی وہی مصنوعی دنیا باقی رہتی ہے تو پھر تم حقیقت میں مومن نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور آخرت کے دن کا انکار کرتا ہے اسے ایمان تو کیا نصیب ہوگا وہ تو بہت دور کی گمراہی میں جا پڑا۔ کیونکہ ایمان اور کفر کے درمیان فرق کرنے والی چیز انہی حقائق کو تسلیم کرنا ہے۔ جس نے ان کا انکار کر دیا اس نے تو تاریک رات میں اپنے ہاتھ کی مشعل توڑ ڈالی۔ اب وہ جیسے جیسے ٹامک ٹوئیاں مارتا ہوا چلے گا ویسے ویسے وہ اپنے راستے سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اس آیت میں ایمان کے جن اجزاء کا ذکر کیا گیا ہے اور کتابوں کے نزول کے لیے ''اَنْزَلَ'' اور ''نَزَّلَ'' دو فعل ذکر کیے گئے ہیں۔ ان تمام باتوں کی تفصیل اس سے پہلے ہم مختلف مقامات پر پڑھ چکے ہیں۔ اس لیے میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھتا۔

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ کَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا کُفْرًا لَّمْ یَکُنِ اللّٰہُ لِیَغْفِرَ لَہُمْ وَلَا لِیَہْدِیَہُمْ سَبِیْلًا﴾

''بے شک جو لوگ ایمان لائے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کی مغفرت فرمانے والا ہے اور نہ ان کو راہ دکھانے والا ہے۔'' (النسآء ۱۳۷)

سابقہ آیت کے اصحاب ایمان کے کردار کی تصویر

اس آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کی تصویر کھینچی گئی ہے جنھیں سابقہ آیت میں ایمان کے دعویٰ کے باوجود حقیقی ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے۔ ان کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کا حال یہ ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے، پھر کفر کیا۔ پھر ایمان لائے پھر کفر کیا۔ پھر کفر میں بڑھتے ہی چلے گئے۔ ہمارے بعض مفسرین نے اس کا ایک مطلب تو یہ لیا ہے کہ اس سے مراد یہود ہیں کہ وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے، پھر بچھڑے کی پوجا کر کے کافر ہو گئے۔ عجل پرستی سے توبہ کر کے پھر مسلمان ہوئے، ان کی نسلیں عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان نہ لا کر پھر کافر ہو گئیں۔ اب رسول اللہ ﷺ پر بظاہر ایمان لا کر اور حقیقت میں کفر کا رویہ اختیار کر کے کفر میں بڑھتی چلی

Marfat.com

جارہی ہیں۔ دشمنی کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتیں۔ لیکن بعض مفسرین اسے منافقین کا ذہنی رویہ قرار دیتے ہیں کہ انھوں نے دین کو ایک غیر سنجیدہ تفریح سمجھ رکھا ہے۔ گویا ایک کھلونا ہے جس سے وہ اپنے تخیلات یا اپنی خواہشات کے مطابق کھیلتے رہتے ہیں۔ جب فضائے دماغی میں ایک لہر اٹھی مسلمان ہو گئے' جب دوسری لہر اٹھی کافر بن گئے یا جب فائدہ مسلمان بن جانے میں نظر آیا مسلمان بن گئے اور جب معبودِ منفعت نے دوسری طرف جلوہ دکھایا تو اس کی پوجا کرنے کے لیے بے تکلف اسی طرف چلے گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے اللہ کے پاس نہ مغفرت ہے نہ ہدایت۔

بعض اہلِ علم نے اسے ذہنی رویہ ہی سمجھا ہے۔ لیکن ان کی تعبیر یہ ہے کہ یہ منافقین ہیں جنھوں نے ایمان وکفر کو ہمیشہ کھیل سمجھا ہے۔ ایک کھیل تو وہ ہے جو تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں۔ اسے مانا بھی اور اسے بگاڑا بھی۔ اور دوسرا کھیل یہ ہے جو وہ اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کرنے کے درپے ہیں۔ انھوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ یہ اب اللہ کی رحمت کے مستحق نہیں رہے۔ اس لیے پروردگار نے فرمایا کہ اللہ نہ تو ان کی مغفرت فرمائے گا اور نہ ان کے لیے ہدایت کا کوئی اور راستہ کھولے گا۔ یہ اسلام دشمنی میں جس طرح بڑھتے جا رہے ہیں ان کی یہی روش بالآخر انھیں جہنم لے جائے گی۔

﴿بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمَا نِ ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَ يُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ اِنَّ اللّٰهَ جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعَا نِ ۝ الَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ قَالُوْا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَنْ يَّجْعَلَ

Marfat.com

اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ﴾

''منافقوں کو مژدہ سناؤ کہ ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے جو کافروں کو دوست بناتے ہیں مسلمانوں کے مقابلے میں۔ یا وہ تلاش کرتے ہیں ان کے پاس عزت؟ تو بے شک عزت سب کی سب اللہ کے لیے ہے۔ اللہ نازل کر چکا ہے تم پر کتاب میں یہ حکم کہ جب تم سنو اللہ کی آیتوں کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو مت بیٹھو ان لوگوں کے ساتھ یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔ ورنہ تم بھی انہی کی طرح ہو گے۔ بے شک اللہ تعالیٰ اکٹھا کرنے والا ہے سب منافقوں اور سب کافروں کو جہنم میں۔ وہ منافق جو انتظار کر رہے ہیں تمھارے لیے گردشوں کا۔ اگر تمھیں اللہ کی طرف سے فتح حاصل ہوتی ہے تو کہتے ہیں کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ اور کافروں کو کوئی جیت ہو جائے تو کہتے ہیں کیا ہم تم پر چھائے نہیں رہے اور ہم نے مسلمانوں سے تم کو بچایا نہیں؟ تو اللہ ہی فیصلہ کرے گا تمھارے درمیان قیامت کے دن اور اللہ کافروں کو مومنوں پر کوئی راہ نہیں دے گا۔'' (النسآء:۱۳۸ تا ۱۴۱)

گزشتہ آیاتِ کریمہ میں جن لوگوں پر تنقید کی گئی اور جنھیں حقیقی ایمان لانے کی دعوت دی گئی پیش نظر آیتِ کریمہ نے واضح کر دیا کہ مراد اس سے منافقین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ اللہ نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ اس کے بعد ان کی علامتیں بیان فرمائی ہیں۔ ہم آج کسی کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ منافق ہے۔ لیکن ان علامتوں کے ذکر نے منافقین کی پہچان آسان کر دی ہے۔ ہم کسی پر منافق ہونے کا فتویٰ نہ بھی دیں جب بھی مسلمان ایسے منافقین کو پہچان کر اپنی صفوں کو درست کر سکتے ہیں۔ اور اجتماعی پالیسیاں بناتے ہوئے اور قومی معاملات کا فیصلہ کرتے ہوئے ایسے لوگوں کے بارے میں ہوشیار اور چوکنا رہ سکتے ہیں۔ جب تک وہ مسلمانوں کے مشترکہ مطالبات کا ساتھ دیں تو انھیں ساتھ لیا جائے لیکن نہایت بیدار مغزی سے ان کی ایک ایک حرکت کا مطالعہ کیا جائے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسے ہوشیار منافق ساتھ چلتے چلتے

Marfat.com

مسلمانوں کی سادگی سے اس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں کہ اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہاتھ کر گئے؟ اور کچھ نہیں تو مسلمانوں کے باہمی فیصلوں اور ان کے اندر کے احساسات سے باخبر ہو کر دشمن کو اپنے دفاعی اقدامات کرنے میں مدد بہم پہنچاتے ہیں۔

منافقین کی پہلی علامت

سب سے پہلی علامت یہ بیان فرمائی گئی کہ تم ایسے منافقین کو دیکھو گے جن کا رجحان اور جن کی دوستیاں مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں یعنی مسلمانوں کے دشمنوں سے ہوتی ہیں۔ جب بھی انھیں موقع ملتا ہے یہ ان کی صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں' بہانے بہانے سے ان سے راہ ورسم پیدا کرتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ کے ہمعصر منافقین زیادہ تر یہود سے تعلقات رکھنے اور بڑھانے کی کوشش کرتے تھے۔ عبداللہ بن ابیؑ نے تو ایک دفعہ صاف کہہ بھی دیا کہ ہم یہود سے تعلقات توڑ کر کسی مصیبت کا شکار نہیں ہونا چاہتے۔ کیونکہ ابھی یہ بات واضح نہیں ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ ممکن ہے مسلمانوں کو غلبہ مل جائے اور ممکن ہے یہود یا مشرکین ان پر غالب آجائیں تو ہم صرف مسلمانوں کے ساتھ نتھی ہو کر اپنا مستقبل مخدوش نہیں بنانا چاہتے۔ بلکہ اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین بظاہر اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن کافروں کی ایسی مجالس میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کے خلاف بکواس کی جاتی ہے اور اللہ کے دین کا تمسخر اڑایا جاتا ہے۔ اور یہ ان کے پاس صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کے ساتھ راہ ورسم کو اپنے لیے عزت کی علامت سمجھتے ہیں۔ وہ چونکہ مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اپنی ایک حیثیت اور ایک اثر رکھتے ہیں۔ اس لیے یہ اپنے آپ کو ان سے وابستہ رکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے بڑے لوگوں کی پناہ لے رکھی ہے۔ عربی زبان میں "عزۃ" کا لفظ ذلت کے متضاد کے طور پر ہی استعمال نہیں ہوتا' بلکہ اس میں عزت کا مفہوم کسی شخص کو ایسی حیثیت کا مالک سمجھنا ہے جب کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ منافقین یہ سمجھتے تھے کہ ہمیں یہ تحفظ انہی کے ساتھ رہ کر حاصل ہو سکتا ہے۔ پروردگار فرماتے ہیں کہ اگر یہ واقعی مومن ہیں تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ عزت' دبدبہ اور غلبہ سراسر اللہ کی ذات کے لیے ہے۔ یہ دولت جسے بھی ملتی ہے اسی کی عطا سے ملتی ہے۔ اور مزید فرمایا کہ ہم اس سے پہلے سورہ الانعام کی آیت نمبر ۶۸ میں یہ حکم نازل کر چکے ہیں کہ ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کا

Marfat.com

جذباتی رشتہ بھی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے ساتھ جڑ جائے۔ اس کی حمیت و غیرت کبھی گوارا نہ کرے کہ کوئی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) اور اس کے دین سے متعلق نازیبا بات کہنے کی جرأت کر سکے۔ اور اگر کوئی ایسی حرکت کرے تو اگر طاقت میسر ہو تو کہنے والی زبان نہیں رہنی چاہیے۔ اور طاقت میسر نہ ہو تو پھر ایمانی غیرت و حمیت کا کم سے کم تقاضا یہ ہے کہ ایسی مجلسوں میں شرکت کا تصور بھی نہ کیا جائے۔ اور اگر کبھی بھول کر ایسی کسی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہو ہی جائے تو یاد آنے پر فوراً اٹھ جائے۔ لیکن اس واضح حکم کے باوجود ان کا رویہ یہ تھا کہ یہ یہود یا دوسرے منافقین کی مجالس میں جاتے' وہاں آنحضرت ﷺ اور قرآن کے بارے میں نامناسب باتیں کہی جاتیں اور مذاق اڑایا جاتا' لیکن ان کے سر پر جوں تک نہ رینگتی۔ اگر ان میں ایمان کی رتی بھی ہوتی تو یہ کبھی ایسی مجالس میں بیٹھنا گوارا نہ کرتے۔ لیکن ان کی ایسی مجالس میں شرکت اور پھر ایسی باتوں کا برداشت کرنا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی زبانوں پر ایمان کا اقرار ضرور موجود ہے' لیکن ان کے دلوں میں بالکل ایمان نہیں۔ اس لیے فرمایا کہ اگر تم یہ سب کچھ سن کر برداشت کرتے ہو تو پھر تم انہی میں سے ہو۔ جیسے وہ اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کے دشمن ہیں تم بھی دشمن ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر زمانہ میں منافقین کی یہی خصوصیت رہی ہے کہ وہ اپنے مومن اور مسلم ہونے کا دعویٰ صرف اس لیے کرتے ہیں تا کہ مسلمان معاشرے سے جو فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں ان میں کمی نہ آنے پائے۔ ورنہ ان کا قلبی رشتہ اور ان کا دماغی رجحان چونکہ مفادات کے تابع ہے اس لیے وقت کی غالب قوت چاہے وہ اسلام اور مسلمانوں کی کیسی ہی بدترین دشمن کیوں نہ ہو یہ ان سے اپنا تعلق عزت اور فخر کی علامت سمجھتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں اور ان کو یہ یقین دلاتے ہیں کہ ہمیں آپ متعصب مسلمان نہ سمجھیں' اسلام سے ہمارا محض نام کا رشتہ ہے' ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تو سب آپ کے ساتھ ہیں۔ اسلام اور کفر کی کشمکش میں آپ دیکھیں گے کہ ہمارا وزن آپ کے پلڑے میں ہوگا۔ ہمیں آپ کا قرب عزیز ہے۔ اس کے لیے ہمیں مسلمانوں کو خون میں بھی نہلانا پڑے اور ان کی عزت و حرمت کا سودا کرنا پڑے تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہیں ہے۔ غلامی کے زمانے میں بھی ہمارے جاگیردار' ہمارے وڈیرے' حتیٰ کہ بعض علماء اور بعض گدی نشین بھی اسی نفاق کا شکار تھے۔ اور انہی کی وجہ سے انگریز تعداد کے اعتبار سے محدود ہونے کے باوجود دو سو سال تک حکومت کرتا رہا۔ ظفر علی خان نے اسی صورتِ حال سے آزردہ ہو کر کہا تھا:

Marfat.com

نکل جاتی ہو سچی بات جس کے منہ سے مستی میں
فقیہِ مصلحت بیں سے وہ رندِ بادہ خوار اچھا
تمسخر کرنے والے دین سے ہی گر مہذب ہیں
تو ان تہذیب کے پتلوں سے مجھ جیسا گنوار اچھا

اور آج مسلمان جس صورتِ حال سے دوچار ہیں اس میں بھی ہمارے نام نہاد حکمران، ہمارا طبقۂ امراء، ہمارے سیاستدانوں کی اکثریت، ہمارے بعض علماء و مشائخ یہی کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ قرآنِ کریم کی اتنی واضح تنقید اور تنبیہ کے بعد بھی ان مسلمان کہلانے والے منافقین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔

منافقین کی دوسری علامت

منافقین کی دوسری علامت یہ بیان فرمائی ہے کہ ان کی ہمدردیاں اور خیر خواہیاں مسلمانوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے اولیاءِ نعمت کے ساتھ ہوتی ہیں۔ یعنی اس قوت کے ساتھ جو علاقے کی غالب کافر قوت ہے۔ اور مسلمان جن کے ساتھ حق و باطل کی کشمکش میں مصروف ہیں۔ یہ ہمیشہ اس کے انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں کو کوئی نقصان پہنچے اور ہم مسلمانوں کے دشمن اور اپنے آقاؤں کے پاس جا کر انھیں یقین دلائیں کہ مسلمانوں کو جو شکست ہوئی ہے اور آپ کو فتح ہوئی ہے اس میں ہمارا بھی ایک کردار ہے؟ اگر ہم پیچھے رہ کر تمھارے لیے یہ کام نہ کرتے اور مسلمانوں سے تمھیں محفوظ نہ رکھتے تو یقیناً تمھارے لیے فتح حاصل کرنا مشکل ہوتا۔ اور اگر مسلمانوں کو فتح نصیب ہوتی ہے تو مسلمانوں کے پاس آ کر مالِ غنیمت میں حصہ بٹانے کے لیے بار بار یقین دلاتے ہیں کہ ہم تو اس معرکے میں قدم قدم پر آپ کے معاون و مددگار رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم ایسے منافقین اور کفار کو جہنم میں جمع کریں گے۔ اور اسی دن اللہ ان کے تمام کرتوتوں سے پردہ اٹھائے گا اور ہر دیکھنے والی نگاہ دیکھے گی کہ یہ لوگ حقیقت میں کس قدر مسلمانوں کے دشمن تھے۔

Marfat.com

28- حقِ امانت کی ادائیگی اور عدل وانصاف کی پاسداری

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰی اَهْلِهَا وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ اِنَّ اللّٰهَ نِعِمَّا یَعِظُكُمْ بِهٖ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ سَمِیْعًا م بَصِیْرًا﴾

(بے شک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کو ادا کرو اور جب فیصلہ کرنے لگو لوگوں میں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ خوب بات ہے یہ جس کی اللہ تمھیں نصیحت کرتا ہے، بے شک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے) (النسآء : ۵۸)

گزشتہ آیات میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ایسی دو نعمتوں سے نوازا ہے جن نعمتوں سے اس سے پہلے یہود کو نوازا گیا تھا۔ یعنی یہود کو ایک حاملِ دعوت امت بنایا گیا تھا اور شریعت الٰہی کی امانت ان کے سپرد کی گئی تھی اور پھر آگے چل کر اللہ تعالیٰ نے ان کو حکومتیں بھی عطا فرمائی تھیں۔ اب یہی دونوں نعمتیں مسلمانوں کو عطا فرمائی جارہی ہیں۔ حکومت سے تو یہود بہت مدت پہلے محروم کردیے گئے اور شریعتِ الٰہی کی ذمہ داریوں سے اب ان کو معزول کیا جارہا ہے اور مسلمان بیک وقت ان دونوں ذمہ داریوں سے سرافراز اور گراں بار کیے جارہے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیات میں مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ تم یہود کی طرح قومی اور گروہی تعصب کی بیماری میں مبتلا نہ ہونا۔ شریعتِ الٰہی کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کرنا جو یہود نے اختیار کیا۔ کتاب کی معرفت تم سے جو عہود لیے گئے ہیں دیکھنا یہود کی طرح ان عہدوں کو نہ توڑنا۔

Marfat.com

آیات کا شانِ نزول

چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اس کے لیے دو بنیادی باتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ایک حقِ امانت کی ادائیگی کا اور دوسرا عدل وانصاف کی پاسداری اور بالا دستی کا۔لیکن ان دونوں باتوں کی وضاحت سے پہلے ہمارے قدیم مفسرین جو اس آیت کا شانِ نزول بیان کرتے ہیں اس میں اگرچہ اس آیت میں بیان کردہ نصائح اور ہدایات کا استقصاء نہیں ہوتا البتہ اس آیتِ کریمہ سے اس واقعہ پر روشنی ضرور پڑتی ہے۔وہ واقعہ یہ ہے کہ عثمان بن طلحہ جو بیت اللہ کے نگران اور چابی بردار تھے ان کا اپنا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ہم پیر اور جمعرات کے روز بیت اللہ کا دروازہ کھولا کرتے تھے اور لوگ اس میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کرتے تھے۔ہجرت سے پہلے ایک روز رسول کریم ﷺ اپنے کچھ صحابہ کے ساتھ بیت اللہ میں داخل ہونے کے لیے تشریف لائے۔عثمان نے آنحضرت کو اندر جانے سے روکا آپ نے بڑی بردباری کے ساتھ عثمان کے سخت کلمات کو برداشت کیا پھر فرمایا اے عثمان! شاید تم ایک روز یہ بیت اللہ کی چابی میرے ہاتھ میں دیکھو گے جبکہ مجھے اختیار ہوگا کہ میں جس کو چاہوں سپرد کردوں۔عثمان بن طلحہ نے کہا کہ اگر ایسا ہوگیا تو قریش ہلاک اور ذلیل ہوجائیں گے۔آپ نے فرمایا نہیں! اس وقت قریش آباد اور عزت والے ہوجائیں گے۔

فتح مکہ کے بعد آنحضرت ﷺ نے عثمان سے چابی طلب فرمائی تو ایک روایت تو یہ ہے کہ عثمان نے چابی سپرد کردی اور ساتھ ہی کہا کہ میں یہ امانت آپ کے سپرد کررہا ہوں۔لیکن بعض دوسری روایات میں یہ ہے کہ عثمان چابی لے کر بیت اللہ کے اوپر چڑھ گیا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ نے زبردستی چابی اس کے ہاتھ سے لے کر آنحضرت کو دی۔بیت اللہ میں داخلہ اور وہاں نماز ادا کرنے کے بعد جب حضور باہر تشریف لائے تو پھر چابی عثمان کے حوالے کرتے ہوئے فرمایا: یہ چابی سنبھالو یہ قیامت تک تمھارے خاندان میں رہے گی۔جو شخص تم سے یہ چابی چھینے گا وہ ظالم ہوگا۔مقصد یہ تھا کہ کسی دوسرے شخص کو اس کا حق نہیں کہ تم سے یہ چابی لے لے۔اس کے ساتھ یہ ہدایت فرمائی کہ بیت اللہ کی خدمت کے صلہ میں تمھیں جو مال ملے اسے شرعی قاعدہ کے مطابق استعمال کرنا۔

عثمان بن طلحہ کہتے ہیں کہ جب یہ کنجی لے کر میں خوشی خوشی چلنے لگا تو آپ نے پھر

Marfat.com

مجھے آواز دی اور فرمایا کہ کیوں عثمان جو بات میں نے کہی تھی وہ پوری ہوئی یا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ بے شک آپ کا ارشاد پورا ہوا اور اس وقت میں کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس روز جب آنحضرت ﷺ بیت اللہ سے باہر تشریف لائے تو یہ آیت آپ کی زبان پر تھی۔ اس سے پہلے میں نے یہ آیت کبھی آپ سے نہ سنی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت اس وقت جوفِ کعبہ میں آپ پر نازل ہوئی۔ بیت اللہ کی نگرانی اور اس کی چابی برداری اگر چہ عثمان کا کوئی حق نہ تھا کیونکہ اب تمام حقوق کا سرچشمہ اللہ اور اس کے رسول کی ذات تھی وہ جس کو جو عطا فرما دیتے وہی اس کا حق بن جاتا۔ لیکن آپ نے عثمان کے ظاہری حق کو دیکھتے ہوئے جو خاندانی طور پر اس کے پاس تھا آپ نے اس آیت پر عمل کرتے ہوئے چابی اس کے حوالے کر دی حالانکہ اس وقت حضرتِ عباس اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے آپ سے درخواست کی تھی کہ جس طرح بیت اللہ کی خدمت، سقایہ اور سدانہ ہمارے پاس ہے، یہ کنجی برداری کی خدمت بھی ہمیں عطا فرما دیجیے۔ مگر آپ نے ان کی درخواست رد کر کے کنجی عثمان بن طلحہ کو واپس فرمائی۔

یہ واقعہ بظاہر حقِ امانت کی ادائیگی کی بہترین مثال ہے کہ آج جبکہ تمام حقوق اور امانتیں آنحضرت کی تحویل میں ہیں لیکن آپ پرانے حوالوں کی بھی قدر فرما رہے ہیں۔ لیکن مراد اس آیت سے صرف یہی حکم دینا نہیں بلکہ جوفِ کعبہ میں اس آیت کا نزول بطورِ خاص یہ بتلانے کے لیے کافی ہے کہ آج فتح مکہ کے بعد اللہ نے اسلام کو ایک ریاست میں تبدیل کر دیا ہے۔ آج آپ جس طرح ایک حاملِ دعوت امت کے رسول اور قائد ہیں اسی طرح ایک ملکِ عظیم کے مالک اور ایک ریاست کے سربراہ بھی ہیں۔ آپ نے اس ریاست کو ایسی بنیادیں فراہم کرنی ہیں اور ان طریقوں پر چلانا ہے جو آئندہ مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہوں گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ آپ کو چند باتوں کا حکم دے رہا ہے جن پر عمل کرتے ہوئے آپ اس ریاست کو نمونے کی ریاست بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

امانت کا مفہوم

سب سے پہلا جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤى اَهْلِهَا﴾

''اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے حقداروں کے سپرد کرو۔''

Marfat.com

اس آیت کریمہ میں سب سے پہلی جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ امانات امانت کی جمع ہے۔امانت کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ امانت صرف یہ نہیں کہ آپ کسی شخص کے پاس کوئی چیز رکھیں اور وہ آپ کو جوں کی توں واپس کردے بلکہ اس کا مفہوم اس سے بہت وسیع ہے۔تمام حقوق وفرائض خواہ حقوق اللہ سے تعلق رکھتے ہوں یا حقوق العباد سے انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے۔اپنوں سے متعلق ہوں یا بے گانوں سے۔مالی معاملات کی قسم سے ہوں یا سیاسی معاہدات کی قسم کے۔صلح وامن کے دور کے ہوں یا جنگ کے۔غرض جس نوعیت اور جس درجے کے حقوق وفرائض ہوں وہ سب امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔اس لحاظ سے اگر آپ غور فرمائیں تو آپ محسوس فرمائیں گے کہ عبادات بھی امانت ہیں۔تمام عائلی حقوق وفرائض تمام معاشرتی حقوق وفرائض، تمام تمدنی حقوق وفرائض،تمام سیاسی حقوق وفرائض ،تمام حکومتی حقوق وفرائض،تمام قومی حقوق وفرائض، یہ سب امانات میں شامل ہیں۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔

(تم میں سے ہر کوئی ذمہ دار ہے اور تم میں ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔)

حکومت کے عہدے اور منصب جتنے ہیں وہ سب اللہ کی امانتیں ہیں۔جس کے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ میں عزل ونصب کے اختیارات ہیں۔ان میں سے کسی کے لیے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ کسی ایسے شخص کے سپرد کردے جو اپنی عملی یا علمی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہ ہو بلکہ ان پر لازم ہے کہ ہر کام اور ہر عہدہ کے لیے اپنے دائرہ حکومت میں اہل کو تلاش کریں۔ایک حدیث میں رسولِ کریم ﷺ کا ارشاد ہے: جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی اور پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی اور تعلق کی وجہ سے بغیر اہلیت معلوم کیے دے دیا اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض مقبول ہے نہ نفل۔یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے۔بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جس شخص نے کوئی عہدہ کسی شخص کے سپرد کیا حالانکہ اس کے علم میں تھا کہ دوسرا آدمی اس عہدہ کے لیے اس سے زیادہ قابل اور اہل ہے تو اس نے اللہ،اس کے رسول اور سب مسلمانوں کی خیانت کی۔خود آنحضرت ﷺ کا طرزِ عمل ملاحظہ فرمایے کہ حضرتِ ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سابقون الاولون میں سے ہیں اور آنحضرت

Marfat.com

کے ساتھ ان کی نہایت قربت تھی۔اس کے باوجود جب حضرتِ ابوذر نے آنحضرت سے درخواست کی کہ آپ مجھے کسی جگہ کا حاکم مقرر فرمائیں تو آپ نے فرمایا:

يَا اَبَاذَرْ اِنَّكَ ضَعِيفٌ وَاِنَّهَا اَمَانَةٌ وَاِنَّهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ خِزْيٌ وَنَدَامَةٌ اِلَّا مَنْ اَخَذَ بِحَقِّهَا وَاَدَّى الَّذِيْ عَلَيْهِ فِيْهَا۔

(اے ابوذر! تم ایک کمزور آدمی ہو اور منصب ایک امانت ہے جس کی وجہ سے قیامت کے دن انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی (اس رسوائی سے صرف وہ بچے گا) جس نے اسے حق کے ساتھ لیا اور جس نے پھر اس کا پورا حق ادا کیا)

اس حدیث سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح منصب عطا کرنے والے اور ذمہ داریاں تفویض کرنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ کسی شخص کو ایسی ذمہ داری پر فائز نہ کرے جس کا وہ اہل نہ ہو۔اسی طرح ذمہ داری اور عہدہ لینے والے کا بھی فرض ہے کہ وہ کسی ایسے منصب اور عہدے کی خواہش اور کوشش نہ کرے جس کی ذمہ داریوں کی ادائیگی کی اس میں صلاحیت نہ ہو اور اگر اس نے دھوکہ دے کر یا سفارش کے ذریعے ایسے کسی منصب کو حاصل کر لیا تو وہ جب تک اس منصب پر رہے گا اللہ کی ناراضگی کا ہدف بنا رہے گا اور قیامت کے دن سخت باز پرس سے گزارا جائے گا۔

نااہلوں کو امانت سپرد کرنا خرابی کا اصل سبب ہے

حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی ادارہ ہو یا ملک اس کی خرابی کی بنیاد ہی یہ ہوتی ہے کہ اس میں ذمہ داریاں ان لوگوں کے سپرد کی جاتی ہیں جن میں ان کی ادائیگی کی صلاحیت نہیں ہوتی۔اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ معاملات روز بروز بگڑتے جاتے ہیں۔اس لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰى غَيْرِ اَهْلِهٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَةَ۔

(جب کاموں کی ذمہ داری نااہلوں کے سپرد کی جائے تو پھر قیامت کا انتظار کرو)

کیونکہ نااہلوں کی کوئی فوج بھی کسی کام پر لگا دی جائے تو وہ کام کے بگاڑ میں اضافہ تو کر سکتی ہے اصلاح نہیں کر سکتی۔ہمارے ملکی اور قومی معاملات روز بروز بگڑتے جا رہے ہیں اور

Marfat.com

ہم نصف صدی سے زیادہ عرصہ سے اس صورتحال سے دوچار ہیں۔لیکن ہم کبھی اس پر غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے حالانکہ معمولی عقل کا آدمی بھی حکومت کے ایوانوں سے لے کر معمولی دفاتر تک یہ صورتحال دیکھ رہا ہے کہ اکثر مناصب پر وہ لوگ فائز ہیں جو یا تو اس فیلڈ سے تعلق نہیں رکھتے اور یا اس کام کی ان میں صلاحیت نہیں۔حکومت کا نظام چلانے کے لیے سیاسی سمجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے۔اور فوج کا نظام چلانے کے لیے عسکری علوم میں مہارت اور تجربے کی۔لیکن اگر جرنیل سیاستدان لگا دیے جائیں اور حکومت جرنیلوں کے سپرد کر دی جائے تو اس کا نتیجہ معلوم کرنے کے لیے کسی بزرجمہر کی ضرورت نہیں۔

جب تعلیمی ادارے جرنیلوں کے سپرد کر دیے جائیں اور انتظامی اداروں پر اساتذہ کو فائز کر دیا جائے ،وزارتِ صحت کسی تاجر کو دے دی جائے اور وزارتِ تجارت کسی ٹیکنو کریٹ کے حوالے کر دی جائے اور یونیورسٹیوں کے چانسلر ایف اے پاس ہوں اور وزیرِ تعلیم تک میٹرک کی سطح کی تعلیم رکھتے ہوں اس طرح سے ہر شعبہ غیر متعلق اور نا اہل لوگوں کے سپرد کر دیا جائے تو اس سے مختلف نتائج نہیں نکل سکتے جن سے آج ہم گزر رہے ہیں۔پنجاب یونیورسٹی کے طلبا نے ایک دفعہ صرف اس لیے گریجوایشن اور پوسٹ گریجوایشن کی ڈگریاں لینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ ڈگریاں ایوارڈ کرنے کے لیے جو گورنر صاحب چانسلر کی حیثیت سے تشریف لائے تھے وہ شاید ایف اے بھی نہ تھے اور ہمارے ملک میں یہ بھی لطیفہ ہو چکا ہے کہ ہمارے ملک کے وزیرِ تعلیم ایک ایسے صاحب رہ چکے ہیں جو میٹرک پاس تھے۔انھیں انڈیا کے دورے پر جانا پڑا جہاں کے وزیرِ تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد تھے جن کے علم وفضل کا چرچا آج تک ان کی سیاسی مخالفت کے باوجود بھی جاری ہے۔ان کے لیے بھی اور ہمارے وزیرِ تعلیم کے لیے بھی مجبوری تھی کہ ہم منصب ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے ملاقات کریں۔ہمارے وزیرِ تعلیم صاحب ان کی ملاقات کو جاتے ہوئے سوچتے گئے کہ ابوالکلام چونکہ عالم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑے ادیب بھی ہیں بہتر ہے کہ میں ملاقات میں کوئی مصرعہ یا شعر ان کے سامنے ضرور پڑھوں۔لیکن ان سے گفتگو کرتے ہوئے ایسے گھبرائے کہ ان سے اجازت چاہتے ہوئے فرمانے لگے

اچھا مولانا اب رستک ملیں گے گر خدا لایا

رخصت کا تلفظ تک بھول گئے اور انڈیا کے اخبارات نے اس کو خوب اچھالا اور

Marfat.com

پاکستان کی عزت میں خوب خوب اضافہ ہوا۔

ہمارے ملک کی وزارتوں پر اور یونیورسٹیوں کے منصبِ صدارت پر جو لوگ فائز ہوتے رہے ہیں اور اسی طرح ہمارے ملک کے کلیدی مناصب پر جن لوگوں کا قبضہ رہا اور آج بھی ہے اللہ کسی کو توفیق دے تو وہ اگر ان کی تفصیلی رپورٹ تیار کر سکے تو ایک ایسا گلدستۂ ظرافت تیار ہوگا جسے دیکھتے ہوئے ہم اپنے سارے غم بھول جائیں گے۔

امانت کی اہمیت

حقِ امانت کا یہ دیوالیہ اس قوم کے ہاتھوں انجام پذیر ہو رہا ہے جسے قرآنِ کریم کی ہدایت کے ساتھ ساتھ سرکارِ دو عالم ﷺ نے بھی اس حد تک تاکید فرمائی تھی کہ صحابہ یہ فرماتے ہیں رسولِ کریم ﷺ نے کوئی خطبہ ارشاد نہیں فرمایا جس میں آپ نے یہ دو باتیں ارشاد نہ فرمائی ہوں۔

۱۔ لاایمان لمن لاامانة له ”جس میں امانت داری نہیں اس میں ایمان نہیں“

۲۔ لادین لمن لاعهد له ”جس شخص میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں“

حق امانت میں عدل وانصاف پر زور

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا جو حکم دیا گیا ہے وہ یہ ہے: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ”جب تم لوگوں کے باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو عدل وانصاف کے ساتھ کیا کرو“۔ آپ دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے ہر سطح کے ملکی مناصب سپرد کرنے کے لیے یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر منصب اللہ کی سپرد کردہ ایک امانت ہے۔ اس میں خیانت مت کرنا۔ خیانت یہ ہے کہ اسے ایسے لوگوں کے سپرد نہ کرنا جن میں ان کی اہلیت نہ ہو اور جو اللہ سے ڈرنے والے نہ ہوں۔ اس حکم کے بعد اب یہ دوسرا حکم دیا جا رہا ہے کیونکہ جس ادارے میں حکمران اہل اور اللہ سے ڈرنے والے نہیں ہوں گے اس میں انصاف کی عمل داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ ایک چور کو اگر گھر کی نگرانی پر لگا دیں، ایک بے نماز کو مسجد کا امام بنا دیں، ایک جاہل اور علم دشمن کو تعلیمی ادارے کا سربراہ بنا دیں، اور آپ ایک ملحد اور اباحیت پسند کو وزارتِ مذہبی امور دے دیں، ایک منکرِ سنت کو نظریاتی کونسل کا چیئرمین بنا دیں، اور پھر آپ انھیں اداروں کی فلاح وترقی کے کام کو تیز کرنے کا حکم جاری کریں تو آپ خوب اندازہ کر سکتے

Marfat.com

ہیں کہ اس حکم کا نتیجہ کیا ہوگا۔اس لیے بنیادی بات یہ ہے کہ اگر مقصود ملک کے رہنے والوں میں عدل وانصاف کو عام کرنا اوران کے معاملات کوعدل وانصاف کے مطابق چلانا ہے تو پھر سب سے پہلے ہر منصب پر اہل اور خدا سے ڈرنے والوں کو مقرر کرنا ہوگا۔اگر عدالت کی کرسی پر ایسا منصف بیٹھا ہو جو جانتا ہو کہ عدل کرنے سے اللہ کے سامنے جوابدہی آسان ہو جائے گی اور اگر بے انصافی کروں گا تو اپنے آپ کو کند چھری سے ذبح کروں گا۔تو ایسے آدمی سے آپ انصاف کی توقع کرسکتے ہیں۔لیکن اگر آپ مقامی عدالتوں سے لے کر عدالتِ عظمٰی تک راشی اور خائن لوگوں کو بٹھادیں اور پھر یہ امید کریں کہ لوگوں کو انصاف ملے گا تو لوگوں کے ساتھ اس سے بڑا مذاق کوئی نہیں ہوسکتا۔اس لیے سب سے پہلے حقِ امانت کی ادائیگی پر زور دیا گیا۔جب ہر ذمہ داری پر اہل شخص فائز ہوگیا تو اب ان کو حکم دیا جارہا ہے کہ تم لوگوں کے معاملات کے فیصلے عدل وانصاف کے مطابق کرو اور یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ فیصلے صرف عدالتوں میں نہیں ہوتے ملک کے ہرادارے میں ہوتے ہیں ایک کلرک سے لے کر چیف سیکرٹری تک بھی فیصلے کرتے ہیں ملک کا ہر تعلیمی ادارہ بچوں کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے۔

حکمران اور جج کو فیصلہ کرتے ہوئے صرف انصاف کے ترازو کے پلڑوں کو درست رکھنا ہے۔اسے ہرگز یہ نہیں دیکھنا کہ فریقین میں بااثر کون ہے اور بے اثر کون ہے۔کون سفارش لے کر آیا ہے اور کون سفارش سے محروم ہے۔کس نے ایک بہت بڑے وکیل کو کھڑا کیا ہے اور کون ہے جو وکیل کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا۔انصاف جب تک بیرونی اثرات سے بے نیاز نہیں ہوتا اس وقت تک اس کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔خلفاء راشدین نے آنحضرت ﷺ کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے درخشاں مثالیں قائم کی ہیں۔فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ جیسا عظیم حکمران خود عدالت میں پیش ہوتا ہے۔ہمارے گورنرز اور ہمارے حکمرانوں کی طرح اس نے اپنا کوئی ذاتی استحقاق نہیں رکھا اور جب عدالت کا جج اس کے احترام میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ برملا کہتا ہے کہ قاضی صاحب آپ نے یہ پہلی بے انصافی کی ہے کیونکہ آپ نے دوسرے فریق پر مجھے ترجیح دی ہے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک مقدمے میں خود عدالت میں فریق بن کر جاتے ہیں۔فریقین کو مساوات دینے کی انتہا یہ ہے ایک یہودی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس مقدمہ لے کر آتا ہے آپ یہودی کو سامنے کھڑا ہونے کا حکم دیتے ہیں اور حضرت علی سے فرماتے ہیں کہ ابوالحسن تم بھی اس کے ساتھ کھڑے ہوجاؤ۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کھڑے تو

Marfat.com

ہو جاتے ہیں لیکن چہرے پر ناگواری کے آثار ہیں۔ فیصلے کے بعد حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا تمھیں یہودی کے برابر کھڑا ہونا برا لگا؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ایسا نہیں! مجھے جو بات بری لگی وہ اور تھی۔ وہ یہ کہ آپ نے یہودی کا تو نام لے کر کھڑا ہونے کا حکم دیا لیکن مجھے آپ نے ابوالحسن کہہ کر کنیت سے پکارا، جو لحاظ اور احترام کی علامت ہے۔ اس طرح سے فریقین میں مساوات نہ رہی، یہودی کیا سمجھے گا کہ اسلام میں مساوات نہیں۔

اس آیتِ کریمہ میں بھی دیکھئے انصاف کا حکم دیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ مسلمانوں کے درمیان انصاف کرو بلکہ بین الناس فرمایا یعنی لوگوں کے درمیان انصاف کرو۔ ایک طرف اگر مسلم ہو اور دوسری طرف غیر مسلم حتیٰ کہ اگر ایک طرف امیر المومنین ہوں اور دوسری طرف غیر مسلم فیصلہ پھر بھی انصاف کے مطابق ہونا چاہیے۔

Marfat.com

29- اسلامی اجتماعی زندگی کے اساسی اصول

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی‘ اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں‘ پھر اگر تمھارے درمیان کسی معاملہ میں نزاع ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ‘ اگر تم واقعی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہو‘ یہ ایک صحیح طریقِ کار ہے اور انجام کے اعتبار سے بھی بہتر ہے) (النسآء : ۵۹)

تمہیدی کلمات

اسلام اپنے ماننے والوں کو جن بنیادوں پر اسلامی ریاست کی تعمیر کا حکم دیتا ہے اور جن بنیادی اُصولوں پر تمدن اور سیاسی نظام کی تشکیل کرتا ہے‘ نہایت اختصار اور ایجاز کے ساتھ ان بنیادی باتوں اور اساسی اصولوں کو اس آیت کریمہ میں ذکر فرما دیا گیا ہے۔ ان اُصولوں کو ذکر کرنے سے پہلے میں یہ چاہتا ہوں کہ تمہیدی طور پر چند باتیں عرض کر دوں۔ جن کے سمجھ لینے کے بعد اسلام کے ان اساسی اُصولوں کو سمجھ لینا آسان ہو جاتا ہے۔

اسلام کے نزدیک سب سے اہم سوال جس کے حل پر انسان کی فلاح و بقا کا دار و مدار ہے‘ وہ یہ ہے کہ انسان کی اطاعت کا اصل مرکز اور اقتدار کا اصل سرچشمہ کون ہے۔ یعنی وہ کون سی ذات یا وہ کون سی قوت ہے جس کی اطاعت کرنا اور احکام بجالانا انسانوں کے لیے ضروری

Marfat.com

ہے اور اسی بات پر انسانوں کی فلاح کا دارومدار ہے۔ اس لیے کہ یہ بات سمجھنا تو کوئی مشکل بات نہیں کہ انسان اجتماعیت چاہتا ہے۔ وہ جنگل کا باسی نہیں بلکہ آبادیوں میں رہنے والی مخلوق ہے۔ وہ اپنا گھر بنا کر کسی کے پڑوس میں، کسی محلے میں، کسی آبادی میں محفوظ حالت میں رہنا چاہتا ہے۔ اس کے علاقات ہیں۔ اس کی قرابت کے رشتے ہیں۔ اس کے مفاداتی روابط ہیں۔ اس کے تعلقات میں ایک وسیع تنوع ہے، جس کی وجہ سے وہ اجتماعیت کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ظاہر ہے کہ جہاں بھی اجتماعیت ہو گی، اس اجتماعیت میں رہنے والوں کے کچھ حقوق و فرائض بھی ہوں گے۔ ان کی کچھ حدودِ کار بھی ہوں گی۔ ان کے رہنے سہنے اور میل جول کے آداب بھی ہوں گے۔ یہیں سے یہ تصور پیدا ہوتا ہے کہ اگر انہی پابندیوں پر اجتماعیت کا دارومدار ہے تو ان پابندیوں پر عمل کرانے کے لیے کون سی چیزیں ضروری ہیں۔ اگر آپ غور فرمائیں تو آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ دو چیزیں ان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک یہ کہ اجتماعیت میں شریک لوگوں میں ایک ایسا آئین اور دستور نافذ ہو، جو تمام کے حقوق و فرائض کی آگاہی دے اور ہر فرد اور ہر ادارے کے سامنے ان کے حدودِ کار کا تعین کرے۔ ہر شخص کو اندازہ ہو کہ اس کے فرائض کیا ہیں اور اس کے حقوق کیا ہیں اور اس کے انفرادی اور اجتماعی حقوق کی حدود کیا ہیں۔ وہ انفرادی زندگی میں کہاں تک آگے بڑھ سکتا ہے، جس سے اجتماعیت مجروح نہ ہو۔

تین نظام ہائے حکومت

دوسری چیز جو ضروری ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح آئین اور دستور اجتماعی اور انفرادی زندگی کی اساس ہے۔ اسی طرح ایک قوت حاکمہ کی بھی ضرورت ہے جو اس بات کی نگرانی کرے کہ کیا آئین اور دستور کی پابندی کی جا رہی ہے یا نہیں۔ کیا افراد اور ادارے اپنی حدود سے تجاوز تو نہیں کر رہے۔ کیا عدالتوں میں ان لوگوں کو انصاف مل رہا ہے یا نہیں، جن کے ساتھ قانون کی خلاف ورزی کی وجہ سے زیادتی ہوئی ہے۔ اور اسی طرح اس اجتماعیت نے اپنے لیے زندگی گزارنے کے جو اصول وضع کیے ہیں، کیا اس کی روح سمیت اس کا احترام کیا جا رہا ہے۔ ان دو بنیادی چیزوں کی پابندی کے بغیر کوئی اجتماعیت بھی وجود میں نہیں آ سکتی اور اگر آ جائے تو باقی نہیں رہ سکتی۔ یہاں آ کر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آئین وضع کرنے والی طاقت کون سی ہے اور وہ کون سی قوتِ حاکمہ ہے جس کا دیا ہوا آئین غیر مشروط اور واجب الاطاعت ہے اور اسی کے نام پر بننے والی حکومت اس آئین کی پابندی

Marfat.com

کرانے کی پابند ہے۔ دنیا نے آج تک اس کے مختلف جوابات دیے ہیں اور اسی کے نتیجے میں دنیا نے ہمیشہ مختلف نظاموں کا تجربہ کیا ہے۔ ایک وقت تھا جب دنیا میں صرف بادشاہت کا نظام چلتا تھا۔ بادشاہ ایک ایسا فرد ہوتا ہے جو کسی کا انتخاب نہیں ہوتا۔ وہ اپنی طاقت کے بل بوتے پر اپنی حکومت بنانے میں کامیاب ہوتا ہے اور پھر یہ حکومت وہ اپنے خاندان اور اولاد میں چھوڑ جاتا ہے۔ اس نظام کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ اس میں کوئی ایسا آئین نافذ نہیں ہوتا جسے لوگ اپنی مرضی سے بناتے ہوں بلکہ بادشاہ کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ آئین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر لوگوں سے وہ آئین کی تسوید و ترتیب میں کام لیتا بھی ہے تو اوراق کے اس مجموعے کی اہمیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک بادشاہ کی اسے تائید حاصل رہتی ہے۔ لوگوں کا کام بادشاہ کی غیر مشروط اطاعت کرنا ہے۔ اس میں لوگوں کے حقوق و فرائض درحقیقت بادشاہ کی عطا اور دین ہوتے ہیں۔

جب عسکریت کا دور آیا۔ جرنیلوں کو اپنی طاقت کا احساس ہونے لگا تو آمریت وجود میں آئی۔ کہنے کو تو یہ بادشاہت سے ایک مختلف چیز ہے کیونکہ اس میں میراث نہیں چلتی لیکن اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور بادشاہت میں کوئی اساسی فرق نہیں ہوتا۔ بادشاہت میں لوگ بادشاہ کی اطاعت کرتے ہیں اور آمریت میں آمر اور ڈکٹیٹر کی اطاعت کرتے ہیں۔ دونوں میں آئین اور قانون کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

تیسرا نظام حکومت جمہوریت کہلاتا ہے۔ یوں تو اسے عوام کی حکومت کہا جاتا ہے اور عوام کے نمائندے اپنی آزادانہ مرضی سے اپنا آئین بناتے ہیں اور حکومت اسی آئین کے مطابق نظام حکومت چلانے کی پابند ہوتی ہے۔ لیکن اکثر ممالک میں جمہوریت برسر اقتدار گروہ یا وہ گروہ جسے طاقت کا سرچشمہ سمجھا جاتا ہے' کی لونڈی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہ آئین کو بھی موم کی ناک بنائے رکھتے ہیں اور جمہوریت کا نام لے لے کر اپنی خواہشات اور اپنی اغراض کے مطابق نظام حکومت چلاتے ہیں۔

اصل خرابی انسان کو غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے

ہم نے تین نظام ہائے حکومت کا ذکر کیا۔ ان تینوں میں ایک نقطۂ اشتراک پایا جاتا ہے۔ وہ یہ کہ چاہے بادشاہت ہو' آمریت ہو یا جمہوریت۔ ہر صورت میں اطاعت انسانوں کی

Marfat.com

کی جاتی ہے۔ انسان' انسان کی چاکری کرنے پر مجبور ہے۔ غلامی کا دور بظاہر ختم ہو گیا لیکن حقیقت میں غلامی کی شکلیں بدل گئیں لیکن اس کی روح پوری طرح زندہ ہے۔ بادشاہت اور آمریت میں تو یہ غلامی صاف نظر آتی ہے لیکن جہاں تک جمہوریت کا تعلق ہے' اس میں بھی سرچشمۂ اقتدار عوام کو کہا جاتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عوام کی مرضی سے چنے جانے والے لوگ انہی کی خواہشات کے مطابق قانون سازی کریں گے اور اسی قانون کی اطاعت تمام ملک کے رہنے والوں کو کرنی پڑے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک انسانوں نے جو نظام ہائے حکومت تشکیل دیے ہیں' ان کی بنیادی روح انسان کی غلامی یا اطاعت ہے۔ جہاں مکمل طور پر آج جمہوریت نافذ ہے' وہاں یہ دیکھ کر انتہائی دکھ ہوتا ہے کہ عوام کے نام سے انسان کے سفلی جذبات اور خواہشات کی پیروی کی جا رہی ہے۔ اخلاقیات کا جنازہ نکال دیا گیا ہے۔ ان جرائم کو سندِ جواز عطا کر دی گئی ہے' جن پر کبھی اللہ کا عذاب نازل ہو چکا ہے۔ انسانی زوال کے بدترین ادوار میں بھی جن برائیوں کو کبھی جائز قرار نہیں دیا جا سکا۔ آج باقاعدہ تالیوں کی گونج میں انھیں سندِ جواز دی جا رہی ہے۔ مرد و عورت کا ناجائز تعلق اور ناجائز اولاد قانونی اور اخلاقی طور پر عزت کے زینے چڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور نکاح اور اس کے نتیجے میں حلال اولاد آہستہ آہستہ مغرب میں بوجھ سمجھی جانے لگی ہے۔ کسی بھی معاشرے میں جب مذہب نظر انداز ہوتا ہے تو اخلاقی حدود کا پامال ہونا یقینی ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے اخلاقیات کا احترام ختم ہو جاتا ہے' ویسے ویسے لوگوں کی اکثریت خواہشات اور سفلی جذبات کی اسیر ہوتی جاتی ہے۔ جمہوریت میں فیصلے چونکہ اکثریت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی آئینی کاوشیں' تہذیبی اظہار' سماجی رسوم اور ثقافتی علامتیں اخلاقی سطح سے گرتی چلی جا رہی ہیں۔ اس پوری تفصیل سے ہمیں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر انسان کی عظمت انسانیت کی بقا میں ہے اور انسانیت اخلاقیات کی پابندی کا دوسرا نام ہے' تو پھر ہمیں ایک ایسے نظام کو اختیار کرنا ہو گا' جس میں سرچشمۂ اقتدار اور سرچشمۂ آئین و قانون عوام نہ ہوں بلکہ وہ ذات ہو جو انسانوں کی خالق ہے۔ جس نے انسانی فطرت و جبلت کو پیدا فرمایا۔ جو انسانی طبیعت اور اس کے مزاج کو سمجھتی ہے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ انسانی زندگی کی اصلاح کن اُصولوں کی پاسداری میں ہے۔ اور وہ کیا پابندیاں ہیں' جن کو اختیار کر لینے کے بعد انسانیت کا محفوظ سفر جاری رہ سکتا ہے۔ انسانوں کو حقوق بھی میسر آتے ہیں اور انسانی تہذیب بھی ترقی کرتی ہے۔ چونکہ خرابی کی ساری بنیاد انسانوں کے چند گروہوں کو

Marfat.com

غیر معمولی اختیارات کا مل جانا ہے اور یا تمام اچھے اور برے انسانوں کو ایک ہی سطح پر رکھ کر ان کی رائے کو یکساں وزن دے کر بنیادی فیصلوں میں انھیں شریک کرنا ہے۔ اسلام نے برائی کی اس بنیاد کو ختم کرنے کے لیے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ حضرت ربعی ابن عامر رضی اللہ عنہ نے رستم کے دربار میں نہایت اختصار کے ساتھ اسے تین باتوں کی صورت میں بیان فرمایا تھا۔ اللہ کے اس عظیم بندے نے ان تین باتوں کی شکل میں قرآن وسنت کا ست نکال لیا ہے۔ رستم نے پوچھا کہ آپ ہمارے ملک پر حملہ کرنے کے ارادے سے کیوں آئے اور وہ کیا دعوت ہے جو آپ پیش کررہے ہیں۔ آپ نے پہلی بات کے جواب میں جو کچھ کہا' وہ اس وقت پیش نظر نہیں۔ البتہ دوسری بات کے جواب میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ ہم تین کام کرنا چاہتے ہیں۔ رستم نے کہا وہ کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا پہلی بات تو یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسان کو انسان کی غلامی سے آزاد کرایا جائے۔ تمام انسان ایک خدا کی مخلوق اور ایک باپ کی اولاد ہیں۔ کسی انسان کو کسی انسان پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ رنگ' جغرافیہ' نسل اور قوم یہ شناختیں ہیں۔ حقیقتِ انسان نہیں' ان کی وجہ سے انسان کو ادنیٰ واعلیٰ میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ تم جس طرح تخت پر خدا بن کر بیٹھے ہو اور تمھارے درباری غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر تمھارے سامنے کھڑے ہیں اور تمھاری ہر خواہش اور تمھاری زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ ان کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے' اسلام اس تقسیم کو قبول نہیں کرتا۔ وہ چاہتا ہے کہ اپنے کردار' اپنے حسنِ عمل اور اپنی جدوجہد کے نتیجے میں اپنا مقام پیدا کرو۔ کوئی آدمی یا کوئی طبقہ پیدائشی طور پر نہ بڑا ہوسکتا ہے اور نہ چھوٹا' تو ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی اور بندگی سے آزاد کرکے حریت اور آزادی کا وہ ماحول دینا چاہتے ہیں' جس میں انسان اپنی جدوجہد کے لیے ایک وسیع میدان پائے۔ اس کے سامنے کسب اور اکتساب کے تمام مواقع کھلے ہوں۔ جہد وعمل کے تمام امکانات موجود ہوں۔ اس آزادی کے نتیجے میں ہر انسان ہر گروہ اپنے مقام ومرتبہ کا جو تعین کرے گا وہی اس کا حقیقی مرتبہ ہوگا اور اسی سے انسانیت برگ وبار پیدا کرے گی۔ مزید فرمایا کہ ہم دوسرا کام یہ کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح اربابِ اقتدار نے اور اقتدار پر فائز ایک طبقہ نے باقی انسانوں کو اپنا غلام بنالیا ہے اور اپنے لیے کچھ مخصوص حقوق خاص کرلیے ہیں' جس سے باقی انسان محروم ہیں' اسی طرح ایک مذہبی طبقہ بھی ہے جو تقدس کا دعویدار ہے جس نے اپنے لیے کچھ حقوق خاص کرلیے ہیں اور لوگوں کو اس فریب میں مبتلا کردیا ہے کہ زمین وآسمان کے خالق کے ساتھ ہمارا کوئی خاص رشتہ

Marfat.com

ہے۔ ہماری رضا اور خوشنودی اس کی رضا ہے اس لیے ہمیں خوش کرنے کے لیے تمہیں نذرونیاز اور ایک خاص قسم کا مذہبی ٹیکس ادا کرنا ہوگا جس کے نتیجے میں ہم تمھارے گناہوں کو بخشیں گے اور تم جنت میں داخل ہوسکو گے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہم اس غلط مذہب کے ظلم وجور سے اور اس مذہبی طبقے کے تسلط سے انسان کو آزاد کریں اور انسانوں کو یہ بات سمجھائیں کہ یہاں کوئی پریسٹ کلاس نہیں ہے' یہاں کوئی مذہبی طبقہ نہیں ہے' یہاں کوئی برہمن نہیں کہ جو کوئی نسلی تفوق رکھتا ہو اور جسے کوئی خاص حقوق حاصل ہوں اور خدا کا کلام صرف انہی کی زبانوں پر جاری رہتا ہو اور مذہبی رسومات صرف انہی کے ذریعے انجام پاسکتی ہوں اور ان کے حضور قربانی اور دان کیے بغیر انسان اپنے خالق و مالک کی رضا حاصل نہ کر سکتا ہو۔ یہ مذہبی غلامی انسانوں نے خود پیدا کی ہے جس کے نتیجے میں ایک مذہبی طبقے کو ظلم کرنے کا حق ملا ہے اور باقی لوگ اس کے نتیجے میں مذہبی آزادی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ اس مذہبی ظلم اور جور سے انسان کو نکال کر اسلام کے سایۂ عدل واحسان میں داخل کردے۔ مزید فرمایا کہ تیسرا کام ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کو اس دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی فراخی میں داخل کردیں۔ انسان کو اللہ نے عظیم مقاصد کے حصول کی آزادی بخشی تھی۔ اس کو وہ بلند پرواز عطا کی تھی' جس کے سامنے دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ہیچ تھی۔ وہ حقیقت میں آزادی رکھتا تھا' جس کی منزل آخرت تھی لیکن جب اسے دنیا کے تنگ نائے میں محصور کردیا گیا تو اس کے نتیجے میں اس کی خوشیاں اس کے غم حتی کہ اس کے مقاصد بھی مختصر ہوتے چلے گئے۔ وہ اس بچے کی طرح ہو گیا جو کھلونا ملنے سے خوش ہوتا اور کھلونا چھن جانے سے غمزدہ ہو جاتا ہے' کیونکہ اس کی نگاہ میں کھلونا ہی اس کی دنیا ہے۔ ایک دنیا دار آدمی جب دنیا ہی کو اپنی معراج سمجھ لیتا ہے اور اسی کا حصول اس کا مقصد بن جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ اس گنبد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے اور اسی کا حصول اس کا مقصد بن جاتا ہے اور اس کی تمام توجہ اس گنبد میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو یہ وہ غلامی ہے جو اس کو انسانیت کے حقیقی جوہر سے محروم کردیتی ہے۔ یہاں کبھی وہ چند ٹکوں کے لیے لڑتا ہے۔ کبھی ایک قطعۂ زمین کے لیے خون بہاتا ہے۔ کبھی عہدہ ومنصب کے لیے دوسروں کی لاشیں گرانے سے بھی دریغ نہیں کرتا' کیونکہ وہ انہی چیزوں کو حقیقی مقاصد سمجھتا ہے۔ حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ نے بتایا کہ یہ وہ چیزیں ہیں جس نے دنیا کو تاریک سے تاریک تر بنا دیا ہے۔ جب انسان کو اس بات کا احساس ہو جائے

Marfat.com

گا کہ میری آزادی کا اصل مقصد آخرت ہے تو اس کے لیے آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہر نعمت کو چھوڑ دینا آسان ہو جائے گا۔ وہ آخرت کی خوشی کے لیے یہاں کی ہر خوشی قربان کر سکے گا۔ وہ جب یہ جانے گا کہ آخرت کی خوشی ایثار کرنے سے ملتی ہے، دوسروں کے گھروں میں چراغ جلانے سے ملتی ہے، کچھ چھین کر نہیں بلکہ کچھ دے کر ملتی ہے۔ حقیقی عظمت منصب واقتدار میں نہیں بلکہ اس اقتدار کو آخرت کا ذریعہ بنانے میں ہے تو پھر ایسے آدمی کی نگاہوں میں آخرت کے مقصد کو اپنانے کا شعور اس طرح ابھرے گا کہ اسے یقین ہو جائے گا کہ میرا یہ مقصد میری زندگی سے بھی طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی تمام چیزیں زندگی سے قدر و قیمت میں کم ہیں۔ جب زندگی اس مقصد پر قربان کی جا سکتی ہے تو باقی چیزوں کی کیا حقیقت ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ نے شاید اسی کی طرف اشارہ کیا تھا:

یہ مال و دولتِ دنیا یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گمان لا الہ الا اللہ

میری ان گزارشات سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ انسانی زندگی کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ سرچشمۂ اقتدار کون ہے؟ غیر مشروط اطاعت کس کا حق ہے؟ کس کا آئین ہے جس کے مقابل میں کسی آئین کو قبول نہیں کیا جا سکتا۔ انسان کو اللہ نے انسانی بندگی سے آزاد پیدا فرمایا ہے کیونکہ اللہ کی بندگی ہی ایک ایسی چیز ہے جس سے انسان کو حقیقی آزادی اور حقیقی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ اس حقیقی آزادی اور آسودگی کو یقینی بنانے کے لیے اس آیت کریمہ میں چند اُصول دیے گئے ہیں جو اسلامی تہذیب اور اسلامی تمدن کی بنیاد بھی ہیں اور اسلامی ریاست کی پہلی دفعہ بھی۔

اسلام میں امر و اطاعت کے مراکز

۱۔ اسلام میں حقیقی حاکمیت اور اطاعتِ کاملہ کا حق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو حاصل ہے۔ وہی غیر مشروط مطاع ہے جس کی اطاعت کو کہیں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نے ایک سے زیادہ جگہوں میں اس حقیقت کو دہرایا ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ

"حکم اور اطاعت صرف اللہ کے لیے ہے۔"

Marfat.com

دوسری جگہ فرمایا:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ

''خبردار جس کی مخلوق ہے اسی کا امر ہے۔''

اس لیے مسلمانوں کی انفرادی زندگی اور اجتماعی نظام کا محور و مرکز خدا کی فرمانبرداری اور وفاداری کے سوا اور کچھ نہیں۔ جس طرح سر صرف اسی کے سامنے جھکتا ہے اور دلوں کی دنیا اسی سے آباد ہوتی ہے اسی طرح تمام معاملات میں رہنمائی کا سرچشمہ اور اطاعت کا آستانہ صرف اسی کی ذات ہے۔ زندگی کی ضرورتوں کے تحت انسان کو اور اطاعتوں سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن ان میں لازمی شرط یہ ہے کہ ان میں سے کوئی اطاعت بھی اللہ کے احکام سے متصادم نہ ہو۔ بلکہ اپنی حقیقت میں غیر خدا کی تمام اطاعتیں اللہ کی اطاعت کی مرہونِ منت اور اس کی تابع ہیں۔ اور اگر کسی حلقۂ اطاعت میں شبہے کی گنجائش بھی پیدا ہو کہ اس میں غیر خدا کی اطاعت کو اہمیت مل سکتی ہے تو ایسا حلقۂ اطاعت توڑ کر پھینک دیا جائے گا۔ نبی کریم ﷺ نے اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔

''خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔''

۲۔ اسلامی نظام کی دوسری بنیاد رسول کی اطاعت ہے۔ رسول کی اطاعت کوئی مستقل بالذات اطاعت نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود بھی اللہ ہی کا مطیع و فرمانبردار ہے۔ اس کی اطاعت تو اس لیے کرنا ضروری ہے کہ دنیا میں اللہ کی اطاعت کی عملی صورت پیغمبر کی اطاعت کے سوا اور کوئی نہیں۔ اسی کی زبان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے احکام کیا ہیں؟ اسی کے عمل سے یہ راہنمائی ملتی ہے کہ اللہ کے احکام پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ بندوں تک اللہ کے احکام اور فرامین پہنچنے کا کوئی مستند ذریعہ رسول اللہ کے سوا موجود نہیں۔ اور احکام کی عملی صورت' اس کے مبہمات کی وضاحت' اس کے مجملات کی تفصیل اور اس کے قول کی عملی شکل صرف پیغمبر ہی کی ذات سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس لیے جو شخص بھی اللہ کی اطاعت کرنا چاہتا ہے اس کے لیے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرے۔ یہ بات کہ نماز فرض ہے یہ بھی ہمیں اللہ کے رسول کے واسطے سے معلوم ہوئی ہے۔ اور نماز پڑھنے کا طریقہ کیا ہے؟ نمازوں کی تعداد کیا ہے؟ اس کے فرائض' واجبات اور سنن کیا ہیں؟ اس کے اوقات کیا ہیں؟ پورا نظام

Marfat.com

صلوٰۃ کیا ہے؟ رسول کی راہنمائی کی بغیر ان میں سے کسی بات کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے پروردگار نے ارشاد فرمایا:

مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔

''جو شخص رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔''

اور خود آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ

مَنْ اَطَاعَنِیْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ وَمَنْ عَصَانِیْ فَقَدْ عَصَی اللّٰہَ

(جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی)۔

تاریخی حقیقت بھی یہ ہے کہ دنیا میں جب بھی کبھی کسی مذہب کو نقصان پہنچا ہے اور مذہب کے ماننے والوں نے اللہ کی اطاعت میں کمزوری دکھائی ہے اور آہستہ آہستہ خواہشات کے پیروکار بنتے چلے گئے اور اپنے دین کو انھوں نے موم کی ناک بنا دیا۔ اور اللہ کی کتابیں ان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئیں۔ اس المیہ کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کا تعلق اللہ کے رسول سے کمزور پڑا' رسول سے جذباتی رشتہ ٹوٹا' اس کی اطاعت اور پیروی تاویلوں کی نذر ہو گئی' رفتہ رفتہ اس کی سنت مٹتی چلی گئی۔ پھر ایک وقت آیا کہ جب اللہ کی کتاب میں من مانی تاویلات کو روکنے کے لیے کوئی رکاوٹ باقی نہ رہی۔ عبادات تک کا نظام بدل ڈالا گیا' تصورات بگاڑ دیے گئے' عقائد کو حقیقی روح سے بیگانہ کر دیا گیا۔ پوری انسانی زندگی کے نظام کا مرکز ومحور اگرچہ اللہ کی اطاعت ہے لیکن اس کی ظاہری شکل وصورت اور اس کی حقیقی روح کو باقی رکھنے کے لیے پیغمبر کی سنت کا محفوظ رہنا اور اس کی اطاعت کے جذبے کا باقی رہنا بے حد ضروری ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے آنحضرت ﷺ کی اطاعت اور اتباع پر یہاں تک زور دیا کہ

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ ۔

(اے پیغمبران سے کہہ دیجیے اگر تم اللہ سے محبت کرنا چاہتے ہو تو پھر میری پیروی کرو' اللہ تم سے محبت کرنے لگے گا اور تمھارے گناہوں کو بخش دے گا)

۳۔ مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد ان کے ماتحت تیسری اطاعت جو اسلامی نظام میں مسلمانوں پر لازم ہے وہ اولوالامر کی اطاعت ہے جو خود مسلمانوں میں سے ہو۔ اس

Marfat.com

آیت کریمہ میں غور فرمائیے اللہ اور رسول کے ساتھ تو مستقلاً اطیعوا کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت مستقل بالذات ہے لیکن اولوالامر کے ساتھ مستقل اطیعوا کا ذکر نہیں کیا گیا اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اولوالامر کی اطاعت مستقل بالذات نہیں ہے' بلکہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ماتحت ہے۔ وہ کوئی ایسا حکم نہیں دے سکتے جو اللہ اور رسول کے احکام سے متصادم ہو یا ان کے مزاج اور روح سے ہٹا ہوا ہو۔ اسے ہر حکم دیتے ہوئے یہ بتانا ہوگا کہ میں جو حکم دے رہا ہوں اس کے لیے قرآن وسنت کی سند کیا ہے؟

اولوالامر سے کیا مراد ہے؟

اس بحث کو آگے بڑھانے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ اولوالامر سے کیا مراد ہے اسے سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ایک تمہیدی بات سمجھ لیجئے۔ جب بھی ہم اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ہم سب سے پہلے قرآنِ کریم کو دیکھتے ہیں۔ اگر ہمیں واضح طور پر قرآنِ کریم میں کوئی حکم مل جاتا ہے تو ہم اس کی اطاعت میں سر جھکا دیتے ہیں۔ اور اگر قرآنِ کریم میں ہمیں واضح حکم نہیں ملتا تو پھر ہم احادیث پاک اور سنت رسول ﷺ کو دیکھتے ہیں۔ تو اگر تو حدیث یا سنت میں ہمیں کوئی واضح حکم مل جاتا ہے جس کے سمجھنے اور جس پر عمل کرنے میں کوئی دشواری حائل نہیں ہوتی تو ہم اس پر بہ صمیم قلب عمل کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں کوئی واضح حکم نہیں ملتا تو پھر ہمارے لیے مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ یعنی کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں ایک حکم تو موجود ہے لیکن وہ اس قدر واضح نہیں کہ ایک عام پڑھا لکھا آدمی اسے سمجھنے پر قادر ہو۔ کیونکہ قرآن کریم کا طریقہ یہ ہے کہ بعض دفعہ ایک آیت دوسری آیت کی تشریح کرتی ہے یا کسی حدیث سے آیت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آیت قرآنی کی ظاہری عبارت سے بات واضح نہیں ہوتی۔ البتہ اہل علم اور اہل بصیرت دلالۃ النص یا اقتضاء النص یا اشارۃ النص سے اس بات کو پا لیتے ہیں۔ لیکن عام قاری کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اور حدیث کے معاملے میں کبھی اس طرح کی صورت حال پیش آتی ہے کہ ایک ہی حکم سے متعلق ذخیرۂ احادیث میں متضاد روایات ملتی ہیں۔ اب ان میں یہ معلوم کرنا کہ کونسی روایت ناسخ ہے اور کونسی منسوخ؟ یا کونسی روایت اور درایت کے اعتبار سے قابل

Marfat.com

قبول ہے اور کونسی نہیں؟ ایسے تمام مواقع پر ہمیں مجتہدین اور قرآن وسنت کے ماہرین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اور ایسے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا ہے جنھوں نے قرآن وسنت کو سمجھنے اور اس کی ایک ایک مشکل کو سلجھانے میں زندگیاں کھپا دی ہوں۔ ایسی صورت حال میں اولوالامر سے مجتہدین قرآن وسنت اور ماہر علوم اسلامیہ مراد ہونگے۔ اگر تو حکومت کے اندر خود ایسے ماہرین موجود ہیں جو اس ضرورت کو پورا کر سکتے ہوں' پارلیمنٹ کا کوئی ذیلی ادارہ ایسے لوگوں پر مشتمل ہو یا نظریاتی کونسل جیسی کوئی کمیٹی نہایت اخلاص سے اس طرح کی خدمت انجام دینے میں لگی ہوئی ہو تو وہ آزادانہ اپنی رائے کا ایسے معاملات میں اظہار کریں اور امت کے ثقہ اہل علم آزادانہ بحث ومباحثہ کے بعد ان معاملات پر پارلیمنٹ کو فیصلے تک پہنچنے میں مدد دیں۔ اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ یہاں اولوالامر سے مراد یہ لوگ ہیں جن کا ہم نے ذکر کیا۔ اگرچہ یہ علماء کی کاوشیں فقہی فتاویٰ کہلاتی ہیں اور علماء ہی کی طرف منسوب کی جاتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ قرآن وسنت سے ماخوذ' مستنبط اور مستفاد ہیں۔ قرآن وسنت سے علیحدہ نہیں۔

زندگی کے بہت سارے معاملات ایسے ہیں جس میں اسلامی شریعت نے کوئی پابندی لگائی ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی حکم جاری فرمایا ہے۔ بلکہ ان پر عمل کرنے والوں کو اختیار ہے کہ جس طرح چاہیں کریں۔ شریعت کی اصطلاح میں ایسے معاملات کو ''مباحات'' کہا جاتا ہے۔ دفاتر کے انتظامی معاملات' مختلف اداروں کی تشکیلات' انسانی ضرورتوں کے نئے نئے منصوبے مثلاً میونسپلیٹی' ریلوے اور ڈاکخانہ کے قواعد وضوابط' پولیس اسٹیشنوں کی تعداد' آبادکاری کے انتظامی معاملات وغیرہ ...... یہ سب مباحات ہیں۔ ان میں سے ایک ایک ادارے کو چلانے کے لیے ظاہر ہے انتظامی ڈھانچہ استوار کرنا ہوگا اور اس کے سربراہ بھی مقرر کرنے ہوں گے۔ اسی طرح عدالتی فیصلوں کے لیے جج یا تمدنی اور معاشرتی امور میں قبیلوں اور بستیوں اور محلوں کی سربراہی کرنے والے شیوخ اور سردار' غرضیکہ پورے ملک میں درجہ بدرجہ اجتماعی معاملات کو سنبھالنے والے تمام صاحب امر کہلاتے ہیں۔ علماء اور مجتہدین دینی معاملات کے حوالے سے اولوالامر ہیں اور باقی تمام ذمہ دار لوگ انتظامی حوالے سے اولوالامر کہلاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر ایک طرف ملکی نظام کی پابندی کرنے کے پابند ہیں تو ساتھ ہی اپنے سیرت وکردار اور مقاصد حیات کے حوالے سے اسلامی آداب زندگی اختیار کرنے کے مکلّف ہیں۔ ان تمام کا سررشتہ پارلیمنٹ اور کابینہ سے ہوتے ہوئے چیف ایگزیکٹو اور صدر مملکت سے وابستہ ہوتا ہے۔

Marfat.com

اپنے بنیادی کردار کے حوالے سے وہ بھی باقی لوگوں کی طرح اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے پابند ہیں اور اجتہادی معاملات میں علماء کے اجتماعی فیصلوں کے مکلّف ہیں۔ ان کا براہ راست تعلق اگرچہ مباحاتی امور سرانجام دینے سے ہوتا ہے لیکن دینی امور کا نفاذ بھی بہر صورت انہی کی ذمہ داری ہے اس لیے ان کے سیرت و کردار میں اگر کوئی ایسی کمزوری ہو جو پوری ریاست کے مزاج پر اثر انداز ہو سکتی ہو تو اسلام اسے کسی طرح بھی گوارا نہیں کرتا۔ نبی کریم ﷺ کے مندرجہ ذیل ارشادات کو دیکھئے اس سے بات کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے گی:

السمع والطاعة على المرء المسلم فی مااحب وکره مالم یومر بمعصیة فاذا امر بمعصیة فلاسمع و لا طاعة۔

(بخاری ومسلم)

(مسلمان کو لازم ہے کہ وہ اپنے اولوالامر کی بات سنے اور مانے خواہ اسے پسند ہو یا ناپسند ہو تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر اسے نہ کچھ سننا چاہیے نہ ماننا چاہیے)

لاطاعة فی معصیة انماالطاعة فی المعروف۔

(بخاری ومسلم)

(خدا اور رسول کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت جو کچھ بھی ہے ''معروف'' میں ہے)

یکون علیکم امراء تعرفون وتنکرون فمن انکر فقد برئ ومن کره فقد سلم ولکن من رضی وتابع فقالوا افلا نقاتلهم!قال لاما صلوا۔ (مسلم)

(حضور ﷺ نے فرمایا تم پر ایسے لوگ بھی حکومت کریں گے جن کی بعض باتوں کو تم معروف پاؤ گے اور بعض کو منکر۔ تو جس نے ان کے منکرات پر اظہار ناراضی کیا وہ بری الذمہ ہوا اور جس نے ان کا ناپسند کیا وہ بھی بچ گیا مگر جو ان پر راضی ہوا اور پیروی کرنے لگا وہ ماخوذ ہوگا۔ صحابہ نے پوچھا پھر جب ایسے حکام کا دور آئے تو کیا ہم ان سے جنگ نہ کریں؟ آپ نے فرمایا نہیں جب تک کہ وہ نماز پڑھتے رہیں)

Marfat.com

یعنی ترکِ نماز وہ علامت ہوگی جس سے صریح طور پر معلوم ہوجائے گا کہ وہ اطاعتِ خدا اور رسول سے باہر ہوگئے ہیں اور پھر ان کے خلاف جدوجہد کرنا درست ہوگا۔

شرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم قلنا یارسول الله افلا ننابذهم عند ذلك؟ قال لاماافاموافیکم الصلوة الاما اقاموفیکم الصلوة۔ (مسلم)

(حضور ﷺ نے فرمایا تمھارے بدترین سردار وہ ہیں جو تمھارے لیے مبغوض ہوں اور تم ان کے مبغوض ہو۔تم ان پر لعنت کرو اور وہ تم پر لعنت کریں۔صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ! جب یہ صورت ہو تو کیا ہم ان کے مقابلہ پر نہ اٹھیں؟ فرمایا: نہیں! جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں نہیں۔جب تک وہ تمھارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں۔)

اس حدیث میں اوپر والی شرط کو اور زیادہ واضح کردیا گیا اوپر کی حدیث سے گمان ہوسکتا تھا کہ اگر وہ اپنی انفرادی زندگی میں نماز کے پابند ہوں تو ان کے خلاف بغاوت نہیں کی جاسکتی۔لیکن یہ حدیث بتاتی ہے کہ نماز پڑھنے سے مراد دراصل مسلمانوں کی جماعتی زندگی میں نماز کا نظام قائم کرنا ہے یعنی صرف یہی کافی نہیں ہے کہ وہ لوگ خود پابند نماز ہوں بلکہ ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے تحت جو نظام حکومت چل رہا ہو وہ کم از کم اقامت صلوٰۃ کا انتظام کرے۔یہ اس بات کی علامت ہوگی کہ ان کی حکومت اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ایک اسلامی حکومت ہے ورنہ اگر یہ بھی نہ ہو تو پھر اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ حکومت اسلام سے منحرف ہوچکی ہے اور اسے الٹ پھینکنے کی سعی مسلمانوں کے لیے جائز ہوجائے گی۔اسی بات کو ایک اور روایت میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ نبی ﷺ نے ہم سے من جملہ اور باتوں کے ایک اس امر کا عہد بھی لیا کہ

ان لاتنازع الامر اهله الاان تروا کفرا بواحاعندکم من الله فیه برهان۔

(ہم اپنے سرداروں اور حکام سے نزاع نہ کریں گے الا یہ کہ تم ان کے کاموں میں کھلا کھلا کفر دیکھو جس کی موجودگی میں ان کے خلاف تمھارے پاس خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے دلیل موجود ہو) (بخاری و مسلم)

Marfat.com

اختلاف کی صورت میں آخری مرجع اور سند

۴۔ چوتھی بات جو آیت زیرِ بحث میں ایک مستقل اور قطعی اصول کے طور پر طے کردی گئی ہے یہ ہے کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند (Final authority) کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان یا حکومت اور رعایا کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن اور سنت کی طرف رجوع کیا جائے گا اور جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِتسلیم خم کردیں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ لازمی خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظامِ زندگی سے ممیّز کرتی ہے ،جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

اسی لیے اس آیت کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِی شَیْءٍ فَرُدُّوْہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوْلِ الخ تنازع کے معنی اختلاف رائے کے آتے ہیں۔ یعنی کسی معاملے میں کسی کی رائے کچھ ہو کسی کی کچھ، موقع دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ اختلاف رائے ہے جو کسی معاملے میں حکم شریعت معین کرنے کے باب میں ہوسکتا ہے۔ مثلاً کسی نص شرعی کی تعبیر و تاویل میں اختلاف رائے ہو جائے۔ یا کسی امرِ اجتہادی میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ یہ اختلاف قرآن کی کسی آیت یا رسول کی کسی سنت کی تاویل میں بھی ہوسکتا ہے اور غیر منصوص معاملات میں کتاب وسنت سے اوفق کے تعین میں بھی۔ علی ہذا القیاس یہ اولوالامر اور عوام کے درمیان بھی ہوسکتا ہے اور خود اولوالامر کے اندر آپس میں بھی ہوسکتا ہے۔ اس طرح کا جب کوئی اختلاف واقع ہو تو اس کے حل کے لیے امت کو یہ ہدایت ہوئی کہ اس معاملے کو اللہ اور رسول کی طرف لوٹاؤ۔ ''اللہ و رسول کی طرف لوٹاؤ'' کا مطلب یہ ہے کہ اگر کتاب وسنت کے نصوص میں اس معاملے کے لیے کوئی قطعی راہنمائی موجود نہیں ہے تو ان کے اشارات، مقتضیات، فحویٰ اور امثال و نظائر کو پیش نظر رکھ کر اس میں اوفق بالکتاب والسنۃ کا تعین کرو اور اس کو اختیار کرو۔ فرمایا کہ یہ طریقہ تاویل کے پہلو سے سب سے زیادہ بہتر و اعلیٰ ہے۔ اس لیے کہ ظن غالب یہی ہے کہ یہ بات اللہ و رسول کی بات کے موافق ہوگی اور اختلاف کا فیصلہ اس قانون کے مطابق ہوگا جو اسلام میں اصل قانون اور تمام فقہ و اجتہاد کا مرکز و مرجع ہے اور یہی طریقہ ہے نظام اجتماعی وسیاسی میں حاکمیت الٰہی کے پوری مضبوطی کے ساتھ پکڑنے اور اعتصام بحبل اللہ کا اور یہی حقیقی توحید ہے۔

Marfat.com

30- ہدایت کے حوالے سے انتہائی توجہ طلب امور

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓی اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰـهُمْ بِالْـبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ O فَلَوْلَآ اِذْ جَآئَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰـكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾

اور ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی امتوں کے پاس اپنے رسول بھیجے' پس ان کو مالی اور جسمانی تکالیف میں مبتلا کیا۔ تا کہ وہ خدا کے آگے جھکیں تو کیوں جب ان پر ہماری پکڑ آئی تو خدا کی طرف نہ جھکے' بلکہ ان کے دل سخت ہو گئے اور شیطان نے ان کی نگاہوں میں اسی عمل کو کھبا دیا' جو وہ کرتے رہے۔''

عذابِ الٰہی کے تدریجی مراحل

ان آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب کے اس پراسس اور اس تدریجی عمل کے پہلے حصے کو بیان فرمایا ہے' جس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کا عذاب کسی بھی قوم پر نازل ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس تاریخی روایت کو بھی بیان کیا ہے' جو اس حقیقت پر شہادت کا درجہ رکھتی ہے۔ اسے تو ہم بعد میں بیان کریں گے' سب سے پہلے اللہ کی اس سنت اور اس پراسس کو سمجھ لینا چاہیے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ نے اس زمین پر انسان کو بسایا ہے اور ان کو اس زمین پر خلافت کا تاج بھی پہنایا ہے۔ اس کو بہت ساری مخلوقات پر فضیلت بھی عطا فرمائی ہے۔ اس زمین پر درحقیقت اسی کی فرمانروائی ہے اور وہی اس گلشنِ ہستی کا گلِ سر سبد ہے' جس سے اس

Marfat.com

چمن کو آراستہ کیا گیا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسے عذاب کا شکار بنایا جائے اور بلاوجہ اسے تباہ کر دیا جائے۔ مشرکین بار بار جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہیں انھوں نے عذاب کو بھی ایک کھیل سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ کسی بھی قوم پر اللہ کا عذاب اس کی مکمل تباہی اور اس کی جڑ کٹ جانے کے مترادف ہے۔ کسی بھی گلشن کا سجانے والا' بلاوجہ کبھی اپنے گلشن کو اجاڑنا پسند نہیں کرتا۔ وہ تو ان لوگوں کو بھی پسند نہیں کرتا' جو اس گلشن کی بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ اسی لیے ہمیشہ فساد فی الارض کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ خود وہ اس چمن کو برباد کر دے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس نے قوموں پر عذاب بھیجے ہیں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ دراصل کسی بھی قوم پر عذاب اس وقت بھیجتا ہے' جب کہ اس قوم کا وجود اس گلشن کے لیے تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اس لیے اس کے یہاں حقیقی ترجیح اس بات کو حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے ہر گروہ کو حتی الامکان اس تباہی اور اس عذاب سے بچائے۔ اس لیے اس کی سنت یہ ہے کہ جب بھی کہیں بگاڑ پھیلتا ہے اور انسان گمراہی کا راستہ اختیار کرتے ہیں تو وہ ان کی ہدایت اور اصلاح کے لیے اپنے رسول بھیجتا ہے' اپنی کتابیں اتارتا ہے۔ رسول دنیا میں آ کر اللہ کی کتاب کی دی ہوئی روشنی کے مطابق بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں' خون کے گھونٹ پی پی کر ان کے ساتھ خیر خواہی کرتے ہیں اور ان کی زندگی سنوارنے میں لگے رہتے ہیں۔ جب تک ان میں خیر کی کوئی امید باقی رہتی ہے اور کسی ایک آدمی کے اصلاح پذیر ہونے کی بھی امید کی جا سکتی ہے' اللہ کے یہ فرستادہ لوگ اللہ کے حکم سے اپنے کام کو جاری رکھتے ہیں۔ لیکن جب یہ قوم ان کی دعوت کے ساتھ نامناسب طرزِ عمل اختیار کرتی ہے' حتی کہ اپنے ان محسنوں کے ساتھ دشمنی کا رویہ اختیار کر لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ انھیں تنبیہ کرنے اور اپنے نبیوں اور رسولوں کی صداقت کو واضح کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً انھیں مصائب میں مبتلا کرتا ہے۔ ان مصائب کے لیے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے ﴿الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ﴾۔ بَاْسَآءِ کا معنی ہے' مالی دشواریاں اور مالی مصیبتیں اور ضَرَّآءِ کا معنی ہے' جسمانی عوارض اور جسمانی مصیبتیں یعنی اس قوم کو کبھی تو اس طرح مالی مشکلات میں مبتلا کیا جاتا ہے کہ ان کے کاروبار میں تعطل پیدا کر دیا جاتا ہے۔ تجارتیں نقصان کا شکار ہوتی ہیں' کھیتیاں ویران ہونے لگتی ہیں۔ بعض دفعہ ملک قحط سالی کا شکار ہو جاتا ہے' بارشیں روک دی جاتی ہیں یا بارشوں کی کثرت سے سیلاب کی صورت پیدا کر دی جاتی ہے۔ صنعتی

Marfat.com

اداروں میں باہمی خلفشار کے نتیجے میں پہیہ جام ہونے لگتا ہے۔ ملک سیاسی طور پر سیاسی انارکی کا شکار ہو کر بے استحکامی کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کبھی بڑی سے بڑی توانا قوم کو بھی جو اپنے یہاں ایک مضبوط صحت کا نظام رکھتی ہے جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ جب ان کے اخلاق بگڑتے ہیں تو اس کے نتیجے میں بعض ایسی بیماریاں جنم لیتی ہیں جن کی نہ تشخیص ہو سکتی ہے' نہ تجویز ممکن ہوتی ہے۔ وبائیں پھیلنے لگتی ہیں' متعدی امراض میں اضافہ ہو جاتا ہے اور یہ پہلے بھی ہوتا رہا' آج بھی قدرت بعض دفعہ کہیں کہیں اس کے جھٹکے دیتی ہے۔ مغربی دنیا میں ایڈز کی بیماری کا پھیلنا آج تک ایک لاینحل مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کینسر نے پوری دنیا کو پریشان کر رکھا ہے اور اب مختلف قسم کا یرقان لاعلاج ہوتا جا رہا ہے۔ اس طرح کے مصائب میں اللہ کی ہدایت کا راستہ روکنے والی قوموں اور رسولوں پر ایمان نہ لانے والوں کو اس لیے مبتلا کیا جاتا ہے تاکہ وہ اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کریں' اس کی کبریائی کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی بندگی کو سمجھیں اور اس کے سامنے فروتنی کا اظہار کرتے ہوئے' اس کی عبادت اور عبودیت کے لیے جھکیں یعنی یہ تکلیفیں اور مصائب محض ان کو پریشان کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ یہ بتانے کے لیے ہوتے ہیں کہ تمھارا کوئی آقا و مالک بھی ہے۔ اس زمین کا کوئی نگران بھی ہے۔ تم اگر اس کی ہدایت کو قبول نہیں کر رہے اور تم نے اس کے ہر حکم کو ماننے سے انکار کر دیا ہے اور اس کے رسولوں سے مسلسل بدسلوکی کر رہے ہو اور زمین کو تم نے فساد سے بھر دیا ہے تو اس طرح کی تکلیفوں میں انھیں مبتلا کر کے بتلایا جاتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھو کہ تم کسی کی گرفت میں نہیں آسکتے' یہی چھوٹی چھوٹی مصیبتیں کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی ہیں اس لیے اس کی ذات کے سامنے جھکو اور اس کے رسولوں پر ایمان لا کر اس کی اطاعت اور اس کی بندگی اختیار کرو۔

دل کی سختی سے مراد

دوسری آیت میں بجائے اس کے کہ یہ بتایا جاتا کہ بگڑی ہوئی قومیں جب اس طرح کی تنبیہات کے بعد بھی راہ راست پر نہیں آتیں تو پھر اللہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ اسی بات کو ایک سوال کی شکل دی گئی' ہے جس سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ انسانی فطرت لازماً اپنے پروردگار کے احساس سے بہرہ ور ہے۔ جب کبھی اس پر غفلت کے پردے پڑنے لگتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب کی صورت میں تنبیہات اس کے پردوں کو چاک کرتی ہیں تو

Marfat.com

انسان فوراً اپنی فطرت کو پہچانتا ہے اس کی آواز پر کان دھرنے لگتا ہے اور اس کے نتیجے میں ایمان کی دعوت کو قبول کر لیتا ہے۔ لیکن جب کوئی قوم حد سے گزر جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے اس کی فطرت مردہ ہو چکی ہے۔ پھر وہ ان مصائب کی کوئی نہ کوئی تاویل کرتی ہے اور کوئی نہ کوئی عقلی توجیہ کر کے اپنی بے عملی بد عملی بلکہ بے دینی کا جواز پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ فرمایا ان لوگوں کا بھی یہی حال معلوم ہوتا ہے کہ جب اللہ کی طرف سے مصائب کا ان پر نزول ہوا تو یہ کیوں نہیں اس کے سامنے جھکے۔ پھر خود ہی اس کا جواب دیا کہ اس لیے نہیں جھکے کہ یہ اپنی فطرت سے محروم ہو چکے ہیں۔ ان کے دل جہاں سے ان کو فطرت کی آواز سنائی دے سکتی ہے وہ اتنے سخت ہو گئے کہ انھوں نے کام کرنا چھوڑ دیا اور انسان کا دل جب سخت ہو جاتا ہے یعنی اپنے اللہ کی اطاعت سے انکار کر دیتا ہے تو پھر اس سے کسی خیر کی توقع نہیں رہتی۔ پھر ان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اللہ کی طرف سے نازل ہونے والے مصائب کو تنبیہ سمجھ کر اپنی غلطیوں سے توبہ کرنے کی کوشش کریں، وہ کوئی نہ کوئی اس کی توجیہ کر کے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو جن لوگوں سے واسطہ پڑا' ان کو بھی وقتاً فوقتاً ایسے مصائب سے دوچار کیا گیا۔ لیکن قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ بجائے اس کے کہ وہ اس کے نتیجے میں اللہ کے سامنے جھکتے' انھوں نے اس کی تاویلیں کیں اور اپنی روش پر قائم رہے۔ انھوں نے کہا کہ ہم جن مصائب سے گزر رہے ہیں' یہ غلط بات ہے کہ یہ اللہ کی نافرمانی کا نتیجہ ہے یا اللہ ہمیں اس سے تنبیہ کر رہا ہے۔ بلکہ یہ تو وقت کے وہ انقلابات اور وہ اتفاقی حوادث ہیں' جن سے ہمیشہ انسانوں کو واسطہ پڑتا رہا ہے۔ کہا:

﴿قَدْ مَسَّ آبَاءَنَا الضَّرَّاءُ وَالسَّرَّاءُ﴾ (الاعراف:۹۵)

''اگلے بھی ایسے گرم اور نرم حالات سے دوچار ہوتے رہے ہیں''

یہ تو دنیا کی ریت ہے' ہم کوئی پہلی دفعہ اس طرح کے حالات سے دوچار نہیں ہوئے۔ برا وقت بھی اچھے وقت کی طرح گزر جاتا ہے' یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ عجیب بات ہے کہ جو بات آج کا دانشور اور ہمارا پڑھا لکھا طبقہ ایسے حالات میں کہا کرتا ہے' وہی بات ساڑھے چودہ سو سال پہلے کا مشرک بھی کہتا تھا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی فطرت ہر دور میں ایک رہی ہے اور ایک ہی رہے گی۔ اس لیے جب بھی کبھی ایسے حالات پیدا ہوں گے اور اللہ اپنے بندوں پر مہربانی فرماتے ہوئے ان کو یہ چھوٹے چھوٹے مصائب کی صورت میں جھٹکے دے گا تا کہ وہ راہ

Marfat.com

راست پر آ جائیں تو ہمیشہ کی طرح دو طرح کے گروہ پیدا ہوں گے۔ ایک وہ گروہ جو ان مصائب کو واقعی تنبیہات سمجھ کر ایمان کے راستے پر آ جائے گا اور ہدایت اختیار کر لے گا اور دوسرا وہ گروہ جو مختلف اسباب کے تحت اپنے بگاڑ میں اور پختہ ہوتا جائے گا۔ اس کا سبب بھی یہاں بیان کیا گیا ہے کہ جب بھی اللہ کے نبی اور اس کے رسول یا مصلحین دنیا میں اصلاح کا عمل شروع کرتے ہیں تو ابلیس بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت ان کا راستہ روکنے اور انسانوں کو بگاڑ میں پختہ کرنے کا عمل شروع کر دیتا ہے۔ چنانچہ اس کا لشکر جس میں زندگی کے ہر طبقے کا نمائندہ موجود ہوتا ہے' وہ ان کو زندگی کے ہر شعبے میں پھیلا دیتا ہے' تاکہ لوگوں کو اصلاح کے عمل سے متاثر ہونے سے روکے اور شیطان کا یہ لشکر سارا زور اس بات پر صرف کرتا ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو' یہ مت سمجھو کہ اس میں کسی غلطی یا بگاڑ کا شائبہ بھی ہو سکتا ہے۔ تمھارے تمام اعمال اور تمھاری زندگی کے تمام اطوار بالکل ٹھیک جہت پر جا رہے ہیں۔ تمھاری علمی کاوشیں' تمھارے کاروبار کے طریقے' تمھارے تہذیبی و ثقافتی ادارے' تمھارے اجتماعی عوامل ان میں کہیں بھی ٹیڑھ نہیں پایا جاتا۔ اس لیے تمھیں اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ یہ شیطانی لشکر' جب پوری طرح ان کے اعمال کو ان کے سامنے خوبصورت پیرائے میں پیش کر کے ان کو ہر طرح سے مطمئن کر دیتا ہے تو یہ وہ موقع ہے جسے کہا جا سکتا ہے کہ ان کے دل سخت ہو گئے۔ اب وہ کسی ہدایت کو سننے کے بھی روادار نہیں ہوتے۔ ان کے اہلِ علم اپنے علمی پندار کی وجہ سے یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہماری علمی دریافتوں اور ہمارے علمی رویے کو کون چیلنج کر سکتا ہے؟ وہ چونکہ کبھی اپنے علمی رویے پر نظرِ ثانی کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے اس لیے یہ ان کا علمی پندار ان کو بالآخر محرومی کی دلدل میں اتار دیتا ہے۔ اقبال مرحوم نے ایک موقع پر کہا تھا کہ "بعض لوگوں کو کنجِ تنہائی میں بیٹھے بیٹھے ہمہ دانی کا دعویٰ ہونے لگتا ہے" ظاہر ہے کہ یہ ہمہ دانی کا دعویٰ آدمی میں ایک ایسے پندار کو جنم دیتا ہے' جس پر کسی نصیحت کے اثر کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح دولت کا نشہ' دولت مندوں کو کسی کی بات سننے پر کبھی آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ بیوروکریٹس میں اقتدار کا خمار کسی بات کے سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ حکمرانوں میں حکومت کا طنطنہ ایک ایسا آہنی پردہ ثابت ہوتا ہے' جس میں کسی صحیح بات کا دخل ممکن نہیں ہوتا۔ یہ دل کی وہ سختی ہے جو انسان کو ہدایت سے محروم کر دیتی ہے۔ دل عجیب چیز ہے۔ یہ جب تک نرم ہے تو پھول کی پتی سے بھی زیادہ نرم ہے لیکن جب سخت ہوتا ہے تو پتھروں

Marfat.com

کی سنگینی بھی اس کے سامنے چھوٹ جاتی ہے۔ پتھر باوجود اس کے کہ ہماری نگاہوں میں اس قدر سخت چیز ہے کہ جس میں کسی چیز کی جوت لگنا ممکن نہیں۔ لیکن قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ کا خوف ان میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ سورۃ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ ان میں بعض پتھر ایسے ہیں کہ جو اللہ کے خوف سے پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی رواں ہو جاتا ہے اور بعض پتھر پہاڑ کی بلندی سے اللہ کے خوف کے باعث لڑھک جاتے ہیں۔ لیکن انسان کا دل جو گوشت کا لوتھڑا ہے' وہ اس قدر سخت ہو جاتا ہے کہ اس پر نہ اللہ کا کلام اثر کرتا ہے اور نہ اللہ کے رسول کی معجز بیانی۔

دل کی کیفیت کو پوری تفصیلات سے سمجھنا تو انسانی عقل کے بس کی بات نہیں۔ لیکن ہم اپنے معمولات میں بعض لوگوں کے طرزِ عمل کو دیکھ کر کچھ نہ کچھ ضرور سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بیمار لوگوں میں بھی دو طرح کا طرزِ عمل پایا جاتا ہے۔ بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ اپنے صحیح طرزِ فکر اور صحیح احساس کے باعث' معمولی سے معمولی بیماری کو بروقت محسوس کر کے' اسے دور کرنے میں کوشاں رہتے ہیں۔ لیکن بعض بیمار ایسے بھی ہوتے ہیں کہ انھیں بیماری کا احساس دلانا بھی بجائے خود ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے مسدس میں لکھا ہے کہ کسی شخص نے بقراط سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک مہلک امراض کیا کیا ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ کوئی مرض ایسا نہیں' جس کی دوا اللہ نے پیدا نہ کی ہو۔ لیکن ایک مرض ہے' جو لاعلاج ہے اور کوئی بڑے سے بڑا مسیحا بھی اس کا علاج نہیں کرسکتا۔ کہا

مگر وہ مرض جس کو آسان سمجھیں
کہے جو طبیب اس کو ہذیان سمجھیں
سبب یا علامت گر اس کو سجھائیں
تو تشخیص میں سو نکالے خطائیں

یہ وہ شخص ہے' جس کا اپنے مرض کی جانب سے دل سخت ہو گیا ہے اور اب اس کی یہ کیفیت باقی نہیں رہی کہ وہ اپنے مرض کا صحیح احساس کر سکے۔ بقراط نے کہا کہ ایسے مریض کا دنیا میں کوئی علاج نہیں۔ روح دل اور اخلاق کی بیماریاں بھی جسمانی بیماریوں کی طرح ہی ہیں' صرف ناموں کا فرق ہے۔ جسمانی بیماریوں کو اگر ہم بخار' نزلہ' کینسر اور یرقان وغیرہ کے ناموں سے یاد کرتے ہیں تو روحانی بیماریاں اعتقادات' اخلاقیات' اعمال' معاملات اور آدابِ زندگی کا بگاڑ کہلاتی ہیں۔ جس طرح ایک آدمی اپنی جسمانی بیماریوں سے بے حس ہو جاتا ہے' اسی طرح

Marfat.com

بلکہ اس سے بھی بڑھ کر بعض دفعہ آدمی اپنی روحانی اور اخلاقی بیماریوں کو سمجھنے سے عاری ہو جاتا ہے اور یہی وہ چیز ہے، جس کو یہاں دل کا سخت ہونا کہا گیا ہے اور پھر عجیب بات یہ ہے کہ جسمانی بے حسی پیدا کرنے کے لیے باقاعدہ کوششیں نہیں کی جاتیں، لیکن روحانی بے حسی پیدا کرنے کے لیے تو پورا ایک ابلیسی لشکر ہے جو مختلف صورتوں میں ہر دور میں موجود رہا ہے۔ یہ مشرکینِ مکہ کے اندر بھی تھا جس کے آثار ہمیں ان کی تاریخ میں ملتے ہیں اور قرآن کریم نے بھی کئی جگہ ان کا ذکر کیا ہے اور آج ہمارے گرد و پیش میں بھی موجود ہے۔ اگر آدمی تھوڑی سی گہری نگاہ سے دیکھے تو اسے ہر اجتماعی ادارے میں اس ابلیسی لشکر کے ارکان کام کرتے دکھائی دیں گے۔ آپ یونیورسٹیوں تک میں دیکھیں گے کہ ایسے اساتذہ کرام موجود ہیں، جو مسلمان کہلانے کے باوجود اسلام کے خلاف ایسی بدگمانیاں نوجوانوں کے دلوں میں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ جس کی امید شاید کسی کافر سے بھی نہ کی جاسکے۔ وہ اس طرح اسلوب بدل بدل کر اور مختلف عنوانات کے تحت بچوں کی برین واشنگ کرتے ہیں جس کے نتیجے میں یہی بچے بڑے ہو کر اخلاقی مفاسد کا بھی شکار ہوتے ہیں اور زندگی میں ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز ہو کر قومی زندگی کو مسموم بھی کرتے ہیں۔ ہمارے اخبارات کے دامن ایسے کالموں سے بھرپور ہوتے ہیں، جنھوں نے ہمارے قومی کردار اور افکار پر نہایت خطرناک اثرات ڈالے ہیں اور پھر ہمیں شاید معلوم نہیں کہ تمام لادینی قوتوں اور بیرونی ممالک کی جانب سے یہاں ہمیشہ ایک پانچواں کالم کام کرتا ہے، جو بعض دفعہ غیر محسوس طریقے سے ایسے ایسے خیالات کو دل و دماغ میں راسخ کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ جب تک گہری نظر سے نہ دیکھا جائے، اس کی سُمّیت کا صحیح اندازہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ آج کل ہمارے اخبارات میں ایسی ہی قوتوں کے زیر اثر بعض ایسے ایسے اسلامی کالم لکھوائے جا رہے ہیں جو عام نگاہوں میں ممکن ہے اسلام کی کوئی خدمت دکھائی دیتی ہو، لیکن حقیقت میں وہ ایسا مخفی زہر ہے جس سے ہماری پوری قومی زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ اس طرح کے تمام کالموں میں اسلام کے مبلغ بن کر اور اسلامی قوتوں کے ساتھ قریبی تعلق کا اظہار کرنے کے بعد دینی سیاسی جماعتوں کو یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ آپ اگر یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان آپ کو قبول کر کے آپ کو اسمبلی میں پہنچائیں اور وہاں پہنچ کر آپ اسلامی نظام لانے میں کامیاب ہوں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ جو چیزیں مسلمان قوم قبول کر چکی ہے، آپ ان کی مخالفت نہ کریں۔ یہ صحیح ہے کہ وہ چیزیں غلط ہیں اور اسلام انھیں قبول

Marfat.com

نہیں کرتا' لیکن سوال یہ ہے کہ ایک تو یہ بات کہ صحیح اور جائز کیا ہے اور ایک یہ کہ آج کے دور میں کیا چل سکتا ہے؟ اس سلسلے میں ہمیں زیادہ آئیڈیلسٹ نہیں ہونا چاہیے' بلکہ حقیقت پسند بن کر زمینی حقیقتوں کو سمجھ کر معروضی حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے اسلام کی وہ تاویل لوگوں کے سامنے رکھنی چاہیے' جو ان کے لیے قابل قبول ہو سکتی ہو۔ مثلاً آپ ان کے سامنے فنون لطیفہ کے بارے میں کچھ نہ کہیں' اس لیے کہ یہ فنون ہماری ثقافتی بلکہ تہذیبی زندگی میں رچ بس گئے ہیں اور ہمارے مزاج کا اس طرح حصہ بن گئے ہیں کہ اب ان کی مخالفت کرنا گویا اپنی مخالفت کو دعوت دینا ہے۔ اسی طرح اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ خواتین کی رائے اپنے حق میں کر سکیں تو پھر ضروری ہے کہ آپ حجاب اور نقاب کے مسئلے کو نہ چھیڑیں۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت اب نقاب پہننا اور حجاب میں رہنا پسند نہیں کرتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ملک کا کاروباری طبقہ آپ کے بارے میں بدگمان نہ ہو تو پھر سود کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں کہنا چاہیے' کیونکہ اس سے یہ غلط فہمی ہونے لگتی ہے کہ آپ ملک کی اقتصادیات کو تلپٹ کر کے رکھ دیں گے اور ظاہر ہے کاروباری طبقہ اس کو ایک لمحے کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسلام میں جہاد کی اہمیت کچھ بھی ہو' آپ کبھی بھول کر بھی اسے زبان پر نہ لائیے۔ ورنہ دہشت گردی کا الزام آپ پر چسپاں ہو جائے گا اور آپ قابل قبول تو کیا ہوں گے' لوگ آپ سے خوف کھانے لگیں گے۔

اندازہ کریں! بظاہر یہ مشورے کس قدر پسندیدہ ہیں اور کس قدر مصلحت پر مبنی اور حکمت کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر آپ یہ اصول تسلیم کر لیں کہ آپ ہر وہ بات کہیں گے جو سننے والے کے لیے قابل قبول ہو تو پھر آپ بتائیے! آپ کون سی بات کہیں گے؟ ایک بے نماز کے لیے نماز قابل قبول نہیں' رشوت لینے والے کے لیے حلال کمائی کا تصور وحشت ناک تصور ہے' سیاست دانوں کو آداب سیاست کا وعظ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے والی بات ہے' حکمرانوں کو آداب حکومت سمجھانا دشمنی مول لینے والی بات ہے۔ اس کا تو مطلب یہ ہے کہ ہم شاید وہاں پہنچ گئے ہیں' جس کے بارے میں مولانا روم نے ایک مثال دی تھی کہ کوئی آدمی کسی مصور کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا کہ صاحب میرے بازو پر شیر کی تصویر بنا دیں۔ اس نے جب تصویر بنانے کے لیے پرکار کی سوئی چبھوئی تو اس نے تکلیف محسوس کر کے پوچھا کہ یہ آپ کیا بنانے لگے ہیں؟ مصور نے کہا: شیر کی دم بنانے لگا ہوں۔ اس شخص نے کہا: چھوڑیئے! کیا دم کٹے شیر نہیں ہوتے؟ کچھ اور بنائیے۔ اس نے پھر سوئی چبھوئی' تکلیف ہوئی تو اس نے پھر

Marfat.com

پوچھا کہ اب آپ کیا بنانے لگے ہیں؟ مصور نے کہا: ٹانگیں بنانے لگا ہوں۔ اس نے کہا: یہ رہنے دیجیے' اس شیر نے کہاں چل کر جانا ہے۔ اس نے پھر سوئی چھوئی تو اس شخص نے پوچھا کہ اب آپ کیا بنا رہے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ اس کا پیٹ بنانے لگا ہوں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ کوئی سچ مچ کا شیر تھوڑا ہے' جس نے کچھ کھانا پینا بھی ہے۔ آپ اسے رہنے دیجیے کچھ اور بنایئے۔ مصور نے پرکار زمین پر رکھ دی اور کہا کہ اللہ نے ایسا شیر پیدا نہیں کیا' جس کی نہ ٹانگیں ہوں' نہ پیٹ ہو' نہ دم ہو اور وہ پھر بھی شیر ہو۔ شیطانی قوتوں نے انسانوں کو ایمانی ہدایت سے دور رکھنے اور دل و دماغ کو مسموم کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے ہیں اور جس طرح لوگوں کے افکار اور اعمال کو آراستہ کر کے انھیں دکھایا ہے اس کی یہ چند مثالیں ہیں جن کا میں نے آپ کے سامنے ذکر کیا ہے۔ شیطانی قوتوں کا یہ حربہ ہر دور میں کامیاب رہا ہے اور مشرکین مکہ اسی کی گرفت میں تھے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ شیطان کی اسی گرفت سے نکالنے کے لیے پروردگار لوگوں کو ان مصائب سے دوچار کرتا ہے کہ شاید وہ اللہ کی طرف رجوع کریں۔ لیکن جب وہ اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتے ہیں اور ان مصائب کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کر کے' اپنے آپ کو مطمئن کر لیتے ہیں تو پھر اللہ کی سنت کا دوسرا مرحلہ سامنے آتا ہے' جس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا گیا ہے:

﴿فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ﴾

"تو جب انھوں نے فراموش کر دیا اس چیز کو' جس کی ان کو یاد دہانی کی گئی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیے۔ یہاں تک کہ جب وہ اس چیز پر اترانے لگے' جو انھیں دی گئی تو ہم نے ان کو دفعتاً پکڑ لیا۔ وہ بالکل ہک دک رہ گئے"۔

مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ سے مراد:

اس آیت کریمہ میں مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ کے دو مطلب علماء نے مراد لیے ہیں۔ ایک یہ کہ اس سے مراد وہ مصائب ہیں' جن سے انھیں دوچار کیا گیا تھا کہ وہ نصیحت حاصل کریں۔ جب انھوں نے ان مصائب کی پرواہ نہ کی اور جس مقصد کے لیے ان مصائب میں انھیں مبتلا کیا گیا

Marfat.com

تھا اسے قبول نہ کیا تو پھر اگلا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ انھیں جس بات سے نصیحت کی گئی تھی یعنی اللہ کے رسول کی دعوت اور اللہ کی کتاب کے واسطے سے' جب انھوں نے اس پر کان نہ دھرے تو تب اس سنت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مصائب کو ختم کر دیتا ہے اور لوگ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ مصائب کا ایک وقتی دور آیا تھا' جیسے ہر قوم پر آیا کرتا ہے' وہ گزر گیا۔ اس لیے اس کا کوئی تعلق پیغمبر کی دعوت سے ہرگز نہیں تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم پھر انھیں ڈھیل دے دیتے ہیں اور اس ڈھیل کو مزید موثر بنانے کے لیے ہر چیز کے دروازے ان پر کھول دیتے ہیں۔ یعنی وقت پر بارشیں ہونے لگتی ہیں' کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں' پیداوار میں اضافہ ہو جاتا ہے' پھل دار درخت پھلوں سے گراں بار ہو جاتے ہیں' زمین سبزے کا مخملی لباس پہن لیتی ہے' جانوروں میں دودھ کی فراوانی ہو جاتی ہے' صنعتوں کا پہیہ تیزی سے چلنے لگتا ہے' کاروبار میں تیزی آ جاتی ہے دولت کی ریل پیل ہو جاتی ہے اور ہن برسنے لگتا ہے' جس چیز میں یہ قوم ہاتھ ڈالتی ہے وہ سونا بن جاتی ہے نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اللہ سے اور دور ہو جاتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں پر شکر کرنے کی بجائے اترانے لگتے ہیں۔ دولت کے نشے میں تمام انسانی اقدار اور شرم و حیا کی تمام حدود کو پامال کر دیتے ہیں۔ اخلاقیات کا ایک ایک بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ اللہ کے رسولوں کی دعوت' ان کے لیے ایک اجنبی بلکہ مکروہ آواز بن جاتی ہے۔ پھر اللہ کا عذاب حرکت میں آتا ہے اور اچانک ان کو پکڑ لیا جاتا ہے۔ اب وہ ایسے ہو جاتے ہیں جیسے بارش والی رات میں باڑے کے ایک کونے میں سمٹی ہوئی بکریاں اور یا اس آدمی کی طرح جو اپنے جھونپڑے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پناہ لیے ہوئے ہو اور سر پر گھٹا تلی کھڑی ہو بادل کڑکتے ہوں اور بجلی کوندر ہی ہو کہ اچانک اس کے سر سے چھت اڑ جائے اب وہ جس طرح بے بسی کی تصویر بن کر اور حواس باختہ ہو کر رہ جاتا ہے اسے کچھ نہیں سوجھتا کہ اب وہ کیا کرے یہ لوگ اس سے زیادہ بے بس ہوتے ہیں۔ ان کا سارا کروفر' ان کا سارا ٹھاٹھ باٹھ ان کی ساری سطوتیں ان کی اس بے بسی میں کچھ کام نہیں آتیں' اب موت ان کے شکار میں ہوتی ہے اور یہ موت کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ان پر گزرتی ہے' اس کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں کیا جا رہا ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''بس ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی' جنھوں نے ظلم کا ارتکاب کیا تھا اور

Marfat.com

شکر کا سزاوار حقیقی اللہ ہے۔ تمام عالم کا رب۔''

پھر ان کی جڑ کاٹ کے رکھ دی جاتی ہے۔ یعنی ان کو دنیا سے مٹا دیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی بداطواریوں کے باعث شجرِ انسانیت کے برگ و بار تو پہلے ہی ضائع کر ڈالے تھے' وہ زمین پر انسانوں کی طرح نہیں بلکہ حیوانوں یا درندوں کی طرح زندگی گزار رہے تھے۔ انھوں نے ایک ایک کر کے اقدار انسانیت کا جنازہ نکال دیا تھا۔ اب لے دے کے ان کی جڑ باقی تھی کیونکہ پہلے مصائب نے ان کو جڑ سے نہیں اکھاڑا تھا اس عذاب نے آ کر انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا اور اس کی تاریخی شہادت دیکھنی ہو کہ کس طرح ایسی قومیں اللہ کے عذاب کا شکار ہو کر دنیا سے مٹائی جاتی رہی ہیں تو اس کے لیے قومِ عادؑ قومِ ثمودؑ قومِ صالح اور قومِ لوط کے کھنڈرات کو دیکھ لینا کافی ہے۔ آغاز کلام میں اسی کا حوالہ دیا گیا تھا کہ اس تاریخی حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے اچھی طرح سمجھ لو کہ تم بھی انہی راہوں پر چل رہے ہو' جن راہوں پر وہ قومیں چلتی ہوئی تباہی کے انجام سے دوچار ہوئیں۔ اگر تم نے راہ ہدایت اختیار نہ کی تو تم بھی اس انجام سے بچ نہ سکو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا اللہ کا بسایا ہوا ایک چمن ہے' جس میں قومیں رنگا رنگ پھولوں کی طرح بہار دے رہی ہیں۔ جب ان میں کوئی زہریلا درخت پیدا ہو جاتا ہے اور پھر اس کی ایک ایک چیز بدبو دینے لگتی ہے اس سے نکلنے والی گیس اس سے نکلنے والی شاخیں' اس سے نکلنے والی بوُ جب سمیت پھیلانے لگتی ہے تو اللہ جو اس چمن کا نگران ہے وہ شروع شروع میں اسے پھیلنے سے روکتا ہے اور اس کے علاج کی فکر کرتا ہے۔ لیکن جب اس کا پھیلاؤ بڑھنے لگتا ہے تو پھر وہ اس کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ قوموں کے ساتھ بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں ایسی قوموں کو ظالم کہا گیا ہے۔ یعنی وہ ظلم کی وجہ سے اپنے برے انجام سے دوچار ہوئیں۔ ظلم کا معنی ہے کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ اسے اس طرح استعمال کرنا جو اس کے استعمال کا طریقہ نہیں۔ یہ لوگ ان معنوں میں ظالم تھے کہ انھوں نے ایک ایک نعمت اور ایک ایک صلاحیت کا غلط استعمال کیا۔ اللہ نے ان کو سر دیا تھا اللہ کے سامنے جھکانے کے لیے انھوں نے غیر اللہ کے سامنے جھکا کر ظلم کیا۔ انھیں دل بخشا گیا تھا اللہ کے تصور اور اس کی محبت سے آباد رکھنے کے لیے۔ انھوں نے تمام طاغوتی قوتوں کو اپنے دل میں بسا کر اس دل سے ظلم کیا۔ اللہ نے ان کو ایک ایک نعمت عطا فرمائی تھی' تا کہ یہ لوگ اللہ کا شکر ادا کریں۔ انھوں نے کفرانِ نعمت کر کے اپنے آپ پر ظلم کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ لوگ اپنے انجام کو پہنچے۔

Marfat.com

آج اللہ ظالم قوتوں کی جڑ کیوں نہیں کاٹ رہا؟

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ ممکن ہے آپ کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ آج دنیا میں کیسی کیسی ظالم قوتیں ہیں' جنھوں نے انسانیت کا مستقبل ہولناک بنا دیا ہے۔ انسانوں پر وہ ظلم ڈھائے جا رہے ہیں کہ گزشتہ ادوار میں جنھیں ہم قرون مظلمہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ایسے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا اور جب سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے انسان دشمنی کی کوئی ایسی مثال ہمیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی' فلسطینیوں کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے جو کچھ اس سے پہلے بوسینیا میں ہو چکا ہے' چیچنیا میں جو قیامت گزر گئی' افغانستان میں انسان دشمنی اور درندگی کے جو ریکارڈ قائم کیے گئے اور آج تک ان کا سلسلہ جاری ہے اور کرنے والے ہاتھ وہ ہیں جنھیں اپنی تہذیب وتمدن اور انسان دوستی کے بڑے دعوے ہیں۔ آخر ان ظالموں کی جڑ کیوں نہیں کاٹی جاتی۔ یہ ظالم قوتیں روز افزوں سرفراز کیوں ہیں دنیا ان کے سامنے کیوں بے بس ہوتی جا رہی ہے؟ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اللہ کا ایک قانون ہے کہ جب وہ قومیں جو اللہ کے دین کی علمبردار ہیں اور جنھیں دنیا میں عدل واحسان قائم کرنا ہے۔ اپنے مقصدِ زندگی کو بھول جائیں اور خود اپنے اپنے ممالک میں اللہ کی نافرمانی اور انسانی ظلم کی داستانیں دہراتے ہوئے کبھی اللہ کا خوف محسوس نہ کریں' اللہ اگر انھیں دنیوی جاہ ومنزلت اور دولت دنیا کے خزانے حوالے کر دے تو انھیں کفر کی خدمت یا اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے استعمال کریں اور خود دینی قوتوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھائیں کہ انھیں دیکھ کر کفر بھی شرمانے لگے تو پھر اللہ تعالیٰ ان ظالم قوتوں سے وہ کام لیتا ہے' جو ایک ڈاکٹر ایک سڑ جانے والے عضو کو کاٹنے اور اسے انسانی جسم سے الگ کرنے کے لیے خنجر اور نشتر سے لیتا ہے۔ پھر دنیا میں بظاہر اسلامی خلافت بھی موجود ہو تو تقدیر چنگیز خان کے نشتر سے مسلمان امت کا آپریشن کرتی ہے' تاکہ اس سے فاسد مادہ نکلے اور اس میں نشأۃ ثانیہ کے امکانات پیدا ہوں اور اگر مسلمان اپنی اصل حیثیت کو برصغیر میں گم کر دے تو تیمور جیسے لوگوں سے تقدیر آپریشن کے نشتر کا کام لیتی ہے۔ اسی کو اقبال مرحوم نے کہا تھا کہ:

ع تقدیر کے نشتر ہیں تیمور ہوں یا چنگیز

قرآن کریم میں ارشاد خداوندی ہے:

Marfat.com

﴿وَكَذَالِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظَّالِمِیْنَ بَعْضَام بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ﴾
''اسی طرح ہم ظالموں کو ظالموں پر مسلط کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے انھیں سزا دلواتے ہیں۔'' (الانعام:۱۲۹)

یہ آج جو کچھ ہو رہا ہے' یہ امت مسلمہ کو ان کے اعمال کی سزا مل رہی ہے۔ عوام نے جس طرح ظالموں کو برداشت کیا یا ظالموں کی خوشامد کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے ظلم کی تائید کی اور دونوں نے مل کر اللہ کے دین کا راستہ روکا اور بعض علاقوں میں دین کے حوالے سے بے حسی اور بے اعتنائی کا ثبوت دیا گیا اور مجموعی طور پر دنیا کو اپنا مقصد زندگی بنا کر دین کو اجتماعی زندگی سے خارج کر دیا اور غضب خدا کا پورے عالمِ اسلام میں کہیں بھی اللہ کی حاکمیت کو نافذ کرنا تو دور کی بات ہے' برداشت بھی نہیں کیا گیا اور جو قوتیں اس کے لیے کوشاں ہیں انھیں اپنے اپنے ملکوں میں نہ صرف اجنبی بنا دیا گیا بلکہ انھیں اذیتوں کا نشانہ بنایا گیا اور اب رفتہ رفتہ انھیں ایک گالی بنا دیا گیا ہے۔ یہ وہ اعمال ہیں' جس کی پاداش میں امت مسلمہ آج عذاب کی گرفت میں ہے اور مغربی قوتوں سے ان کے اعمال کی سزا دلوائی جا رہی ہے۔ آج اس عذاب سے بچنے کی صرف ایک صورت ہے کہ امت مسلمہ مجموعی طور پر یا اس کا کوئی ایک ملک اسلام کا نمائندہ بن جائے۔ اسلام کو اپنا آئین بنا کر زندگی کے ہر شعبے کو اسلام کی تحویل میں دے دے اور پھر اول و آخر اسلام کا نمائندہ بن کر اپنے ملک کی ترقی کے اسباب پیدا کرے اور حکمت و بصیرت سے کام لیتے ہوئے مشکلات میں اپنے لیے راستہ نکالے۔ شروع میں قدرت کی طرف سے ان کے اخلاص کی آزمائش ہوگی' لیکن بالآخر یہ ملک ایک عظیم قوت بن کر اٹھے گا اور قدرت ان کو اسی طرح نوازے گی جیسے قرون اولیٰ میں مسلمانوں کو نوازا گیا۔ پھر آج کی ظالم قوتیں یا اس کے سامنے جھک جائیں گی یا مٹ جائیں گی۔ تاریخ کے ہر دور میں قدرت کا یہی قانون کارفرما رہا ہے اور آج بھی اللہ کی اس سنت کے بدل جانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

Marfat.com

31- لباس کے حوالے سے نہایت اہم ہدایات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَرِیْشًا وَلِبَاسُ التَّقْوٰی لا ذٰلِکَ خَیْرٌ ط ذٰلِکَ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّھُمْ یَذَّکَّرُوْنَ﴾

''اے اولادِ آدم! ہم نے تم پر لباس اتارا' جو ڈھانپتا ہے تمھاری شرم کی جگہوں کو اور زینت بھی۔ مزید برآں تقویٰ کا لباس ہے' جو سب سے بہتر ہے۔ یہ اللہ کی آیات میں سے ہے' تاکہ وہ یاد دہانی حاصل کریں۔''

بنی آدم! اپنے باپ سے ابلیس کی دشمنی کو مت بھولنا

اس آیت کریمہ میں ایک ایک لفظ ہمیں غور اور تدبر کی دعوت دیتا ہے سب سے پہلے اس میں یہ دیکھئے کہ خطاب بنی آدم کو ہو رہا ہے کسی خاص انسانی گروہ کو نہیں اور پھر انسان کہہ کر نہیں بلکہ بنی آدم کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ اے انسانو! تم آدم کی اولاد ہو' آدم تمھارے جد امجد ہیں۔ کوئی بھی صالح اولاد اپنے باپ، اس کے حالات کو ،اسے پیش آنے والے واقعات کو کبھی نہیں بھولتی۔ وہ جب بھی اپنے باپ کا تذکرہ کرتی ہے تو جہاں باپ کے دوستوں کا تذکرہ کرتی ہے وہاں وہ اس کے دشمنوں کو بھی ضرور یاد رکھتی ہے کیونکہ جس طرح باپ کے دوستوں کا یاد کرنا ان کے حقِ دوستی کو ادا کرنا ہے اسی طرح باپ کے دشمنوں کو یاد رکھنا باپ کی غیرت کا ورثہ ہے اور عرب میں تو اس بات کو خاص اہمیت حاصل تھی وہ نسلوں تک بھی اپنی خاندانی دشمنی کو کبھی فراموش نہیں ہونے دیتے تھے چنانچہ اسی پس منظر میں مشرکینِ عرب کو بنی آدم کہہ کر خطاب کیا جا رہا ہے اور انھیں احساس دلایا جا رہا ہے کہ تم اپنے جد

Marfat.com

امجد کے حوالے سے اور اپنے قومی تفاخر کے حوالے سے اس بات کو یاد رکھنے کے پابند ہو کہ تمھارے جدامجد کا دشمن کون ہے اور وہ کون ذات ہے جس نے تمھارے جدامجد کو جنت میں بھی چین سے رہنے نہیں دیا اور وہاں بھی اسے بہکانے کی خطرناک کوشش کر ڈالی جس کے نتیجے میں اگر اللہ کی رحمت شامل حال نہ ہوتی تو وہ تمھارے جدامجد کو تباہ کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا اس لیے تم پر لازم ہے کہ ایسے خطرناک دشمن کو جس نے اولادِ آدم کو گمراہ کرنے کی نہ صرف قسم کھا رکھی ہے بلکہ اس نے چیلنج بھی دے رکھا ہے کبھی بھولنے کی حماقت نہ کرنا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنا کہ اس نے تمھارے جدامجد پر جو سب سے پہلا حملہ کیا وہ وہ تھا جس نے انھیں حلۂ جنت سے محروم کر دیا اور وہ برہنگی کا شکار ہوئے اس لیے تم پر بھی جب وہ حملہ کرے گا تو کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ سب سے پہلے تمھارے جنسی احساسات کو بگاڑ کر تمھیں بے لباس کر دے اور اس طرح تمھارے کپڑے اتارے کہ تم اخلاقی صفات سے بالکل محروم ہو جاؤ۔ چنانچہ اس خطاب میں ان تمام احساسات کو بیدار کرنے کے بعد پھر فرمایا جا رہا ہے کہ چونکہ اس شیطان نے سب سے پہلے تمھارے والدین کو بے لباس کر کے اپنی گمراہی کا آغاز کیا تھا تمھارے ساتھ بھی اندیشہ ہے کہ وہ ایسا ہی نہ کرے اس لیے ہم سب سے پہلے تمھیں بتاتے ہیں کہ اللہ نے تم پر ایک لباس نازل کیا ہے یعنی تمھاری فطرت پر اس کا الہام کیا ہے کہ جس طرح تمھارے رب نے تمھارے والدین کو حلۂ جنت کی صورت میں ایک لباس عطا کیا تھا جو ان کی انسانیت اور ان کی شخصیت کا نمائندہ تھا اس طرح ہم تمھیں بھی ایک لباس دے رہے ہیں اگر تم اس میں ملبوس رہو گے اور پوری طرح اس کا حق ادا کرو گے تو انسانیت کے برہنہ ہونے سے بچ جاؤ گے۔ چنانچہ یہاں جو اَنْزَلْنَا کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ اسی فطری الہام کی طرف اشارہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو صفات یا جو احکام انسانی زندگی کے لیے اساسی حیثیت رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ انسانوں کو پیدا کرتے ہی ان کی فطرت پر ان کا الہام کر دیتا ہے اور پھر وحی الٰہی ان کو متشکل اور مسجع کرنے میں مدد دیتی ہے یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ تمھیں جو لباس کے تفصیلی احکام دیے گئے ہیں یہ تو نزول شریعت کے بعد کی بات ہے لیکن تمھاری شخصیت کی تعمیر کے لیے چونکہ لباس کو ایک اساسی حیثیت حاصل ہے اس لیے ہم نے پہلے ہی دن تمھاری فطرت پر اس کا الہام کر دیا تھا اس کے بعد اس لباس کی جو ضروری صفات ہیں ان کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

Marfat.com

لباس کی پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ لباس کو ساتر ہونا چاہیے یعنی لباس ایسا ہو جو تمھاری شرم کی جگہوں کو ڈھانپ دے اور اگر وہ لباس ستر پوشی کا کام نہیں دیتا اس کے علاوہ چاہے وہ کتنے ہی افادیت کے پہلو رکھتا ہو وہ ہرگز لباس کہلانے کا مستحق نہیں۔

لباس سے مقصود ستر پوشی بھی ہے اور زینت بھی

لباس کی دوسری صفت یہ ہونی چاہیے کہ وہ ریش کا کام دے۔ ریش کا لفظ چڑیوں کے پروں کے لیے بھی آتا ہے اور اس سے زیب و زینت کا لباس بھی مراد ہوتا ہے یعنی لباس ایسا ہونا چاہیے جو موسم کی شدت سے بھی حفاظت کرے اور انسانی شخصیت' انسانی وقار میں اضافے کا باعث بھی بنے۔ قرآن کریم نے لباس کو زینت قرار دے کر شاید اس جوگیانہ تصور کی نفی کی ہے جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو مذہبی تقدس کا درجہ دیتا ہے ان کے نزدیک لباس انسان کی وقت کے ساتھ ساتھ پیدا کی جانے والی ضرورتوں میں سے ہے جیسے جیسے انسانی تہذیب آگے بڑھی ہے ویسے ویسے نئی نئی چیزیں وجود میں آئی ہیں اور انہی میں سے ایک لباس بھی ہے ورنہ انسان اپنی فطری سادگی میں جب تک زندگی گزارتا رہا ہے یا تو وہ لباس سے بالکل آزاد تھا اور یا زیادہ سے زیادہ وہ لنگوٹی باندھتا تھا اس سے زیادہ اسے کسی اور لباس کی ضرورت نہیں تھی لیکن یہاں قرآن کریم پہلے انسان کی سرگزشت بیان کرتے ہوئے اس تصور کا ابطال کر رہا ہے کہ پہلے انسان کی فطرت پر لباس کا الہام کیا گیا اور اس حد تک شرم و حیا اس کی طبیعت میں راسخ کر دیا گیا کہ جیسے ہی شیطان نے اس کو بے لباس کیا تو وہ سراسیمہ ہو کر رہ گیا اور شرم کے مارے اس نے اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی اور مزید یہ فرمایا جا رہا ہے کہ لباس کو جہاں ہم نے ستر پوش بنایا ہے وہاں انسانی شخصیت کو تشکیل دینے والا بھی بنایا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں یہ تأثر بھی ملتا ہے کہ لباس کو اگرچہ موسم کی شدت سے بچنے اور شخصیت کی تعمیر کا ذریعہ بنایا گیا ہے لیکن اس کی جو پہلی شناخت ہے وہ اس کا ستر پوش ہونا ہے اگر ایک لباس موسم کی شدت سے بچانے اور زینت آرائی میں بھی اپنی مثال آپ ہے بلکہ وہ سرتاپا زینت ہی زینت ہے لیکن وہ ستر پوشی میں ناکام رہتا ہے تو قرآن کریم کی نگاہ میں وہ لباس کہلانے کا مستحق نہیں یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان عورتوں پر لعنت فرمائی ہے جو لباس پہن کر بھی ننگی ہوتی ہیں یعنی یا ان کا لباس بہت تنگ ہوتا ہے یا بہت باریک ہوتا ہے۔

Marfat.com

اصل مقصود لباسِ تقویٰ ہے' کی وضاحت

تیسری بات لباس کے سلسلے میں جو فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اسے لباسِ تقویٰ ہونا چاہیے اور یہ لباس پہلے دونوں لباسوں کی نسبت اللہ کی نگاہ میں پسندیدہ ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ایک تو لباس وہ ہے جو انسانی جسم پر نظر آتا ہے جو ستر پوش بھی ہے اور باعث زینت بھی لیکن ایک لباس وہ ہے جو انسان کی اندر کی شخصیت کو پہنایا جاتا ہے۔ یہ وہ لباس ہے جسے خشیت الٰہی شرم وحیا اور احساس عبدیت کا نام دیا جاتا ہے یہی وہ لباس ہے جو خوف خدا سے وجود میں آتا ہے۔ اگر انسان کی اندرونی شخصیت بے لباس ہے اور یہ لباس تقویٰ اس کے نصیب میں نہیں ہوا تو باہر کی شخصیت کو آپ چاہے کتنا بھی ملبوس کر دیجیے حقیقت میں وہ ننگا ہی رہے گا اور اگر اس کے اندر لباس تقویٰ موجود ہے اور اس کی باہر کی شخصیت اگر چیتھڑوں میں بھی ملبوس ہو تو وہ برہنگی سے پاک انسانی وقار کا ایسا نمونہ ہوگی جس پر انسانیت رشک کرے گی حقیقت تو یہ ہے کہ یہ لباس تقویٰ یعنی اندر کے شرم وحیا کا جذبہ ہی ہے جو باہر کے لباس کی ضرورت پیدا کرتا ہے۔ جب اندر سے آدمی بے لباس ہو جاتا ہے تو پھر باہر کے لباس کو وہ اپنی شخصیت کے لیے ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ برہنگی اسے عزیز ہو جاتی ہے وہ فیشن کے نام سے اور کبھی تہذیب کے نام سے بے لباس ہونے کو اپنا مقصد زندگی بنا لیتا ہے۔ جیسے جیسے اس کا لباس اترتا جاتا ہے وہ اپنے آپ کو مہذب سمجھتا ہے اور لباس اس کی نگاہ میں دقیانوسی رویہ بن کے رہ جاتا ہے۔

لباس تقویٰ سے چونکہ باہر کا لباس خاص شکل اختیار کرتا ہے اور انسانی احساسات بھی خاص قالب میں ڈھلنے لگتے ہیں اس لیے شریعت نے اس کو علی الاطلاق نہیں چھوڑا بلکہ اس نے اس حوالے سے بھی راہنمائی عطا فرمائی ہے۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ لباس تقویٰ وہ ہے جو پوری طرح ساتر ہو زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو۔ یعنی ایسا بھی نہ ہو کہ لوگ اس کی طرف انگلیاں اٹھائیں کہ دیکھو اس شخص نے کس قدر قیمتی اور کیسا بھڑکیلا لباس پہن رکھا ہے اور ایسا بھی نہ ہو کہ اللہ نے جو اس کو مالی حیثیت دے رکھی ہے اس سے بہت فروتر ہو کہ دیکھنے والا اسے نادار اور قلاش سمجھ کر اس کی مدد کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسی طرح اس کے لباس میں فخر وغرور اور تکبر وریا کا کوئی شائبہ نہ ہو اور ان ذہنی امراض کی نمائندگی بھی نہ کرتا ہو جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں اور عورتیں مردانہ پن کی نمائش کرنے لگتی

Marfat.com

ہیں اور ایک قوم دوسری قوم کے مشابہ بننے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے بعد فرمایا: ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ۔ اٰيٰتِ اللّٰه کا ترجمہ دو صورتوں میں ہو سکتا ہے۔ ایک اللہ کی نشانیاں اور دوسرا اللہ کی آیات۔ پہلے ترجمے کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح انسانی لباس کی ضرورت کو انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے لازمی ٹھہرایا اور پھر جس طرح اس کی شخصیت پر اس کا الہام کیا اور پھر صرف ظاہری لباس تک بات کو محدود نہیں رکھا بلکہ انسان کی اندرونی شخصیت اور بیرونی شخصیت کو ہم آہنگ کرنے کی بھی ہدایت فرمائی بلکہ احساس کی دولت اس کے اندر ودیعت فرما کر باہر کی شخصیت کے لیے معاون بنا دیا۔ اس حقیت پر جب ہم غور کرتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ لباس بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک ہے جو حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں اس پر آدمی جیسے جیسے غور کرتا ہے اسے اس بات کا یقین پیدا ہوتا جاتا ہے کہ انسانی لباس کو ستر پوش اور زینت قرار دینا اور پھر لباس تقویٰ کی شکل میں اسے اصل ہدف بنا دینا اور انسانی فطرت پر اس کے الہام کی صورت میں اسے ایک محرک کی شکل دے دینا یہ اللہ کی نشانی کے سوا یا اس کی ذات کی طرف رہنمائی دینے والی چیز کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔

مزید رہنمائی کے لیے اگلی آیت سے استفادہ ازبس ضروری ہے۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿يٰبَنِىْٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ﴾

''اے آدم کی اولاد! شیطان تمھیں فتنہ میں نہ ڈالنے پائے' جیسا کہ اس نے نکال دیا تھا تمھارے ماں باپ کو بہشت سے' اتروائے ان سے ان کے کپڑے' تا کہ دکھلا دے انھیں ان کی شرم گاہیں۔ وہ اور ان کا جتھہ تم کو وہاں سے تاڑتا ہے' جہاں سے تم ان کو نہیں تاڑتے۔ ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے' جو ایمان نہیں لاتے۔''

Marfat.com

شیطان کا اصل ہدف لباسِ تقویٰ ہے

اس آیت کریمہ میں خطاب پھر بنی آدم سے فرمایا جا رہا ہے یعنی ان کے ان احساسات کو آواز دی جا رہی ہے جو ایک صالح اور باحمیت اولاد اپنے باپ کے دشمن کے بارے میں رکھتی ہے انہی احساسات کے حوالے سے تنبیہ کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو شیطان اور اس کی قوتیں تمھیں کسی نہ کسی فتنے میں مبتلا کرنے کی کوشش کریں گی اور ان کے فتنہ میں مبتلا کرنے کا سب سے پہلا ہدف وہی ہو گا جس کے حوالے سے حملہ انھوں نے تمھارے جد امجد پر کیا اور پھر جس طرح اس کے کپڑے اتروا دیے ایسا نہ ہو کہ تم پر بھی ایسا ہی حملہ کیا جائے اور تم بھی بے لباس کر دیے جاؤ۔ سابقہ آیت میں لباس کے بارے میں پوری تفصیل بیان کر دی گئی ہے اور یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جو لباس اللہ کے یہاں مطلوب ہے وہ لباس تقویٰ ہے اور یہی وہ لباس ہے جو ظاہری لباس کی ضرورت کو پیدا کرتا ہے اور پھر اسے باقی بھی رکھتا ہے۔ دیکھنا کہیں ابلیس تمھیں لباس تقویٰ سے محروم نہ کر دے اور تمھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ابلیس اور اس کی ہمنوا طاقتوں کے وسائل بے پناہ ہیں وہ تم پر ایسی جگہوں اور ایسے طریقوں سے حملہ آور ہو سکتے ہیں جس کا ادراک کرنا بھی تمھارے لیے مشکل ہو گا۔ وہ شکاری کی طرح گھات میں بیٹھ کر برابر تمھیں تاڑتے رہتے ہیں لیکن تم انھیں دیکھنے میں ناکام رہتے ہو۔ تم بظاہر یہ سمجھتے رہتے ہو کہ وہ تمھارے خیر خواہ ہیں اور تمھیں تعلیم دے رہے ہیں حقیقت میں وہ تمھاری برین واشنگ کر رہے ہوتے ہیں تم یہ سمجھتے ہو کہ تمھیں تہذیب سکھائی جا رہی ہے حالانکہ وہ تمھیں لباس تقویٰ اور حمیت کے جذبات سے محروم کرنے کی کوشش میں ہوتے ہیں تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ ترقیاتی کام کر رہے ہیں اور اس کے لیے انھیں اشتہار اور پبلسٹی کے لیے صنف نازک کی ضرورت پڑتی ہے لیکن وہ تمھیں اس بات کا احساس نہیں ہونے دیتے کہ کس طرح وہ طریقے طریقے سے لڑکے اور لڑکیوں کے مل بیٹھنے کے مواقع پیدا کرتے ہیں، کس طرح انھیں الگ الگ تقسیم کر کے خلوتوں کا سامان کیا جاتا ہے اور کس طرح رفتہ رفتہ غیرت اور حمیت کو آگ لگا دی جاتی ہے اور پھر ایک وقت آتا ہے جب عورت صرف عورت رہ جاتی ہے بلکہ عورت کی سطح سے گر کر وہ ایک اشتہار بن جاتی ہے یا مجلسوں کی رونق کا سامان اور اس سے وہ تقدس چھین لیا جاتا ہے جو ماں، بہن اور بیٹی کی شکل میں اسے حاصل تھا۔ یہ سب کچھ شیطان کا قبیلہ اس چابکدستی اور ذہانت سے کرتا ہے کہ جن

Marfat.com

کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جاتا ہے ان کی عقلیں ماؤف ہو کر رہ جاتی ہیں۔ وہ اپنی نہایت روشن تاریخ کو بھول جاتے ہیں انھیں شرم و حیا کی بجائے عریانی تہذیب کے طور پر دکھائی دینے لگ جاتی ہے اور ساتر لباس انھیں وحشت اور دقیانوسیت محسوس ہونے لگتا ہے اس طرح رفتہ رفتہ پورا تمدن شہوانیت کے زہر سے مسموم ہو جاتا ہے لیکن اولاد آدم کو اندازہ ہی نہیں ہو پاتا کہ ہمارے ساتھ شیطانی قوتیں کیا کھیل کھیل رہی ہیں۔ یہاں اسی بات کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے اور صاف بتایا جارہا ہے کہ تم جب تک کھلی آنکھوں سے اور زندہ احساس کے ساتھ شیطانی قوتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرو گے اس وقت تک وہ تمھارے ساتھ یہ کھیل کھیلتی رہیں گی اور تمھیں اس کا احساس تک نہیں ہوگا۔ اس آیت کے آخر میں شیطانی قوتوں کے حملوں سے بچنے کے لیے طریقہ سکھایا جارہا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تم شیطانی قوتوں کا مقابلہ کر سکو تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے ایمان کا جائزہ لو شیطانی قوتوں سے مقابلہ کرنے کے لیے، یہی ایک اسلحہ اور تدبیر ہے جو شیطانی قوتوں کو مغلوب کر سکتی ہے وہ اپنی ہزار کوششیں کریں اور چاہے کیسے ہی کمندیں پھینکیں اگر ایک مومن کے دل میں ایمان زندہ ہے یعنی وہ ان ہدایات پر ایمان رکھتا ہے جن کا ذکر ابھی ہو چکا تو پھر شیطانی قوتیں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ شیطان اس وقت حملہ کرنے میں کامیاب ہوتا ہے جب دل ایمان کی قوت سے محروم ہو جاتا ہے۔ جس طرح خالی گھر میں جنات بسیرا کر لیتے ہیں اسی طرح وہ دل جو خدا کی یاد سے غافل ہو اور جس دل میں اللہ کی اطاعت کا جذبہ کمزور پڑ جائے اور اسے یاد ہی نہ رہے کہ اللہ نے مجھے شرم و حیا اور غیرت وحمیت کی پاسداری کا حکم بھی دیا تھا اور اس کی فطرت اس حد تک مردہ ہو جائے کہ لباس تقویٰ کا جو الہام اس کی فطرت پر کیا گیا تھا وہ اس کے ادراک سے بھی محروم ہو جائے تو وہ اللہ کے قانون کی زد میں آجاتا ہے۔ اللہ نے کئی جگہ یہ بات فرمائی ہے اور پیچھے اس کا ذکر بھی ہو چکا کہ جو شخص بھی اللہ کے ذکر اور اس کی یاد سے اعراض کا رویہ اختیار کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں اور پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور ہر جگہ اسے کھینچے پھرتا ہے اب جو آدمی شیطان کے قبضے میں آجاتا ہے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑانے کی قوت اس کے اندر نہیں رہتی تو وہ شیطانی حملوں سے کیسے محفوظ رہ سکتا ہے۔ بلکہ اس کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ وہ آہستہ آہستہ شیطان کا ایجنٹ بن جاتا ہے اور اس لیے یہاں فرمایا گیا ہے کہ شیطانوں کو ہم ایسے لوگوں کا سرپرست بنا دیتے ہیں جو اللہ پر اور اس کے احکام پر ایمان اور یقین نہیں رکھتے۔ اگلی آیت

Marfat.com

کریمہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان کی قوت سے محروم ہوتے ہیں جب شیطان ان پر حملہ آور ہوتا ہے تو وہ نہ صرف شیطان کے حملوں کو روکنے میں ناکام رہتے ہیں بلکہ وہ شیطان کے فتنے کے اس حد تک اسیر ہو جاتے ہیں کہ وہ اسی کی زبان بولنے لگتے ہیں اور اس کا ہر فتنہ ان کی زندگی کا عنوان اور ان کے دل کی آواز بن جاتا ہے۔ اسی کی تصویر کشی کرتے ہوئے بعض اشارے فرمائے گئے ہیں:

﴿وَاِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَآ اٰبَآئَنَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَا قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ﴾

''اور جب یہ لوگ کوئی شرمناک کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر پایا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ ان سے کہو! اللہ بے حیائی کا کبھی حکم نہیں دیا کرتا۔ کیا تم اللہ پر وہ تہمت جوڑتے ہو جس کے باب میں تم کو کوئی علم نہیں؟''

شیطان کی چال

اولادِ آدم کے ذکر کے ضمن میں یہاں قریش اور عربوں کا حال بطور خاص بیان کیا جا رہا ہے کہ ذرا اندازہ کیجیے کہ کس طرح شیطان نے ان لوگوں کو فتنے کی نذر کیا اور بہکایا ہے اور کس طرح ان کو چکمہ دے کر اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ جس طرح حضرت آدم و حوا کو اس نے جنت میں بہکا کر ان کے کپڑے اتروا دیے اور جنت میں ان کو بے لباس کر دیا تھا اسی طرح اس نے انھیں بہکا کر اور گمراہ کر کے حرم میں بے لباس کر دیا ہے اور حال یہ ہے کہ وہ بجائے اس کے کہ اس گمراہی کو سمجھیں الٹا اس پر دلیل بازی سے کام لے رہے ہیں اور ان کی جسارت کی انتہا یہ ہے کہ اسے اللہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے بھی نہیں ڈرتے۔ مفسرین نے اس کی صراحت کی ہے کہ مشرکین عرب کا حال یہ تھا کہ وہ جب کعبہ کے طواف کے لیے آتے تو یہ خیال کرتے کہ ہمارے کپڑے چونکہ آلائش دنیا اور زینت دنیا میں داخل ہیں اس لیے انھیں پہن کر ہم اللہ کے گھر کا طواف نہیں کر سکتے کیونکہ اللہ کا گھر تو ایک پاکیزہ جگہ ہے اور طواف ایک عبادت ہے اگر ہم دنیا کے لباس میں طواف کریں گے تو عبادت کی حرمت پامال ہو جائے گی۔ قریش نے اس گمراہی سے اگرچہ اپنے آپ کو بچا رکھا تھا لیکن باقی پورا عرب اس

Marfat.com

گمراہی میں مبتلا تھا اور قریش ان کی اس گمراہی کے پیدا کرنے اور انھیں اس گمراہی پر باقی رکھنے میں ممد و معاون بنے ہوئے تھے یعنی ان کو یہ بات سمجھاتے تھے کہ تمھارا لباس چونکہ آلائش دنیا سے آلودہ ہے اس لیے اب تمھارے طواف کی ایک ہی صورت ہے کہ یا تو کسی قریشی سے اس کا لباس مستعار لے لو اور اگر تم اس کا انتظام نہیں کر سکتے (اور ظاہر ہے کہ اس کا انتظام ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ قریش کس کس کو اپنا لباس دیتے) تو پھر مجبوری ہے کہ تم مادرزاد ننگے ہو کر اللہ کے گھر کا طواف کرو اور یہ بات صرف مردوں تک محدود نہیں تھی عورتیں بھی اس گمراہی کا شکار تھیں وہ بھی بالکل برہنہ ہو کر طواف کرتی تھیں۔ ممکن ہے کسی کو یہ خیال ہو کہ یہ بات بظاہر قرینِ عقل معلوم نہیں ہوتی کہ قوم کے بیشتر افراد اتنی بڑی گمراہی کا شکار ہو جائیں لیکن اس بات کی کیا تاویل ممکن ہے کہ یہ ہمارا زمانہ جسے روشنی اور ترقی کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ کیا اس میں آج بھی مندروں اور کلیساؤں میں عیاشی اور نفس پروری کا سامان میسر نہیں؟ اور کیا وہاں کے پروہت اور پجاری اس طرح کی شیطنت کے محافظ بن کے نہیں بیٹھے ہوئے؟ اور انھوں نے اس قسم کی گمراہیوں کو کیا مذہبی تقدس کا درجہ نہیں دیا؟ اگر آج یہ ساری خباثتیں موجود ہیں تو چودہ سو سال پہلے اس کے وجود کو ہم خلاف عقل کیسے قرار دے سکتے ہیں۔ اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عرب کے لوگ اس گمراہی میں مبتلا تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولاں گاہ بن کے رہ گئی تھی اور حرم کی نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں اس طرح نمایاں ہوئیں کہ آج بھی آدمی انھیں پڑھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا اور کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا۔

آباؤ اجداد کے طرزِ عمل سے استدلال

عجیب بات یہ ہے کہ جب مشرکینِ عرب سے یہ کہا جاتا تھا کہ تم کس قدر پستی میں اتر گئے ہو کہ اللہ کے گھر میں تم نے کپڑے تک اتار دیے ہیں تو وہ جواب میں دو باتیں کہتے تھے۔ ایک تو یہ بات کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔ اندازہ فرمائیے کہ اس بے سروپا دلیل پر اتنی بڑی گمراہی کی بنیاد رکھنا کس قدر تعجب خیز ہے لیکن انھیں اپنی اس دلیل پر اصرار تھا حالانکہ بالکل سامنے کی بات ہے کہ یہ

Marfat.com

جس طرح اپنے اعمال کی دلیل اپنے آباؤ اجداد کے عمل کو بنا رہے ہیں اسی طرح آنے والی نسل موجودہ لوگوں کو اپنے اعمال کی دلیل بنائے گی اور اسی طرح یہ سلسلہ پہلے بھی چلتا آیا ہے اور آئندہ بھی چلتا جائے گا حالانکہ یہ بات سمجھنا مشکل نہیں کہ غلطیاں ہر دور میں ہوئی ہیں جس طرح آج کے لوگ غلطیاں کر رہے ہیں اسی طرح ان کے آباؤ اجداد نے بھی کی ہیں اور کل کو آنے والی نسلیں بھی وہ غلطیاں کریں گی اس لیے ایک نسل کی غلطی یا گمراہی دوسری نسل کے لیے جواز نہیں بن سکتی۔ ہاں کوئی چیز اگر جواز بن سکتی ہے تو ضروری ہے کہ یا تو اس کے ساتھ علم کی روشنی ہو اور یا ہدایت کی سند ہو۔ محض یہ بات کہ پہلے ایسی غلطی ہوتی رہی ہے اور اب بھی ہونی چاہیے۔ اس سے زیادہ بے اصل بات اور کوئی نہیں ہو سکتی اس لیے یہاں قرآن پاک نے اس کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

قریش کی دلیل کا جواب

دوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ یہ چونکہ مذہبی معاملہ ہے اس لیے ہمارے آباؤ اجداد اگر ایسا ہی کرتے تھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی نے اس بات کا حکم دیا ہوگا کیونکہ مذہب کی کوئی بات تو اللہ کے حکم کے بغیر اختیار نہیں کی جا سکتی۔ اس کے جواب میں پروردگار نے دو باتیں ارشاد فرمائیں

1- برہنگی ایک فاحشہ ہے یعنی ایسی بات ہے جس کو کھلی ہوئی بے حیائی کہا جاتا ہے اور عرب اپنی تمام بداخلاقیوں کے باوجود برہنگی کو بے حیائی سمجھتے تھے اور اسے ناپسند کرتے تھے کوئی بھی عزت والا عرب اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی مجلس میں کپڑے اتار دے۔ اگرچہ ان کے بازاری اور گرے پڑے لوگ ایک دوسرے کے سامنے ننگا ہو جانے اور راستوں میں رفع حاجت کے لیے بیٹھ جانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے لیکن ایسا طبقہ تو ہر دور میں موجود رہا ہے۔ سوال تو ان لوگوں کا ہے جو عوام کو لیڈ کیا کرتے ہیں وہ برہنگی کو بہر حال ایک بے حیائی سمجھتے تھے اور کبھی بھی اس کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے چنانچہ اس مسلمہ امر کو دلیل بناتے ہوئے پروردگار ارشاد فرماتے ہیں کہ جب برہنگی ایک بے حیائی ہے تو تم یہ بتلاؤ کہ اگر تم اللہ کی ذات اور اس کی صفات کے بارے میں کچھ بھی جانتے ہو تو کیا تم اس بات کا تصور کر سکتے ہو کہ اللہ کبھی بے حیائی کا حکم دے گا؟ اور اگر وہ واقعی بے حیائی کا حکم نہیں دیتا تو پھر تم یہ کیسے کہتے ہو

Marfat.com

کہ اللہ نے ہمیں برہنہ طواف کرنے کا حکم دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ جس نے بھی تم سے یہ بات کہی اس نے تم سے جھوٹ کہا اور ایک غلط مفروضہ پر اس نے تمھاری دینی زندگی تباہ کردی۔

2- اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ نے تمھیں اس بات کا حکم دیا ہے تو پھر تمھارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہونا چاہیے۔ کوئی علمی ثبوت جو تمھیں حضرت اسماعیل یا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہنچا ہو۔ کوئی ایسی سینہ بہ سینہ روایت جس کی سند ان بزرگوں سے متصل ہو۔ یقیناً تمھارے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تو پھر کیا تم اللہ پر ایک ایسی بات کہہ رہے ہو جس کا تمھیں کوئی علم نہیں یعنی جس کی کوئی علمی سند تمھارے پاس نہیں تو بغیر علمی سند کے اور بغیر کسی آگاہی کے اللہ کریم کے بارے میں کوئی بات کہنا یہ تو اللہ پر افترا کرنے والی بات ہے اور تم جانتے ہو کہ اللہ کے بارے میں کوئی تہمت باندھنا اور اس کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا کتنا بڑا جرم ہے کیا تم نے کبھی اس کی ہولناکی کے بارے میں سوچا ہے؟ البتہ ہم تمھیں بتاتے ہیں کہ اللہ کن باتوں کا حکم دیتا اور کن باتوں کو پسند کرتا ہے اور وہ کیا بنیادیں ہیں جن پر دینی عمارت اٹھائی جاسکتی ہے:

Marfat.com

32- آیات کے تناظر میں اصلاح وتربیت کے دومؤثر طریقے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

دنیا میں اصلاح اور تربیت کے لیے جتنے طریقے اختیار کیے گئے ہیں یا جتنے اسلوب آزمائے گئے ہیں ان میں سب سے مؤثر دو ہی طریقے ہیں ایک ہے ترغیب اور دوسرا ہے ترہیب یعنی کسی بھی آدمی کو اگر آپ آمادۂ عمل کرنا چاہیں تو اسے یا تو اس کے عمل کے نتیجے کے طور پر کسی بہت بڑے انعام کی ترغیب دیجیے اور یا پھر اسے کسی بہت برے انجام سے ڈرایئے یہی دو طریقے ہیں جس سے کسی بھی شخص کو آمادۂ حرکت یا آمادۂ عمل کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے بارہا تجربہ کیا ہوگا کہ ایک شخص جو کوئی پابندی قبول کرنے یا کسی طرح کی زحمت اٹھانے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوتا لیکن اگر آپ اسے یقین دلا دیجیے کہ اس کے نتیجے میں تمھیں بہت بڑا کوئی منصب مل سکتا ہے یا کوئی مالی منفعت حاصل ہوسکتی ہے تو آپ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوگی کہ وہ شخص سرتاپا عمل بن جائے گا۔ مثال کے طور پر ایک شخص اپنے گھر میں لحاف میں لپٹا پڑا ہے شدید سردی کا موسم اور باہر ہلکی پھلکی پھوار اور یخ بستہ رات۔ اس کی بیوی کو اچانک یاد آتا ہے کہ صحن میں کچھ چیزیں پڑی رہ گئی ہیں نہ اٹھائی گئیں تو بارش سے خراب ہو جائیں گی وہ بچے کو لیے لیٹی ہوئی اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ میں اس حال میں اٹھ کر اگر باہر نکلوں گی تو اندیشہ ہے کہیں بیمار نہ پڑ جاؤں۔ آپ ماشاء اللہ صحت مند ہیں باہر جائیں اور صحن میں جو چیزیں پڑی ہیں وہ اٹھا لائیں وہ کہتا ہے بھاڑ میں جائیں یہ چیزیں میں ان کی خاطر اپنی صحت کو داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اس نے ہر چند اصرار کیا لیکن یہ شخص اپنے لحاف سے نکلنے پر آمادہ نہ ہوا۔ اچانک باہر دروازے پر دستک ہوئی اس نے وہیں سے پکار کر پوچھا کون ہے جواب ملا کہ یہاں سے چار میل کے فاصلے

Marfat.com

پر گیسٹ ہاؤس سے میں آیا ہوں وہاں تیرے افسر اعلیٰ تشریف لائے ہیں انھوں نے اسی وقت تمھیں طلب کیا ہے اگر تم نے تساہل کیا تو نوکری سے نکال دیے جاؤ گے یہ شخص جو لحاف سے نکلنے پر مستعد نہیں تھا وہ فوراً لحاف سے نکلا گرم کپڑے پہنے' دھسہ اوڑھا' چھتری لی اور اس کے ساتھ ہو گیا۔ چار میل گیا اور چار میل واپس آیا لیکن سردی نے نہ جانے سے اسے روکا اور نہ آنے سے جبکہ یہ شخص اپنے صحن تک جانے کے لیے تیار نہیں تھا دونوں طرح کی صورتحال میں فرق یہ ہے کہ اس کے صحن میں جو چیزیں پڑی خراب ہو رہی تھیں وہ اتنی قیمتی نہیں تھیں جسے یہ آسانی سے بنا نہ سکتا ہو اس لیے ان چیزوں کی خرابی کا ڈر اس کو ہلانے میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن جب اس کے سامنے ایک ایسا خوف آیا یعنی نوکری سے نکالے جانے کا تو فوراً اس کی قوت متخیلہ نے پوری صورتحال کو اس کے سامنے متشکل کر دیا۔ اس نے تصور میں دیکھا کہ اگر میری نوکری جاتی رہی تو گھر کا چولہا بجھ جائے گا' بچے سکول کی فیس نہیں دے سکیں گے' کرائے کا مکان چھن جائے گا' ہمارا سامان فٹ پاتھ پر پڑا ہو گا' زندگی موت سے بدتر ہو جائے گی۔ اس خوفناک انجام نے اس کو ہلا کے رکھ دیا اور وہ سردی کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو گیا۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ غلامی کے دنوں میں لوگوں نے مالی فوائد کی خاطر ایمان بیچے' عہدہ و منصب کی خاطر اسلامی غیرت کو تیاگ دیا' جاگیریں حاصل کرنے کے لیے اپنی قوم کے افراد جنگوں میں جھونک دیے' محض فاتحین کا قرب حاصل کرنے کے لیے آزادی کے بدلے میں غلامی لے لی۔

اس سے یہ بات سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ ترغیب اور ترہیب یہ دو ایسے محرکات ہیں جو انسان کو غلط یا صحیح کرنے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم کا اسلوب بھی یہ ہے کہ اس نے جہاں پاکیزہ فکر اور طہارت قلب کے ذریعے انسان کو بدلا وہیں اسے ان دونوں فطری محرکات سے بھی آمادۂ عمل کرنے کی کوشش کی چنانچہ پہلے جہنم کے عذاب کا ذکر فرما کر ترہیبی محرک کا ذکر کیا اور اب اگلی آیتوں میں جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے تاکہ انسان کو اندازہ ہو سکے کہ اگر میں ایمانی زندگی اختیار کروں تو مجھے دنیا اور آخرت میں ایک آسودہ اور کامیاب زندگی نصیب ہو سکتی ہے چنانچہ ارشاد فرمایا:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ ز اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ﴾

''اور جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک کام کیے' ہم کسی جان پر

Marfat.com

اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے' وہی جنت والے ہیں' وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔''

سابقہ آیت کریمہ میں اہل جہنم کا جو طرز عمل بیان فرمایا گیا تھا یہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ وہ لوگ پیغمبر اور اس کی دعوت کی تکذیب کرتے تھے یہ لوگ ایمان لاتے ہیں انھوں نے استکبار کا رویہ اختیار کیا' ان کی زندگی کا اصل سرمایہ عمل صالح یعنی حسن عمل ہے اس کا منطقی نتیجہ ایک ہی ہونا چاہیے کہ وہ لوگ اپنے برے طرز عمل کے باعث اپنے برے انجام کو پہنچے اور یہ اپنے خوب صورت طرز عمل کے باعث اللہ کی جنت کے مستحق ہوئے یہ تو وہ بات ہے جو قرآن کریم میں بار بار دہرائی گئی ہے کیونکہ اصلاً یہی بات ہے جو دل و دماغ میں راسخ کرنے کی ضرورت ہے اور اسی کے نتیجے میں غلبۂ دین کی منزل قریب آ سکتی ہے اور انسان اپنی حقیقی زندگی اور حقیقی مقصد کو پا سکتا ہے لیکن اس آیت کریمہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایمان اور عمل صالح اور اس کے نتیجے کے درمیان ایک جملہ ارشاد فرمایا گیا ہے: لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا آخر اس کی کیا ضرورت تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ اسلام ایک فطری دین ہے جس طرح اس کے احکام فطرت پر مبنی ہیں اسی طرح اس کی دعوت بھی سراسر اپنے اندر فطری اسلوب رکھتی ہے اس لیے اس میں دعوت کے سلسلے میں ترغیب اور ترہیب سے کام لیا گیا ہے کیونکہ انسانی فطرت اس کے بغیر متوجہ ہی نہیں ہوتی یہ جملہ بھی اصلاً انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے اس جملہ کو لایا گیا ہے۔ انسانی احساس یہ ہے یا انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ کبھی بھی اپنے لیے پابندیاں پسند نہیں کرتی اور جہاں بھی اسے مشکلات سے گزرنا پڑے وہ اس سے کوسوں دور بھاگتی ہے اور جہاں تک تعلق ہے ایمان و عمل کا وہ تو سراسر ایک مشکل گھاٹی ہے جس پر چڑھنا آسان نہیں۔ ایمان دل و دماغ کی پاکیزگی اور نظریاتی یکسوئی کا نام ہے جبکہ عقل نارسا کی نارسائیاں اور اس کج فکر کی کج ادائیاں اور طاغوتی قوتوں کی طرف سے پیدا کردہ فکری پیچیدگیاں اور موہوم غیر مرئی قوتوں کے حوالے سے دل و دماغ میں در آنے والے واہمے اور خدشات اور اقتدار کی ہر چوکھٹ پر سر جھکانے کی کوششیں کسی طرح بھی دل و دماغ کو یکسو نہیں رہنے دیتیں اسی طرح عملِ صالح نام ہے اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی غیر مشروط اطاعت اور اللہ اور اس کے رسول سے بے پناہ وابستگی کا جبکہ خواہشات کی ہمہ گیری اور مفادات سے وابستگی انسان کو قدم قدم پر اللہ کی اطاعت سے پھیرتی اور اللہ اور اس کے رسول سے وابستگی سے

Marfat.com

کنارہ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔آج بھی آپ کسی تعلیم یافتہ آدمی سے اسلامی عقائد اور اسلامی احکام کے حوالے سے بات کر کے دیکھئے وہ ہر اسلامی عقیدے میں قدم قدم پر تشکک اور اضطراب کا اظہار کرے گا اور شرعی احکام کو آج کے دور میں نا قابل عمل ٹھہرائے گا۔آپ کسی بھی دانشور سے کہیئے کہ سچ اچھا ہے یا جھوٹ تو وہ سچ پر پورا لیکچر دے دے گا لیکن اگر آپ اسے سچی زندگی گزارنے کی تلقین کریں تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھے گا۔کسی چھوٹے یا بڑے منصب پر فائز آدمی سے یہ نصیحت کر کے دیکھئے کہ رزقِ حلال انسانی سیرت و کردار کی پہلی بنیاد ہے جس قوم میں رزقِ حلال باقی نہیں رہتا وہ صدق مقال سے بھی محروم ہو جاتی ہے اور پھر اس کی زندگی سیرت و کردار کے ایسے عوارض کا شکار ہوتی ہے کہ انفرادی اور اجتماعی طور پر ایسی قوم اخلاقیات سے عاری ہو کر رہ جاتی ہے اس لیے صاحبِ منصب لوگوں کو بالخصوص دوسرے لوگوں کے لیے نمونہ بن کر رزقِ حلال کی پابندی اختیار کرنی چاہیے اور صرف اپنی تنخواہوں پر اکتفا کر کے باقی آمدنی کا ہر راستہ بند کر دینا چاہیے تو اس کے جواب میں آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ آپ کا مذاق اڑایا جائے گا بلکہ الٹا آپ سے سوال کیا جائے گا کہ کیا اس دور میں صرف تنخواہ پر گزارا کیا جاسکتا ہے؟ زندگی اس قدر مہنگی ہوگئی ہے اور زندگی کی ضروریات اس قدر گراں ہوگئی ہیں کہ وہ صرف رزق حلال میں تو پوری نہیں کی جاسکتیں۔یہ اس قوم کے افراد کا حال ہے جو اپنے آپ کو خیر الامم کہتی ہے اور جو اب دنیا میں اللہ کے آخری دین کی امین ہے۔ایسے ہی احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آساں سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تصور کیجیے اس وقت کا جب یہ قرآن کریم نازل ہو رہا تھا تو قرآن کریم اپنے مخاطبین کو جب ایمان و عمل کی ترغیب دے رہا تھا تو بجا طور پر سننے والوں کے دلوں میں یہ اندیشے لہرا رہے تھے کہ ایک ایسے دور میں جبکہ ہر طرف دل و دماغ کے لیے آلودگیاں بکھری ہوئی ہیں اور قدم قدم پر بداعمالیوں کے کانٹے بچھے ہوئے ہیں۔دل و دماغ کی یکسوئی اور سیرت و کردار کی پاکیزگی کا ایسے ماحول میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضرت اایمان وعمل کی جو دعوت پیش کر رہے ہیں اسے قبول کرلیا جائے؟ یہی وہ احساسات ہیں جن کے ازالے کے لیے یہ جملہ یہاں لایا گیا ہے۔مسلسل عبارت کو نامکمل چھوڑ کر اس

Marfat.com

طرح کسی جملے کا لانا جو اس عبارت سے پیدا ہونے والے خیالات کا ازالہ کر دے اس کو جملہ معترضہ کہتے ہیں چنانچہ انہی احساسات کا ازالہ کرتے ہوئے اور ان شبہات کا جواب دینے کے لیے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تمھارا یہ سمجھنا کہ آج کے دور میں ایمان و عمل کے حکم پر عمل کرنا ممکن نہیں یہ سراسر کج فکری یا کوتاہ فہمی ہے اس لیے کہ جس پروردگار نے تمھیں پیدا کیا وہ خوب جانتا ہے کہ اس نے تمھاری فطرت کیسی بنائی ہے تمھیں کس طرح کی صلاحیتوں سے نوازا ہے تم کن باتوں کا تحمل کر سکتے ہو اور کن باتوں پر عمل کرنے سے تم عاجز ہو؟ اس لیے یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمھارا خالق و مالک تمھیں ایسی باتوں کا حکم دے جن باتوں کو قبول کرنا اور عمل کرنا تمھارے لیے ممکن نہیں اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے اپنے اوپر یہ بات لازم کر لی ہے کہ ہم کسی کو بھی ایسے حکم کا پابند نہیں ٹھہراتے جس حکم کی تعمیل کی اس میں طاقت نہ ہو۔ اگر تم میں ایمان و عمل کی طاقت نہ ہوتی تو ہم تمھیں کبھی اس بات کا حکم نہ دیتے۔ رہی یہ بات کہ تم اسے اپنی ہمت سے بہت بڑا خیال کرتے ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ حکم تمھاری ہمت سے بڑھ کر ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ تم نے اپنی ہمتوں کو بہت حد تک تباہ کر کے رکھ دیا ہے یہ تو بالکل ایسے ہی ہے جیسے کوئی آدمی مسلسل بیٹھ کر کام کرنے کی وجہ سے چلنے پھرنے میں دشواری محسوس کرنے لگے اور چند سو گز کا فاصلہ بھی اسے پہاڑ پر چڑھنا محسوس ہو تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ یہ چند سو گز کا فاصلہ انسانی ہمت سے بڑی بات ہے۔ یقیناً آپ اس بات سے اتفاق کریں گے کہ جو آدمی مناسب عمر میں ہوتے ہوئے بھی یہ فاصلہ طے نہیں کر سکتا اس نے اصلاً خود اپنے آپ کو اس ہمت اور توانائی سے محروم کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اتنا فاصلہ طے کرنا انسانی ہمت کے لیے مشکل بات ہے جب کسی نوجوان کو فوج میں بھرتی کیا جاتا ہے تو یہ دیکھ کے کیا جاتا ہے کہ وہ صحت مند آدمی ہو۔ لیکن جب شروع شروع میں ایسے نوجوان کو ٹریننگ سے گزارا جاتا ہے تو وہ چونکہ اس کا عادی نہیں ہوتا اس لیے بہت سارے لوگ اس سے نکل بھاگنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ جب وہ اس ٹریننگ میں لگے رہتے ہیں تو ان کی ہمت ان کا ساتھ دینے لگتی ہے۔ یہی حال پوری انسانی زندگی کا ہے کہ انسان غلط ماحول' غلط تربیت' خواہشات کی بالادستی کی عادت ارادوں کی کمزوری اور اولوالعزمی کے فقدان کے باعث کسی بھی بڑے کام کی ہمت اپنے اندر نہیں پاتا بلکہ ایسے کام بھی جو انسانی زندگی کے معمولات میں داخل ہیں وہ بھی اس کو دوبھر معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً جو آدمی دن چڑھے تک سو رہنے کا عادی ہو جائے اس کے لیے علی الصبح

Marfat.com

اٹھنا آسان نہیں ہوتا حالانکہ دیر تک سوئے رہنا انسانی صحت کے لیے نقصان دہ ہے اور انسانی معمولات کے لیے الجھنوں کا باعث ہے۔ یہاں بھی یہی بات فرمائی جا رہی ہے کہ ہم نے کوئی ایسا حکم نہیں دیا جو انسانی فطرت پر گراں گزرتا ہو' جو انسانی طاقت کے لیے کلفت کا باعث ہو سکتا ہو لیکن تم اگر اپنے لیے مشکل محسوس کر رہے ہو تو یہ تمھاری اپنی پیدا کردہ ہے۔ اب اس کا علاج یہ نہیں کہ تم ایمان و عمل سے جی چراؤ بلکہ اس کا علاج یہ ہے کہ تم اپنی بری عادتوں اور ناپختہ ارادوں سے جان چھڑانے کی کوشش کرو۔ یہ جو کچھ کہا گیا یہ تو عام سطح کی انسانی زندگی کے لیے ہے۔ رہے وہ افراد یا وہ قومیں جن سے کوئی بڑا کام لینا مقصود ہوتا ہے انھیں تو ہمیشہ ذمہ داریاں تفویض کرنے سے پہلے بڑی مشقتوں سے گزارا جاتا ہے جس طرح ہم اوپر فوج کی مثال دے چکے ہیں اور ان سے اس بات کی امید کی جاتی ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر اپنے آپ کو مشقتیں برداشت کرنے کا عادی بنائیں کیونکہ

جن کے رتبے ہیں سوا ان کی سوا مشکل ہے

ایسے ہی نوجوانوں کی تربیت چونکہ اقبال کے پیشِ نظر تھی اس لیے وہ ہمیشہ تمنا کرتا تھا کہ کاش نوجوانوں میں ایسی صفات پیدا ہو جائیں اس لیے کبھی وہ ترغیب کے انداز میں کہتا:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد

اور کبھی حسرت سے کہتا:

جو راہ کی سختی کو سامانِ سفر سمجھے
اے وائے تن آسانی کمیاب ہے وہ راہی

حقیقت یہ ہے کہ کسی حکم کا نرم یا سخت' قابل عمل یا ناقابل عمل ہونے کا دارومدار بہت حد تک انسانی سوچ پر ہے جس سوچ پر اولوالعزمی غالب ہے اور جو اپنی منزل کو پہچان چکا ہے اور اس کے لیے ہمہ تن آمادۂ عمل ہو چکا ہے اس کے لیے کٹھن سے کٹھن حکم بھی ایک معمول کی بات معلوم ہوتی ہے حتیٰ کہ اس راستے میں اسے بڑی سے بڑی قربانی بھی اگر دینا پڑے تو وہ بڑی آسانی سے کر گزرتا ہے انسانی زندگی انسان کے لیے سب سے گراں سب سے قیمتی اور سب سے محبوب متاع ہے لیکن جن لوگوں کے پیشِ نظر ایسے مقاصد ہوتے ہیں جو انھیں اپنی زندگی سے بھی زیادہ عزیز ہوں تو وہ اپنے مقاصد کے حصول میں زندگی کو بھی نہایت آسانی سے قربان

Marfat.com

کر دیتے ہیں صحابہ کی پوری زندگی اور شہدائے اسلام کی داستانیں ہمیں یہ سمجھانے کے لیے کافی ہیں وہ نہ صرف کہ زندگی قربان کر دینے کی ہمت اپنے اندر رکھتے تھے بلکہ اس کے لیے اللہ سے دعائیں مانگتے تھے اور جب کبھی ایسا موقع آتا تھا تو خوشی خوشی اپنی زندگی اللہ کے حوالے کر دیتے تھے۔ اسی کی ترجمانی کرتے ہوئے کسی نے کہا تھا:

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

قرون اولیٰ کی مثالیں تو بے شمار ہیں وہ تو بارگاہ نبوی کے تربیت یافتہ لوگ تھے یا ان تربیت یافتگان کے تربیت یافتہ تھے لیکن اس دور میں بھی جن لوگوں نے اس راز کو پالیا ہے ان کی مثالیں کم نہیں۔ افغانستان کی مثال ہمارے سامنے ہے وہاں ہزاروں شہداء کی فصل ہماری نظروں کے سامنے کٹی ہے۔ کشمیر، چیچنیا، فلسطین میں آج بھی اسی تاریخ کو دھرایا جا رہا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سید قطب شہید کو جب پھانسی کے لیے لے جایا جا رہا تھا تو میں نے ان کی تصویر دیکھی تھی وہ پیچھے پلٹ کے دیکھ رہے تھے اور مسکرا رہے تھے۔ ان کی تصویر کے نیچے کسی نے لکھا تھا:

جس شان سے مقتل تک پہنچا وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں

یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف یہاں اشارہ فرمایا گیا کہ جو لوگ جنت کے مسافر ہیں اور جنت کا حصول جن کی منزل ہے ان کے لیے ایمان و عمل کے تقاضوں کو پورا کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور جن کو یہ کام مشکل معلوم ہوتا ہے انھیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کی ہمتوں میں کمزوری ہے اور یہ کمزوری انھوں نے خود پیدا کی ہے ورنہ ہم نے کوئی حکم ایسا نہیں دیا جو ان کی فطری توانائیوں سے بڑھ کر ہو اور ویسے بھی جنت کوئی ایسی معمولی نعمت تو نہیں جسے آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہو جو نعمتیں عظیم ہوتی ہیں ان کے لیے قربانیاں بھی عظیم ہوتی ہیں۔

بہرِ غفلت یہ تری ہستی نہیں
دیکھ جنت اس قدر سستی نہیں

اگلی آیت کریمہ میں اہل جنت کو جو نعمتیں عطا فرمائی جائیں گی ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اہل جنت کے احساسات کو بھی ریکارڈ پر لایا گیا ہے جو بجائے خود

Marfat.com

ایک نعمت ہے۔ ارشاد فرمایا:

﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰنَا لِهٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِیْ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدٰنَا اللّٰهُ لَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ وَنُوْدُوْۤا اَنْ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾

''اور ان کے سینے کی ہر خلش ہم نکال دیں گے' ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہ کہیں گے! تعریف ہے اس اللہ کے لیے' جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا۔ اگر اللہ نے ہمیں ہدایت نہ بخشی ہوتی تو ہم تو ہدایت پانے والے نہ بنتے۔ ہمارے رب کے رسول واقعی حق ہی لے کر آئے تھے۔ ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے' جس کے تم اپنے اعمال کے صلے میں وارث بنائے گئے ہو۔''

داخلی احساسات پر اللہ کی نوازش

جو لوگ ایمان وعمل کا حق ادا کریں گے اللہ انھیں سب سے پہلے جنت جیسے انعام سے نوازے گا اور پھر جنت میں جانے کے بعد اللہ کی مزید نوازشات ان پر برسیں گی۔ ان نوازشات کا ذکر قرآن وسنت میں مختلف جگہوں پر کیا گیا ہے ان میں سے چند ایک کا یہاں ذکر فرمایا گیا ہے۔ جنت میں سامانِ ضیافت کے بعد جو سب سے پہلی نوازش کی جائے گی وہ یہ ہوگی کہ ان کے دلوں میں اگر ایک دوسرے کے بارے میں کوئی خلش' کوئی رنجش یا کوئی بدگمانی ہو گی تو انھیں اس سے پاک کر دیا جائے گا۔ یہ اللہ کی بیش بہا نعمت ہے کیونکہ کسی بھی بڑی سے بڑی ضیافت کے شرکاء بے شک اکل وشرب کے حوالے سے ہزاروں نعمتوں سے شاد کام ہو رہے ہوں لیکن وہ ایک دوسرے سے اگر تکدر رکھتے ہیں اور تقریب میں شامل ہو کر بھی ایک دوسرے سے بات کرنا یا ایک دوسرے سے محبت سے پیش آنا اور گھل مل کر تقریب کی مسرتوں سے مسرور ہونا انھیں گوارا نہ ہو تو اس تقریب کی ساری نعمتیں ان کے لیے بے کار ہو جاتی ہیں اس لیے کہ جہاں اچھا کھانا پینا انسان کی ضرورت ہے وہیں خوشی اور مسرت کے دوسرے لوازمات بھی اس کی ایسی ہی ضرورت ہیں بلکہ بعض دفعہ دوسری چیزیں کھانے پینے سے بڑھ کر

Marfat.com

خوشی کا باعث بنتی ہیں اگر آپ کسی ایسی تقریب میں شامل ہوں جس میں ضیافت کا سامان تو بہت سادہ ہو لیکن وہاں ایسے لوگوں سے آپ کی ملاقات ہو جائے جن کی محبت آپ کے لیے حقیقی مسرت کا باعث ہو تو آپ محسوس کریں گے کہ اس تقریب میں آ کر آپ کو حقیقی خوشی حاصل ہوئی ہے اس لیے جب یہ اہل جنت جنت میں پہنچیں گے تو ان کی خوشیوں کو مکمل اور دوبالا کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ ان پر یہ احسان فرمائیں گے کہ جنت کے شرکاء میں اگر کوئی ایسے لوگ ہوں جنھیں ان سے یا انھیں اُن سے کچھ تحفظات ہوں' کچھ بدگمانیاں ہوں یا کچھ ان کی جانب سے طبیعت میں خلش پائی جاتی ہو' انھیں ان سے ملنا اچھا نہ لگتا ہو اور یا سابقہ زندگی میں کچھ حوادث کے باعث یہ ان سے گھل مل کے باتیں نہ کر سکتے ہوں تو یقیناً یہ جنت بھی ان کو حقیقی خوشی نہیں دے سکے گی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ ان تمام اہل جنت کو اس طرح کی تمام باتوں سے پاک صاف کر کے جنت میں بھیجیں گے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں جانے والے لوگ جب جنت کی طرف جا رہے ہوں گے تو راستے میں ایک نہر آئے گی۔ اس کا پاکیزہ پانی پینے کے لیے انھیں کہا جائے گا تو جیسے ہی اس کا پانی پئیں گے تو ان کے دل اور ان کے سینے ہر طرح کی ایسی بدگمانیوں سے پاکیزہ ہو جائیں گے۔ اب جب یہ جنت میں جائیں گے تو جن لوگوں سے کوئی ناراضگی رہی ہو گی یہ اسے بالکل بھول چکے ہوں گے اور ایک دوسرے سے پوری محبت اور مسرت سے پیش آئیں گے۔ روایات میں آتا ہے کہ اس آیت کو پڑھ کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا تھا کہ مجھے امید ہے کہ اللہ میرے اور عثمان اور طلحہ اور زبیر کے درمیان بھی صفائی کرا دے گا یعنی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے بعد جس طرح کے واقعات صحابہ میں پیش آئے۔ حتیٰ کہ ان کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں تو واقعات پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ان واقعات کا سبب بلوائیوں کا ایک مخصوص گروہ تھا جنھوں نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا اور وہی لوگ صحابہ میں اختلافات پیدا کرنے حتیٰ کہ جنگوں تک نوبت پہنچانے کا سبب بنے اور جب بھی بات صلح تک پہنچی انھوں نے رات کو چھپ کر جانبین کی فوجوں پر شب خون مار کر لڑائی کی آگ کو بھڑکا دیا اور دونوں طرف کے لوگ یہ سمجھتے رہے کہ دوسرے فریق نے عہد شکنی کی ہے۔ حالانکہ یہ سب کچھ کیا دھرا ان بلوائیوں کا تھا چنانچہ انہی حوادث میں حضرت زبیر اور حضرت طلحہ بھی شہید ہوئے جس کا حضرت علی کو بے حد رنج تھا اسی حوالے سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ بات فرمائی تھی لیکن یہاں ایک بات یاد رہنی چاہیے کہ دلوں

Marfat.com

کی یہ بدگمانیاں یا یہ خلشیں جو پروردگار اہل جنت کے دلوں سے نکال دے گا اس کا تعلق ان باتوں سے ہے جنھیں کرنے والوں نے حدود سے تجاوز کرتے ہوئے نہ کیا ہو بلکہ بعض دفعہ بے خبری یا بدگمانی میں ایسا کچھ ہو گیا ہو اور پھر اس کے نتیجے میں طبیعت میں ایک انقباض پیدا ہوا ہو جس کا زندگی میں نکلنے کا موقع نہ آیا ہو تو قیامت کے دن ایسے لوگ اگر جنت میں جائیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو اس طرح کے احساسات سے پاک فرما دے گا لیکن جو لوگ جان بوجھ کر ایک دوسرے کے حقوق پامال کرتے اور قصداً دوسروں کی دل آزاریاں کرتے ہیں انھیں تو بہر حال اپنے رب کے سامنے جواب دہی کرنا ہو گی البتہ اگر وہ وہاں اپنی نیکیاں دے کر معاف کرانے میں کامیاب ہو گئے تو اللہ تعالیٰ ان سے بھی ایسا ہی سلوک فرمائے گا اور اگر معافی نہ مل سکی تو پھر وہی معاملہ ہو گا جو اللہ کے قانون کا تقاضا ہو گا۔

اہلِ جنت کا جذبۂ شکر وسپاس

باہر کی نعمتیں جو جنت میں رواں دواں ہوں گی ان کا تو کوئی حد و شمار نہیں ہو گا البتہ ان سے محظوظ ہونے کے لیے جو طبعی رکاوٹ پیش آ سکتی تھی اللہ جب اسے بھی دور فرما دے گا تو اب مسرتوں کی ایک ایسی بہار چھا جائے گی جس کا تصور بھی دنیا میں ممکن نہیں۔ خوشیوں کا ایک سیلاب بہہ رہا ہو گا جس کے سوتے سینوں سے پھوٹ رہے ہوں گے لیکن باہر کی فضا کے حوالے سے پروردگار نے صرف ایک بات ارشاد فرمائی کہ اہل جنت کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اس کی حقیقی صورت کیا ہو گی یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن دنیا میں بھی ہم جانتے ہیں کہ ایسے محلات بادشاہوں نے بنائے جن کے دائیں بائیں اور نیچے سے بھی نہریں رواں دواں ہوتی تھیں۔ جس کا کسی حد تک نظارہ تاج محل میں کیا جا سکتا ہے جو اگر ایک طرف محلات کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی تھیں تو دوسری طرف وہاں کے مکینوں کے سینوں کو بھی اس طرح خوشی سے بھر دیتی تھیں جیسے یہ نہریں باہر نہیں بلکہ ان کے اندر بہہ رہی ہوں۔ خوشیوں اور مسرتوں کا یہ سیل جب اندر باہر اس طرح بہہ رہا ہو گا تو اہل جنت اس منظر سے مبہوت ہو کر بے ساختہ پکار اٹھیں گے کہ تعریف اور شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ورنہ ہم خود اس قابل کہاں تھے کہ جنت کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے یہ بالکل اس طرح کا احساس اور ادائے شکر ہے جو کسی طویل اور پر صعوبت سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا

Marfat.com

ہے۔ آپ ایک ایسے مسافر کو تصور میں لایئے جسے حالات نے کسی طغیانی میں آئے ہوئے دریا کی موجوں کے حوالے کر دیا ہے وہ اپنی پوری توانائیاں بروئے کار لا کر ہاتھ پاؤں مارتا ہوا جب ساحل تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے پھر وہ ہانپتا کانپتا ساحل سے جب باہر نکلے تو وہ تو دل میں یہ محسوس کرے گا کہ زندگی تھی جو بچ نکلے اور یہ کرم تھا میرے اللہ کا کہ ساحل نصیب ہو گیا ورنہ آج تو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اور بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی کہ اچانک وہ دیکھے کہ ساحل کے ساتھ ہی ایک ایسا نعمتوں سے لدا ہوا باغ ہے جس میں مسرتیں اور شادمانیاں صرف اسی کے لیے سراپا انتظار ہیں اب جس طرح اس کی زبان اپنے محسن کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے میں رطب اللساں ہو گی اگر اس کا تصور کیا جا سکے تو کسی حد تک اس آیت کے مفہوم کا ادراک کیا جا سکتا ہے کہ زندگی کا یہ سفر جونجانے کتنے دریاؤں پر مشتمل ہے۔ آدمی ایک دریا پار کرتا ہے تو سامنے دیکھتا ہے کہ ایک اور دریا اس کا راستہ روکے کھڑا ہے اور وہ ہر قدم پر محسوس کرتا ہے:

منجدھار میں ہے ناؤ شکستہ ہیں بادباں کیسے لگیں گے پار ہوا سامنے کی ہے

خواہشات کے بے شمار بھنور ہیں جو ایمان کی کشتی کو نگل جانا چاہتے ہیں حوادث کے طوفان ہیں جو نیکیوں کے بادبانوں کو بے کار کیے دے رہے ہیں لیکن جب کشتی کھینے والا ہمت نہیں ہارتا تو توفیق ایزدی اس کو نہ صرف پار لگا دیتی ہے بلکہ ان نعمتوں کا مالک بنا دیتی ہے جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے تو بے ساختہ اس کی زبان سے جس طرح شکر کا اظہار ہو گا اس کو کسی حد تک یہاں زبان دی گئی ہے کہ وہ بے ساختہ یہ پکارے گا کہ یا اللہ یہ تیری جنت جو میری حقیقی منزل تھی بلکہ جو میرے جد امجد کی وراثت تھی اس لیے آگے اُوْرِثْتُمُوْهَا کا لفظ آ رہا ہے جس سے اس وراثت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میں اس کو کسی طرح حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ الٰہی تیرا کرم ہے کہ تو نے اپنے رسول بھیجے وہ تیرا پیغام حق لے کر ہمارے پاس آئے۔ انھوں نے ہمیں خون جگر پی پی کر سمجھایا' ہم گالیاں دیتے تھے وہ دعائیں دیا کرتے تھے' ہم ان کی زندگی کے درپے تھے لیکن وہ ہمیں جنت کا وارث بنانا چاہتے تھے۔ یا اللہ تیرا کرم کہ تو نے ہمیں توفیق دی اور ہم تیرے رسولوں پر ایمان لائے۔ اگر تو اپنے رسول حق دے کر نہ بھیجتا تو ہم اس حقیقت کو کیسے پا سکتے تھے پھر تو اگر ہمیں ایمان کی توفیق نہ دیتا تو ہم اس حقیقت سے کیسے بہرہ ور ہو سکتے تھے۔ پھر شرعی احکام پر چلنا خواہشات کے مارے ہوئے لوگوں کے لیے کوئی آسان نہ

Marfat.com

تھا تو نے ہم پر کرم فرمایا اور ہمیں اس کی ہمت عطا فرمائی یہ تمام مراحل صرف تیری نظرِ کرم' تیری توفیق اور تیری عنایت سے ہم سر کر سکے ورنہ ہم اس قابل کہاں تھے کہ یہ سب کچھ ہم خود کر سکتے۔ کسی شاعر نے جہاز پر سفر کرتے ہوئے حج کو جاتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا:

کہاں میری قسمت عنایت ہے ان کی' سفینے پہ ان کے چلا جا رہا ہوں
ہواؤں کی بخشش لیے جا رہی ہے' حرم کی کشش کے مزے پا رہا ہوں

Marfat.com

33- حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کے مصداق اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف:۱۵۷)

’’جو پیروی کریں گے اس نبی امی رسول کی، جس کا ذکر انھیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے وہ انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے بدی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزیں جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور پابندیاں اٹھاتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں، لہٰذا جو لوگ اس پر ایمان لائے اور جو اس کا احترام بجا لائے اور جنھوں نے اس کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی ہے، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔‘‘157

اس آیت کریمہ میں بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت اور تمام انسانوں کو نجات کا راستہ دکھایا گیا ہے کہ اب فوز و فلاح ان لوگوں کو نصیب ہو گی جو اس رسول نبی امی پر ایمان لائیں گے یہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ تین الفاظ کے ساتھ کیا گیا ہے اور یہ تینوں الفاظ آپ

Marfat.com

کے تعارف کے لیے استعمال ہوئے ہیں یعنی اب جس آخری پیغمبر پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے وہ نبی بھی ہے رسول بھی ہے اور امی بھی ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے چونکہ نوع انسانی کی ہدایت کے لیے آیا ہے اور وہ اپنی قوم کو بنیاد بنا کر تمام انسانوں کی اصلاح کرنا چاہتا ہے اس لحاظ سے وہ اللہ کا نبی ہے لیکن اس کی اصلاح اور تربیت کا دارومدار کسی سابقہ شریعت پر نہیں کیونکہ اہلِ کتاب نے سابقہ شریعتوں اور آسمانی کتابوں کو ترمیم اور تحریف کے ذریعے غیر محفوظ کر دیا ہے اب ان کتابوں کی بنیاد پر دنیا کی اصلاح کرنا ممکن نہیں رہا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس نبی کو رسول بھی بنایا اور ان پر کتاب اتاری اور نئی شریعت عطا کی کیونکہ رسول وہ ہوتا ہے جسے اللہ تعالیٰ نئی کتاب اور نئی شریعت عطا فرماتا ہے اور مزید برآں یہ کہ نبی کی زندگی اور دعوت کے نتیجہ میں احقاقِ حق تو ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ ابطالِ باطل مکمل ہو جائے اور حق کو عمومی غلبہ نصیب ہو لیکن رسول کی بعثت سے یہ دونوں کام مکمل کر دیئے جاتے ہیں۔ حق کی دعوت اس قوت اور صراحت سے پیش کی جاتی ہے کہ اسے قبول نہ کرنے والے دلوں میں اس کی حقانیت کے قائل ہو جاتے ہیں اور باطل کو جھنجلانے اور پیغمبر کے خلاف انتہائی مخالفت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہ جاتا وہ جب دیکھتا ہے کہ دلائل کی دنیا میں باطل کو لاجواب کر دیا گیا ہے تو پھر وہ پیغمبر کو قتل کرنے کے منصوبے باندھتا ہے یہ وہ وقت ہوتا ہے جب اللہ تعالیٰ اپنے پیغمبر اور ان پر ایمان لانے والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے اور دعوتِ حق کا انکار کرنے والوں پر عذاب نازل کرتا ہے اس طرح سے رسول جس انقلاب کی نوید بن کر آتا ہے وہ انقلاب مکمل کر دیا جاتا ہے' تو رسول کا لفظ کہہ کر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ آنحضرت کو صرف نبی نہ سمجھنا کہ وہ تمھیں حق کی خبر دے کر واپس چلے جائیں گے بلکہ وہ اللہ کی طرف سے کامل حجت اور کامل عدالت بن کر تشریف لائے ہیں ان کے آنے سے تم پر حجت تمام کر دی گئی ہے اب اگر تم نے انکار کی روش نہ چھوڑی تو تمھیں تباہ کر دیا جائے گا اور تیسرا لفظ آپ کے لیے استعمال ہوا ہے (امی)' اس لفظ کے استعمال کا سبب یہ ہے کہ پہلی آسمانی کتابوں میں عموماً اسی لفظ کے ساتھ آپ کی تشریف آوری کی خبر دی گئی ہے یعنی یہ لفظ آپ کے لیے ایک شناخت کا درجہ بھی رکھتا ہے اور اعزاز کا بھی' شناخت سے مراد یہ ہے کہ امی کا لفظ تمام عربوں کے لیے عموماً اور قریش کے لیے خصوصاً اس لیے بولا جاتا تھا کہ قریش اور عرب لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور اس سے بھی بڑی بات یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کوئی پیغمبر بنی اسماعیل میں نہیں آیا تھا جب کہ بنی اسرائیل

Marfat.com

میں اس دوران سینکڑوں انبیاء تشریف لائے تو چونکہ ایک طویل مدت تک یہ سرِ زمین وحی الٰہی سے محروم رہی اس لیے قریش اور عرب کتاب و شریعت کی تعلیم سے یکسر نا آشنا رہے۔ انھوں نے اپنے رسوم و رواج کو اپنا دین سمجھ رکھا تھا وہ شریعت کے نام سے کسی چیز سے واقف نہیں تھے تو لکھنے پڑھنے سے ناواقفیت اور دین و شریعت سے جہالت کے باعث نہ صرف اہل کتاب ان کو امی کہتے تھے بلکہ خود عرب بھی اپنے آپ کو شناخت کے طور پر امی کے لفظ سے یاد کرتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کو اپنی اس شناخت پر فخر تھا انھیں روایتی تعلیم و تعلم سے کوئی دلچسپی نہ تھی البتہ زندگی کے کمالات اور فضائل سے وہ ضرور آگاہ تھے جن انسانی فضائل کو وہ انسانیت کا جوہر سمجھتے تھے انھیں حاصل کرنا اپنے لیے ضروری جانتے تھے ایک عرب کو عزت حاصل کرنے کے لیے تلوار کا دھنی، دل کا غنی، ارادے کا مستحکم اور مسائل اور مشکلات کے مقابلے میں صبر مجسم زبان کا تیور شناس اور قومی احساسات میں حد درجہ حساس ہونا ضروری تھا انھیں چیزوں کو وہ حاصل کرنا اپنی زندگی کے لیے کافی سمجھتے تھے لیکن اہلِ کتاب امی کے لفظ کو ان کے لیے شناخت کے طور پر استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ تحقیر کے لیے استعمال کرتے تھے ان کا قومی فخر و غرور عربوں کو اپنے برابر سمجھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا ان کے قومی پندار نے ان کو یہاں تک پہنچا دیا تھا کہ وہ عربوں کو اپنے مقابل انسانی حقوق کا حامل بھی نہیں سمجھتے تھے ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم چونکہ انبیاء کی اولاد ہیں اس لیے ہم عربوں کے کچھ حقوق دبا بھی لیں تو بھی عربوں کو اس پر شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں اور یہ خباثت معلوم ہوتا ہے یہود کے ذہنوں میں آج تک موجود ہے ان کے نیشنل پروٹوکول کے نام سے بعض در پردہ جو کتابیں چھپتی ہیں اور جس کی اشاعت بہت سارے تحفظات کے ساتھ کی جاتی ہے اس میں وہ دنیا کی کسی قوم کو اپنے مقابل سمجھنے کے لیے تیار نہیں اور اپنے آپ کو دوسری قوموں کے مقابلے میں ایک برتر مخلوق تصور کرتے ہیں جب آج روشنی کے زمانے میں ان کا یہ حال ہے تو اسوقت ان کے قومی فخر و غرور کا کیا عالم ہوگا اس کا اندازہ مشکل نہیں۔

جہاں تک آنحضرت ﷺ کے لیے اس لفظ کے استعمال کا تعلق ہے وہ صرف شناخت ہی نہیں اعزاز بھی ہے۔ اعزاز ان معنوں میں کہ اللہ کا یہ رسول قریش کے انسانی قافلے کا ایک فرد ہے مکہ میں وہ پیدا ہوا اور وہیں پلا بڑھا اسی کی فضاء میں اس نے شعور کی آنکھ کھولی بچپن بکریاں گزارتے گزرا اور جوانی کی عمر میں چند تجارتی سفروں کے سوا باہر کی دنیا کو دیکھنے کا اتفاق

Marfat.com

تک نہیں ہوا اور مکہ کی سرزمین میں نہ کسی تعلیمی ادارے کا وجود تھا اور نہ تعلیمی فضاء میسر تھی اور پھر آپ کی معلومات کے سرچشمے بھی وہی تھے جو باقی عربوں کے تھے بایں ہمہ چالیس سال کی عمر کو پہنچتے ہی غارِ حرا کی تنہائی سے نکلنے والی اس ذاتِ عزیز کی زبان مبارک سے علم و حکمت کا چشمہ پھوٹ نکلا۔ ایک ایسا کلام جس کی فصاحت و بلاغت کے سامنے سارے عرب کی فصاحت گنگ ہو کر رہ گئی جس کے علوم و معارف نے دنیا بھر کے صاحبانِ علم و فضل کو سوچنے کی نئی نئی راہیں دیں اور راہنمائی کے وہ اصول بتا دیئے جس تک انسانی فکر کی رسائی ممکن نہ تھی انسانی زندگی کے وہ گوشے جو علم و دانش کے فیضان کے باوجود آج تک تاریک تھے انھیں معرفتِ ذات' معرفت کائنات' معرفتِ حقوق و فرائض اور معرفتِ حق کے نور سے منور کر دیا گیا اور دستور اور قانون کی زبان میں ایک ایسا آئین دیا گیا جس کی ہر ادا نئے بانکپن کی حامل اور جس کا ہر لفظ شعور و آگہی کا خزانہ ہے اور یہ سب کچھ اس زبان مبارک سے ادا ہو رہا ہے جس نے کسی ادارے میں علم حاصل نہیں کیا جس نے کسی شخص کے سامنے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا اس لحاظ سے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کریم آپ کو امی کے لفظ سے یاد کر رہا ہے تو یقیناً اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ لوگو! اس شخص کے اعزاز کا تم کیا اندازہ کر سکتے ہو اور اس کی عظمت کا کیا ٹھکانہ ہے کہ وہ تمھارے طرح ایک امی اور ان پڑھ ہے لیکن دنیا بھر کے علوم و معارف اس کی علمی عظمتوں کے سامنے سرنگوں ہیں اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو شائد یہ کمالات' کمالات ہوتے ہوئے بھی اس درجہ اعزاز کا مستحق نہ ہوتے اصل وجہ اعزاز تو یہ ہے کہ دنیا نے تعلیم و تعلم کے حوالے سے کوئی چیز اس کے حوالے نہیں کی لیکن اس نے امی ہوتے ہوئے بھی دنیا کو علوم کے خزانوں سے مالا مال کر دیا'

مزید فرمایا کہ وہ ذات جو رسول نبی اور امی ہے امرِ واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی نگاہوں نے تو اسے اب دیکھا ہے لیکن اہلِ کتاب تو اپنی کتابوں میں اسے صدیوں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں اس کی علامتیں موجود نہ ہوں اور کوئی رسول ایسا نہیں جس نے اس کے آنے کی خبر نہ دی ہو تورات اور انجیل میں اس کی علامتیں لکھی گئی تھیں اگرچہ اہلِ کتاب نے پوری کوشش کر ڈالی کہ کوئی علامت باقی رہنے نہ دی جائے لیکن ان کی ساری کوششوں کے باوجود آج بھی ان کی کتابوں میں ایسی آیات موجود ہیں جس سے آنحضرت ﷺ کی تشریف آوری کی خبر ملتی ہے۔ ان میں سے چند کو ہم یہاں ذکر کرتے ہیں۔

''خداوند تیرا خدا تیرے لیے تیرے ہی درمیان سے تیرے ہی بھائیوں

Marfat.com

میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا' تم اس کی سننا...... اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے ان ہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثناء ب ۱۸۔۱۵۔۱۹)

اس سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پر خود حضرت موسیٰ ہی نے یہ حقیقت واضح کر دی تھی کہ آنے والا نبی بنی اسماعیل یعنی امیوں میں پیدا ہوگا اس لیے کہ اس سیاق میں' تیرے بھائیوں میں سے'' یا '' انہی کے بھائیوں میں سے کا مطلب اس کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے گویا اسی بشارت کا اعادہ تھا جو سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسل سے ایک رسول کی بعثت کی دی تھی۔ تفصیلات اسکی بقرہ میں گزر چکی ہیں۔

اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ وہ صرف نبی نہیں ہوگا بلکہ رسول بھی ہوگا اس لیے کہ ''میری مانند'' اور ''تیری مانند'' سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مانند ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام' فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جن کے ذریعہ سے بنی اسرائیل کو نجات حاصل ہوئی اور فرعون اور اس کی قوم کو اللہ تعالیٰ نے تباہ کر دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اسی طرح اپنی قوم قریش اور اہل عرب کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔

''خدا سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا، فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا' دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لیے تھی''۔ (استثناب ۳۳ ۲)

''آتشی شریعت'' سے میرے نزدیک اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام نے ظاہر فرمائی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہوگا' وہ اپنے کھلیان کو خوب صاف کرے گا' دانے کو بھس سے الگ کرے گا پھر دانے کو محفوظ کرے گا اور بھس کو جلا دے گا یہ ٹھیک ٹھیک رسول کی وہ خصوصیت بیان ہوئی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا کہ وہ اپنی قوم کے لیے عدالت بن کر آتا ہے اور حق و باطل کے درمیان اس کے ذریعے سے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

Marfat.com

یسعیاہ نبی کی پیشنگوئی ان لفاظ میں مذکور ہے۔

''دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا' بڑا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے۔ میں نے اپنی روح اس پر رکھی وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرے گا' اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے گا۔'' یسعیاہ ب۴۲ (۱۔۴)

سیدنا مسیح علیہ السلام کی پیشن گوئی ملاحظہ ہو

یسوع نے ان سے کہا کہ کیا تم نے کتاب مقدس میں پڑھا نہیں کہ جس پتھر کو معماروں نے رد کیا وہی کونے کے سرے کا پتھر ہو گیا۔ یہ خداوند کی طرف سے ہوا اور ہماری نظر میں عجیب ہے۔ اس لیے میں تم سے کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور اس قوم کو جو اس کے پھل لائے دے دی جائے گی اور جو اس پتھر پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے مگر جس پر وہ گرے گا اسے پیس ڈالے گا۔''

متی ۲۱ (۴۲۔۴۴)

''اور میں باپ سے درخواست کروں گا' تو وہ تمھیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمھارے ساتھ رہے۔'' یوحنا ۱۴ (۱۷)

''اس کے بعد میں تم سے بہت سی باتیں نہ کروں گا کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کا کچھ نہیں۔'' یوحنا ۱۴ (۳۱)

ان پیشنگوئیوں پر غور کیجیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل میں آخری نبی ہیں۔ ان کے بعد کوئی نبی بنی اسرائیل میں نہیں آیا۔ پھر ان پیشنگوئیوں کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہوسکتا ہے؟ آخر وہ پتھر کون ہوسکتا ہے جس کو معماروں نے تو رد کر دیا تھا لیکن بالآخر وہی کونے کے سرے کا پتھر بن گیا؟ یہ کس کی شان ہے کہ جو اس پر گرے گا اس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور جس پر وہ گرے گا اس کو پیس ڈالے گا؟ یہ کس کا مرتبہ بیان ہوا ہے کہ وہ دنیا کا سردار ہے جو ابد تک لوگوں کے ساتھ رہے گا اور وہ باتیں بتائے گا جو حضرت مسیح علیہ السلام بتانے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ ضد اور مکابرت کی بات اور ہے لیکن جو شخص بھی ان پیشنگوئیوں پر انصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا کہ یہ اگر کسی پر راست آسکتی ہیں تو

Marfat.com

صرف نبی امی اور رسول خاتم محمد ﷺ پر ہی راست آ سکتی ہیں۔ نبی امی کے سوا اور کوئی ان کا مصداق نہیں ہو سکتا۔

اہل کتاب میں سے جو لوگ مسلمان ہوئے ان کی روایت سے احادیث میں آنحضرت ﷺ کی صفات نقل کی گئی ہیں جنھیں محدثین نے اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے ان میں سے چند ہم یہاں نقل کرتے ہیں:

بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک یہودی لڑکا نبی کریم ﷺ کی خدمت کیا کرتا تھا وہ اتفاقاً بیمار ہو گیا تو آپ اس کی بیمار پرسی کے لے تشریف لے گئے تو دیکھا کہ اس کا باپ اس کے سرہانے کھڑا ہوا تورات پڑھ رہا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس سے کہا کہ اے یہودی میں تجھے خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمائی ہے کہ کیا تو تورات میں میرے حالات اور صفات اور میرے ظہور کا بیان پاتا ہے؟ اس نے انکار کیا تو بیٹا بولا یا رسول اللہ یہ غلط کہتا ہے تورات میں ہم آپ کا ذکر اور آپ کی صفات پاتے ہیں اور میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں۔ آنحضرت ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین کو حکم دیا کہ اب یہ مسلمان ہے انتقال کے بعد اس کی تجہیز و تکفین مسلمان کریں، باپ کے حوالہ نہ کریں۔ (مظہری)

اور حضرت علی مرتضی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول کریم ﷺ کے ذمہ ایک یہودی کا قرض تھا اس نے آ کر اپنا قرض مانگا آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس کچھ نہیں کچھ مہلت دو، یہودی نے شدت کے ساتھ مطالبہ کیا اور کہا کہ میں آپ کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گا جب تک میرا قرض ادا نہ کر دو آنحضرت ﷺ نے فرمایا یہ تمھیں اختیار ہے میں تمھارے پاس بیٹھ جاؤں گا چنانچہ رسول کریم ﷺ اسی جگہ بیٹھ گئے اور ظہر، عصر، مغرب، عشا کی اور پھر اگلے روز صبح کی نماز یہیں ادا فرمائی صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین یہ ماجرا دیکھ کر رنجیدہ اور غضبناک ہو رہے

Marfat.com

تھے اور آہستہ آہستہ یہودی کو ڈرا دھمکا کر یہ چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ کو چھوڑ دے' رسول اللہ نے اس کو تاڑ لیا اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین سے پوچھا یہ کیا کرتے ہو؟ تب انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم اس کو کیسے برداشت کریں کہ ایک یہودی آپ کو قید کرے آپ ﷺ نے فرمایا کہ "مجھے میرے رب نے منع فرمایا ہے کہ کسی معاہد وغیرہ پر ظلم کروں" یہودی یہ سب ماجرا دیکھ اور سن رہا تھا۔

صبح ہوتے ہی یہودی نے کہا اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اس طرح مشرف باسلام ہو کر اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میں نے اپنا آدھا مال اللہ کے راستہ میں دے دیا اور قسم ہے خدا تعالیٰ کی کہ میں نے اس وقت جو کچھ کیا اس کا مقصد صرف یہ امتحان کرنا تھا کہ تورات میں جو آپ کی صفات بتلائی گئی ہیں وہ آپ میں صحیح طور پر موجود ہیں یا نہیں؟ میں نے تورات میں آپ کے متعلق یہ الفاظ پڑھے ہیں: "محمد بن عبداللہ ان کی ولادت مکہ میں ہوگی اور ہجرت طیبہ کی طرف اور ملک ان کا شام ہوگا' نہ وہ سخت مزاج ہوں گے نہ سخت بات کرنے والے نہ بازاروں میں شور کرنے والے' فحش اور بے حیائی سے دور ہوں گے"۔

اب میں نے ان تمام صفات کا امتحان کر کے آپ میں صحیح پایا' اس لیے شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں اور یہ میرا آدھا مال ہے آپ کو اختیار ہے جس طرح چاہیں خرچ فرمائیں اور یہ یہودی بہت مالدار تھا' آدھا مال بھی ایک بڑی دولت تھی اس روایت کو تفسیر مظہری میں بحوالہ دلائل النبوۃ بیہقی نقل فرمایا ہے۔

امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ کعب احبار رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ انھوں نے فرمایا کہ تورات میں آنحضرت ﷺ کے متعلق یہ لکھا ہوا ہے کہ "محمد اللہ کے رسول اور منتخب بندے ہیں' نہ سخت مزاج ہیں نہ بیہودہ گو' نہ بازاروں میں شور کرنے والے' بدی کا بدلہ بدی سے نہیں دیتے بلکہ معاف

Marfat.com

فرما دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں' ولادت آپ کی مکہ میں اور ہجرت طیبہ میں ہوگی' ملک آپ کا شام ہوگا اور امت آپ کی حمادین ہوگی یعنی راحت وکلفت دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کی حمد وشکر ادا کرے گی ہر بلندی پر چڑھنے کے وقت وہ تکبیر کہا کرے گی وہ آفتاب کے سایوں پر نظر رکھے گی تاکہ اس کے ذریعہ اوقات کا پتہ لگا کر نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھا کرے' وہ اپنے نچلے بدن پر تہبند استعمال کریں گے اور اپنے ہاتھ پاؤں کو وضو کے ذریعہ پاک صاف رکھیں گے ان کا اذان دینے والا فضا میں آواز بلند کرے گا' جہاد میں ان کی صفیں ایسی ہوں گی جیسے نماز کی جماعت میں' رات کو ان کی تلاوت اور ذکر کی آوازیں اس طرح گونجیں گی جیسے شہد کی مکھیوں کا شور ہوتا ہے'' (مظہری)۔

ابن سعد اور ابن عساکر نے حضرت سہل مولیٰ خیثمہ سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے کہ حضرت سہل نے فرمایا کہ میں نے خود انجیل میں محمد مصطفیٰ ﷺ کی یہ صفات پڑھی ہیں کہ ''وہ نہ پست قد ہوں گے نہ بہت دراز قد' سفید رنگ دو زلفوں والے ہوں گے ان کے دونوں شانوں کے درمیان ایک مہر نبوت ہوگی' صدقہ قبول نہ کریں گے' حمار اور اونٹ پر سوار ہوں گے' بکریوں کا دودھ خود دوہ لیا کریں گے' پیوند زدہ کرتہ استعمال فرمادیں گے اور جو ایسا کرتا ہے وہ تکبر سے بری ہوتا ہے وہ اسماعیل علیہ السلام کی ذریت میں ہوں گے' ان کا نام احمد ہوگا''۔

ابن سعد نے طبقات میں دارمی نے اپنے مسند میں بیہقی نے دلائل نبوت میں حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے جو یہود کے سب سے بڑے عالم اور تورات کے ماہر مشہور تھے انھوں نے فرمایا کہ تورات میں رسول اللہ کے متعلق یہ الفاظ مذکور ہیں:

''اے نبی! ہم نے آپ کو بھیجا ہے سب امتوں پر گواہ بنا کر اور نیک عمل کرنے والوں کو بشارت دینے والا' برے اعمال والوں کو ڈرانے والا بنا کر اور امیین یعنی عرب کی حفاظت کرنے والا بنا کر' آپ میرے بندے اور رسول ہیں' میں نے آپ کا نام متوکل رکھا ہے' نہ آپ سخت مزاج ہیں

Marfat.com

نہ جھگڑالو اور نہ بازاروں میں شور کرنے والے' برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے بلکہ معاف کر دیتے ہیں اور درگزر کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ ان کو اس وقت تک وفات نہ دیں گے جب تک ان کے ذریعہ ٹیڑھی قوم کو سیدھا نہ کر دیں یہاں تک کہ وہ لا الہ الا اللہ کے قائل ہو جائیں اور اندھی آنکھوں کو کھول دیں اور بہرے کانوں کو سننے کے قابل بنا دیں اور بند ھے ہوئے دلوں کو کھول دیں''۔

اس جیسی ایک روایت بخاری میں بروایت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ بھی مذکور ہے۔

اور کتبِ سابقہ کے بڑے ماہر عالم حضرت وہب بن منبہ سے بیہقی نے دلائل النبوۃ میں نقل کیا ہے کہ

''اللہ تعالیٰ نے زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف یہ وحی فرمائی کہ اے داؤد! آپ کے بعد ایک نبی آئیں گے جن کا نام احمد ہوگا' میں ان پر کبھی ناراض نہ ہوں گا اور وہ کبھی میری نافرمانی نہ کریں گے اور میں نے ان کے لیے سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دی ہیں' ان کی امت امتِ مرحومہ ہے میں نے ان کو وہ نوافل دیے ہیں جو انبیاء کو عطا کیے تھے اور ان پر وہ فرائض عائد کیے ہیں جو پہلے انبیاء پر لازم کیے گئے تھے یہاں تک کہ وہ حشر میں میرے سامنے اس حالت میں آئیں گے کہ ان کا نور انبیاء علیہم السلام کے نور کی مانند ہوگا' اے داؤد! میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو تمام امتوں پر فضیلت دی ہے' میں نے ان کو چھ چیزیں خصوصی طور پر عطا کی ہیں جو دوسری امتوں کو نہیں دی گئیں اول یہ کہ خطا و نسیان پر ان کو عذاب نہ ہوگا جو گناہ ان سے بغیر قصد کے صادر ہو جائے اگر وہ اس کی مغفرت مجھ سے طلب کریں تو میں معاف کر دوں گا اور جو مال وہ اللہ کی راہ میں بطیبِ خاطر خرچ کریں گے تو میں دنیا ہی میں ان کو اس سے زیادہ دے دوں گا اور جب ان پر کوئی مصیبت پڑے گی اور وہ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ کہیں گے تو میں ہر اس مصیبت کو صلوٰۃ و

Marfat.com

رحمت اور جنت کی طرف ہدایت بنا دوں گا وہ جو دعا کریں گے میں قبول کروں گا کبھی اس طرح کہ جو مانگا ہے وہی دے دوں اور کبھی اس طرح کہ اس دعا کو ان کی آخرت کا سامان بنا دوں۔ (روح المعانی)

نبی کریم ﷺ کی یہ وہ صفات و علامات ہیں جو پہلی آسمانی کتابوں میں ذکر کی گئی ہیں اور مزید چند صفات پروردگار نے اس آیت کریمہ میں بھی بیان فرمائی ہیں اگرچہ ان کا تذکرہ دوسرے الفاظ میں سابقہ آسمانی کتابوں میں بھی ہے لیکن یہاں بطورِ خاص انھیں ذکر کیا جا رہا ہے ان میں سے سب سے پہلی جو صفت بیان فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ:

۱۔ امر بالمعروف نہی عن المنکر

نبی آخر الزماں ﷺ لوگوں کو معروف کا حکم دیں گے اور منکر سے روکیں گے، معروف کا لفظی معنی جانا پہچانا اور منکر کا لغوی معنی اوپرا اور اجنبی ہے جس کی پہچان میں دشواری پیش آئے، اس جگہ معروف سے مراد وہ نیک کام ہے جو شریعت اسلام میں جانے پہچانے جاتے ہیں اور عقل اور سلامتِ فکر اس کی پہچان میں دشواری محسوس نہیں کرتی اور منکر سے مراد وہ برے کام ہیں جن کا دین اور شریعت سے کوئی تعلق نہیں اور اسلامی ذوق کی حامل عقل انھیں قبول کرنے سے انکار کرتی ہے۔ ہم سورۃ انعام میں اس کا ذکر کر چکے ہیں ان دونوں کے حوالے سے فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کے آخری رسول معروف کا حکم دیں گے اور برائی اور منکر سے روکیں گے، عجیب بات یہ ہے کہ یہ ایک ایسی صفت ہے یعنی معروف کا حکم دینا اور برائی سے روکنا جو آنحضرت ﷺ کی خصوصیت نہیں بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کا یہ فریضہ بھی تھا اور پہچان بھی۔ اس کے باوجود آنحضرت ﷺ کے حوالے سے بطورِ خاص اس کا ذکر کیا جانا یقیناً اپنے اندر کوئی سبب رکھتا ہے غور کرنے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ بات کہ اگرچہ یہ صفت تمام انبیاء کرام میں پائی جاتی ہے لیکن آنحضرت ﷺ میں اس صفت نے انتہائی کمال اور اعجاز کے ساتھ ظہور کیا ہے آپ نے اپنے بگڑے ہوئے معاشرے کو جس اسلوب کے ساتھ دعوت دی ہے اور رفتہ رفتہ جس طرح منکرات سے انھیں روکنے میں کامیابی حاصل کی ہے وہ یقیناً آپ کی ذات کا اعجاز بھی ہے اور آپ کی خصوصیت بھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام منکرات کو روکنے میں خاص اہمیت رکھتے ہیں آپ کی طبیعت میں غیر معمولی جلال ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو پرہیبت شخصیت بخشی

Marfat.com

ہے اس لیے آپ نے کبھی بھی کسی منکر کو برداشت نہیں کیا اور نہایت سختی سے اسے روکا لیکن جب ہم نتائج پر غور کرتے ہیں تو وہ نہایت قابلِ تعریف ہونے کے باوجود اس سطح تک نہیں پہنچے جس سطح تک آنحضرت ﷺ کا کام پہنچا ہے آپ نے معروف کی بھی آبیاری کی لیکن بنی اسرائیل نے عموماً آپ کی کوششوں کو ناکامی سے دوچار کیا ہے حتیٰ کہ تورات ایک سے زیادہ جگہ ہمیں اس بات کی خبر دیتی ہے کہ بنی اسرائیل کے اس رویے سے مایوس ہو کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے شکایت کی لیکن اس کے برعکس ہم آنحضرت ﷺ کی مساعیٔ جمیلہ اور اس پر مرتب ہونے والی کامیابیوں کو دیکھتے ہیں تو ایک حیرت افزا صورتِ حال سامنے آتی ہے دشمنوں کی ہر چند مخالفتوں کے باوجود آپ نے انہی میں سے نہایت کامیابی سے ہیرے اور جواہر چنے ہیں۔ اور جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی گئی ہے' ان کی سیرت و کردار کا معیار بھی بلند سے بلند تر ہوتا گیا حتیٰ کہ آپ کی زندگی کے آخری سالوں میں ایک ایسا معاشرہ وجود میں آیا جس میں گناہ کا وجود صفر تک پہنچ گیا' معروف کی بہار چھا گئی اور منکرات کو اس سوسائٹی سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا' پھر یہ بات جانی پہچانی ہے کہ آپ کو جس قوم سے واسطہ پڑا تھا ان کی غالب اکثریت نہایت جاہل اور اکھڑ لوگوں پر مشتمل تھی انھیں کوئی بات سمجھانا' نیکی کی طرف مائل کرنا اور برائی چھڑوانا یہ بے حد مشکل کام تھا لیکن آپ نے بدو چرواہوں تک کو جس دل آویز طریقے سے نیکیوں کی طرف مائل کیا اور منکرات کو ان کی زندگی سے نکالا وہ آپ کی اس درخشاں صفت کی روشن مثال ہے' آپ ہر سطح کے آدمی کو سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت سے متصف تھے۔ اسی طرح دقیق سے دقیق مضامین کو بھی نہایت سادہ اور سہل الفاظ میں سمجھا دینا اور مشکل سے مشکل بات کو پانی کر دینا آپ کی طبیعت کا خاص جوہر تھا ہر سطح کے مخاطب سے اس کے فہم کے مطابق بات کرنا اور اس کے ذوق کا لحاظ کرتے ہوئے اسلوبِ کلام اختیار کرنا اس کا بھی بار بار آپ کی گفتگو اور آپ کے خطبات سے اظہار ہوتا ہے' شائد اسی غیر معمولی صلاحیت اور غیر معمولی اللہ کی رحمت کے باعث آپ کی اس صفت کو بطورِ خاص بیان کیا گیا ہے۔

دوسری بات جو معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک استعلاء برتری قوت اور اقتدار کے طالب ہیں کیونکہ امر اور نہی' فہمائش' فرمائش' درخواست اور عرض کرنے کو نہیں کہتے' اس کا مطلب تو یہ ہوتا ہے کہ تمھیں برائی سے روکا جا رہا ہے اور نیکی کا حکم دیا جا رہا ہے یہ نیکی تمھیں کرنا ہو گی اور برائی سے رکنا ہو گا اگر یہ نیکی نہیں کرو گے تو حکم

Marfat.com

عدولی میں پکڑے جاؤ گے اور برائی سے نہیں رکو گے تو مجرم سمجھ کر احتساب کے حوالے کر دیئے جاؤ گے یہ صفت اسی کو میسر آ سکتی ہے اور یہ صورتِ حال اسی وقت جنم لے سکتی ہے جب کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والا اقتدار پر فائز ہو اس کی حیثیت صرف ایک رسول کی نہ ہو بلکہ سربراہِ ریاست کی بھی ہو اگر یہ بات صحیح ہے تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صفت کو بیان کر کے پروردگار اس بات کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ ہمارا آخری پیغمبر صرف داعی بن کر نہیں آئے گا بلکہ اللہ تعالیٰ اس کی دعوت کو کامیابی عطا فرمائیں گے وہ جس انقلاب کی دعوت لے کر اٹھے گا اس انقلاب کو برپا ہونے کا موقع دیا جائے گا بالآخر یہ دعوت ایک ریاست کی شکل اختیار کر لے گی اور ہمارا پیغمبر ریاست کا سربراہ بن کر نیکی اور خیر کی قوتوں کو غالب کر دے گا اور برائی کو مغلوب کر کے جڑ سے اکھاڑ پھینکے گا' اس کا مطلب یہ ہے کہ اس صفت کے بیان کرنے سے آنحضرت ﷺ کی دعوت کو بے ہمہ وجود جو کامیابی ملنے والی تھی اس کی خبر بھی دے دی گئی ہے اور آپ کی حیثیت کا تعین بھی فرما دیا گیا ہے۔

2۔ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرے گا

اس کے بعد فرمایا گیا کہ وہ نبی امی جب آئے گا تو وہ لوگوں کے لیے طیبات کو حلال کرے گا اور خبائث کو حرام کرے گا۔ یہ دونوں باتیں بھی ہر رسول کی صفات میں شامل رہی ہیں لیکن آنحضرت ﷺ کی اس خصوصیت کو بطور خاص بیان کرنے کا درحقیقت ایک پس منظر ہے جس کا کسی حد تک ذکر سورۃ آلِ عمران' سورۃ مائدہ اور سورۃ الانعام میں گزر چکا ہے' وہاں یہ بتایا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے صرف خبائث ہی کو حرام نہیں کیا گیا تھا بلکہ ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر بعض ایسی چیزیں بھی ان پر حرام کر دی گئی تھیں جو اگرچہ خبائث نہیں بلکہ طیبات میں داخل تھیں لیکن ان کا حرام کرنا بنی اسرائیل کے لیے ایک سزا تھا مثلاً تمام ناخن والے جانور اور گائے بکری وغیرہ کی چربی یہ اپنی ذات میں قابلِ حرمت نہ تھیں لیکن بنی اسرائیل کی سزا کے طور پر ان کو حرام کیا گیا۔ اسی طرح ان پر حلال وحرام کے سلسلے میں بعض ایسی پابندیاں لگائی گئیں جس کی وجہ سے بعض حلال جانور بھی ان پر حرام ہو گئے' مثلاً ان سے یہ کہا گیا کہ چوپایوں میں صرف وہ چوپائے حلال ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوئے ہوں اور وہ جوگالی بھی کرتے ہوں چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اونٹ' سافان اور خرگوش جیسے جانور بھی ان پر حرام ہو گئے۔

Marfat.com

3۔ بوجھ اتارے گا اور بیڑیاں کاٹے گا

مزید فرمایا کہ وہ آنے والا پیغمبر لوگوں سے بوجھ اتارے گا اور ان سے بیڑیاں کاٹ دے گا جو انھوں نے پہن رکھی ہیں اصر بوجھ اور بارِ گراں کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے آدمی حرکت نہ کر سکے اور اغلال، غلو کی جمع ہے اس ہتھ کڑی کو کہتے ہیں جس سے مجرم کے ہاتھوں کو اس کی گردن کے ساتھ باندھ دیا جاتا ہے اور وہ بالکل بے اختیار ہو جاتا ہے یہاں ان دونوں چیزوں سے مراد وہ سخت احکام و واجبات ہیں جو اصل دین میں مقصود نہ تھے لیکن بنی اسرائیل کی سرکشی کے سبب انھیں ان کا حکم دیا گیا جیسا کہ ابھی اس کا کچھ ذکر ہوا ہے اور یا ان کے فقہاء نے اپنی فنی موشگافیوں کے باعث بلا وجہ بعض چیزوں کو اپنے اوپر لازم کر لیا، مثلاً اللہ تعالیٰ نے ان پر وہ چربی حرام کی تھی جو گوشت کی جز کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ کمر یا آنکھوں یا ہڈیوں سے آسانی سے الگ کی جا سکتی ہے لیکن تورات کی تفصیلات پڑھ کر دیکھئے انھوں نے مطلقاً اپنے اوپر چربی حرام کر لی یعنی وہ چربی بھی جسے جانور کے گوشت اور آنکھوں اور ہڈیوں سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر اسی طرح کی چیزیں ان کے لیے زندگی کا بوجھ بن گئیں اور پھر وہ جب اس پر عمل نہ کر سکے اور سرکشی کا راستہ اختیار کیا تو قدرت نے ان کی سرکشی کے علاج کے لیے ایسے سخت احکام ان کو دیئے جن پر چلنا آسان نہ تھا مثلاً ان کو حکم دیا گیا کہ کپڑا ناپاک ہو جائے تو اس کی پاکی کے لیے دھو دینا کافی نہیں بلکہ ضروری ہے کہ جس جگہ نجاست لگی ہو اسے کاٹ دیا جائے، اسی طرح جہاد کی صورت میں جو مالِ غنیمت انھیں ملتا تھا اس کو استعمال میں لانا ممنوع قرار دے دیا گیا، ہفتہ کے دن شکار کرنے پر پابندی لگا دی گئی، قتلِ عمد کی صورت میں قصاص واجب تھا خون بہا کی کوئی صورت نہیں تھی، اسی طرح کے سخت احکام ہیں جنھیں انھیں اصر اور اغلال سے تعبیر کیا گیا ہے اور آنحضرت ﷺ کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ جب وہ مبعوث ہوں گے تو انسانوں کی گردنوں سے یہ طوق اتاریں گے اور ان کو اس بارِ گراں سے نجات دیں گے، اس لیے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمھارے دین کے معاملے میں کوئی تنگی نہیں رکھی اور آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں جو دین لے کر آیا ہوں وہ آسان ہے، مشکل نہیں اور میں تمھارے لیے ایک سہل اور آسان شریعت چھوڑ کر جا رہا ہوں جس میں نہ کوئی مشقت ہے اور نہ گمراہی کا اندیشہ۔

Marfat.com

34- دُنیا اور آخرت میں کامیاب لوگوں کی چند صفات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِہٖ وَعَزَّرُوْہُ وَنَصَرُوْہُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْ اُنْزِلَ مَعَہٗ لا اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾

خاتم النبیین ﷺ کی ان صفات اور کمالات کا ذکر فرمانے کے بعد بنی اسرائیل اور آنے والی نوع انسانی کو واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ اب اگر کوئی کامیابی حاصل کرنے والا گروہ ہے تو وہ صرف وہ ہے جو اس آخری پیغمبر پر ایمان لائے اس طرح سے آنے والی دنیا کو کامیاب دنیا کی خبر بھی دی گئی ہے' پیشگوئی بھی فرمائی ہے اور ضمنی طور پر حکم بھی دیا جا رہا ہے' اور پھر ایمان کے ساتھ ساتھ مزید چند احکام بھی دیئے گئے جن کی تعمیل کیے بغیر نہ ایمان کی حقیقت متحقق ہوتی ہے اور نہ ایمان کے فوائد مرتب ہوتے ہیں' اس لیے ایمان کے بعد تین باتوں کا ذکر فرمایا

1- تعظیم وتکریم 2- نصرتِ پیغمبر 3- قرآنِ کریم کا اتباع۔

اب ایک ترتیب سے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

قرآنِ کریم سے ایمان کی وضاحت

ایمان کا لفظ اگرچہ زبانی اقرار کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن اس کا حقیقی معنی سچے دل سے ماننا اور یقین کرنا ہے لغت میں اٰمَنَ لَہٗ کا معنی ہے صَدَّقَہٗ وَاعْتَمَدَ عَلَیْہِ (اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا) اور اٰمَنَ بِہٖ کے معنی ہیں اَیْقَنَ بِہٖ (اس پر یقین کیا)۔ قرآن دراصل جس ایمان کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے اس کو ان آیات میں پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾

(الحجرات۔۱۵)

Marfat.com

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور پھر شک میں نہ پڑیں۔''

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِيٓ أَنفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا﴾ (النسآء ٦٥)

''پس نہیں' (اے نبی) تمھارے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں تمھیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں' پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔''

ان سے بھی زیادہ اس آیت میں زبانی اقرارِ ایمان اور حقیقی ایمان کا فرق ظاہر کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اصل مطلوب حقیقی ایمان ہے نہ کہ زبانی اقرار:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا آمِنُوا بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ﴾ (النسآء ١٣٦)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر۔''

انسان ایک عالمِ اصغر ہے اس کی فکری پیچیدگیوں اور احساس کی ناہمواریوں کو سمجھنا آسان نہیں جب کوئی نئی نظریاتی بات انسان کے سامنے پیش کی جاتی ہے تو سب سے پہلے اس کی فکر اسے قبول کرنے سے انکار کرتی ہے وہ اپنے پہلے سے مانے ہوئے خیالات وتصورات میں کوئی ترمیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا طرزِ کہن اسے عزیز ہوتی ہے اور آئینِ نو سے اسے گھبراہٹ ہوتی ہے اس لیے ممکن حد تک وہ نہ صرف اسے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے بلکہ اس کے راستے میں رکاوٹیں بھی کھڑی کرتا ہے۔ اگر رفتہ رفتہ قبولیت کے دروازے تک پہنچتا بھی ہے تو درِ قبول پوری طرح کھلنے نہیں پاتا اس میں نئی طرح کی رکاوٹیں پیدا ہونے لگتی ہیں اب وہ بات کو کسی حد تک قبول کرتا ہے لیکن وہ گلے سے نیچے نہیں اترتی قبولیت کا اظہار کرتا ہے لیکن صرف زبانی اقرار کی حد تک، بڑی مشکل اور طویل تربیت کے بعد وہ وقت آتا ہے جب کہ دل اور زبان میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہاں تک پہنچ کر بھی بعض دفعہ اس میں ایک اور پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ کہ جب وہ اللہ اور اللہ کے رسول کی بات کو بھی مانتا ہے تو تب بھی اس کے لیے وہ ذریعہ جس پر وہ اعتماد کرتا ہے اور جس کی وجہ سے وہ ماننے پر مجبور ہوتا ہے وہ اس

Marfat.com

کی عقل ہوتی ہے یا وقت کا چلن ہوتا ہے جب عقلی طور پر کسی بات سے مطمئن ہو جاتا ہے تو اسے مان لیتا ہے یا جب وہ لوگوں کو دیکھتا ہے کہ لوگوں کی ایک بڑی تعداد اس بات کو مان رہی ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان لوگوں کا ماننا بے سبب تو نہیں ہوگا اس لیے وہ بھی انسانی ریوڑ کے ساتھ چلنا شروع کر دیتا ہے۔ اللہ اور رسول کے معاملے میں بھی وہ عموماً یہی رویہ اختیار کرتا ہے اور اسی کو ایمان کا نام دیتا ہے آپ نے اگر غور فرمایا ہے تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ ایمان کے سلسلے میں تین بنیادی کمزوریاں ہیں جس میں بالعموم انسان مبتلا ہوتا ہے۔

1- وہ زبانی اقرار کو ایمان سمجھتا ہے۔

2- اس کے نزدیک اصل معیار اور کسوٹی عقل ہوتی ہے وہ اسی پر اعتماد کرتا اور اسی کو بھروسے کے قابل سمجھتا ہے وہ اس کے اعتماد پر جس بات کو تسلیم کرتا ہے اس میں اسے غلط فہمی یہ رہتی ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا ہوں حالانکہ وہ اپنی عقل پر ایمان لاتا ہے کیونکہ عقل جس طرف راہنمائی کرتی ہے وہ اس طرف چلنا شروع کر دیتا ہے جس کو ماننے کی ترغیب دیتی ہے اسے ماننے کے لیے تیار ہو جاتا ہے وہ بہت سی باتوں کے بارے میں جانتا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام ہیں لیکن عقل جب تک انھیں سندِ قبولیت عطا نہیں کرتی اس وقت تک وہ انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ غور فرمایئے! ایسی صورت میں کیا یہ بات خود فریبی سے کم ہے کہ آدمی اسے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان کا نام دے۔

3- انسانوں کی اکثریت یا انسانوں کے بالادست طبقے یا وہ لوگ جو ذرائع ابلاغ پر قابض ہیں، بالعموم انسان کی طبیعت پر حکمرانی کرتے ہیں جس طرف ان کا جھکاؤ ہوتا ہے انسان بلا سوچے سمجھے عقل کو زحمت دیئے بغیر ان پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی بات کو مان کر ان کی پیروی کرنے لگتا ہے یہی تین طریقے ہیں جس نے ہمیشہ انسانوں کو حقیقی ایمان سے دور رکھا ہے اللہ اور اللہ کے رسول پر جس ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور جس کو دنیا اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت بنایا گیا ہے وہ ایمان ان تینوں طرح کے ایمان سے بالا بلند ہے اللہ اور اس کا رسول جس ایمان کی دعوت دیتا ہے اس کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ اس کا دارومدار زبانی اقرار پر نہ ہو بلکہ دل کی تصدیق بھی اس میں شامل ہو اگر ایک بات زبان تک محدود رہتی ہے دل پر اثر انداز نہیں ہوتی اور دل سے اس کی تائید نہیں اٹھتی تو اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں، اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا

Marfat.com

تو عرب ہو یا عجم ہو تیرا لا الہ الا
لغتِ غریب جب تک تیرا دل نہ دے گواہی

اسی طرح دوسری شرط یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان عقل کی تائید کا محتاج نہیں جس بات کو ماننے کا حکم دیا گیا ہے اگر اسے عقل تسلیم کرتی ہے تو یہ عقل کے لیے سرمایۂ افتخار ہے لیکن اگر وہ عقل کی گرفت میں نہیں آتی تو پھر اس بات کا انتظار نہیں کیا جائے گا کہ عقل اسے تسلیم کرے تو اسے مانا جائے بلکہ اس کے ماننے کی بنیاد عقل پر اعتماد نہیں بلکہ اللہ کے رسول پر اعتماد ہے' عقل یقیناً عطیۂ الٰہی ہے لیکن ایک تو انسانوں کی عقل میں باہمی بے حد تفاوت ہے اور مزید یہ کہ عقل کی وسعتیں عالمِ محسوسات اور معقولات سے آگے نہیں بڑھ سکتیں اور دین کا تعلق تو عالمِ مابعدالطبیعات عالمِ الٰہیات اور عالمِ آخرت سے بھی ہے پھر انسانوں کے اجتماعی مسائل اور اقوام کے عروج وزوال کے اخلاقی ضوابط ایسے نازک معاملات ہیں جنھیں عقل جیسی نارسا قوت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ عقل کی تمام خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ غلطیوں سے پاک نہیں وہ تو وہم اور اشتعال جیسے محرکات سے متاثر ہو کر غلطی کیے بغیر نہیں رہتی چہ جائے کہ اسے انسانی زندگی کے وسیع تر اور اجتماعی دباؤ کے مقابلے میں کھڑا کیا جا سکے اس لیے زندگی کے معاملات میں عافیت کا راستہ اس کے سوا ممکن ہی نہیں کہ اس کا دارومدار اس ذریعۂ علم پر رکھا جائے جو ہر طرح کی غلطی سے پاک ہر طرح کی نارسائی سے معرا اور ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہے یہ وہ ذریعۂ علم ہے جسے وحیِ الٰہی کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول اسی ذریعہ علم کے پیغامبر بن کر تشریف لاتے ہیں اس لیے اعتماد کے لائق کوئی ذریعہ ہو سکتا ہے تو وہ یہی ذریعہ ہے اور اسی کے اعتماد پر جس تسلیم وانقیاد کی بنیاد رکھی جائے گی' وہی زندگی کے سفر میں قابلِ اعتماد اور قابلِ نجات ہو گا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی شرط ہے کہ اللہ کے نبی کے اعتماد پر جس بات کو تسلیم کیا جائے' اس میں زبانی اقرار کے ساتھ ساتھ ایسی تصدیق شامل ہونی چاہیے جو یقین اور اذعان سے عبارت ہو کہ جس پر ماننے والے کو اس درجے کا یقین حاصل ہو کہ شک وارتیاب کا کوئی کانٹا کبھی اس میں اپنی جگہ نہ بنا سکے دنیا اس میں ہزار شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرے لیکن یہ مضبوط ایمان یقین کی قوت سے بڑی آسانی سے اس کا مقابلہ کر سکے' یہی وہ قوت ہے جو انسان میں سیرت وکردار کی تعمیر کا باعث بنتی ہے' ہر طرح کی قربانی دینے پر آمادہ کرتی ہے اور بڑے سے بڑے نقصان کو برداشت

Marfat.com

کرنے کی ہمت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے اقبال نے کہا تھا

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

یہ انسانی کمزوری ہے کہ جب تک کسی حقیقت کا یقین اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا وہ اس کے لیے نہ تو عمل پر آمادہ ہوتا ہے نہ وقت دینے پر نہ مال صرف کرنے پر اور نہ کسی طرح کی قربانی دینے پر' اللہ کے نبی انسانی سیرت و کردار کی تعمیر اور انسانی زندگی کی اصلاح کے لیے تشریف لاتے ہیں ان کے پیشِ نظر زندگی کے ایک ایک شعبے کو تبدیل کرنا ہوتا ہے ہر غلط چیز کو نکال کر ہر صحیح چیز کو رواج دینا ہر برائی کو ختم کر کے ہر نیکی کو فروغ دینا خواہشات کو حدود میں محدود کر کے صالح جذبات کو قوت بخشنا' انسانی معاشرے کے بالا دست طبقوں کو انکسار سکھانا اور کمزور اور ناتواں طبقوں میں اٹھنے کی امنگ پیدا کرنا اس طرح سے انفرادی اور اجتماعی زندگی کو معاشرے اور سماج کے راستے سے ہوتے ہوئے ایوانِ ہائے حکومت تک بدل دینا یہ پیغمبر کے پیشِ نظر ہوتا ہے یہ اتنی بڑی تبدیلی ہے جس سے بڑی تبدیلی کا تصور بھی انسانی زندگی میں ممکن نہیں معمولی تبدیلی بھی انسان قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا چہ جائیکہ وہ اتنی بڑی تبدیلی کو گوارا کر لے اس تبدیلی کو بروئے کار لانے کے لیے ایک ہی زوردار جذبہ ہے جو کامیابی سے اس منزل کو آسان کر دیتا ہے وہ یہی یقین اور ایمان ہے جب ایمان لانے والا اپنے پیغمبر کی صداقت اس کی معصومیت اس کے علم کی بے پناہی اس کی بے لوث قیادت اس کے لائے ہوئے نظامِ زندگی کے بے عیب ہونے پر پوری طرح یقین پیدا کر لیتا ہے تو اس کے لیے اسے قبول کرنا دنیا اور آخرت کی کامیابیوں کے لیے اسے لازمی سمجھنا اور اس کے لیے ہر طرح کی قربانی دینا اور دنیا کے علمی فتنوں اور تہذیبی واہموں کا مقابلہ کرنا کوئی مشکل نہیں رہتا اس کی عقل اگر کسی وقت پیغمبر کی بات نہیں سمجھتی تو وہ عقل کو جھٹک کر پیغمبر کی بات کے سامنے سر جھکا دیتا ہے کیوں کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ عقل تو نارسا ہے لیکن پیغمبر کے علم کا رشتہ' تو اللہ کے علم کے ساتھ جڑا ہوا ہے اگر کبھی کسی بھی دور کے علمی مسلمات پیغمبر کی تعلیم سے متصادم ہوتے ہیں تو وہ علمی مسلمات کو بڑی آسانی سے ٹھکرا دیتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دنیائے علم نے آج تک بارہا ٹھوکریں کھائی ہیں لیکن پیغمبر کا علم ایسی ہر ٹھوکر سے مبرا ہے اگر دنیا کا چلن کبھی وحی الٰہی کے خلاف ہوتا ہے تو وہ پیروی صرف وحی الٰہی کی کرتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی بڑی سے

Marfat.com

بڑی نام نہاد صداقت غلط ہوسکتی ہے بلکہ ناممکن چیزیں بھی ممکن ہوسکتی ہیں لیکن اللہ کے پیغمبر کا علم اور اس کی راہنمائی کبھی غلطی قبول نہیں کرتی اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعے جو صداقتیں عطا فرمائی ہیں اور جو خبریں دی ہیں یہ تو ممکن ہے کہ آدمی اس بات کو تسلیم کرلے کہ صبح سورج طلوع نہیں ہوگا یا پانی الٹی طرف بہنا شروع کردے گا دریا کے دو کنارے مل جائیں گے' یا تاریخ کے دو باب جمع ہو جائیں گے لیکن یہ وہ کبھی قبول نہیں کرتا کہ اللہ کے رسول کی دی ہوئی راہنمائی کبھی غلط ہوسکتی ہے یہ وہ یقین ہے جسے ایمان کا نام دیا گیا ہے اور یہی یقین صحابہ کے رگ و پے میں سما چکا تھا جنگِ خندق میں جبکہ عرب کی پوری قوت صرف تین ہزار محدود افرادی قوت پر حملہ آور ہوئی تو دنیا کا کوئی مدبر بلکہ معمولی عقل رکھنے والا بھی یہ گمان نہیں کرسکتا تھا کہ مسلمانوں کی یہ معمولی قوت بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی لیکن خندق کھودتے ہوئے جب آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو خبر دی کہ میں نے یہ جو چٹان پر تین ضربیں لگائی ہیں ان میں میں نے یمن، روم اور ایران کے محلات دیکھے ہیں تم وقت کی ان تینوں بڑی قوتوں پر غالب آؤ گے تو یہ لوگ جو حالات میں گھرے ہوئے اپنی زندگی تک کا یقین نہیں کرسکتے تھے ان میں سے کسی نے یہ خیال تک نہیں کیا کہ یہ خبر غلط ہوسکتی ہے انھوں نے پوری آمادگی سے دل و دماغ میں اس خبر کو بٹھایا اور اس یقین سے سرشار ہوگئے کہ واقعی ایک نہ ایک دن اللہ تعالیٰ ان بڑی طاقتوں پر ہمیں غلبہ عطا فرمائے گا کیونکہ رسول ﷺ کا ارشاد کبھی غلط نہیں ہوسکتا منافقین نے مسلمانوں کو ہر چند بہکانا چاہا کہ عرب بھر کے مشرک تم حملہ آور ہوگئے ہیں اب تم کسی طرح بچ نہیں سکتے آؤ ان سے کوئی معاملہ کرلیں قرآنِ کریم بتاتا ہے کہ مسلمان بجائے ڈرنے اور خوف زدہ ہونے کے بے اختیار پکار اٹھے کہ یہ تو وہی باتیں ہیں جس کا اس سے پہلے اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا ہے چنانچہ بجائے سراسیمہ ہونے کے ان کے ایمانوں میں اور اضافہ ہوا۔

صحابہ کی پوری زندگی اسی یقین و ایمان کے مظاہر کی داستان ہے ہمیں قدم قدم پر ان کی زندگی میں ایمان کی قوت کی درخشاں مثالیں ملتی ہیں اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ انھیں اللہ کے بعد اللہ کے رسول کی زبان اور ان کی تعلیمات پر ایسا مضبوط یقین پیدا ہوگیا تھا جس نے ان کی پوری شخصیتوں کو تبدیل کرکے رکھ دیا تھا اس کے لیے انھیں کسی طرح قربانی دیتے ہوئے تامل نہیں ہوتا تھا کیونکہ یقین ایسی ہی قوت کا نام ہے جس میں جل مرنا بھی انسان کے لیے راحت سے کم نہیں ہوتا اور ایسے یقین سے تہی دامن ہو جانا غلامی سے بھی بدتر ہوتا ہے

Marfat.com

اقبال نے بالکل سچ کہا

یقیں مثلِ خلیل آتش نشینی
یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی

آج امتِ مسلمہ کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ایمان کے دعوی داروں کی کمی نہیں لیکن ان کی اکثریت کا ایمان زبان کے اقرار سے آگے نہیں بڑھتا' اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امت کی اکثریت عمل کی قوت سے بے گانہ ہوگئی ہے مومن اور مسلمان ہونے کے دعوے بہت ہیں لیکن اسلامی تعلیمات اپنے ماننے والوں کے عمل کو ترستی ہیں مساجد روز بروز نمازیوں سے خالی ہوتی جارہی ہیں اور اجتماعی زندگی بہت حدتک اسلامی تعلیمات سے بے گانہ ہی نہیں باغی ہوتی جارہی ہے اور جو لوگ ایک قدم آگے بڑھ کر اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کا ارادہ کرتے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ ہر اسلامی تعلیم اور آنحضرت کے ہر ارشاد کو اپنی عقل کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں یعنی ان کے ایمان کا دارومدار آنحضرت کی ذات گرامی نہیں بلکہ اپنی عقل ہے جس بات کو عقل قبول کرلیتی ہے وہ اسے قبول کرلیتے ہیں اور جسے عقل قبول کرنے سے انکار کردیتی ہے وہ چاہے کیسا ہی بنیادی حکم کیوں نہ ہو وہ اسے ماننے سے انکار کردیتے ہیں اس صورتحال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ آئینی تہذیبی اور تمدنی مسائل میں بیرونی تعلیمی اور تہذیبی اثرات کے تحت بری طرح دماغی آوارگی اور قلبی ناآسودگی کا شکار ہے اور ہمارے اجتماعی ادارے بیرونی اثرات کے زیر اثر ہیں یا فکری انارکی کی گرفت میں ہیں اس کا علاج اس کے سوا ممکن نہیں کہ مسلمانوں کو دوبارہ حقیقی ایمان سے آشنا کیا جائے جس کا اس آیت کریمہ میں حکم دیا گیا ہے۔

ایمان کی تشریح حدیث سے

ایمان کی تشریح وتفسیر کے سلسلے میں آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے ہمیں مزید روشنی ملتی ہے جس سے ایمانی تفصیلات کو طے کرنا آسان ہوجاتا اور تکمیلِ ایمان میں مدد ملتی ہے آپ نے فرمایا:

لا یومن احدکم حتی اکونَ احب الیہِ منْ والدہ و ولدہ

Marfat.com

والناس اجمعین۔

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے والدین سے اور اس کی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں''

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ

''سفر کے دوران ایک گفتگو میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے گزارش کی کہ حضور آپ مجھے اپنے والدین اپنی اولاد اور دنیا کی ہر چیز سے زیادہ پیارے ہیں لیکن اپنی جان سے نہیں تو آپ نے فرمایا کہ عمر مجھے اپنے رب کی قسم ہے جب تک میں تمھیں تمھاری جان سے زیادہ پیارا نہیں ہو جاتا اس وقت تک تم کامل مومن نہیں ہو سکتے''

ان دونوں احادیث سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ تکمیل ایمان کے لیے یہ لازمی شرط ہے کہ ہر صاحبِ ایمان اللہ کے آخری رسول ﷺ کو اپنے مال و دولت اپنے اعزہ واقربا اپنی اولاد اور اپنی جان سے بھی زیادہ پیارا سمجھے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کبھی آنحضرت ﷺ کی ذات اور ان مذکورہ چیزوں میں سے ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو حضور کا انتخاب کرے اور دوسرے کو چھوڑ دے یعنی والدین ایسی بات کہیں جو اللہ کے رسول کے احکام کے خلاف ہو یا اولاد ایسی فرمائش کرے شریعت جس کی اجازت نہ دیتی ہو یا بیوی ایسا مطالبہ کرے آنحضرت نے جس بات سے روکا ہو یا آدمی کا نفس خلافِ شریعت کسی کام کو کرنا چاہے تو اب رسول ﷺ سے محبت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے احکام اور آپ کے ارشادات پر عمل کیا جائے اور باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیا جائے حتی کہ کبھی رسول ﷺ کی محبت تمام مال و دولت کے خرچ کرنے کا تقاضا کرے یا آپ کی محبت یہ چاہے کہ اپنی اولاد کو چھوڑ دو یا جان دینے کا مطالبہ کرے تو پھر آپ کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ مال و دولت اولاد حتی کہ اپنی جان کو بھی قربان کر دیا جائے راحتیں اور محبتیں بھی اس حد تک باقی رہیں جس حد تک آنحضرت کے احکام اجازت دیتے ہیں اور آپ سے تعلق اس تعلق کو برداشت کرتا ہو اور اگر حال یہ ہو کہ خوشی کے ہر موقع پر آدمی اپنے نفس کا تابع ہو کر رہ جائے یا برادری اور احباب کا دباؤ اسے ان کے اشاروں پر چلنے پر مجبور کر دے یا حالات کی گرفت اسے اپنے ڈھب پر چلنے کے لیے مجبور کرے اور ایمان کا دعوی دار اس بات کو بھول جائے کہ مجھے رسولِ ﷺ سے محبت کا دعویٰ بھی ہے اس لیے میں ان کی محبت سے متصادم

Marfat.com

کسی بات کو جائز نہیں سمجھ سکتا تو پھر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم نے محبت کے نام پر اپنے آپ کو دھوکہ دے رکھا ہے یا ہم دروغ گوئی کا شکار ہیں۔ یہ تو وہ کم سے کم مطالبات ہیں جو آنحضرت ﷺ کی محبت کا تصور کرتے ہی سامنے آجاتے ہیں لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو حقیقت یہ ہے کہ جس سے آدمی کو محبت ہوتی ہے اس کی اطاعت آدمی کا مقصد بن جاتی ہے اس کی ایک ایک ادا قلب و نگاہ کے لیے تسکین کا باعث ہوتی ہے اس کی پسندیدہ چیزیں پسندیدہ بن جاتی ہیں اور ناپسندیدہ چیزیں ناپسندیدہ بن جاتی ہیں جو چیزیں اس کے یہاں مقاصد کا درجہ رکھتی ہیں وہ محبت کرنے والے کی نگاہ میں بھی مقاصد کا درجہ حاصل کر لیتی ہیں جن چیزوں کی عزت و حرمت کے لیے اس نے جان کھپائی ہوتی ہے محبت کرنے والا بھی انہی چیزوں کے لیے جان کھپانا اپنا فرض سمجھتا ہے جو چیزیں اس کے یہاں ترجیح کے لائق ہوتی ہیں محبت کرنے والا بھی انہی کو ترجیح دینا ضروری سمجھتا ہے حتی کہ اس کا کھانا پینا اس کا اوڑھنا پہننا اس کا چلنا پھرنا اس کا سونا جاگنا جو سراسر انسانی عادتوں سے عبارت ہے وہ بھی محبت کرنے والے کے دل میں محبت کے پیغام سے کم نہیں ہوتا وہ اس کی ہر ادا کی نقل کرتا اور ہر ادا پر جان دینا محبت کا لازمی تقاضا سمجھتا ہے اور پھر یہ محبت چند دنوں کا معاملہ نہیں بلکہ زندگی بھر کا وظیفہ ہے جب تک محبوب زندہ ہے تب بھی یہی مشغلہ ہے اور جب محبوب دنیا سے چلا جاتا ہے تو عادات و اطوار مقاصد و ترجیحات اور حسن و قبح کے معیارات زندگی بھر کا معمول بن جاتے ہیں کوئی اور چیز زندگی سے نکل سکتی ہے لیکن محبوب کا یہ ورثہ زندگی سے الگ نہیں ہوسکتا ٹھیک کہا کسی نے:

دریچے بند کر کے سونے والو
محبت عمر بھر کا رتجگا ہے

متذکرہ بالا چیزیں تو عام محبت کا حاصل ہیں لیکن یہاں ہم رسول ﷺ کی محبت کا ذکر کر رہے ہیں جو تکمیلِ ایمان کے لیے لازمی ہے اس پاکیزہ محبت کی عظمت کو سامنے رکھتے ہوئے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کی کیا کیا نزاکتیں ہوں گی؟ کم سے کم لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے

محمد کی محبت آنِ ملت شانِ ملت ہے — محمد کی محبت روحِ ملت جانِ ملت ہے
محمد ہے متاعِ عالمِ ایجاد سے پیارا — پدر مادر برادر مال جان اولاد سے پیارا
محمد کی غلامی، ہے سند آزاد ہونے کی — خدا کے دامنِ توحید میں آباد ہونے کی

تکمیل ایمان کے لیے آنحضرت ﷺ نے ایک اور بات کا بھی حکم دیا ہے جو اس

Marfat.com

محبت کالازمی نتیجہ ہے ارشاد فرمایا

لا یومن احدکم حتی یکونَ هواه تبعاً لما جئت به۔

''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا تا وقتیکہ اس کی خواہشات اس (شریعت) کے تابع نہ ہو جائیں جسے میں لے کر آیا ہوں''

یعنی جب تک تمھاری زندگی کا ایک ایک عمل میری لائی ہوئی شریعت کی اطاعت اور پیروی میں نہ گزرے اور تم کوئی سا کام کرنے سے پہلے یہ نہ سوچو کہ اس بارہ آنحضرت ﷺ کے احکام کیا ہیں بلکہ جو جی میں آئے کر گزرو اور اگر تمھیں بتایا بھی جائے کہ اس کام سے متعلق حضور کی یہ یہ ہدایات ہیں تو تم اس کی پرواہ نہ کرو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کامل مومن نہیں حقیقت بھی یہ ہے کہ جو آدمی محبت کا دعوی کرتا ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ اپنے محبوب کے احکام کی خلاف ورزی کرے وہ تو اس کی اداؤں پر جان چھڑکتا ہے چہ جائے کہ اس کے احکام کی پرواہ نہ کرے کسی عرب شاعر نے کیا خوب کہا:

تعصی الرسولُ و انتَ تظهر حبه　　هٰذا لعمری فی الزمان بدیع

''تو رسول ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے حالانکہ تو ان سے محبت کا اظہار بھی کرتا ہے مجھے اپنی بقاء کی قسم ہے زمانے میں یہ ایک نئی بات ہے''

لو کان حبك صادقاً لا طعته　　ان المحب لمن یحب مطیع

''اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو رسول ﷺ کی ضرور اطاعت کرتا کیونکہ محبّ ہمیشہ اپنے محبوب کی اطاعت کیا کرتا ہے''

قرآنِ پاک میں ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا ہے کہ ''ہم نے جب بھی کوئی رسول بھیجا ہے اس لیے بھیجا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے، اللہ کے رسول دنیا کے کسی لیڈر کی طرح نہیں ہوتے کہ اس کی بات ماننے یا نہ ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اللہ کے رسول کی فرماں برداری اور اس کی اطاعت بالکل اللہ کی اطاعت ہے اور اس کی نافرمانی اللہ کی نافرمانی ہے'' ایک حدیث میں تو حضور نے اطاعت نہ کرنے والے کو ایمان سے خارج قرار دیا ہے۔ ارشاد فرمایا:

کل امتی یدخلون الجنته الا من ابیٰ قالو یا رسول الله ومن ابیٰ قال من اطاعنی فقد دخل الجنة ومن عصانی فقد ابیٰ۔

Marfat.com

''میری ساری امت جنت میں جائے گی ہاں وہ نہیں جائے گا جس نے انکار کیا لوگوں نے پوچھا اے اللہ کے رسول کس نے انکار کیا فرمایا جس نے میری اطاعت کی وہ جنت میں گیا اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے (مجھے ماننے سے) انکار کر دیا۔''

پھر یہ اطاعت زندگی کے کسی ایک شعبے میں نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ دین نام ہی اطاعت اور اتباعِ رسول کا ہے اور پھر اطاعت اس چیز کا نام نہیں کہ آپ نے جو حکم دیا اس کی تعمیل کر لی بلکہ اطاعت اس اتباع کو کہتے ہیں جس میں ہو بہو آپ کی زندگی کی نقل کی جائے حدیث شریف میں آتا ہے کہ چند آدمی ازواجِ مطہرات کی خدمت میں آئے تا کہ آنحضرت ﷺ کی رات کی عبادت کی تفصیل معلوم کریں چنانچہ انھیں بتایا گیا تو انھوں نے اسے کم جانا اور کہنے لگے کہ آنحضرت ﷺ کو تو عبادت کی ضرورت نہیں کیونکہ آپ معصوم پیدا ہوئے ہیں وہ جتنی بھی عبادت کریں کافی ہے ہمیں تو اس سے زیادہ عبادت کی فکر ہونی چاہیے ایک صاحب کہنے لگے میں تو آج سے ہمیشہ روزے رکھوں گا دوسرے بولے میں کبھی رات بھر نہیں سوؤں گا بلکہ عبادت میں مصروف رہوں گا تیسرے صاحب نے کہا میں کبھی شادی نہیں کروں گا بلکہ طیبات سے کنارہ کش ہو کر اللہ کی عبادت میں لگا رہوں گا اسی اثناء میں حضور تشریف لے آئے آپ کو جب بتایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ سنو میں رات کو عبادت بھی کرتا ہوں اور سوتا بھی ہوں میں روزے بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں بیویوں سے تعلق بھی رکھتا ہوں اور عبادت و زہد کا بھی حق ادا کرتا ہوں یہ میرا طریقہ ہے جس نے میرے طریقے کی خلاف ورزی کی اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔ اندازہ فرمایے کہ آنے والے حضرات سراسر نیکی کے جذبے سے اپنی مرضی سے عبادت کرنا چاہتے تھے لیکن آپ نے ان پر یہ بات واضح فرمائی کہ عبادت بھی وہ معتبر ہے جو میرے طریقے کی پیروی میں ہے ورنہ اس کا کوئی اعتبار نہیں حدیث سے تو یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ کسی فرض حکم پر بھی اگر آنحضرت کی منشاء کے خلاف عمل کیا جائے تو وہ نافرمانی بن جاتا ہے مسلم شریف کی روایت ہے کہ آپ نے ایک سفر میں موسم کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے ایک ٹیلے پر چڑھ کر روزہ کھول دیا اور لوگوں کو بھی روزہ کھولنے کا حکم دیا حالانکہ یہ رمضان شریف کا روزہ تھا۔ سہ پہر کے بعد آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ ایک شخص پر چادر تانے کھڑے ہیں آپ نے استفسار فرمایا تو معلوم ہوا کہ ان صاحب نے روزہ

Marfat.com

افطار نہیں کیا یہ سمجھے کہ میں روزہ پورا کرلوں گا اب گرمی کی شدت کی وجہ سے حالت غیر ہونے لگی ہے اس لیے لوگ ان کے سر پر سایہ کیے کھڑے ہیں آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ یہی لوگ نافرمان ہیں' یہی لوگ نافرمان ہیں حالانکہ اس شخص نے ایک فرض حکم کی اطاعت کے جذبے سے یہ تکلیف اٹھائی تھی جس میں نافرمانی کا کوئی تصور تک نہ تھا لیکن چونکہ یہ فرض کی ادائیگی آنحضرت کے حکم کے خلاف کی جا رہی تھی اس لیے آپ نے اسے نافرمانی قرار دیا اس وضاحت سے یہ بات واضح ہوگئی ہوگی کہ اللہ کے رسول پر ایمان کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ ایمان کے ساتھ ساتھ محبت اور اطاعت شامل نہ ہو کیوں کہ جس ایمان میں محبت شامل نہیں اس ایمان میں کوئی گہرائی نہیں اور جس ایمان میں اطاعت شامل نہیں اس ایمان کا کوئی ثمر نہیں تو گہرائی سے خالی بے ثمر ایمان' ایمان کے دعویٰ دار کو زبانی جمع خرچ کے سوا اور کیا دے سکتا ہے۔ لیکن جب یہ دونوں جذبے ایمان کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں تو پھر صاحبِ ایمان کے دل میں اللہ کے رسول کی عظمت و حرمت مچلنے لگتی ہے جس کے نتیجے میں تعظیم و توقیر اور احترام و ادب کا جذبہ دل میں پیدا ہوتا ہے اس لیے اس آیتِ کریمہ میں ایمان کے بعد احترام کا حکم دیا گیا ہے۔

آپ ﷺ کا احترام

عزروہ'' تعزیر سے مشتق ہے۔ تعزیر کے اصلی معنی شفقت کے ساتھ منع کرنے اور حفاظت کرنے کے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس کے معنی تعظیم و تکریم کرنے کے بتلائے ہیں اور مبرد نے کہا کہ اعلیٰ درجہ کی تعظیم کو تعزیر سے تعبیر کیا جاتا ہے قرآن کریم نے اس کے علاوہ بھی جا بجا آنحضرت کی تعظیم و توقیر کے لیے ہدایات دی ہیں اور اس کے آداب سکھائے ہیں۔ اس آیت میں تو عَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ کے الفاظ سے اس کی طرف ہدایت کی گئی ہے اور ایک دوسری آیت میں بھی وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ آیا ہے اور کئی آیتوں میں اس کی ہدایت کی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ایسی بلند آواز سے بات نہ کریں کہ آپ کی آواز سے بڑھ جائے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ اور ایک جگہ ارشاد ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ یعنی اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے پیش قدمی نہ کرو یعنی جس مجلس میں حضور ﷺ تشریف فرما ہوں اور کوئی معاملہ پیش آئے تو آپ سے پہلے کوئی نہ بولے''

Marfat.com

حضرت سہل بن عبداللہ نے اس آیت کے معنی یہ ملتے ہیں کہ آپ سے پہلے نہ بولیں اور جب آپ کلام کریں تو سب خوش ہو کر سنیں۔

ایک آیتِ قرآن میں اس کی ہدایت فرمائی گئی ہے کہ آنحضرت ﷺ کو پکارنے کے وقت ادب کا لحاظ رکھیں اس طرح نہ پکاریں جس طرح آپس میں ایک دوسرے کو پکارا کرتے ہیں لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا آخر آیت میں اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ اس کے خلاف کوئی کام بے ادبی کا کیا گیا تو سارے اعمال حبط اور برباد ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین باوجودیکہ ہر وقت' ہر حال میں آنحضرت ﷺ کے شریکِ کار رہتے تھے اور ایسی حالت میں احترام و تعظیم کے آداب ملحوظ رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ان کا یہ حال تھا کہ آیتِ مذکورہ کے نازل ہونے کے بعد حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کچھ عرض کرتے تو اس طرح بولتے تھے جیسے کوئی پوشیدہ بات کو آہستہ کہا کرتا ہے یہی حال حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا تھا۔

(شفاء)

حضرت عمرو بن عاص فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے زیادہ کوئی مجھے دنیا میں محبوب نہ تھا اور میرا یہ حال تھا کہ میں آپ کی طرف نظر بھر کر دیکھ بھی نہ سکتا تھا اور اگر کوئی مجھ سے آپ کا حلیہ مبارک دریافت کرے تو میں بیان کرنے پر اس لیے قادر نہیں کہ میں نے کبھی آپ کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں۔

ترمذی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ مجلسِ صحابہ میں جب آنحضرت ﷺ تشریف لاتے تھے تو سب نیچی نظریں کر کے بیٹھتے تھے صرف صدیق اکبر اور فاروقِ اعظم آپ کی طرف نظر کرتے اور آپ ان کی طرف نظر فرما کر تبسم فرماتے تھے۔

عروہ بن مسعود کو اہل مکہ نے جاسوس بنا کر مسلمانوں کا حال معلوم کرنے کے لیے مدینہ بھیجا اس نے صحابہ کرام کو پروانہ وار آنحضرت ﷺ پر فدا ہوتے دیکھا واپسی پر رپورٹ دی کہ میں نے قیصر و کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں اور ملک نجاشی سے بھی ملا ہوں مگر جو حال میں نے اصحابِ محمد ﷺ کا دیکھا وہ کہیں نہیں دیکھا۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ ان کے مقابلہ میں ہرگز کامیاب نہ ہو گے۔

Marfat.com

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی حدیث میں ہے کہ جب آپ گھر میں تشریف فرما ہوتے تھے تو صحابہ کرام باہر سے آواز دے کر آنحضرت ﷺ کو بلانا بے ادبی سمجھتے تھے دروازہ پر دستک بھی صرف ناخن سے دیتے تھے تاکہ زیادہ کھڑکا اور شور نہ ہو۔

آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد بھی صحابہ و تابعین کا معمول یہ تھا کہ مسجدِ نبوی میں کبھی بلند آواز سے بات کرنا تو درکنار کوئی وعظ تقریر بھی زیادہ بلند آواز سے پسند نہ کرتے تھے اکثر حضرات کا عالم یہ تھا کہ جب کسی نے آنحضرت ﷺ کا نامِ مبارک لیا تو رونے لگے اور ہیبت زدہ ہو گئے۔

آپ ﷺ کی نصرت

اس آیتِ کریمہ میں آنحضرت ﷺ پر ایمان اور آپ کے احترام کے بعد آپ کی نصرت اور مدد کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے یعنی آپ سے تعلق کی جو بنیادیں ہیں یا آپ کے حقوق جو ہر امتی پر عائد ہوتے ہیں وہ صرف ایمان اور احترام سے مکمل نہیں ہوتے بلکہ یہ بات ازبس ضروری ہے کہ آپ جو دعوت لے کر اٹھے ہیں اور جس انقلاب کو برپا کرنا آپ کے پیشِ نظر ہے اور آپ جس طرح سے نوعِ انسانی کی اصلاح کا کٹھن کام سرانجام دینا چاہتے ہیں اور آپ جس طرح انسانوں کو دوبارہ اللہ کے آستانے پر جھکانا چاہتے ہیں اس میں قدم قدم پر آپ کو تعاون اور مدد کی ضرورت ہے آپ ایک ایک آدمی کے پاس تنہا دعوت لے کر نہیں جا سکتے جاہلیت اور کفر کے جتھے اپنی گروہی عصبیتوں کے باعث کبھی بھی اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے آسانی سے تیار نہیں ہو سکتے وہ اسے روکنے کے لیے ہر ممکن طاقت استعمال کرتے ہیں ان کے سامنے تنہا پیغمبر کا جانا آسان کام نہیں اور ان کے تعصّبات اور جاہلی حمیت کو روکنا اس سے بھی کٹھن کام ہے کہ پیغمبر اپنی دعوت میں اگرچہ بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر کرتا ہے اور اللہ ہی ہر حال میں اس کا معاون اور مددگار ہوتا ہے بایں ہمہ! اسباب کی دنیا میں بے حد ضروری ہے کہ انسانوں میں سے آپ کو ایسے جاںنثار اور سرفروش ملیں جو ہر ممکن طریقے سے آپ کی اور آپ کی دعوت کی نصرت کا فرض انجام دیں آپ کے ساتھ یا آپ کے حکم کے مطابق اس دعوت کو ہر شخص تک پہنچانے کی کوشش کریں دشمن جب حضور کی ذات کو نقصان پہنچانا چاہے تو مسلمان ان کے سامنے ڈھال بن جائیں اور پھر اپنی قربانیوں اور فداکاریوں سے نہ صرف کہ دین کی قوت کا

Marfat.com

باعث بنیں بلکہ اپنی استقامت سے انکار کرنے والوں کے انکار میں دراڑیں ڈال دیں وہ لوگ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ یہ معاشرے کے انتہائی پسماندہ اور کمزور لوگ جو کل تک ہماری آواز سے بھی خوف زدہ رہتے تھے آخر آج ان میں یہ قوت کس وجہ سے آئی ہے اگر اس کی وجہ اس دین سے وابستگی ہے تو یقیناً اس دین میں ایسی بات کوئی ضرور ہے جس سے کمزور توانا ہو جاتے ہیں اور متکبر متواضع ہو جاتے ہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت وحفاظت

پھر اگر کفر پیغمبر کو قتل کرنے کے منصوبے باندھنے لگے اور وہ آخری اقدام پر تل جائے تو مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ آخر حد تک نصرت کا فرض انجام دیتے ہوئے پیغمبر کی حفاظت کریں حکم ملے تو اس کے ساتھ ہجرت کر جائیں پھر اپنے نئے وطن کو اسلامی سوسائٹی اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے اپنے پیغمبر کی آخر حد تک مدد اور نصرت کریں اگر اس کے لیے جنگی معرکوں سے گزرنا پڑے تو دریغ نہ کریں اگر خود جان دینا پڑے یا بچوں کو ذبح کروانا پڑے تو اس کو نصرتِ پیغمبر کا لازمی حصہ سمجھ کر خندہ پیشانی سے قبول کر لیں اور اس بات پر یقین رکھیں کہ ہماری دنیوی اور اخری کامیابی اسی نصرتِ پیغمبر اور نصرتِ دین میں مضمر ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایمان لاتے ہی اس حقیقت کی تہہ کو پا لیا تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے کے بعد پوچھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اب تک جو کام میں تنہا کرتا تھا اب تمھیں اس کام میں نصرت کرنا ہوگی چنانچہ اس میں سب سے بڑا کام چونکہ لوگوں کو اللہ کے دین کی طرف بلانا اور ہر ممکن طریق سے انھیں دین کی طرف راغب کرنا تھا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نہایت خاموشی سے مکہ کے جگر گوشوں کی ایک معقول تعداد آنحضرت کی آغوش میں ڈال دی اور پھر جب مخالفت کا دور شروع ہوا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں پر حملے شروع ہو گئے تو آپ کی حفاظت کے لیے سب سے پہلی مار صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کھائی اور جب مدینہ میں پہنچ کر یہ دعوت حق و باطل کے معرکے کی صورت اختیار کر گئی تو اس میں بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے۔ اسی مقصد کے لیے اپنا سارا مال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نذر کر دیا اپنی تین پشتیں اور اپنے والدین اسلامی قافلے کے مسافر بنا دیئے زندگی کا اصل غم اور اصل ہدف اسی دین کی بالا دستی کو بنایا جس کے لیے حضور مبعوث ہوئے اور

Marfat.com

اس کی نصرت کرتے ہوئے ہر وہ قربانی دے ڈالی جس کی آنحضرت ﷺ نے ضرورت محسوس فرمائی یہ معاملہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خصوصیت نہیں بلکہ ہر صحابی نے بقدرِ ہمت واستعداد اسی طرح اس فرض کو انجام دیا ایک صحابی جو جنگ احد میں شہید ہوئے انھوں نے جان دیتے ہوئے دوسرے صحابی سے کہا کہ آنحضرت ﷺ کو میرا اسلام کہنا اور مسلمانوں کو میرا یہ پیغام پہنچانا کہ دیکھنا آنحضرت ﷺ کی ذات اور آپ ﷺ کے لائے ہوئے دین کو کوئی نقصان نہ پہنچے آپ ﷺ کی نصرت اور اس دین کی حفاظت مسلمانوں کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ اگر تم نے اس میں ذراسی کوتاہی برتی تو یاد رکھو کہ قیامت کے دین اپنے پروردگار کا سامنا نہ کرسکو گے۔ مسلمانوں کے لیے نصرتِ پیغمبر اور نصرتِ دین ایک ایسا فریضہ ہے جس پر اللہ کے دین کی بقا کا دارومدار ہے اس لیے صحابہ کرام میں ایک ایک فرد حتیٰ کہ بچے تک بھی اسی جذبے سے سرشار تھے انھوں نے اپنا مال اپنا وطن اپنے کاروبار اپنا اثر و رسوخ حتیٰ کہ اپنی جانیں بھی اسی فریضہ کے سپرد کر دی تھیں وہ زندہ تھے تو آنحضرت ﷺ اور آپ کے دین کے لیے وہ جان دیتے تھے تو اسی مقصد کی سربلندی کے لیے اور یہ مقصد اس طرح اس معاشرے میں رچ بس گیا تھا کہ ان کے بچے بھی شعوری عمر کو پہنچتے ہی اسی کو اپنی زندگی کا مقصد اور حاصل بنا لیتے تھے بیان کیا جاتا ہے کہ جنگ بدر میں جب کہ جنگ زوروں پر تھی اچانک دو نوعمر لڑکوں نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ چچا آپ ہمیں بتا سکتے ہیں ابوجہل کون ہے اور کہاں ہے؟ حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ بیٹا تمھیں اس سے کیا کام ہے؟ وہ اس وقت اپنے محافظوں کے نرغے میں ہے اور پھر وہ عرب بھر کا مانا ہوا جنگجو بہادر ہے تم اس کا کیا بگاڑ سکتے ہو؟ بچوں نے بیک وقت بڑے جذبے سے کہا:

قسم کھائی ہے مر جائیں گے یا ماریں گے ناری کو
سنا ہے گالیاں دیتا ہے وہ محبوبِ باری کو
یہ کہتے کہتے غیرت سے ہوئے منہ لال دونوں کے
شہادت کے لہو سے تمتمائے گال دونوں کے

یہ ان کے رخساروں کی سرخی ان کے اس جذبۂ بے پناہ کی عکاس تھی اور ان کا اپنی جان پر کھیل کر ابوجہل کو قتل کرنے کا جذبہ اس فریضہ کی ادائیگی کی ایک مومنانہ کوشش تھی جسے یہاں نصرتِ پیغمبر سے تعبیر کیا گیا ہے جب تک حضور دنیا میں رہے صحابہ نے خون دے کر آپ

Marfat.com

کی حفاظت کا فرض انجام دیا اور آپ کے لائے ہوئے دین کی بالا دستی کے لیے اپنی ہر چیز قربان کر ڈالی اور جب حضور اس دنیا سے تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے اللہ کی کتاب اور اپنی سنت کی امانت صحابہ کے سپرد کر گئے تو پھر انھوں نے ان دونوں امانتوں کو نوع انسانی تک پہنچانے اور ان کے پیش کردہ دین کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا آج امتِ مسلمہ جو ایک ارب پچیس کروڑ سے زیادہ افرادی قوت سے مالا مال ہے اور دنیا میں ان کی ستر کے قریب قریب حکومتیں ہیں یہ سب کچھ انھیں کوششوں کا صدقہ ہے لیکن یہ بات یہاں" ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ فریضہ صرف صحابہ کرام کے ساتھ مخصوص نہیں یہ قیامت تک رہنے والی اس امت کے ایک ایک فرد کی ذمہ داری ہے وہ اپنے حالات کے مطابق اس ضرورت کو سمجھنے کی کوشش کرے اور پھر مقدور بھر اپنے تمام وسائل حتی کہ اپنی ذات بھی اس پر قربان کر دے۔ٹھیک کہا تھا کسی نے:

ہم کو بخشی ہیں خدا نے دوہری خدمتیں
خود تڑپنا ہی نہیں اوروں کو تڑپانا بھی ہے
خود سراپا نور بن جانے سے کب چلتا ہے کام
ہم کو اس ظلمت کدے میں نور پھیلانا بھی ہے

قرآن کا اتباع

آخری بات اس آیتِ کریمہ میں حضور پر ایمان لانے والوں کے لیے جو فرمائی جا رہی ہے وہ اس نور کا اتباع ہے جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوا مراد اس سے قرآن کریم ہے۔ آغازِ کلام میں آنحضرت ﷺ کے اتباع کا ذکر فرمایا گیا تھا اور یہاں قرآنِ کریم کے اتباع کا، اس کا مطلب یہ ہے کہ جس اتباع کا مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے وہ ان دونوں سے مل کر مکمل ہوتا ہے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزم ہیں پیغمبر جو کچھ فرماتا ہے اس کی بنیاد قرآنِ کریم یا وحی الٰہی ہوتی ہے وہ اپنی ہوائے نفس سے کبھی کوئی بات نہیں کہتا اور قرآن کریم اصول بیان کر کے فروع کو اللہ کے رسول پر چھوڑ دیتا ہے چنانچہ اس کی وضاحت اللہ کا رسول فرماتا ہے قرآن احکام جاری کرتا ہے لیکن ہر حکم کی ضمنی تفصیلات اور اس کی عملی شکل وہ اللہ کے پیغمبر کی ذات سے وجود میں آتی ہے مثلاً قرآنِ پاک نماز پڑھنے کا حکم دیتا ہے لیکن نمازوں کی

Marfat.com

تعداد نمازوں کے اوقات ہر نماز میں پڑھی جانے والی رکعتیں اور ہر رکعت میں پڑھی جانے والی دعائیں اور قرآنِ کریم پھر نماز کے آداب کی تفصیل یہ سب کچھ اللہ کے رسول کا عطا کردہ ہے قرآنِ کریم نے ان میں سے کچھ بھی بیان نہیں کیا بس اسی مثال پر قیاس کرتے ہوئے یوں سمجھ لیجئے کہ قرآن قول ہے اور آنحضرت ﷺ کی سنت اس کا عمل ہے' قرآن متن ہے' سنت اس کی شرح ہے' قرآن ایک تھیوری ہے' سنت اس کا پریکٹیکل ورک ہے' قرآن میں کہیں اجمال ہے' تو سنت اس کی تفصیل ہے' کہیں ابہام ہے' تو سنت اس کی تفسیر ہے' اس طرح سے قرآن و سنت دونوں مل کر جو آئین' قانون' روایت اور نظام زندگی عطا کرتے ہیں اس کی پیروی کرنے کا یہاں ذکر فرمایا جا رہا ہے اور یہی وہ پیروی ہے جو ایمان محبت اطاعت احترام اور نصرت کے ساتھ مل کر ایک مکمل اسلامی زندگی کو جنم دیتی ہے اور آنحضرت ﷺ کے ساتھ وابستگی کے حق کو ادا کرتی ہے اور اسی پر دنیا اور آخرت کی کامیابی کی ضمانت دی گئی ہے۔

Marfat.com

35- اسلام میں اجتماعی زندگی کی اہمیت اور اس کی اساسات

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِکَ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ یُھَاجِرُوْا مَالَکُمْ مِّنْ وَّلَایَتِھِمْ مِّنْ شَیْءٍ حَتّٰی یُھَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ فَعَلَیْکُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰی قَوْمٍم بَیْنَکُمْ وَبَیْنَھُمْ مِّیْثَاقٌ وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ﴾ (الانفال : ۷۲)

(بے شک جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اپنی جان و مال سے اللہ کی راہ میں اور وہ لوگ جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی تمھارا ان سے کوئی رشتۂ ولایت نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر وہ مدد طلب کریں تم سے دین کے معاملے میں تو تم پر مدد واجب ہے مگر یہ کہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلے میں ہو جن کے ساتھ تمھارا معاہدہ ہو اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے۔)

پیشِ نظر آیاتِ کریمہ سے پیشتر آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سامنے یہ بات کھول کر رکھ دی ہے کہ تم نے ہدایت کا جو راستہ اختیار کیا ہے اور دنیا کو جس نئی روشنی کی طرف

Marfat.com

بلانے کے لیے اٹھے ہواس کے نتیجے میں راتوں کے مسافر اور گمراہیوں کو زندہ رکھنے والے تمھارے لیے جینا مشکل کر دیں گے۔ان کے ہاتھوں سے جنگل کے درندوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ چور اور ڈاکو ان کے لیے قابلِ برداشت ہیں۔لیکن جو لوگ انھیں کسی طرح گوارا نہیں وہ تم ہو کیونکہ وہ تمھاری زندگی میں اپنی موت دیکھتے ہیں۔عنقریب تمھیں ایک بڑی کشمکش اور ایک بڑے تصادم سے سابقہ پیش آنے والا ہے۔اس کے لیے انتہائی ضروری ہے کہ تم اپنی شیرازہ بندی کی بنیادوں کو اچھی طرح سمجھ لو اور جو چیزیں تمھارے وجود اور تمھاری بقا کی ضامن ہیں انھیں اچھی طرح ذہن نشین کر لو اور اپنی اجتماعی زندگی کو انھیں اساسات پر اٹھاؤ جن پر تمھاری اجتماعی زندگی کی عمارت استوار ہو سکتی ہے۔

اسلام جس ماحول میں آیا اس میں اجتماعی زندگی کی بنیاد اور باہمی توافق اور تخالف کی اساس قبیلے کی عصبیت پر قائم تھی۔خاندان کی مختلف شاخیں پھیل کر جب ایک قبیلے کی شکل اختیار کر لیتی تھیں تو وہ اجتماعی زندگی کا حصار بن جاتا تھا۔قبیلے کا ہر فرد قبیلے کی عصبیت کو اپنی قوت اور طاقت سمجھتا تھا اور قبیلہ اپنے ایک ایک فرد کی حفاظت ونصرت اپنا فریضہ خیال کرتا تھا۔قبیلے کے کسی فرد سے باہر کے کسی آدمی کی لڑائی ہو جاتی تو قبیلے کے فرد کے لیے صرف قبیلے کا نام لے کر دہائی دینا اور مدد کے لیے پکارنا کافی تھا۔قبیلے کا کوئی فرد یہ جاننا ضروری نہیں سمجھتا تھا کہ لڑائی میں حق پر کون ہے اور ناحق پر کون۔انھیں تو صرف اتنا معلوم تھا کہ جب ہمارے قبیلے کا کوئی آدمی قبیلے کے نام پر ہمیں مدد کے لیے پکارتا ہے تو ہمیں اس کی مدد صرف اس لیے کرنی ہے کہ وہ ہمارے قبیلے کا آدمی ہے۔قطع نظر اس سے کہ وہ غلطی پر ہے یا صواب پر۔قبیلے کا غلام بھی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اتنا اہم ہو جاتا تھا کہ دوسرے قبیلے کا سردار بھی اس کی مخالفت مول نہیں لے سکتا تھا ورنہ اسے قبیلے کی دشمنی سے واسطہ پڑتا تھا۔

توافق وتخالف اور تعاضد وتناصر کی یہ بنیاد اس قدر پختہ اور ہمہ گیر تھی کہ حلیف قبائل بھی اس میں شریک ہو جاتے تھے اور پھر اسی بنیاد پر سالوں تک لڑائیاں چلتی تھیں اور ہزاروں لوگ تہِ تیغ ہوتے تھے۔اسلام نے سب سے زیادہ زور اسی بنیاد کو بدلنے پر صرف کیا۔کوئی بھی اجتماعی نظم اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ اجتماعی زندگی کے لیے باہمی تعاون کی کوئی مشترکہ بنیاد ہونی چاہیے۔جس کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں شریک ایک ایک فرد حرکت میں آجائے۔لیکن اصل سوال یہ تھا کہ وہ بنیاد کیا ہو؟ عربوں نے قبیلے کی وحدت کو اجتماعیت کی بنیاد بنایا،اسی کی

Marfat.com

عصبیت کو اس کی مضبوطی کے لیے استعمال کیا لیکن اس کا نتیجہ جو ہر صاحبِ بصیرت پر روشن تھا وہ یہ تھا کہ اس کے نتیجے میں قبائل کی آویزش اور دشمنی بجائے کم ہونے کے روزافزوں تھی۔ جس کی وجہ سے پورا عرب دہکتا ہوا جہنم بن چکا تھا۔ اسلام نے اجتماعیت کی بنیاد کو تسلیم کیا لیکن قبیلے کی عصبیت کو صالح اجتماعیت کا دشمن قرار دیا۔ اس نے اجتماعیت کے لیے وہ بنیادیں فراہم کیں جس کی نتیجے میں نہ صرف قبیلے کی عصبیت ختم ہوئی اور انسان اس تنگ نائے سے نکلنے پر قادر ہوا بلکہ عرب سے باہر دنیا نے رنگ و نسل اور جغرافیے کو جس طرح وحدت کا ذریعہ سمجھ رکھا تھا اس گمراہی کا بھی ازالہ فرمایا اور مسلمانوں پر نہایت کامیابی سے یہ راز آشکارا کیا کہ تم ایک ایسے دین کے داعی بن کر اٹھے ہو جو پوری نوعِ انسانی کی ضرورت ہے جس طرح اس کا محتاج عرب ہے اسی طرح عجم بھی ہے۔ جس طرح کالے اور سانولے اس سے فائدہ اٹھانے کے پابند ہیں اسی طرح گورے اور سرخ بھی اسی کی تعلیم کے محتاج ہیں۔ اگر تم اپنی پرانی بنیادوں کو نہیں توڑو گے اور قبیلے کے محدود ماحول سے نہیں نکلو گے تو دنیا کے دوسرے ملکوں اور انسانوں کے پورے قافلے میں تمھاری دعوت کیسے قبول کی جائے گی؟ اور یہ بات بھی ان پر واضح کی کہ دنیائے کفر جب تمھارے خلاف متحد ہو کر تم پر حملہ آور ہوگی تو تم نے اگر وسیع تر بنیادوں پر اپنی صف بندی نہ کی تو ان کا مقابلہ کیسے کر سکو گے؟ چنانچہ ان ضرورتوں کے پیشِ نظر آیاتِ کریمہ میں ان اساسات کو واضح فرمایا جن پر مسلمانوں کی قومی وحدت استوار کی جا سکتی ہے۔

پانچ بنیادیں

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اسلامی اجتماعیت اور اسلامی وحدت کے لیے پانچ بنیادوں کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

۱۔ ایمان: ایمان چند بنیادی حقائق کا زبان سے اقرار کرنے، دل سے تصدیق کرنے اور اعضاء و جوارح سے اس کے مطابق عمل کرنے کا نام ہے۔ ایمان یقین کی وہ قوت ہے جس سے ایک عام آدمی کا رشتہ اپنے خالق و مالک سے قائم ہو جاتا ہے۔ وہ اس کی کبریائی کو اس طرح دل و نگاہ میں بٹھا لیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی نظروں میں جچتی نہیں۔ دنیا کا کوئی نظریہ اس کے لیے قابلِ قبول نہیں رہتا کسی آستانے پر اس کا سر نہیں جھکتا اور کسی کے سامنے وہ دستِ سوال دراز نہیں کرتا۔ وہ زندگی کا ہر فیصلہ اس شریعت کے مطابق کرتا ہے جو

Marfat.com

اسے اپنے اللہ سے ملی ہے اور اس کی زندگی کے لیے عملی نمونہ وہ رسولِ گرامی ہے جسے اللہ نے انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمایا ہے۔ وہ اپنے ہر عمل سے پہلے یہ سوچتا ہے کہ جب اللہ کے روبرو حاضری ہوگی تو کیا میں اپنے عمل کا جواب دے سکوں گا یا نہیں؟ یہ زندگی دار العمل ہے اس کی کامیابی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ یہ زندگی آنے والی زندگی کی تیاری میں صرف ہو جائے۔ جو شخص ان بنیادی حقائق کو تسلیم کر لیتا ہے وہ ایک نئی امت اور نئی اجتماعی قوت کا رکن بن جاتا ہے اس کا قبیلے کی عصبیت سے تعلق ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ تعاضد وتناصر میں قبیلے کے اشتراک کو نہیں دیکھتا بلکہ ایمان کے اشتراک کو دیکھتا ہے۔ وہ اگر قریشی ہے تو اس کا ابولہب اور ابوجہل سے کوئی رشتہ نہیں حالانکہ وہ اس کے خاندان کے لوگ ہیں۔ اس کا رشتہ بلال رضی اللہ عنہ سے ہے، صہیب رضی اللہ عنہ سے ہے یا ایسے ہی دوسرے لوگوں سے جو اللہ کے رسول کی دعوت پر ایمان لا چکے ہیں۔ بلال کالا کلوٹا سہی اور صہیب رومی غلام سہی، لیکن یہ اس نئی اجتماعیت کے افراد ہیں جن کی بنیاد ایمان پر ہے۔ اس اجتماعیت میں شریک لوگ نفع وضرر کے احساسات میں ایک دوسرے کے شریک ہیں۔ وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے لیے جیتے اور ایک دوسرے کے لیے مرتے ہیں۔ ان سب کے پیشِ نظر اسی نئی بنیاد اور وحدت پر امت کے دائرے کو وسیع کرنا ہے۔ وہ شب وروز اسی دھن میں گزارتے ہیں کہ کس طرح ایک ایک شخص کو اس نئی وحدت میں شامل کیا جائے۔ جب مخالف قوت ان کا جینا مشکل کر دیتی ہے اور ان کی دعوت کے راستے بند کر دیتی ہے تو وہ اپنے اس مضبوط تعلق کو ثابت کرنے کے لیے ایک فیصلہ کرتے ہیں، جس سے اسلامی اجتماعیت کی دوسری بنیاد جنم لیتی ہے۔

۲:۔ ہجرت: ہجرت درحقیقت ایمان کی قیمت ادا کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ ہمارا وہ شہر جس میں ہمیں وجود ملا اور ہمارے وہ گھر جس میں ہم نے شب وروز گزارے اور ہمارے وہ بڑے جن کی شفقت کے سائے میں ہم پروان چڑھے اور ہمارے وہ بھائی اور ساتھی جن کے ساتھ کھیلتے ہوئے ہم جوان ہوئے۔ ہمارے مکانات، ہمارے باغات، ہمارے کاروبار ان میں سے کوئی چیز ایمان اور دین کا بدل نہیں ہو سکتی۔ اگر کفر کی طاقتیں ہمارے لیے ایمان کے ساتھ جینا مشکل کر رہی ہیں تو ہم ایسے شہر، ایسے تعلق دار اور ایسے ماحول کو اپنے دین پر قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔ چنانچہ وہ محض اپنے ایمان کی حفاظت اور اسلامی ذمہ داریوں کی بجا آوری کے لیے اپنا وطن چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ دیس کی راحتوں پر اس پردیس کو ترجیح دیتے

Marfat.com

ہیں جس میں ان کی ایمانی زندگی سلامت ہو۔ چنانچہ ایمانی زندگی کی حفاظت کے لیے وطن چھوڑ دینا اور ایک ایک تعلق سے دستبردار ہو جانا ''ہجرت'' کہلاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ہجرت بھی ایمان کی طرح فرض تھی۔ چنانچہ جو لوگ ہجرت کرنے میں تأمل کرتے تھے ان کے ایمان کو بے اعتبار ٹھہرا دیا جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایمان کوئی ساکت و جامد چیز نہیں۔ یہ عمل کی صورت میں اسلام بن جاتا ہے اور اسلام اللہ کے تمام احکام کی اطاعت کا نام ہے اور اللہ کے احکام آنحضرت ﷺ پر مسلسل نازل ہو رہے تھے جنھیں آہستہ آہستہ پایۂ تکمیل کو پہنچنا تھا۔ جو شخص ہجرت کر کے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں نہیں پہنچتا تھا وہ اسلامی احکام سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی اسلامی زندگی بھی ادھوری رہتی اور اسلامی تربیت بھی نامکمل رہتی تھی اور دوسری یہ بات کہ مسلمان جس روشنی کو لے کر اٹھے تھے اس کا چراغ صرف ان کے اپنے گھروں ہی میں نہیں جلنا تھا بلکہ اس شمع کو ہر اس جگہ پہنچنا تھا جہاں کہیں انسان بستے اور جہاں دھرتی پانی دیتی تھی۔ یہ ایک جانگسل کشمکش کا آغاز تھا جس میں حق و باطل کے قدم قدم پر معرکے تھے۔ اس لیے یہ بات انتہائی ناگزیر تھی کہ آنحضرت ﷺ کی صحبت میں زیادہ سے زیادہ ایسے افراد کا ہجوم ہوتا جن میں سے ایک ایک کے دل میں طوفان موجزن ہوتے۔ آئے دن جن کی تعداد میں اضافہ ہوتا تاکہ اہلِ حق کی اتنی بڑی قوت وجود میں آجائے جو کفر کے اجتماعی جتھوں کا مقابلہ کر سکے۔ ان ضرورتوں کے پیشِ نظر مسلمانوں پر لازم کر دیا گیا کہ وہ جہاں کہیں بھی ایمان لائیں اپنا گھر اور وطن چھوڑ کر اللہ کے رسول کی خدمت میں مدینہ طیبہ ہجرت کر جائیں۔ ان دو بنیادوں نے ایک امت کی تشکیل و تعمیر میں بنیادی کردار ادا کیا۔

۳:۔ پناہ دینا: مختلف علاقوں سے لوگ جب ہجرت کر کے مرکزِ اسلام میں پہنچیں گے تو سب سے پہلی ضرورت جو پہلے ہی دن پیش آئے گی وہ یہ ہے کہ کیا مرکزِ اسلام اور وہاں کے رہنے والے ان نئے آنے والے مہمانوں کے لیے پناہ گاہ بننے کے لیے بھی تیار ہیں یا نہیں کیونکہ کسی بھی ملک یا شہر پر مہاجرین کا ہجوم ایک ایسا مسئلہ ہے جو قوموں کو ہلا کر رکھ دیتا ہے۔ کسی ملک میں حالات خراب ہوتے ہیں تو بعض دفعہ وہاں کے عوام پناہ کے لیے ہمسایہ ملک کا رخ کرتے ہیں اور ہمسایہ ملک کے لیے انھیں پناہ دینا اور ان کی ضروریات کا فراہم کرنا بعض دفعہ ایسا مسئلہ بن جاتا ہے کہ دوسرے ملکوں سے اپیلیں کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن جب معاملہ ایک ایسی امت کا ہو جو نئی بنیادوں پر وجود میں آرہی ہے اور پرانی جاہلیت اور پرانا سماج

Marfat.com

انھیں کسی طرح گوارا کرنے کو تیار نہیں تو ایسی صورت میں ان کی مدد کے لیے اپیل بھی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس ہجرت کا بوجھ تمام تر ان لوگوں کو اٹھانا پڑتا ہے جو پہلے سے ان کی نظریاتی زندگی سے وابستہ اور ایمانی توانائی سے آراستہ ہوں کیونکہ دوسرا کوئی شخص اس میں شریک ہونے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جس طرح ہجرت ایک مشکل معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سوچ سمجھ کر اللہ سے وابستگی کا عہد کر چکے ہوں، اسی طرح انھیں پناہ دینے کا فیصلہ بھی آسان نہیں۔ اس کا ارادہ بھی وہی لوگ کر سکتے ہیں جو پوری دنیا سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔

۴۔ نصرت: مہاجرین کو صرف پناہ دینا کافی نہیں بلکہ ان کے لیے ضروریات کی فراہمی بھی ناگزیر ہے۔ ان کی رہائش کا بندوبست، ان کے کھانے پینے کا انتظام، ان کے کاروبار کی کوئی شکل وصورت، ان میں سے کوئی بات ایسی نہیں جسے نظر انداز کیا جاسکے یہی وہ چیز ہے جسے ''نصرت'' کہا گیا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ہجرت کی اور مرکزِ اسلام کو اپنا وطن بنایا انھیں ''مہاجر'' کہا گیا اور جن لوگوں نے انھیں ٹھکانہ دیا اور نصرت کی انھیں ''انصار'' کے معزز لقب سے یاد کیا گیا۔ جس طرح مہاجرین نے ہجرت کی صعوبتیں اٹھا کر ایمان واخلاص کی نئی نئی جہتوں کو آشکارا کیا اسی طرح انصار نے نصرت وایثار کی وہ مثالیں قائم کیں جنھیں چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ انصار نے اپنے گھر مہاجرین کے لیے خالی کر دیے، اپنی زمینیں تقسیم کرنے کے لیے تیار ہوگئے، بعض لوگ تو اس حد تک سراپا ایثار بن گئے کہ ان میں سے کسی ایک کی اگر دو بیویاں تھیں تو اس نے اپنے مہاجر بھائی سے کہا کہ میں ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں تم اس سے نکاح کرلو۔ لیکن آنحضرت ﷺ نے اس کی اجازت نہیں دی۔ مہاجر اور انصار دونوں اسی عرب قوم کے افراد تھے جو اپنے قبیلے سے باہر کسی آدمی کے لیے کلمۂ خیر کہنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہمدردیاں اور محبتیں صرف اپنے قبیلے کے افراد تک محدود تھیں اور اب ان کی محبت اور نصرت کے لیے ایمان اور ہجرت کا حوالہ کافی تھا۔ اس تعلق نے ان کے درمیان ایک ایسے مضبوط رشتے کو وجود دیا جس کی وجہ سے باقی تمام رشتے ماند پڑ گئے۔ اس مضبوط شیرازہ بندی اور مخلصانہ معنوی وحدت نے عزم وحوصلہ کی ایک ایسی قوت کو جنم دیا جس کے نتیجے میں وہ اپنے مال اور اپنی جانیں اللہ کے راستے میں قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔ چنانچہ یہ وہ جذبۂ بے پناہ ہے جسے ''جہاد'' سے یاد کیا جاتا ہے۔

Marfat.com

۵:۔ جہاد: جہاد ایک جہدِ مسلسل کا نام ہے۔جس میں نہ اپنی ذات پیشِ نظر ہوتی ہے نہ مال ومتاع کا حصول، نہ شہرت وناموری، نہ کسی ملک پر قبضہ کرنا، نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی، صرف ایک فکر ہوتی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت تمام نوعِ انسانی تک پہنچ جائے۔جن قوتوں نے اس دعوت کا راستہ روک رکھا ہے اور وہ اس آبِ حیات کو دوسروں تک پہنچنے کی اجازت نہیں دیتے ان قوتوں سے ٹکرانا اور راستے سے ہٹانا جہاد کی ایک ضرورت بن جاتا ہے۔ مقصود صرف اللہ کی دعوت کو پہنچانا ہے اگر اس کے لیے راستے ہموار ہیں تو کوئی تصادم نہیں ہوتا۔لیکن اگر تخت وتاج کے مالک اس دعوت کو اپنے تخت وتاج کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں تو پھر ان سے نبرد آزما ہو جانا ضروری ہو جاتا ہے۔

بہر حال یہ پانچ بنیادیں ہیں جن پر ایک امت کی عمارت اٹھائی جاتی ہے۔جن میں نظریاتی وحدت کی قوت بھی ہے اور اس راستے میں ہر چیز کو چھوڑ دینے کی صلاحیت بھی اور اگر اس کے لیے اپنا مال ومتاع قربان کرنا پڑتا ہے تو اس کے لیے ایثار کی قوت بھی ہے۔پھر یہ تمام معنوی قوتیں مل کر ایک ایسے لشکر میں بدل جاتی ہیں جو اللہ کے نام کی سربلندی اور اس کے دین کی بالادستی کے لیے بہ ہمہ وجود تیار رہتا ہے اور یہ لوگ آپس میں ایسا گہرا رشتہ رکھتے ہیں جس کی گہرائی خونی رشتے سے زیادہ ہے۔ان میں صرف اخوت ہی قائم نہیں ہوتی بلکہ ان کے درمیان ایک ولایت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے جو اپنی وسعت میں اخوت کے رشتے سے بڑھ کر ہے ۔انھیں کے بارے میں فرمایا کہ یہ باہم دگر ایک دوسرے کے ولی ہیں۔اسلامی اخوت کا رشتہ صرف ایمان سے وجود میں آتا ہے لیکن اسلامی ولایت کے لیے ہجرت اور نصرت ضروری ہیں اور جو لوگ ہجرت نہیں کرتے ان کے درمیان اسلامی اخوت تو ضرور باقی رہتی ہے بشرطیکہ ان کا اسلام سے مخلصانہ تعلق ہو لیکن ان میں ولایت کا قانونی رشتہ قائم نہیں ہوتا اس لیے یہاں فرمایا گیا کہ جو لوگ ہجرت پر آمادہ نہیں ہوتے تمھارے اور ان کے درمیان ولایت کا کوئی رشتہ نہیں ۔یعنی وہ رشتہ جو اسلامی حکومت اور اس کے زیرِ سایہ رہنے والوں کے درمیان ہوتا ہے جس کے نتیجے میں اسلامی حکومت اپنی رعایا کے ایک ایک فرد کے بنیادی حقوق کی ضامن ہوتی ہے اور اسلامی ریاست کے زیرِ اثر رہنے والے افراد میں سے ایک ایک فرد اپنی ریاست کا ہمدرد اور غمگسار ہوتا ہے وہ اس کے مفادات کو اپنے مفادات پر ترجیح دیتا ہے اور اسلامی ریاست اس کے مفادات کو اپنے مفادات سمجھتی ہے اور وہ کسی ممکن طریقے سے کسی طرف سے بھی اس کے

Marfat.com

مفادات کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں دیتی۔ حضور ﷺ کا مشہور ارشاد ہے:

(اگر خدانخواستہ میں ایک طرف کعبہ کو گرتا ہوا دیکھوں اور دوسری طرف مسلمان کا خون بہتا ہوا تو میں پہلے مسلمان کو بچانے کی فکر کروں گا کیونکہ مسلمان ریاست کو اس کا پاسبان بنایا گیا ہے۔)

اس لیے حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

(اگر فرات کے کنارے کوئی کتا بھوکا مر جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کا سوال کیا جائے گا۔)

اور جہاں تک مسلمانوں اور ان کے بچوں کا تعلق ہے اس کے لیے تو مسلمان خلفاء کی راتوں کی نیندیں اڑ جاتی تھیں۔ حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ مدینہ سے باہر پڑاؤ ڈالنے والے قافلوں کی ضرورتوں کا جائزہ لینے کے لیے رات کو گشت فرماتے تھے اور جب کبھی معلوم ہوتا کہ ان کے بچے بھوکے ہیں تو خود اپنی کمر پر بوجھ لاد کر ان کی ضروریات پوری کرتے اور اس وقت انھیں چین آتا تھا جب ان کے بچے کھا پی کر خوشی سے کھیلنے لگتے تھے اور جب حضرت عمرِ فاروق کو یہ معلوم ہوا کہ بعض مائیں بچے کے وظیفے کی خاطر بچے کا قبل از وقت دودھ چھڑا دیتی ہیں تو صبح کی نماز آپ کے لیے پڑھانا مشکل ہو گیا گریہ وزاری کا آپ پر اس قدر غلبہ ہوا کہ بار بار نماز میں چیخ نکل جاتی تھی۔ نماز کے ختم ہوتے ہی فرمایا ''عمر برباد ہو گیا نہ جانے کتنی ماؤں نے بچے قبل از وقت دودھ چھڑا کر ہلاک کر دیے اس لیے میں حکم جاری کرتا ہوں کہ ہر بچہ کا وظیفہ پیدا ہوتے ہی لگا دیا جائے تاکہ کسی ماں کو قبل از وقت دودھ چھڑانے کی ضرورت نہ پڑے۔'' یہی وہ ولایت کا رشتہ ہے جو حکومت اور رعیت کے درمیان ہے۔ جس کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے کے پاسبان ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق کے پاسبان ہیں اور یہ رشتہ ہجرت کے بعد قائم ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں حکم دیا گیا کہ اگر کچھ مسلمان ہجرت نہیں کرتے اور دارالکفر میں رہنا ان کے لیے گوارا ہے تو مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتۂ ولایت نہیں جس کی وجہ سے مسلمان ان کے حقوق اور مفادات کی نگرانی کی ذمہ داری محسوس کریں کیونکہ ولایت کا لفظ عربی زبان میں (حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اور اس سے ملتے جلتے مفہومات) کے لیے بولا جاتا ہے اور اس آیت کے سیاق وسباق میں صریح طور پر اس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست اپنے شہریوں سے اور شہریوں کا اپنی

Marfat.com

ریاست سے اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے۔ پس یہ آیت دستوری اور سیاسی ولایت کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

(میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت اور حفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو۔)

معاہدے کا احترام ضروری ہے

وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِى الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اور اگر وہ مسلمان جنھوں نے ہجرت نہیں کی تم سے مدد طلب کریں تو پھر تم پر مدد کرنا لازم ہے۔ یعنی وہ اس طرح کی شکایت کریں کہ جس شہر یا جس ملک میں وہ رہ رہے ہیں وہ اس لیے ان پر ظلم کر رہے ہیں کہ وہ مسلمان کیوں ہیں۔ اس طرح انھیں مسلمان ہونے کی سزا دی جا رہی ہے تو مسلمانوں کے لیے لازم ہے کہ وہ جس طرح بھی ہو سکے۔ غیر مسلموں کے مظالم کو رکوائیں ورنہ یہ اندیشہ ہے کہ کافر انھیں دوبارہ کفر میں لے جائیں گے۔ ان کے ایمان کی حفاظت کے لیے ان کی مدد ضرور کی جائے لیکن اگر مدد ایسی قوم کے خلاف مانگی جا رہی ہے جن کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی معاہدہ ہے۔ تو پھر معاہدے کی پابندی پہلے ضروری ہے کیونکہ مسلمان کسی حال میں بھی معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے کوئی ایسا اقدام نہیں کیا جائے گا جو معاہدے کی رُوح کے خلاف ہو البتہ! مسلمانوں کو بالکل بے سہارا بھی نہیں چھوڑا جائے گا کیونکہ انھوں نے دارالاسلام کی طرف ہجرت نہ کر کے خود اپنے آپ کو غیر محفوظ کر لیا ہے اس لیے مسلمان ایک خاص حد سے آگے ان کی مدد کرنے کے مکلّف نہیں ہیں۔ البتہ! سفارتی ذرائع سے اخلاقی اور سیاسی دباؤ استعمال کر کے مسلمانوں کی کسی نہ کسی حد تک مدد ضرور ہونی چاہیے۔

یہی وجہ ہے کہ حدیبیہ میں نبی کریم ﷺ قریش کے نمائندے کی طرف سے معاہدے کی یہ دفعہ جب قبول کر چکے کہ "اگر کوئی شخص مکہ معظمہ سے مسلمان ہو کر مدینہ منورہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے" تو اسی دوران ابو جندل رضی اللہ عنہ جو قریش کے نمائندہ کے بیٹے اور قریش کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ وہ اس حال میں مسلمانوں کے سامنے پہنچے کہ ان کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ وہ نہ جانے کس طرح بیڑیاں کھینچتے ہوئے حدیبیہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کی ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا اور جسم پر تشدد

Marfat.com

کے آثار تھے۔ انھوں نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو اپنے زخم دکھاتے ہوئے درخواست کی کہ مجھے اس ظلم سے نجات دلائیں اور اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں۔ قریش کے نمائندہ نے فوراً کہا کہ ہم یہ شق قبول کر چکے ہیں کہ اگر کوئی شخص مسلمان ہو کر مدینہ جائے گا تو مسلمان اسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے۔ آپ اگر معاہدے کے پابند ہیں تو آپ اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے۔ آنحضرت ﷺ نے ہر چند اصرار کیا کہ ابھی معاہدہ مکمل نہیں ہوا لیکن قریش کا نمائندہ کسی طرح ماننے پر آمادہ نہ ہوا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ میں ذاتی طور پر تم سے درخواست کرتا ہوں کہ تم میری خاطر لڑکے کو میرے حوالے کر دو لیکن اس نے صاف کہا کہ اگر آپ اسے لے جانے پر اصرار کریں گے تو میں معاہدہ توڑ دوں گا۔ چنانچہ آپ نے معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے ابوجندل رضی اللہ عنہ کو واپس جانے کا حکم دیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکالے گا۔ اسی طرح ابوبصیر رضی اللہ عنہ مکہ سے بھاگ کر مدینہ پہنچ گئے اور ان کے پیچھے پیچھے قریش کے دو قاصد انھیں لینے کے لیے پہنچے آنحضرت ﷺ نے انھیں ان کے حوالے کیا اور ساتھ جانے کا حکم دے دیا۔ انھوں نے راستے میں موقع پا کر ایک کو قتل کر دیا اور دوسرا بھاگ گیا اور پھر مدینے چلے آئے۔ دو میں سے جو شخص جان بچا کر بھاگا تھا، وہ بھی پیچھے پیچھے مدینہ جا پہنچا اور جا کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں سارا واقعہ سنایا۔ آپ نے ابوبصیر کو بلایا تو انھوں نے عرض کیا کہ حضور آپ معاہدے کی پابندی کرتے ہوئے مجھے ان کے حوالے کر چکے ہیں اب آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔ لیکن حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص جنگ کی آگ بھڑکانے والا ہے۔ ابوبصیر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ حضور دوبارہ مجھے اس شخص کے ساتھ جانے کا حکم دیں گے۔ چنانچہ وہ مدینہ سے نکلے اور ساحلِ سمندر پر جا بیٹھے اور وہیں انھوں نے اپنا ٹھکانہ بنالیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمان جو دارالکفر میں رہتے ہوں اور ہجرت نہ کر سکے ہوں ان سے اس حد تک ہمدردی ہو سکتی ہے جس میں کسی معاہدے کی شکست کا خطرہ نہ ہو یا جنگ کی آگ بھڑکنے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن بالکلیہ انھیں کافروں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

آخر میں فرمایا تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ تم مسلمانوں کی جتنی مدد کر سکتے تھے وہ بھی نہیں کر رہے اور دوسرا یہ کہ تم حدود سے بڑھ کر اس طرح مدد کر رہے ہو کہ تمھیں معاہدے کی پابندی کا احساس نہیں رہا۔ یعنی دونوں پہلوؤں پر اللہ کی نگاہ ہے نہ معاہدے کو نقصان پہنچے اور نہ مسلمان نظر انداز ہوں۔

Marfat.com

مسلمانوں کی مندرجہ بالا بنیادوں پر تشکیل کیوں ضروری ہے؟

﴿وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا بَعْضُهُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ اِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَکُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ کَبِیْرٌ﴾ (الانفال: ۷۳)

(اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ آپس میں ایک دوسرے کے ولی ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد مچے گا۔)

سابقہ آیتِ کریمہ میں امتِ مسلمہ کی اجتماعی زندگی کی ان اساسات کو بیان کیا گیا ہے۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں اس کا سبب اور حکمت بیان کی گئی ہے کہ اگر مسلمان ایمان، ہجرت، نصرت اور جہاد کو اپنی اجتماعی زندگی کی بنیاد نہیں بناتے اور اس طرح سے وہ ایک مضبوط سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی صورت اختیار نہیں کرتے اور تفریق اور امتیاز کے تمام اسباب کو ختم کر کے صرف انھیں بنیادوں پر اپنی شیرازہ بندی نہیں کرتے تو پھر انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ دنیائے کفر انھیں دنیا میں زندہ رہنے کا حق دینے کے لیے کبھی تیار نہ ہوگی۔ کافر مسلمانوں کا بطور مسلمان زندہ رہنے کو کبھی گوارا نہیں کرتے۔ جیسے میں عرض کر چکا ہوں دنیا میں ان کے لیے ہر طرح کی مخلوق گوارا ہے بلکہ وہ درندوں تک سے پیار کرتے ہیں، حیوانات کی بقا کے لیے وہ نہ صرف اسباب فراہم کرتے ہیں بلکہ قانون بھی بناتے ہیں، ان کی نمود و پرداخت کے لیے چڑیا گھر بنائے جاتے ہیں تاکہ لوگوں میں ان کی ضرورت و دلچسپی کا شعور پیدا کر کے ان کے لیے مراعات کو یقینی بنائیں۔ انسدادِ بے رحمیِ حیوانات مستقل محکمہ ہے جو ہر جگہ کام کرتا ہے۔ جس جانور کی نسل کم ہونے لگتی ہے اس کے شکار کو ممنوع قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر کبھی سمندر کے کنارے پر وہیل مچھلیاں ریت میں پھنس جائیں تو ان کو نکالنے کے لیے مملکت کے پورے وسائل حرکت میں آجاتے ہیں۔ لیکن اگر کسی بدنصیب گروہ کے لیے ان کے دلوں میں جگہ ہے نہ ان کی آبادیوں میں تو وہ صرف امتِ مسلمہ کے افراد ہیں۔ ان سے بطور مزدور کام لیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کے اپنے مفادات اس سے وابستہ ہیں۔ لیکن انھیں عزت و احترام نہیں دیا جاسکتا ان کی عزتِ نفس کی پاسداری نہیں کی جاسکتی، ان کی کتابِ مقدس اور رسولِ مقدس کی حرمت کا

Marfat.com

کوئی انتظام نہیں کیا جاسکتا،ان کے ملکوں پر چڑھ دوڑنا ان کے وسائل پر قبضہ کرلینا، ان کے غداروں کو استعمال کر کے ملکی معیشت کو تباہ کرنا،اوران کی تہذیب وتمدن کو برباد کرنا وہ ان باتوں کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔وہ اپنے کسی ملک میں کسی کی مداخلت کو کبھی برداشت نہیں کرتے لیکن مسلمان ملکوں میں ان کی مداخلت ایک معمول بن کر رہ گئی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اسلام اور مسلمان دشمنی میں ان میں کوئی اختلاف نہیں حالانکہ ان میں ایسے ایسے اختلافات موجود ہیں جنھیں کبھی کوئی قوم گوارا نہیں کرتی۔لیکن وہ تمام اختلافات بھلا کر مسلمان دشمنی میں اکٹھے ہیں۔ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو کچھ کیا جس طرح سے ان کی والدہ پر بدچلنی کا الزام لگایا اور عیسیٰ علیہ السلام کو ناجائز اولاد قرار دیا اور پھر انھیں بقول ان کے سولی پر چڑھایا اور اس طرح سے انھیں لعنت کی موت مرنے پر مجبور کیا۔لیکن عیسائی دنیا ان کی ان تمام باتوں کو جاننے اور ان تمام الزامات کو سننے کے باوجود محض مسلمان دشمنی میں نہ صرف انھیں گوارا کرتی ہے بلکہ لے پالک بچے کی طرح انھیں پالتی اور قلبِ عرب میں ایک ناسور بنا کر اس لیے گاڑ دیتی ہے تاکہ مسلمان ہمیشہ اس اذیت کا شکار رہیں اور مسلسل انھیں ہر طرح کی مدد پہنچا کر عربوں کے لیے ناقابلِ تسخیر بنا دیتی ہے۔وہ یہ سب کچھ اس لیے کرتے ہیں کیونکہ اس آیت کے مطابق وہ ایک دوسرے کے ولی، ہمدرد، غمگسار اور کارساز ہیں۔ اسی طرح دنیا میں پھیلے ہوئے اور کافر بھی اسلام دشمنی میں ان کے ساتھ ہیں۔ ہندو، نہ عیسائی کو برداشت کرتا ہے نہ یہودی کو لیکن مسلمان دشمنی اور اسلام کی عداوت میں وہ ان دونوں سے کندھا سے کندھا ملا کر چلتا ہے۔ان کے اس متحدہ محاذ اور متحدہ قوت کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت ممکن ہے کہ مسلمان بھی اپنے تمام اختلافات اور امتیازات اور ملکوں کے تفرقات اور مسالک کے تفردات کو مٹا کر ایک حبل اللہ المتین کو تھام لیں اور وہ یہ عہد کرلیں کہ جس طرح دنیائے کفر ایک ہے اس طرح دنیائے اسلام بھی ایک ہے اور اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو دنیا میں ایک فتنہ اٹھے گا اور بہت فساد مچے گا۔تاریخ بار بار اس بات کی سچائی کو ثابت کر چکی ہے۔مسلمان جب اندلس میں داخل ہوئے تو صرف مسلمان تھے ان میں عربی، عجمی اور کالے، گورے کی کوئی تمیز نہ تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ قلتِ تعداد کے باوجود چند دنوں میں پورے اندلس کے حاکم ہوگئے۔پھر جب تک اسلام ہی ان کی اصل قوت رہا اسی کی رہنمائی میں انفرادی اور اجتماعی زندگی گزرتی رہی تو عیسائی اپنی ساری کوششوں کے باوجود اندلس کے مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔لیکن جب مسلمانوں میں عربی اور اندلسی کا

Marfat.com

سوال پیدا ہوا، بربر اور غیر بربر کے امتیاز نے سر اٹھایا۔ اسلام کی بجائے دوسرے امتیازات مرغوب ہوتے گئے، حبِّ دنیا دین کی محبت پر غالب آ گئی، نتیجہ معلوم ہے کہ آٹھ سو سال تک اندلس پر حکمرانی کرنے والی قوم اس طرح وہاں سے نکالی گئی کہ ایک فرد بھی مسلمان نام کا وہاں باقی نہ رہا۔ مسلمان بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے گئے ان کی یونیورسٹیاں اور ان کی دانش گاہیں جو کبھی پورے یورپ کے لیے علم و دانش کا سرچشمہ تھیں انھیں آگ لگادی گئی۔ مسلمانوں کے علمی مراکز جلا کر راکھ کر دیے گئے۔ جو ترکی یا مراکش کی طرف ہجرت کرنے میں کامیاب ہو گئے وہ زندہ رہے اور جو نکل نہ سکے یا جن کو بہلاوے دے کر روک لیا گیا انھیں قتل کر دیا گیا یا عیسائی بنالیا گیا۔ آج بھی پوری دنیا میں جگہ جگہ اس حقیقت کو دہرایا جا رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ اسلام دشمنی کا مرکز بن چکی ہے ایک فتنے کی آگ ہے کہ پوری دنیائے اسلام اس کی لپیٹ میں ہے۔ لاکھوں مسلمان موت کی نیند سلائے جا چکے ہیں۔ کتنی مسلمان ریاستیں ہیں جو اپنے حقوق کی بازیافت کے لیے ہر طرح کی اذیتوں کا شکار ہیں۔ جگہ جگہ فساد کی آگ بھڑک رہی ہے اور اس کا ایندھن صرف مسلمان ہیں۔ ہندوستان جہاں صدیوں تک مسلمانوں کی حکومت رہی وہاں مسلمان کا خون پانی سے ارزاں ہو گیا ہے۔ اس سے بڑھ کر فتنہ سامانی اور کیا ہوگی کہ خود مسلمان ملکوں میں اسلامی زندگی گزارنا ایک الزام بن گیا ہے۔ مختلف الزامات کے تحت احتسابی ادارے جس کو پکڑ لیتے ہیں اس کی کوئی داد ہے نہ فریاد۔ یوں تو تاریخ کے ہر دور میں یہ آیت مسلمانوں کو پکارتی رہی ہے لیکن آج تو مسلمانوں کا نوشتۂ تقدیر معلوم ہوتی ہے۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے مسلمان کب اس پر کان دھریں گے اور اس حقیقت کو سمجھ کر ازسرِ نو اپنی عظمتِ رفتہ کے لیے کوشش کرنے کا عہد کریں گے۔ اپنی ناکامیوں کے اصل اسباب کو سمجھیں گے اور اس حقیقت کا پوری طرح ادراک کریں گے کہ امتِ مسلمہ کی کسی ایک نسل یا کسی ایک جغرافیے میں سمٹ کر رہنے والی امت کا نام نہیں۔ اس میں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں۔ بیسیوں نسلوں کے لوگ ہیں جن کے رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہر براعظم میں ان کا وجود پایا جاتا ہے۔ کوئی محدود جغرافیہ انھیں اپنے اندر سمیٹ نہیں سکتا۔ اس طرح تفرقات اور امتیازات میں بٹی ہوئی امت اگر کسی بنیاد پر اکٹھی ہو سکتی ہے اور ان کا شیرازہ کسی ایک رسی سے باندھا جا سکتا ہے اور ان کے جہاز کسی ایک لنگر سے باندھے جا سکتے ہیں اور ان کے اجزائے ہستی کو کسی ایک سریش سے جوڑا جا سکتا ہے تو وہ صرف ''اسلام'' ہے۔ صرف وہ نسخۂ شفا ہے جسے نبی کریم ﷺ لے کر آئے تھے۔ وہ کل بھی ہماری قوت تھا آج بھی ہماری قوت ہے۔ یہی وہ تاریخی حقیقت ہے جو

Marfat.com

اس آیتِ کریمہ سے نمایاں ہو رہی ہے۔

اس آیتِ کریمہ میں اولیاء کے لفظ پر غور کرتے ہوئے ذہن ایک اور بات کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ ایمان کی بنیاد پر مسلمانوں میں اخوت کا رشتہ قائم ہوتا ہے اور یہی اخوت ہے جسے اسلامی اخوت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور جس کی اسلام میں بہت قدر و منزلت ہے۔ لیکن دوسرا وہ رشتہ ہے جو ہجرت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے۔ اس رشتہ کو سابقہ آیتِ کریمہ میں ولایت کا نام دیا گیا ہے۔ ولایت کا رشتہ اخوت کے رشتے سے بڑھ کر ہے۔ جب مسلمان ہجرت کر جاتے ہیں تو اخوت اور ولایت کے دونوں رشتے جمع ہو جاتے ہیں۔ لیکن جو شخص ہجرت نہیں کرتا وہ اخوت کا رشتہ رکھتے ہوئے بھی اخوت کے بعض مظاہر سے محروم ہو جاتا ہے کیونکہ ہجرت نہ کرنے کی صورت میں ایک تو اس چیز کا فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ جو شخص ایمان کا دعویٰ کر رہا ہے کیا وہ اپنے دعوے میں مخلص بھی ہے یا نہیں کیونکہ اخلاص کا ثبوت ہجرت ہی سے ملتا ہے اور دوسری یہ بات کہ ہجرت ہی وہ ذریعہ ہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں سے جوڑتا اور ایک متحدہ طاقت کا حصہ بناتا ہے اور یہی طاقت وقت آنے پر جہاد کی قوت ثابت ہوتی ہے۔ جو شخص ہجرت نہیں کرتا وہ دریا سے نکلی ہوئی ایک لہر ہے جس کی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں اور جس کے وجود سے دریا کی قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ یہ ایک ایسا وجود ہے جو بے اصل بھی ہے اور بے ثمر بھی۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مسلمانوں تم ایک دوسرے کے ولی ہو اس لیے ولی ہونے کی حیثیت سے تمھارے آپس میں رشتے دہرے ہیں۔ تم باہمی بھائی بھی ہو اور ایک دوسرے کے ولی بھی جس طرح تمھارا آپس کا ایک رشتہ ہے اسی طرح تمھارا رشتہ ریاست کے ساتھ بھی ہے۔ تم سب ایک دوسرے کے خیر خواہ اور ہمدرد ہو۔ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی رعیت کے ایک ایک فرد کے حقوق کی نگہداشت کرے۔ ان میں ایسے ادارے قائم کرے جو ان میں عدل و انصاف کو بروئے کار لائیں۔ ان کے گرے پڑے طبقے بے بسی کا شکار ہونے کی بجائے ریاست کی طاقت اور افرادِ امت کی طاقت سے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکیں۔ ریاست جس حد تک افراد کے حقوق کی نگہداشت کرے گی اور افراد جس حد تک ریاست کے ساتھ اخلاص کا ثبوت دیں گے اسی حد تک امتِ اسلامیہ اپنی قوت و عظمت میں پختہ تر ہوتی چلی جائے گی اور اگر دونوں نے اپنی اپنی سطح پر اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کی تو زمین میں فتنہ پھیلنے اور فساد کو بھڑکنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

Marfat.com

36- اللہ تعالیٰ کا انسانِ مطلوب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَھَاجَرُوْا وَجٰھَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ اَعْظَمُ دَرَجَۃً عِنْدَاللّٰہِ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفَآئِزُوْنَ o یُبَشِّرُھُمْ رَبُّھُمْ بِرَحْمَۃٍ مِّنْہُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّھُمْ فِیْھَا نَعِیْمٌ مُّقِیْمٌ o خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ اَجْرٌ عَظِیْمٌ o

(التوبۃ: ۲۰ تا ۲۲)

"جو ایمان لائے اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کیا ان کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور وہی لوگ کامیاب وکامران ہیں۔ خوشخبری دیتا ہے ان کو ان کا رب اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لیے ہمیشہ رہنے والی نعمتیں ہیں۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے بے شک اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے۔"

انسانِ مطلوب کا سراپا

بحث کو سمیٹتے ہوئے مسلمانوں کے سامنے مکمل اور ہمیشہ کی راہنمائی کے لیے ان انسانوں کا سراپا لاکر کھڑا کر دیا ہے جو اللہ کو مطلوب اور محبوب ہیں تا کہ جب بھی مسلمان کامیابی اور کامرانی کا راستہ تلاش کریں تو یہ سراپا انھیں رہنمائی کے لیے کفایت کرے۔ اس میں سب سے پہلی صفت وہی بیان کی گئی ہے جس کا ذکر سابقہ آیتِ کریمہ میں بھی ہوا کیونکہ ایک مومن جو دنیا بھر کے کافروں سے الگ راستہ اختیار کر کے ایک نئی زندگی اختیار کرتا ہے اس کا آغاز ایمان

Marfat.com

سے ہی ہوتا ہے۔ اہلِ دنیا یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری کامیابیوں اور کامرانیوں کا راز دولتِ دنیا اور اقتدار میں ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا پھر اس کے بل بوتے پر انسانوں کو اپنا غلام بنانا اور پھر اسی کے سہارے اقتدار کے مناصب پر فائز ہوجانا یہ ایک دنیادار انسان کی زندگی کا خلاصہ بھی ہے اور معراج بھی۔ تعلیم صرف دولت کمانے کا ذریعہ ہے اور دولت ہر طرح کی آسائش حاصل کرنے، سر پر کلغی سجانے، اپنی عظمت کے ڈنکے بجانے اور اقتدار پر قبضہ کرنے کا نام ہے۔ لیکن اسلام بالکل اس کے برعکس ایک دوسرا تصور دیتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ دولتِ دنیا ایک ضرورت ہے اور ضروریات کے حصول کا ذریعہ بھی۔ لیکن انسانی زندگی کا حاصل اور اس کی معراج چند مقاصد سے وابستہ ہے۔ ان مقاصد کا حصول انسان کے فرائض میں داخل کیا گیا ہے۔ اور انہی مقاصد کو انسانی زندگی کی کامیابی کی ضمانت بنایا گیا ہے۔ ضروریاتِ زندگی کے لیے محنت حیوان بھی کرتا ہے اور کافر بھی اور مسلمان کو بھی زندگی کی بقاء کے لیے ایک حد تک ان کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ لیکن مسلمان کا اصل ہدف صرف دنیا کمانا اور اس کو بیش از بیش ترقی دینا، عیش و عشرت کے اسباب فراہم کرنا اور دوسروں سے آگے بڑھنے کی دھن میں زندگی صرف کر دینا نہیں ہے۔ اس کا اصل ہدف اللہ کی معرفت اور اس کی رضا کا حصول ہے۔ جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ کائنات کی ایک ایک چیز میری چاکری میں دی گئی ہے میں ان کا مقصود بنایا گیا ہوں اور وہ میری خدمت بجالانے میں کبھی کوتاہی کی مرتکب نہیں ہوتیں۔ میری غذا بہم پہنچانے کے لیے سورج چاند، ہوا اور مٹی اور موسموں کے تغیرات اپنا اپنا فرض انجام دیتے ہیں۔ صرف اتنی بات کے لیے کہ مجھے غذا ملنی چاہیے تمام عناصرِ قدرت مسلسل کوشاں نظر آتے ہیں کیونکہ انھیں اسی مقصد کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ انسان جو کائنات کا گلِ سرسبد ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسے بغیر کسی مقصد کے پیدا کیا گیا ہو اللہ کے پیغمبر اور ان پر اترنے والی کتابیں انسانوں پر واضح کرتی ہیں کہ تم کائنات کے مخدوم ہو لیکن اللہ کے بندے ہو۔ اس کی بندگی بجالانا تمھارا اولین فریضہ ہے۔ رہی یہ بات کہ بندگی کا حق ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ کے پیغمبر اور اس کی کتابیں اس ضرورت کو بتمام و کمال ادا کرتی ہیں۔ انسان کا اصل مقصد یہ ہے کہ وہ اللہ کو پہچان کر اپنے فریضۂ زندگی کو جان کر اللہ کے نبیوں کی رہنمائی میں زندگی گزارے۔ جب آدمی اس بات کو سمجھ لیتا ہے اور قبول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے تو اسی کو ''ایمان'' کہتے ہیں۔ اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی کو قبول کرنا اور دل کی گہرائیوں سے اس کا یقین کرنا اور پھر کبھی اس میں

Marfat.com

شک وارتیاب کا کانٹا نہ چبھنے دینا یہ وہ ایمان ہے جس سے انسان کی حقیقی زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس کی بیشتر باتیں چونکہ انسان کی خواہشات کے برعکس ہیں اور ساتھ ہی ساتھ بہت سی باتیں عالمِ غیب سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان باتوں کو قبول کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آدمی اس بات کا یقین پیدا نہ کرے کہ اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی میں جو کچھ میرے حوالے کیا جارہا ہے اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اللہ کے آخری نبی کے آجانے اور آخری کتاب کے نزول کے بعد اللہ کی طرف سے آنے والی راہنمائی مکمل ہوگئی۔ اب اس سے فائدہ اٹھانے کا دارومدار اس بات پر ہے کہ آدمی اس بنیادی حقیقت کو تسلیم کرے اور یقین کے ساتھ تسلیم کرے۔ دنیا اپنے عقل و دانش کے بل بوتے پر ہزار نئی راہیں نکالے اور زندگی کے نئے نئے تجربے کرے لیکن ایک مومن کے لیے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت کی راہنمائی کے سوا کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے اور کبھی اس کے یقین میں لرزش پیدا نہ ہو۔ اسے کامل یقین ہو کہ اللہ کا علم ہر نارسائی سے پاک ہے۔ اس کا آخری نبی باقی نبیوں کی طرح ہر انسانی کمزوری سے مبرّا ہے۔ اس کی لائی ہوئی تعلیم کے بنیادی ماخذ بتمام و کمال محفوظ ہیں۔ نئی ضرورتوں کے لیے اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ لیکن جن باتوں پر شریعت فیصلہ دے چکی ہے ان میں کوئی قلم کاری نہیں ہوسکتی۔ اس پر جتنا پختہ ایمان اور یقین ہوگا اتنا ہی اللہ اور اس کے رسول کی راہنمائی پر چلنا ایک مومن اور امتِ مسلمہ کے لیے آسان ہوجائے گا اور دوسری یہ بات کہ جب آدمی اللہ کے احکام پر عمل کرے تو اس کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس بات کا سو فیصد یقین رکھے کہ میرا اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں ہر وقت اس کی نگاہوں میں ہوں، میری کوئی تنہائی اس سے محفوظ نہیں، وہ میرے صرف ظاہری اعمال کو نہیں بلکہ باطنی اعمال اور دل کے رازوں سے بھی واقف ہے۔ جس آدمی کو اس بات کا یقین ہوگا وہ کبھی گناہ نہیں کرسکے گا۔ کبھی گناہ کی بات سوچ بھی نہیں سکے گا، وہ کبھی کسی کا نقصان نہیں کرے گا، اس کا قدم کبھی غلط جگہ پر چل کر نہیں جائے گا۔ اس کی نگاہ آوارہ نہیں ہوگی، اس کے دل کے خیالات بے قابو نہیں ہوں گے اور اس کے ساتھ ساتھ اگر اسے اس بات کا بھی یقین میسر آجائے کہ میرے اللہ کی قدرتیں بے پناہ ہیں، دنیا ساری مل کر اس کے ارادے کو بدل نہیں سکتی، وہ چاہے تو چشمِ زدن میں سمندر کو صحرا میں اور صحرا کو سمندر میں تبدیل کردے۔ اس کی بے پناہ قدرت ہمیشہ اس آدمی کی تائید ونصرت میں ہوتی ہے جو شریعت کے مطابق اور اللہ کی رضا کے حصول کے لیے زندگی کا ہر قدم

Marfat.com

اٹھاتا ہے، وہ بڑے بڑے بادشاہوں کو کٹھ پتلیوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ان کی طاقت مصنوعی اور چند روزہ ہے۔ اللہ کے لشکر بے شمار ہیں، اللہ جب اپنے بندوں کی مدد کرتا ہے تو کوئی بڑی سے بڑی طاقت بھی مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ یہ ایمان کے ادنیٰ تقاضے ہیں جس سے بہرہ ور ہو کر انسانی زندگی میں انقلابِ عظیم آجاتا ہے۔ اس کی زندگی طہارتِ فکر اور طہارتِ عمل کا پیکر بن جاتی ہے۔ وہ چیتھڑے پہن کر بھی اللہ کے بھروسے پر بڑی سے بڑی قوت سے ٹکرا جاتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میں ایک بے طاقت آدمی ہوں لیکن میری پشت پر سب طاقتوں کا پروردگار ہے۔ ان تصورات سے چونکہ زندگی کی بنیاد اٹھتی ہے اور اسی کی روشنی میں زندگی کی عمارت بلند ہوتی ہے اس لیے قرآنِ کریم نے بار بار ایمان کا ذکر کیا ہے۔

۲:۔ ایمان کے بعد اس آیتِ کریمہ میں ہجرت کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ ہجرت ایمان کا تقاضا بھی ہے اور ایمان کا پھل بھی۔ ہجرت کا معنی ہے ''چھوڑ دینا''۔ فتحِ مکہ سے پہلے اپنا گھر اور اپنا مال و دولت چھوڑ کر مدینہ پہنچنا ہجرت کہلاتا تھا۔ لیکن فتحِ مکہ کے بعد اپنا وطن چھوڑ کر مرکزِ اسلام میں پہنچنا اس لیے ضروری نہ رہا کیونکہ پورا جزیرۂ عرب آہستہ آہستہ اسلام کے زیرِ نگیں آگیا اور اسلامی ریاست قائم ہوگئی۔ لیکن فتحِ مکہ کے بعد بھی ہجرت کا ایک تصور باقی رہا اور قیامت تک باقی رہے گا۔ وہ ہجرت وہ ہے جس کے بارے نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

المهاجر من هجر مانهى الله عنه۔

''مہاجر وہ ہے جو ہر وہ چیز چھوڑ دے جس سے اللہ نے روکا ہے۔''

پہلے وطن چھوڑنے کو ہجرت کہا جاتا تھا اب ہر اس بات کو چھوڑ دینا جسے اللہ اور اس کے رسول نے منع کیا ہے اللہ کے اوامر پر عمل کرنا اور نواہی سے رکنا، یہ وہ ہجرت ہے جو قیامت تک باقی رہے گی۔ یہ ہجرت جیسا کہ عرض کیا گیا ایمان کا لازمی تقاضا ہے، جو آدمی اللہ اور اس کے رسول کے ہر حکم کی صداقت پر یقین رکھتا ہے وہ اگر کرنے کی بات ہے تو اس پر ضرور عمل کرے گا اور اگر رکنے کی بات ہے تو وہ اسے ضرور چھوڑ دے گا۔ اور اگر وہ شریعت کی حرام کردہ چیزوں سے رکتا نہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اسے شریعت کے احکام پر یقین نہیں وہ انھیں ماننا ضرور ہے لیکن ایسی بے دلی سے جس کا عملی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایمان ایسے ماننے کو نہیں کہتے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے ایک جگہ فرمایا:

Marfat.com

﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اٰمِنُوْا﴾

''اے وہ لوگو! جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ۔''

یعنی ایسا ایمان جو تمھیں آمادۂ عمل نہیں کرتا جو تمھاری زندگی پر حکمران نہیں جس کی موجودگی میں تم اللہ کی نافرمانی کرنے کی جسارت کر گزرتے ہو اور اللہ کے رسول کی سنتوں کو توڑتے ہو وہ ایمان نہیں محض زبان کا جمع خرچ ہے۔ حقیقی ایمان آدمی کو اللہ سے غافل نہیں ہونے دیتا، رسول اللہ کی محبت پر کسی اور محبت کو غالب نہیں آنے دیتا۔ شریعت کی ایک ایک بات اس کے دل کی آواز بن جاتی ہے اور اگر کبھی بشری تقاضے سے کوئی گناہ کر گزرتا ہے تو اپنے آپ کو موت کے حوالے کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ معمولی غفلت پر وہ اس قدر رنجیدہ ہوتا ہے کہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے۔

حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک دن اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے۔ باغ کا گھنا سایہ کھجوروں کے باہم پیوستہ درخت، انگور کی چڑھی ہوئی شاخیں، ایسے گھنے سائے میں نہ جانے چند چڑیاں کیسے گھس آئیں۔ انھوں نے باہر نکلنا چاہا راستہ نہ ملنے پر ٹہنی ٹہنی پر پھدکنا شروع کیا اور اپنی آہ و بکا سے وہ سماں باندھا کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ یکسوئی قائم نہ رکھ سکے، نظر ان کے ساتھ بھٹکنے لگی۔ اس منظر میں ایسے کھوئے کہ یاد ہی بھول گیا کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ جیسے ہی خیال آیا اس قدر دل گرفتہ ہوئے کہ دیر تک بیٹھے روتے رہے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جا کر سارا ماجرا کہہ سنایا اور اجازت چاہی کہ میں اپنا سارا باغ جو بہت قیمتی تھا صدقہ کرنا چاہتا ہوں چنانچہ اجازت ملنے پر انھوں نے صدقہ کر دیا۔

چند منٹ کی غفلت جو چڑیوں کے چہچہے سے پیدا ہوئی تھی اور نماز سے غفلت کا سبب بن گئی تھی اس کی اتنی بڑی قیمت ادا کی کہ سارا باغ اللہ کی نذر کر دیا۔ صحابہ کے اس طرح کے بے شمار واقعات ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ایمان ایک ایسی زندہ حقیقت تھی جو ان کی زندگی پر حکمران ان کے اعمال کی نگران اور محرک تھی، ایسا ایمان جب نصیب ہو جاتا ہے تو پھر انسان کے لیے ہر اس بات کو چھوڑنا جس سے اللہ اور اس کے رسول نے منع فرمایا ہے مشکل نہیں

Marfat.com

رہتا کیونکہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ مجھے جن باتوں سے روکا گیا ہے ان سے رکنے میں میری بھلائی ہے اور جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا کرنا میرے لیے آسودگی کا باعث ہے۔ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کو شریعت کی زنجیر پہنا کر رکھتا ہے۔ اس کے عمل کی تمام قوتوں اور محرکات پر اللہ کے خوف کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ خواہشاتِ نفس کی خاطر شریعت میں چور دروازے نکالنے کی کوشش نہیں کرتا۔ جب کہیں یہ دیکھ کر اس کے قدم رکنے لگتے ہیں کہ آگے بڑھنا خطرے سے خالی نہیں، اس کا ایمان اسے سہارا دیتا ہے اور عمل کی قوتیں اس سے اور توانا ہو جاتی ہیں۔

۳:۔ ایمان سے دل ونگاہ کی آبیاری ہوتی ہے اور ایک مضبوط قوتِ ارادی پیدا ہوتی ہے اور ہجرت سے آدمی تمام آلائشوں سے پاک ہو کر خوبصورت کردار وعمل کا پیکر بن جاتا ہے ۔اس کے نتیجے میں اس کے اندر یہ احساس ابلتا ہے کہ یہ ایمان کی روشنی کیا صرف میری ذات تک محدود رہے گی اور کیا گناہوں کا چھوڑ دینا اور اللہ کی نافرمانی سے تائب ہو جانا کیا میری ذات تک محدود رہ کر معاشرے اور سماج میں وہ نتائج پیدا کر سکے گا جس سے صالح انسانی معاشرے کی تعمیر ہو سکے۔ ایک فرد چاہے اپنی ذات میں کیسا ہی مخلص اور پاکیزہ صفات کیوں نہ ہو اگر اس کے گردوپیش میں بدعملی کے طوفان اٹھ رہے ہوں اور بے یقینی کی وبا پھیلی ہوئی ہو تو اس کی ذاتی خوبیاں اور اس کے عمل کی پاکیزگی دیر تک باقی نہیں رہ سکتی اس لیے کہ کوئی آدمی بھی گھر میں بند رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا۔ اسے گلی محلے میں بھی نکلنا ہے، اسے ہمسائیوں سے بھی واسطہ پڑنا ہے، اس کے بچے سکول کی عمر کو پہنچ کر سکول بھی جائیں گے، اسے اپنے محلے میں غمی اور خوشی کے مواقع میں شریک ہونا ہے۔ اس کے کئی کام دوسروں سے متعلق ہوں گے اور دوسروں کے اس سے۔ یقیناً ایک دوسرے سے ملنا ایک مجبوری ہوگی۔ ایسی صورت میں فرد کا سرتاپا خیر ہو جانا بھی اس وقت تک کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے اندر ایک جذبہ نہ ابھرے، جس سے وہ اپنے گردوپیش کو ہر طرح کی گندگیوں سے پاک کرنے کا تہیہ کرلے وہ یقین کرلے کہ میرا گھر اس وقت تک محفوظ ہے جب تک کہ یہ محلّہ محفوظ ہے اور یہ محلّہ اس وقت تک محفوظ ہے جب تک یہ شہر محفوظ ہے اگر مجھے اپنے گھر کو باقی رکھنا ہے تو مجھے شہر کو باقی رکھنے کی کوشش کرنا ہوگی۔ اگر میں اپنے بچوں کا برائیوں سے بچانا چاہتا ہوں تو مجھے باقی بچوں کو بھی صاف ستھرا کردار دینا ہوگا۔ اگر میں چاہتا ہوں کہ میرے گھر میں چوری نہ ہو میرے گھر میں

Marfat.com

ملاوٹ کا مال نہ پہنچے، تو مجھے اپنے معاشرے کے ایک ایک فرد میں دیانت وامانت کا ذوق اور اللہ کا خوف پیدا کرنے کی کوشش کرنا ہوگی کیونکہ ایک فرد اچھا ہے تو صرف اس کی اچھائی کافی نہیں اور اس کی اچھائی کی بقا کی کوئی ضمانت بھی نہیں کیونکہ:

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اپنی خیریت، اپنے بچوں کی خیریت، اپنی بقاء اور اپنے بچوں کی بقا اسی صورت میں ہے کہ معاشرے میں جہاں تک ہو سکے خیر کے جذبات کو عام کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو شر کے عوامل کو ختم کرنے کی کوشش کی جائے۔ اپنی ذات سے باہر خیر کی قوتوں کو سپورٹ کرنا اور شر کی قوتوں کو کمزور کرنے اور ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کو بروئے کار لانا اسی کو قرآنِ کریم کی زبان میں ''جہاد'' کہتے ہیں۔ اس کے لیے اپنا مال صرف کرنا پڑے تو مال صرف کرنا ضروری ہے۔ پسینہ بہانا پڑے تو پسینہ بہانا فرض ہے حتیٰ کہ بدرجۂ آخر اگر جان دینا پڑے تو جان دینا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

آنحضرت ﷺ نے ۱۳ سال تک مکہ معظمہ میں جان کھپائی، پسینہ بہایا، اذیتیں برداشت کیں، صرف اس لیے تاکہ انسانوں کو صحیح معنی میں انسان بنایا جائے۔ انھیں اللہ کے راستے پر چلنے کی ترغیب دی جائے، انھیں معرفتِ حق دے کر بندگی کا شعور بخشا جائے۔ جب انھوں نے آپ کا جینا مشکل کر دیا اور آپ کے تمام راستے بند کر دیے تو آپ نے ہجرت فرمائی اور مدینہ منورہ پہنچ کر دعوت کی قوتوں کو بھی منظّم کیا اور جہاد کی سپرٹ بھی پیدا کی۔ ہر ایمان لانے والے کے دل میں ایمان کو قوت بنایا، اللہ کی ہر نافرمانی چھوڑ دینے کا جذبہ پیدا کیا پھر اسی متاعِ فکر کو عام کرنے کے لیے دعوت کو زیادہ قوت سے پھیلانے کی کوشش کی اور اس راستے میں پیش آنے والی مشکلات کو طاقت سے دور کرنے کا نہ صرف تہیہ کیا بلکہ آہستہ آہستہ انھیں دور بھی کر دیا۔ آج بھی ہم غور کریں تو ایک مسلمان کی زندگی کے یہی تین عنوانات ہیں۔ ﴿ایمان، ہجرت اور جہاد﴾ اور تینوں کا رشتہ آپس میں اس قدر جڑا ہوا ہے کہ کسی کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان ایک ایسی روشنی ہے جس کی موجودگی میں اللہ کی نافرمانی کی ظلمت کو جگہ نہیں مل سکتی اور اگر کچھ قوتیں یا نفسانی خواہشیں راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں تو پھر جہاد کے ہتھیار سے کام لے کر ان قوتوں کو سرنگوں کرنا پڑتا ہے۔

Marfat.com

تین صفات پر تین بشارتیں

یہ تین بنیادی صفات ہیں جن سے ایک مومن کا سراپا تیار ہوتا ہے انھیں صفات سے موصوف افراد سے جب امت تیار ہوتی ہے تو وہ حزب اللہ کہلاتی ہے۔ اس کی پشت پر اللہ کی تائید ہوتی ہے اور ان کے پیشِ نظر اللہ کی رضا اور اس کے دین کے غلبے کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا وہ اپنے دل میں کسی شک وشبہ کو آنے کا راستہ نہیں دیتے۔ ان کی زندگی میں اللہ کی نافرمانی داخل نہیں ہوسکتی۔ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کی نافرمانی اور لادینی کی قوتوں کے غلبے کو دیکھ کر بے چین ہوجاتے ہیں۔ وہ افراد کی اصلاح کے لیے بھی جہاد کرتے ہیں اور لادینی قوتوں کے خاتمے کے لیے بھی جہاد کرتے ہیں۔ یوں کہنا چاہیے کہ ایک مومن کی مومنانہ زندگی کی تعمیر ایمان اور ہجرت سے ہوتی ہے اور اس کی زندگی کے مقاصد کی تکمیل جہاد سے ہوتی ہے۔ ان میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جسے عرصۂ انتظار میں رکھا جائے۔ جو لوگ ایمان ویقین کی محنت کو منکرات کے خاتمے اور جہاد سے الگ رکھ کر دیکھتے ہیں وہ محنت اور یقین کی فضا کبھی پیدا نہیں کرسکتے کیونکہ صالح غذا ایسے ماحول میں کبھی پیدا نہیں ہوتی جس کی فضا میں سمّیت رچی بسی ہو اور کوئی فضا بھی زہر کی آلودگی سے پاک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہاں کے رہنے والے اس کی سرکوبی یعنی جہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں ہوتے اور اسے بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کرتے۔ افسوس یہ ہے کہ جو یقین وایمان کی بات کرتے ہیں وہ نہی عن المنکر کے تصور سے خالی اور جہاد سے بے بہرہ ہیں اور جو جہاد کی بات کرتے ہیں وہ اس بات کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ نمازیں بے روح ہوگئی ہیں، ایمان میں نور باقی نہیں رہا اور گھروں تک میں منکرات پہنچ گئے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ایک مکمل اسلامی زندگی سے صدیوں سے محروم چلے آرہے ہیں۔

قرآنِ کریم نے تینوں کو ایک ترتیب اور ایک ہی جگہ بیان فرما کر اس کی یکجائی کا تصور دیا ہے اور یہ اشارہ کیا ہے کہ اگر تم اسلامی زندگی کی برکات سے بہرہ ور ہونا چاہتے ہو تو ان تینوں صفات کو ایک ساتھ پیدا کرنے کی کوشش کرو ورنہ نسخے کے الگ الگ اجزا اپنے اندر کیسی بھی افادیت رکھتے ہوں کبھی بھی مریض کی صحت یابی کا باعث نہیں بنتے۔ مکمل روحانی بالیدگی انھیں کو نصیب ہوتی ہے جو ان تینوں کو ایک ساتھ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہی اللہ کے یہاں سب سے اعلیٰ اور سب سے بڑے مرتبے کے مالک ہیں اسی لیے فرمایا:

Marfat.com

اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَاللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ''وہی اللہ کے نزدیک سب سے عظیم مرتبہ کے مالک ہیں اور وہی لوگ کامیاب ہیں'' اَعْظَمُ اگرچہ اسمِ تفضیل ہے لیکن یہاں یہ تقابل کے معنی میں نہیں آیا بلکہ مطلقاً ان لوگوں کے مرتبے کے بیان کے لیے آیا ہے جو ان تینوں صفات کے حامل ہیں اور یہی لوگ دنیا و آخرت میں کامیاب ہیں۔

اگلی آیتِ کریمہ میں ان تین صفات کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے تین طرح کے انعامات کی بشارت دی ہے۔ ایمان کے مقابلے میں اپنی رحمت اور مہربانی کی بشارت دی ہے جبکہ کافر اور مشرک پر اللہ کا غضب بھڑکتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص اللہ کی ذات و صفات میں شرک کرتا ہے تو اللہ کی غیرت جوش میں آتی ہے۔ لیکن جب کوئی شخص اللہ کی ذات وصفات کو تسلیم کر کے اور اس کے تمام احکام کے واجب الاطاعت ہونے کا اقرار کر کے ایمان لانے کا اعلان کرتا ہے تو اللہ کی رحمت اس کا استقبال کرتی ہے اور انھیں صاحبِ ایمان لوگوں کی وجہ سے کافر و مشرک اللہ کے غضب سے بچے رہتے ہیں۔ اللہ کا فضل و کرم اور اس کے انعامات اس کی رحمت ہی کا اظہار ہیں جب کسی کی طرف اس کی رحمت متوجہ ہو جاتی ہے تو پھر وہ اللہ کے انعامات اور فضل و کرم کا مورد بن جاتا ہے۔ اس کی نیکیاں برگ و بار پیدا کرتی ہیں اور اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں عفو و درگزر کی سزاوار ٹھہرتی ہیں۔

جو شخص اللہ کی رضا کے لیے اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے اور جن باتوں سے اس نے روکا ہے ان میں سے ایک ایک کو چھوڑ دیتا ہے وہ اپنی سابقہ زندگی میں جن باتوں کا عادی تھا اور جن باتوں کے لیے اس نے ہمیشہ لڑائیاں لڑی تھیں، اب اللہ کی شریعت کو تسلیم کرنے کے بعد وہ ان میں سے ایک ایک سے دامن کشاں ہو جاتا ہے۔ وہ جن چیزوں کو اپنے لیے خوشی کا سامان سمجھتا تھا ان سے منہ پھیر لیتا ہے۔ جن مجلسوں میں اس کے خوشی کے لمحات گزرتے تھے وہ ان مجلسوں پر لعنت بھیجتا ہے۔ اب اسے صرف ایک بات کی فکر رہتی ہے کہ مجھ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہونے نہ پائے جس میں اللہ کی نافرمانی پائی جاتی ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کے انعام کے طور پر فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے چونکہ میری خاطر اپنی مرضیات کو چھوڑا ہے، اپنے کافر احباب کو چھوڑا ہے، اپنی پرانی مجالس کو چھوڑا ہے اور اپنے مرغوبات کو چھوڑا ہے، ہم قیامت کو اس کا صلہ یہ دیں گے کہ ہم اسے اپنی رضا سے نوازیں گے۔

رضوان جنت میں ایک مقام بھی ہے جو اس کے خاص بندوں کو عطا ہوگا اور رضوان

Marfat.com

جنت کے ناموں میں سے ایک نام بھی ہے اور رضوان اللہ کی رضا کو بھی کہتے ہیں اور یہ رضا اتنا بڑا انعام ہے کہ جب اہلِ جنت کو یہ انعام عطا ہوگا تو وہ یوں محسوس کریں گے کہ جنت کی ساری نعمتیں اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

تیسری صفت جہاد ہے۔ اس کے انعام کے طور پر ارشاد فرمایا کہ جہاد کرنے والوں کو ہم جنتوں سے نوازیں گے یہ جنتیں ایسی ہوں گی جس میں اللہ تعالیٰ کی وہ نعمتیں پائی جائیں گی جنھیں نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھا اور نہ کبھی کسی کان نے سنا اور نہ کبھی کسی دل میں اس کا خیال تک گزرا اور مزید یہ کہ ان نعمتوں کو کبھی زوال نہیں آئے گا۔ بڑی سے بڑی نعمت استعمال کے بعد ختم ہو جاتی ہے لیکن جنت کی ہر نعمت دائمی اور ابدی ہوگی۔ دنیا میں کتنی ایسی نعمتیں ہیں کہ ان کی عمر خود انسان سے طویل ہے۔ محلات کھڑے رہ جاتے ہیں محلات میں رہنے والے ختم ہو جاتے ہیں۔ زمینیں باقی رہتی ہیں اور زمیندار اٹھ جاتے ہیں۔ ایوان ہائے حکومت تا دیر باقی رہتے ہیں اور حکمران چل دیتے ہیں۔ یہ دنیا کی ریت ہے لیکن جنت میں نہ نعمتوں کو زوال آئے گا اور نہ نعمت والوں پر موت آئے گی۔ جنت بھی ہمیشہ رہے گی اور اہلِ جنت بھی ہمیشہ رہیں گے۔ یہ وہ تین نعمتیں ہیں جو ایک ایک صفت کے بدلے میں دی گئی ہیں لیکن عجیب ماجرا یہ ہے کہ جس طرح متذکرہ بالا تینوں صفات الگ الگ نتیجہ خیز نہیں ہوتیں بلکہ ان کے اثرات ایک دوسرے سے مل کر پیدا ہوتے ہیں اسی طرح یہ تینوں نعمتیں الگ الگ ہونے کے باوجود الگ نہیں ہوں گی۔ جنت ہی میں اللہ کی رضوان بھی ملے گی اور جنت ہی اللہ کی رحمت مہربانی اور اس کے فضل و کرم کا مرکز اور محور ہے۔

آخری جملہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾ یہ ایسا بلیغ جملہ ہے کہ ادراک اس کی وسعتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا کہ تم نے جن نعمتوں کا تذکرہ پڑھا ہے۔ ان میں سے ایک ایک نعمت کی عظمت کی کوئی انتہا نہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اسی پر تمام نہیں ہو جاتیں اس کے پاس تو اجرِ عظیم بھی ہے یعنی وہ اپنے بندوں کو جب نوازنے پر آئے گا تو صرف جنت اور اس کی نعمتوں پر اکتفا نہیں فرمائے گا بلکہ اس کے علاوہ بھی وہ کچھ عطا کرے گا جسے وہ خود عظیم فرما رہا ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر شخص کی اپنی شخصیت کے مطابق بلندی اور پستی ہوتی ہے اور اپنی وجاہت کے مطابق کثرت اور قلت ہوتی ہے۔ جب ایک بچہ کسی چیز کو بڑا کہتا ہے تو وہ بڑی چیز اس کے اپنے ہاتھوں کے مطابق ہوتی ہے۔ لیکن جب باپ کسی چیز کو بڑا کہتا ہے تو وہ اس کے خیال کی

Marfat.com

وسعتوں کے مطابق ہوتی ہے۔ پھر بڑی عمر کے لوگوں میں بھی علم، دولت اور حوصلہ کے اعتبار سے انسانوں کی بے شمار قسمیں ہیں اور ہر شخص کے بڑے اور چھوٹے الگ الگ پیمانے ہیں۔ ایک غریب آدمی چند ہزار روپے کو بہت بڑی رقم سمجھتا ہے لیکن ایک امیر آدمی چند ہزار کو خاطر میں لانا ہی پسند نہیں کرتے۔ بادشاہ سونا اچھالتے اور اشرفیاں لٹاتے ہیں اور عام آدمی ایک ایک اشرفی کو سنبھال کر رکھتا ہے۔ کہنا یہ ہے کہ اجرِ عظیم ہر ایک کی اپنی حیثیت کے مطابق ہے جب بندہ کسی اجر کو بڑا کہتا ہے تو وہ ایسا ہی اجر ہوگا جسے بندے دے سکتے ہیں۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی اجر کو اجرِ عظیم کہتا ہے تو وہ اس کی اپنی شان کے لائق ہے۔ اس کی وسعتیں انسانوں کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔ ہمارے حساب کتاب اور ناپ تول کے پیمانے اس کے سامنے شکست ہو جاتے ہیں۔ ہر شخص اپنی پرواز کے مطابق اندازہ کر سکتا ہے کہ اللہ کا اجرِ عظیم کیا ہوگا لیکن سچائی یہ ہے کہ اس کا صحیح علم صرف قیامت کو ہو سکے گا۔

Marfat.com

37- آنحضرت ﷺ کا اسوہ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوْا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا﴾

(اور تمھارے لیے اللہ کے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور یومِ آخرت کا امیدوار ہو، اور اللہ کو زیادہ سے زیادہ یاد کرے۔)

گزشتہ آیات میں پروردگار نے منافقین اور ایمان میں کمزور مسلمانوں پر تنقید کرتے ہوئے ان کے نفاق، ان کی مفاد پرستی، دین پر اپنی ذات، اپنے بچوں اور اپنے مفادات کو ترجیح دینے اور حق و باطل کے معرکے میں بزدلی اور کم ہمتی کا مظاہرہ کرنے کو نمایاں کیا ہے۔ اب انھیں مزید غیرت دلاتے ہوئے اور غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ تم جب مختلف حوالوں سے جنگِ احزاب کے موقع پر مفاد پرستی اور عافیت کوشی کا ثبوت دے رہے تھے اور تم سمجھتے تھے کہ اب اپنے بچاؤ کی فکر کے سوا سوچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن تمھیں یہ خیال نہیں آیا کہ جس رسول پر تم ایمان کے مدعی ہو وہ تمھارے اندر موجود ہے۔ تم اس کے اتباع کا دعویٰ بھی رکھتے ہو۔ لیکن تم نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا کہ ایسے خطرناک موقع پر اس رسول کا رویہ کیا ہے جبکہ تم اپنے آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ جنگ کے ہولناک موقعوں پر ایک لمحہ کے لیے بھی محاذِ جنگ سے غائب نہیں ہوا۔ اس نے ہر مشقت اور مشکل میں تمھارا ساتھ دیا۔ بلکہ جب بھی کوئی مشکل وقت آیا تو اس نے دوسروں سے بڑھ کر اس میں حصہ لیا۔ اور کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جس کا مطالبہ آپ نے لوگوں سے کیا ہو اور خود اس میں شریک نہ رہے ہوں۔

Marfat.com

ہوں۔ آپ نے خندق کی کھدائی میں بنفسِ نفیس حصہ لیا۔ دوسروں نے پیٹ پر ایک پتھر باندھا تو آپ نے دو پتھر باندھے۔ دوسروں کے بچے جس خطرناک صورتحال سے دوچار رہے آپ کے اہل وعیال بھی اس کا حصہ بنے رہے۔ غرضیکہ قربانی وایثار کا کوئی موقع ایسا نہ تھا جس میں وہ دوسروں سے آگے نہ رہے ہوں۔ تم اگر واقعی ان پر ایمان رکھتے تھے اور ان کے اتباع کا حقیقی جذبہ تم میں موجود تھا تو تمھیں نمونہ انھیں بنانا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم سے جس کمزوری کا صدور ہوا ہے یہ کوئی وقتی کمزوری نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ کے راستے اور معرکۂ حق و باطل میں جان کا نذرانہ پیش کرنا اور ثابت قدمی دکھانا ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور آخرت کے دن کی حاضری کی امید رکھتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کے پیشِ نظر صرف وقتی مفاد اور دنیا ہی کی فلاح و بقاء ہو اور آخرت اور اس میں ملنے والے اجر وثواب پر یقین نہ ہو ان کے لیے آنحضرت ﷺ کا اسوہ قابلِ تقلید نہیں ہوسکتا۔ منافقین نے اگر کمزوری دکھائی ہے تو اس کا سبب کوئی وقتی مصلحت نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہیں۔ اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کو یاد رکھنے والے لوگ ہیں۔

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّ تَسْلِيْمًا﴾

''اور جب اہلِ ایمان نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا، اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا اور اس چیز نے ان کے ایمان اور ان کی سپردگی میں اور اضافہ کر دیا۔''

مخلص مومنوں کا رویہ

رسول اللہ ﷺ کے اسوہ کی طرف توجہ دلانے کے بعد اب اللہ تعالیٰ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کی طرف توجہ دلا رہا ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل ہی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے رسول کے اسوہ کی صحیح تعبیر اور حقیقی ترجمانی ہے۔ اور اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ جن دلوں میں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی امید اور آخرت کا

Marfat.com

یقین ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے رسول کی اطاعت واتباع کا سچا جذبہ رکھتے ہیں ان کا طرزِ عمل وہ ہوتا ہے جس کا اظہار صحابہ کے طرزِ عمل سے ہو رہا ہے۔ اور جو صرف ایمان کو وقتی مصلحت کے تابع اور زبان کا جمع خرچ سمجھتے ہیں ان کا طرزِ عمل وہ ہوتا ہے جو اس سے پہلے آیت بارہ میں ہم پڑھ چکے ہیں کہ منافقین نے جب دشمنوں کے لشکرِ جرار کو دیکھا اور ان کے محاصرے کی شدت دیکھی اور حالات کے تیور دیکھے تو انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے رسول نے تو ہم سے وعدے فتح و نصرت اور غلبۂ اسلام کے کیے تھے اور ہمیں قیصر و کسریٰ پر حکومت کے خواب دکھائے تھے، جبکہ ہمیں اپنی جان کے لالے پڑے ہیں اور ہم رفع حاجت کے لیے بھی باہر نہیں نکل سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ وعدے ایک فریب تھے۔ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب ان فوجوں کو دیکھا تو وہ دیکھتے ہی پکار اٹھے کہ یہ تو وہی چیز ہے جس کی خبر ہمیں اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کے رسول نے دی تھی۔ اس میں اشارہ درحقیقت ان آیات کی طرف ہے جن میں مسلمانوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں سے تم اس وقت بہرہ ور ہو سکو گے جب نہایت صبر آزما امتحانوں سے کامیابی سے گزر کر اپنا استحقاق ثابت کر دو گے۔ اس کا ذکر تو قرآنِ کریم نے متعدد مواقع پر کیا ہے لیکن ہم صرف ایک ہی حوالے پر اکتفا کرتے ہیں۔

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ﴾

”کیا تم نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی تمھیں اس طرح کے حالات سے سابقہ پیش آیا ہی نہیں جس طرح کے حالات سے ان لوگوں کو سابقہ پیش آیا جو تم سے پہلے گزرے، ان کو فقر و بیماری کے مصائب پہنچے۔ اور وہ اس قدر جھنجھوڑے گئے کہ رسول اور جو لوگ اس کے ساتھ ایمان لائے پکار اٹھے کہ اللہ کی مدد کب نمودار ہوگی! آگاہ، کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔“ (البقرۃ۔۲۱۴)

منافقین نے آنحضرت ﷺ کی زبانِ مبارک سے جو غلبۂ اسلام اور مسلمانوں کی فلاح و کامیابی کے وعدے سنے انھوں نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ ہمیں اب بنی اسرائیل کی

Marfat.com

طرح کچھ کرنا نہیں پڑے گا بلکہ جو کچھ بھی ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے ان وعدوں کے تحت معجزانہ طور پر ظہور پذیر ہوتا رہے گا۔ لیکن جب انھوں نے دشمنوں کا لشکرِ جرار دیکھا کہ اس نے مدینے کا محاصرہ کرلیا ہے تو انھوں نے یہ سمجھا کہ اب تو اسلام اور مسلمانوں کی کشتی ڈوبے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اور جو کچھ ہم سے وعدے کیے گئے تھے وہ سب فریب ثابت ہوئے ہیں۔ لیکن مخلص مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدوں کو اس آئینے میں دیکھا جس کا ذکر ابھی سورۃ البقرۃ کی ایک آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے وعدے درحقیقت اس بات کے ساتھ مشروط ہیں کہ مسلمان انتہائی صبر آزما آزمائشوں سے کس صبر اور استقلال کے ساتھ گزرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر کس قدر بھروسہ کرتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے جب ان بیشمار دشمنوں کو دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزمانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اب ہماری کامیابیوں کا راستہ ان آزمائشوں سے کامیابی سے گزرنے پر منحصر ہے۔ ہماری تھوڑی سی کمزوری ہمارے مستقبل کو مخدوش بنادے گی۔ اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر صبر و استقامت کامیابیوں کا راستہ کھول دے گی۔ چنانچہ ان لشکروں کو دیکھ کر پریشان ہونے کی بجائے ان کے ایمان اور تسلیم میں اور اضافہ ہوگیا۔ جس طرح سونا بھٹی میں چڑھ کر کندن بن جاتا ہے اسی طرح مسلمان کا ایمان بھی آزمائشوں کی بھٹی میں اور جلا پاتا اور اللہ تعالیٰ کے وعدوں کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ج فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ لِيَجْزِىَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا﴾

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا، ان میں سے بعض تو اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض ان میں سے منتظر ہیں اور انھوں نے ذرا بھی تبدیلی نہیں کی ہے۔ تاکہ اللہ سچوں کو ان کی سچائی کی جزاء دے، اور منافقوں کو اگر چاہے تو سزا دے، اور اگر چاہے تو ان کی توبہ قبول کرلے، بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔''

نَحْبَ، عہد و پیمان اور نذر کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ امام بخاری کے نزدیک یہاں عہد کے معنی میں آیا ہے۔ اور یہی صحیح معلوم ہوتا ہے۔

Marfat.com

مردانِ خاص کا طرزِ عمل

گزشتہ آیت میں ہم نے پڑھا ہے کہ مسلمان راہِ حق میں پیش آنے والے بڑے سے بڑے واقعہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش سمجھتے ہیں۔ اور بجائے اس کے کہ اس سے متاثر ہو کر کمزوری دکھائیں وہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے کامیابی و کامرانی کا ذریعہ سمجھ کر اس کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز ان کے ایمان و تسلیم میں اضافے کا باعث ثابت ہوتی ہے۔ یہ کیفیت یوں تو تمام صاحبِ ایمان لوگوں کی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسانوں کا بہتر سے بہتر گروہ بھی بلند صفات میں یکساں نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان مسلمانوں میں بھی اپنی تمام تر اعلیٰ صفات کے باوجود کچھ نمونے کے لوگ ایسے ہیں جنھیں رجال کہہ کر ان کے بلند مرتبہ ہونے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مراد اس سے مردانِ خاص ہیں، کہ ان کی جرأت و بسالت کا عالم یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو سچا ثابت کر دکھایا۔ اور اپنی جان کا نذرانہ پیش کر کے اس کی صداقت و حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کر گئے اور اللہ تعالیٰ سے کیا ہوا عہد سچا ثابت کر دیا۔ اور جن لوگوں کو ابھی تک جان کا نذرانہ پیش کرنے کا موقع نہیں ملا وہ اس کے منتظر ہیں کہ کب ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں سر کٹوا کر اپنے کندھوں کا بوجھ ہلکا کرتے ہیں۔ لیکن اس انتظار کی کیفیت میں ان کے ایفائے عہد کے جذبے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

اگلی آیت میں فرمایا کہ لوگ نہ جانے احزاب کے اس حملے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اسے شاید اہلِ عرب کی دشمنی کا ایک بہت بڑا اظہار سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ طوفان اس لیے اٹھایا تاکہ راست بازوں اور منافقوں کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی بن جائے۔ جو لوگ راست بازی کا ثبوت دیتے ہوئے جان پر کھیل جائیں اور یا جان ہاتھ پر رکھے انتظار میں کھڑے ہوں انھیں ان کی راست بازی کا صلہ دیا جائے۔ اور منافق اگر اپنی غلطیوں کو محسوس کر کے توبہ کی طرف آ جائیں تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرمائے۔

Marfat.com

38- اپنی ذات اور اپنے اہلِ خانہ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا﴾
(اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو جہنم کی آگ سے بچاؤ)

اس آیت کے اگلے حصے میں اس آگ کی ہولنا کی کا نقشہ کھینچا گیا یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ جہنم کی آگ سے خود بھی بچو اور تمھاری اولاد بھی جہنم کی آگ سے محفوظ رہے تو پھر اسلام کے دیے ہوئے اصولوں کے مطابق اپنی اولاد کی تربیت کرو۔ چنانچہ یہ تربیت کی ذمہ داری ایسی شدید ذمہ داری ہے کہ قرآنِ کریم نے انبیاءِ کرام کے حوالے سے بار بار اس کا ذکر کیا کہ وہ معصوم ذاتیں بھی اپنی اولاد کی ذمہ داریوں کے حوالے سے کس طرح ہمیشہ فکر مند رہتی تھیں اور کس طرح اپنی اولاد کے لیے اللہ سے دعائیں کرتی تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مشہور دعا جو ہم نماز میں پڑھتے ہیں اس میں جہاں آپ نے اپنے والدین کے لیے اور اپنے لیے دعا کی ہے وہیں اپنی اولاد کے لیے بھی بے تابی سے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے۔ ان کی دعا کے الفاظ یہ ہیں:

رَبِّ اجْعَلْنِیْ مُقِیْمَ الصَّلٰوۃِ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَا۔

''اے میرے رب! مجھے اور میری اولاد کو نماز کو قائم کرنے والا بنا دے، (اے میرے رب تو ہی دعاؤں کو قبول کرتا ہے میری بھی اس) دعا کو قبول فرما۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ جب ان کی

Marfat.com

وفات کا وقت قریب آیا تو اپنی اولاد کو جمع کر کے جو وصیت فرمائی اس میں کہیں دور دور تک اولاد سے متعلق دنیوی پریشانیوں کا ذکر نہیں ملتا۔ حالانکہ آدمی جب دنیا سے جانے لگتا ہے تو اگر اولاد برسر روزگار نہ ہو یا اپنے پاؤں پر ابھی کھڑی نہ ہوسکی ہو یا بچے ابھی چھوٹے ہوں تو وہ بار بار اس کا ذکر کیے بغیر نہیں رہتا کہ میرے بعد میری اولاد کا کیا بنے گا؟ لیکن دیکھیں حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے یہ نہیں پوچھا کہ بتاؤ میرے بعد تمھاری دنیاوی ضرورتوں کا کیا بنے گا؟ تم کس طرح آپس میں زندگی گزار سکو گے؟ بلکہ پوچھتے ہیں تو صرف یہ پوچھتے ہیں:

اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ بَعْدِیْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰـهَكَ وَاِلٰـهَ اٰبَـآئِكَ اِبْرَاهِیْمَ وَاِسْمَاعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰـهًا وَّاحِدًا وَنَحْنُ لَـهٗ مُسْلِمُوْنَ۔

”اس وقت کو یاد کرو جب حضرت یعقوب علیہ السلام نے اپنے بیٹوں سے کہا کہ تم میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟ انھوں نے کہا کہ ہم اس ذات پاک کی پرستش کریں گے جس کی آپ اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق (علیہم السلام) کرتے آئے ہیں۔“

یعنی وہی معبود جو وحدہ لاشریک ہے ہم اسی کے ہو کر زندہ رہیں گے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں قرآنِ کریم ہمیں بتاتا ہے کہ ان کی صفات میں سے ایک ممتاز صفت یہ تھی کہ انھیں ہمیشہ اپنے بچوں کی دینی تربیت کی فکر رہتی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے:

﴿وَكَانَ یَاْمُرُ اَهْلَـهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ﴾

”اور اسماعیل علیہ السلام ہمیشہ اپنی اولاد کو نماز کی پابندی اور زکوٰۃ کی ادائیگی کا حکم دیتے رہتے تھے“

خود حضور ﷺ کو ہم دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے نواسوں سے بے پناہ محبت رکھتے تھے لیکن معمولی سے معمولی کوتاہی پر سرزنش بھی فرماتے تھے۔ سیدنا حسن رضی اللہ عنہ سے آنحضرت ﷺ کو بہت پیار تھا لیکن اس کے باوجود جب ایک دفعہ بیت المال کی زمین پر بکھری ہوئی کھجوروں میں سے ایک کھجور اٹھا کر انھوں نے منہ میں رکھ لی اور کھانے لگے تو آنحضرت ﷺ کی نگاہ پڑی، آپ نے بے ساختہ فرمایا ﴿تھو کو تھو کو﴾ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ تمھیں نہیں معلوم کہ ہم بنو ہاشم صدقہ کی کوئی چیز نہیں کھایا کرتے۔ منہ میں انگلی ڈال کر کھجور نکال کر باہر پھینک دی۔ یعنی

Marfat.com

اولاد کی تربیت کے بارے میں فکر مند رہنا یہ تمام انبیاء کرام کی طبعتوں کا خاصا رہا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نبوت و رسالت کی دعوت کا آغاز بھی ہمیشہ اپنے اہل وعیال اور خاندان سے ہی کیا کرتے تھے۔ اس لیے تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں سے محبت کریں، ان کو اللہ کی عظیم نعمت سمجھیں، لیکن ساتھ ساتھ اس بات کو کبھی نہ بھولیں کہ وہ اللہ کی جانب سے اس لحاظ سے ایک آزمائش ہیں کہ کیا ان کی بہتر سے بہتر تربیت کر کے والدین ان کو ایک کارآمد انسان بناتے ہیں؟ یا لاپرواہی اور غلط اظہارِ محبت سے ان کو ایک بگڑا ہوا انسان بنا دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں تربیت کے حوالے سے اسلام نے بہت واضح ہدایات دی ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

افتحوا علی صبیانکم اول کلمة بلا اله الا الله۔

''جب تمھارے بچے بولنا سیکھیں تو ان کو سب سے پہلے لا الہ الا اللہ کا کلمہ سکھاؤ۔''

اس لیے کہ بچپن میں بچے کا دماغ ایک صاف سلیٹ کی طرح ہے۔ اس پر جو لکیریں کھینچ دی جائیں وہ ساری زندگی رہنمائی کے نقوش بن کر روشنی دیتی رہیں گی۔ مسلمانوں کے لیے زندگی کا اساسی اصول چونکہ لا الہ الا اللہ ہی ہے اس لیے فرمایا کہ بچوں کو سب سے پہلے یہ کلمہ سکھانے کی کوشش کرو۔ اور پھر الفاظ پر ہی اکتفا نہیں کرنا چاہیے، بلکہ طریقے طریقے سے اور ہلکی پھلکی مثالوں سے اس کا مفہوم بھی دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے اور طریقے طریقے سے بچے کے دل میں یہ بات ڈالنی چاہیے کہ بیٹا اللہ وہ ہوتا ہے جو ہر وقت اور ہر حال میں دیکھتا ہے۔ وہ ہماری کمزوریوں میں ہماری دستگیری کرتا ہے، ہماری ناکامیوں میں ہماری مدد فرماتا ہے، تمام سہارے ٹوٹ جائیں تو وہ ایک ایسا سہارا ہے جو ہمیشہ قائم رہتا ہے، خوف صرف اس کا ہونا چاہیے اور محبت بھی اسی سے ہونی چاہیے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں اگر بچے کے دل و دماغ میں اتر جائیں تو پھر وہ ایک مضبوط سیرت و کردار کا مالک بن کر زندگی کے میدان میں اترتا ہے۔ پھر اس لا الہ الا اللہ کا اظہار یوں تو زندگی کے ہر میدان میں ہوتا ہے لیکن اس کی صحیح تربیت کا اہتمام نماز کی صورت میں پانچ وقتوں میں کیا گیا ہے۔ جب آدمی بار بار اللہ کے سامنے اپنی بندگی اور وفاداری کا اقرار و اظہار کرتا ہے۔ اس لیے بچوں کی تربیت کے حوالے سے آنحضرت ﷺ نے یہ حکم دیا کہ:

Marfat.com

مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَآءُ سَبْعٍ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَآءُ عَشْرِ سِنِيْنٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ

''اپنی اولاد کو نماز کا حکم دو جب وہ سات سال کی ہو جائے اور جب وہ دس سال کی ہو جائے تو پھر نماز چھوڑے تو اس کو مار کر نماز پڑھاؤ، اور دس سال کی عمر کے بعد اس کو ایک بستر پر سونے کی اجازت نہ دو، بلکہ اس کے بستر الگ الگ کر دو۔''

نماز چونکہ پوری اسلامی زندگی کی ایک اجتماعی صورت ہے اس لیے حکم دیا کہ سات سال کی عمر بچے کی تربیت کی صحیح عمر ہے۔ اس سے پہلے لا الہ الا اللہ جیسے کلمات اور ان کے ہلکے پھلکے مطالب ذہن نشین کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے لیکن کوئی عملی ذمہ داری، دینی حوالے سے ان پر ڈالنا مناسب نہیں۔ اس لیے علماء نے لکھا کہ جب بچہ سات سال سے چھوٹا ہو تو اسے روزے رکھنے کے لیے نہ کہا جائے۔ یہ اس پر غیر معمولی بار ہو گا جو تنفر کا باعث بھی ہو سکتا ہے تو سات سال کی عمر میں بچے کو نماز کا عادی بنانا چاہیے۔ اگرچہ ابھی اس پر نماز فرض نہیں ہوئی، لیکن آہستہ آہستہ جب عادت پڑ جائے گی تو فرض نماز کو ادا کرنا آسان ہو جائے گا۔ لیکن اگر بچہ دس سال کی عمر کو پہنچ کر بھی نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو پھر حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ سرزنش سے کام لیا جائے۔ ہلکی پھلکی سختی کرنا اس کی بھی اجازت ہے۔ یہ تصور کوئی صحیح تصور نہیں ہے کہ بچہ کچھ بھی کر گزرے، کبھی اس کی سرزنش نہ کی جائے یا اس پر کبھی ہاتھ نہ اٹھایا جائے۔ البتہ آنحضرت ﷺ نے ناروا سختی کرنے سے منع فرمایا۔ منہ پر مارنے سے منع فرمایا اور ایسی مار مارنے جس سے جسم پر نشان پڑ جائیں اس سے بھی روکا۔ لیکن اس بات کا بھی کوئی جواز نہیں کہ بالکل سختی سے اجتناب کا راستہ اختیار کیا جائے اس لیے کہ بعض دفعہ شیخ سعدی کے قول کے مطابق ''بچے کے لیے سختی ایسے ہی ضروری ہوتی ہے جیسے کسی پودے کے لیے پانی دینا۔''

تربیت کے دو پہلو ہوتے ہیں، مثبت اور منفی۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ بچوں کو دینی شعار کے احترام کی تلقین کی جائے اور فرائضِ دینیہ کی ادائیگی کی عادت ڈالی جائے۔ اور منفی پہلو یہ ہے کہ انھیں ہر وہ کام کرنے سے روکا جائے جس سے ان کی زندگی پر برے اثرات پڑ سکتے ہوں۔ اس لیے قرآنِ کریم نے صحبتِ بد اور برے لوگوں کی ہم نشینی سے سختی سے منع فرمایا اور نیک لوگوں کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کا حکم دیا اور ان کی صحبت سے مستفیض ہونے کی تلقین کی۔

Marfat.com

آنحضرت ﷺ نے اچھی صحبت اور اچھی سوسائٹی کو عطر کی دکان سے تشبیہ دی ہے۔ فرمایا تم عطر کی دکان میں جاؤ عطر نہ بھی خریدو جب بھی باہر نکلو گے تو تمھارے کپڑوں سے عطر کی خوشبو ضرور آئے گی۔ اور آپ نے بری صحبت کو کوئلے کی دکان سے تشبیہ دی اور فرمایا بری صحبت ایک کوئلے کی دکان ہے۔ تم کوئلہ لو یا نہ لو لیکن تمھارے کپڑوں پر کہیں نہ کہیں کالک ضرور لگ جائے گی۔

ایک اور موقع پر فرمایا:

وَحْدَةُ الْمَرْءِ خَيْرٌ مِّنْ جَلِيْسِ السُّوْءِ۔

''آدمی کا تنہا رہنا بری صحبت سے بہتر ہے۔''

انہی باتوں پر قیاس کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام مخربِ اخلاق لٹریچر اور تمام عادات کو بگاڑنے والے پروگرام، ان سے اولاد کو بچانا یہ بھی ماں باپ کی ذمہ دری ہے۔ ماں باپ کو دیکھنا چاہیے کہ ہمارے بچے کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں؟ کس قسم کے دوستوں میں بیٹھتے اٹھتے ہیں؟ کس قسم کی صحبتوں میں بیٹھتے ہیں؟ ان حوالوں سے انھیں ایسے ہی فکر مند ہونا چاہیے جس طرح والدین اس وقت فکر مند ہوتے ہیں جن ان کو پتہ چلے کہ ہمارا بچہ کسی نشہ آور چیز کا شکار ہو گیا ہے یا کہیں ڈاکوؤں میں شامل ہو کر ڈاکے ڈالنے کی تربیت لے رہا ہے یا انھیں پولیس سے اطلاع ملے کہ تمھارا بچہ ملک و ملت کے خلاف کسی سازشی گروہ میں بیٹھتا اٹھتا ہے۔ اس اطلاع پر والدین کی فکر مندی اور پریشانی کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں ہے تو بالکل ایسے ہی والدین کو اس وقت بھی پریشان ہونا چاہیے جب انھیں یہ معلوم ہو کہ ہمارا بچہ ایسی جگہ بیٹھتا اٹھتا ہے جہاں دنیا کی رسوائی بھی اس کا مقدر ہو گی اور آخرت بھی تباہ ہو جائے گی۔

بات اصل میں یہ ہے کہ ہم دنیوی نقصانات کی حقیقت کو تو خوب سمجھتے ہیں، لیکن اخروی نقصانات کی ہمیں نہ شناخت ہے اور نہ اندازہ۔ آنحضرت ﷺ نے یہی بات ایک اور حوالے سے بڑے محسوس کرنے والے انداز میں فرمائی تھی۔ فرمایا ''مومن وہ ہے کہ جو چھوٹے چھوٹے گناہ کو بھی یوں محسوس کرتا ہے جیسے ایک پہاڑ اس کے سر پر آ گرا ہو۔ لیکن منافق وہ ہے جو بڑے سے بڑے گناہ کو سمجھتا ہے کہ ایک مکھی تھی جو چہرے پر بیٹھی اور اڑ گئی۔'' ظاہر ہے کہ اگر احساس کا حال یہ ہو گا تو بچہ گناہ پر گناہ بھی کرتا جائے، نماز چھوڑے، بے حیائی کے کاموں میں پڑ جائے، تو بھی ماں باپ اس کی فکر نہیں کرتے، بلکہ اسے جوانی کا کھیل سمجھ کر یہ کہہ کر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جوانی تو دیوانی ہوتی ہے۔ اس میں ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ حالانکہ قرآنِ

Marfat.com

کریم نے گناہوں میں آلودہ ہونے کو آگ میں گر جانے سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں یہ آگ نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر اگر سمجھنے کا ارادہ ہو تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کسی کمرے میں گیس بھر جائے تو دیکھنے والے کو بالکل اندازہ نہیں ہو پاتا کہ اندر آگ بھری ہوئی ہے، لیکن اگر اسے دیا سلائی دکھا دی جائے تو پھر اس میں جو کچھ بھی ہو گا وہ سب بھک سے اڑ جائے گا۔ تب اندازہ ہو گا کہ یہ کمرہ تو آگ سے بھرا ہوا تھا۔ بالکل یہی حال انسانی زندگی کا بھی ہے کہ گناہوں کی آگ ہمارے پورے معاشرے میں جل رہی ہے لیکن ہمیں اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔

تربیت کے بعد وہ ذمہ داری جو اولاد کی طرف سے والدین پر عائد ہوتی ہے وہ حسن سلوک ہے۔ یعنی والدین کا رویہ اولاد کے ساتھ نہایت منصفانہ لیکن محبت اور شفقت سے گراں بار ہو۔ جس طرح اولاد کو والدین سے محبت کرنے کا پابند ٹھہرایا گیا، اسی طرح والدین کو بھی اس کا پابند کیا گیا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو جہاں حسن تربیت سے نوازیں وہیں ہر ممکن طریقے سے ان کا اکرام کریں اور ان سے شفقت بھی پیش نظر رکھیں۔ آنحضرت ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا اَوْلَادَکُمْ۔

''کہ اپنی اولاد کے ساتھ اکرام (عزت اور شفقت) سے پیش آؤ اور ان کو حسن ادب سے آراستہ کرو۔''

یوں تو اس حسن سلوک کے حقدار بچے اور بچیاں دونوں ہیں، لیکن عرب معاشرے میں چونکہ بچیوں کو ہمیشہ دوسرے درجے کی اولاد سمجھا جاتا تھا، اس لیے اسلام نے ان کے ساتھ احسان و مروت کرنے کی زیادہ تاکید کی ہے اور اس کے لیے بڑے اجر و ثواب کی امید دلائی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

مَنْ وُلِدَتْ لَهٗ اِبْنَةٌ فَلَمْ يُوْذِهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُوْثِرْ وَلَدَهٗ عَلَيْهَا يَعْنِيْ الذُّكُوْرَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ بِهَا الْجَنَّةَ۔

''کہ جس کے یہاں بچی پیدا ہوئی، پھر اس نے نہ تو بچی کو تکلیف پہنچائی اور نہ اس کی توہین کی اور نہ اپنے بیٹے کو اس پر ترجیح دی یعنی نرینہ اولاد کو اس پر ترجیح نہ دی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا۔''

ایک دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا:

Marfat.com

من ابتلی من هذه البنات بشیء فاحسن الیهن کن له سترا من النار۔

''کہ جس شخص پر اللہ نے دو بچیوں کی کفالت یعنی دو بچیوں کی پرورش کا بار ڈالا تو اس نے باحسن طریق اسے ادا کیا تو یہ بچیاں اس کے لیے جہنم سے رکاوٹ بنیں گی۔''

ماں باپ کو اللہ تعالیٰ نے اس بات کا ذمہ دار ٹھہرایا اور پابند کیا ہے کہ وہ بچیوں کے ساتھ انصاف اور برابری کریں۔ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی کو زیادہ نوازا جائے اور کسی کو محروم رکھا جائے یا کم دیا جائے۔ کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفت عدل کے خلاف ہے اور تربیت کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ بات نہایت اہمیت رکھتی ہے کہ بچوں میں ہر طرح مساوات کا لحاظ رکھنا چاہیے ورنہ ان میں ماں باپ کے خلاف بھی جذبات پیدا ہو سکتے ہیں اور باہمی دشمنی اور حسد بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ جو دین اور تقویٰ کے لیے تباہ کن اور ہزار فتنوں کی جڑ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت نعمان بن بشیر سے روایت ہے کہ میرے والد مجھے لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میں نے اس بیٹے کو ایک غلام ہبہ کر دیا ہے (بعض روایت میں بجائے غلام کے باغ ہبہ کرنے کا ذکر ہے) آنحضرت ﷺ نے ان سے پوچھا کہ تم نے اپنے سب بیٹوں کو اتنا ہی دیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا کہ نہیں اوروں کو تو نہیں دیا۔ صرف اسی لڑکے کو دیا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمھاری سب اولاد یکساں طور پر تمھاری فرمانبردار اور خدمت گزار بنے؟ انھوں نے عرض کیا کہ ''ہاں'' حضور یہ تو ضرور چاہتا ہوں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا پھر ایسا نہ کرو کہ ایک کو دو اور دوسرے کو محروم رکھو اور ایک اور روایت میں ایسے ہی ایک موقع پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں ایسے بے انصافی کے معاملے میں گواہ نہیں بن سکتا۔ یعنی اولاد میں سے کسی کے ساتھ داد و دہش میں ترجیحی سلوک کیا جائے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو جور یعنی بے انصافی قرار دیا۔ ہاں کوئی ایسی دینی ضرورت پیش آجائے تو پھر اس ترجیحی سلوک کی گنجائش ہے۔ مثلاً اولاد میں سے کسی کی صحت مستقل طور پر خراب ہے اور دوسرے بھائیوں کی طرح معاشی جدوجہد نہیں کر سکتا یا کسی بچے نے مستقل طور پر اپنے آپ کو دین وملت کی خدمت میں لگا دیا ہے تو اس کے ساتھ مناسب حد تک خصوصی سلوک نہ صرف جائز بلکہ باعث اجر ہوگا۔ ورنہ اسلام کا مجموعی مزاج یہ ہے کہ بچوں میں والدین کو

Marfat.com

برابری کا سلوک اور منصفانہ رویہ رکھنا چاہیے۔ جیسے پہلے گزر چکا کہ بچیوں کے ساتھ عام طور پر کمتر درجے کا سلوک ہوتا تھا۔ ان کو نرینہ اولاد کے برابر نہیں سمجھا جاتا تھا اس کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے بطورِ خاص ارشاد فرمایا:

سَوُّوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ فِي الْعَطِيَةِ فَلَوْ كُنْتُ مُفَضِّلاً اَحْدًا فَضَّلْتُ النِّسَآءَ۔

''دادودہش میں اپنی سب اولاد کے درمیان مساوات اور برابری کا معاملہ کرو، اگر میں اس معاملے میں کسی کو ترجیح دیتا یعنی اگر مساوات اور برابری ضروری نہ ہوتی تو میں حکم دیتا کہ لڑکیوں کو لڑکوں سے زیادہ دیا جائے۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جب تک بچیاں اپنے والدین کے گھر میں رہیں آنحضرت ﷺ کی خواہش یہ ہے کہ ان کے ساتھ بچوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر سلوک کیا جانا چاہیے۔

اولاد کے حقوق میں سے اور والدین کی ذمہ داریوں میں سے ایک بات یہ ہے کہ جب بچہ یا بچی نکاح کے قابل ہو جائے تو احسن طریق سے ان کے نکاح کا اہتمام کریں اور اس بات کی تاکید فرمائی گئی ہے کہ اس میں ہرگز غفلت نہ برتی جائے اور اگر والدین کی غفلت کی وجہ سے بچہ یا بچی خدانخواستہ کسی گناہ میں مبتلا ہو گئے تو اس کی ذمہ داری اور اس کا گناہ باپ کے ذمہ ہوگا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتنی بڑی ذمہ داری ہے جو اللہ تعالیٰ نے والدین پر ڈالی ہے:

عن ابی سعید و ابن عباس قالا قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه واله وسلم من ولد له ولد فلیحسن اسمه وادبه فلما بلغ فلیتزوجه فان بلغ ولم یزوجه فاصاب اثما فانما اثمه علی ابیه۔

''حضرت ابوسعید خدری اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کو اللہ تعالیٰ اولاد دے تو چاہیے کہ اس کا نام اچھا رکھے، اور اس کو اچھی تربیت دے اور سلیقہ سکھائے، پھر جب وہ سن بلوغ کو پہنچے تو اس کے نکاح کا بندوبست کرے، (اگر اس

Marfat.com

نے اس میں کوتاہی کی) اور شادی کی عمر کو پہنچ جانے پر بھی (اپنی غفلت اور بے پرواہی سے) اس کی شادی کا بندوبست نہ کیا اور وہ اس کی وجہ سے حرام میں مبتلا ہو گیا تو اس کا باپ اس گناہ کا ذمہ دار ہوگا۔''

اپنے صحیح وقت پر بچوں کے نکاح کی ذمہ داری ادا کرنا فی الحقیقت بچوں کی تربیت کا ایک اہم حصہ ہے۔ اس ذمہ داری کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جو قباحتیں پیدا ہوتی ہیں اور جس طرح نوجوان بچوں اور بچیوں کے ذہن میں جنسی بے راہ روی کے احساسات جنم لیتے ہیں، اس کے نتیجے میں باقی ساری تربیتی کوششیں ناتمام رہ جاتی ہیں۔ لیکن انتہائی دکھ کی بات یہ ہی کہ مسلمان معاشرہ اولاً تو اس ذمہ داری کے احساس سے بالکل تہی دامن نظر آتا ہے۔ ثانیاً اگر کہیں اس کا احساس موجود بھی ہے تو ہم نے جس طرح رسم و رواج کی بھاری بیڑیاں قدموں میں ڈال رکھی ہیں اور شادی کے نام پر غیر ضروری اخراجات کا بار اپنے سر پر لاد رکھا ہے، اس کی وجہ سے چاہنے کے باوجود بھی بروقت یہ ذمہ داری ادا نہیں ہو پاتی۔ اگر ہم اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ کی سنت اور قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے تعامل کو سامنے رکھتے تو بچوں کی شادیاں کرنا ہمارے لیے کوئی تکلیف دہ مسئلہ نہ ہوتا۔

اس کے ساتھ ساتھ ایک بات جس کو محسوس کرنا بہت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے بچوں کی شادی بیاہ کی ذمہ داری میں بلاوجہ بعض چیزیں داخل کر رکھی ہیں۔ ہم اپنے بچوں بچیوں کی شادیاں اس وقت تک نہیں کرتے جب تک وہ اعلیٰ تعلیم سے فارغ نہ ہو جائیں۔ پھر وہ کسی اچھے کاروبار میں کامیابی سے اپنے پاؤں نہ جمالیں یا کسی اچھے عہدہ و منصب پر فائز نہ ہو جائیں۔ لیکن جن چیزوں کا شادی کے بعد بچوں کی زندگی سے براہِ راست تعلق ہے اس کے حوالے سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوتی اور نہ ہم اس کی تیاری بہم پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یعنی ہم بچوں کو اس بات کی بالکل تربیت نہیں دیتے اور نہ ہی ان ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو میاں بیوی ہونے کی حیثیت سے پہلے دن ہی ان پر عائد ہو جائیں گی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر شادیاں ناکام ہو رہی ہیں اور گھر اجڑتے رہتے ہیں۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ اگر کہیں میاں بیوی میں تلخی ہو جاتی ہے اور معاملہ علیحدگی تک پہنچ جاتا ہے تو ہمارے نوجوان بچے جو ماشاء اللہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوتے ہیں ان کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ غلط طریقے سے طلاق دے کر گناہ گار بھی ہوتے ہیں اور پھر

Marfat.com

رجوع کرنے یا دوبارہ نکاح کرنے کی تمام صورتیں بھی ختم ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس لیے والدین کو جہاں اپنی دوسری ذمہ داریوں کی فکر ہے وہاں تعلیم و تربیت کے حوالے سے بچپن سے لے کر شادی بیاہ تک ہر مرحلے کے حوالے سے اولاد کو جس طرح کی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہے جس سے ایک اسلامی زندگی وجود میں آ سکتی ہے اس کا پوری طرح ادراک ہونا چاہیے اور پھر پوری طرح ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اسی صورت میں ہم معاشرے کو ایک بہتر نسل مہیا کر سکتے ہیں اور اللہ کے سامنے جوابدہی سے بچ سکتے ہیں۔

Marfat.com

39- اسلامی معاشرت کے چند آداب

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ علٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتَ النَّبِیِّ اِلَّآ اَنْ یُّؤْذَنَ لَکُمْ اِلٰی طَعَامٍ غَیْرَ نٰظِرِیْنَ اِنٰہُ وَلٰکِنْ اِذَا دُعِیْتُمْ فَادْخُلُوْا فَاِذَا طَعِمْتُمْ فَانْتَشِرُوْا وَلَا مُسْتَاْنِسِیْنَ لِحَدِیْثٍ اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ یُؤْذِی النَّبِیَّ فَیَسْتَحْیٖ مِنْکُمْ وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ذٰلِکُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِکُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ وَمَا کَانَ لَکُمْ اَنْ تُؤْذُوْا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَلَآ اَنْ تَنْکِحُوْٓا اَزْوَاجَہٗ مِنْ بَعْدِہٖٓ اَبَدًا ط اِنَّ ذٰلِکُمْ کَانَ عِنْدَ اللّٰہِ عَظِیْمًا﴾

(اے ایمان والو! نبی کے گھروں میں داخل نہ ہو، مگر یہ کہ تم کو کسی کھانے پر آنے کی اجازت دی جائے، نہ کہ انتظار کرتے ہوئے کھانے کی تیاری کی، لیکن جب تم کو بلایا جائے تو ضرور آؤ، پھر جب تم کھانا کھا چکو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے میں نہ لگے رہو، تمھاری یہ حرکتیں نبی کریم (ﷺ) کو تکلیف دیتی تھیں لیکن وہ تمھارا لحاظ کرتے تھے اور اللہ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا، اور جب تم کو نبی کی بیویوں سے کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگو، یہ تمھارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے زیادہ مناسب طریقہ ہے، تمھارے لیے ہرگز جائز نہیں کہ تم اللہ کے رسول کو تکلیف پہنچاؤ اور نہ یہ جائز ہے کہ تم اس کی بیویوں سے اس کے بعد نکاح کرو، یہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ ۵۳)

Marfat.com

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں کے ایک دوسرے کے گھروں میں آنے جانے اور اسلامی معاشرت سے متعلق چند آداب و احکام بیان کیے گئے ہیں۔ سببِ نزول کے اعتبار سے چونکہ اس کا تعلق آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات سے ہے اس لیے بیوت النبی کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن ان احکام میں عموم پایا جاتا ہے۔ کیونکہ شریعت کا یہ مسلمہ اصول ہے العبرة لعموم اللفظ لا لخصوص السبب ”یعنی اعتبار لفظ کے عموم کا ہوتا ہے سبب کے اختصاص کا نہیں۔“

آداب کی تعلیم میں چار احکام دیے گئے ہیں یا یوں کہہ لیجیے کہ چار ادب سکھائے گئے ہیں۔ پہلا ادب یہ ہے کہ جب تک تمھیں گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے یعنی تمھیں کھانے کی دعوت نہ دی جائے اس وقت تک نبی کریم ﷺ کے گھروں میں تمھیں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اس میں دو ادب سکھائے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ گھروں میں داخل ہونے کے لیے اجازت طلبی ضروری ہے اور اگر اجازت نہ دی جائے تو واپس پلٹ جاؤ۔ اور دوسری یہ بات کہ کسی دعوت میں بن بلائے مت جاؤ۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب انھیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں جگہ کھانے کی تقریب ہے تو وہ بن بلائے پہنچ جاتے ہیں۔ اس آیتِ کریمہ میں اس سے روکا گیا۔ اور بعد میں نبی کریم ﷺ نے مختلف مواقع پر اپنے عمل سے اس کی وضاحت فرمائی۔

تیسرا ادب یہ سکھایا گیا ہے کہ اگر کسی دعوت میں بلایا جائے تو اسے بہانہ بنا کر کھانے کی تیاری کے انتظار میں وہیں دھونی رما کر مت بیٹھ رہو۔ جس دین نے اپنے ماننے والوں کو قناعت اور کفایت کی تعلیم دی ہے اور فقیری اور ناداری کی حالت میں بھی خودداری کا ادب سکھایا ہے ان کے لیے یہ ہرگز مناسب نہیں کہ وہ کسی طماعی اور سفلہ پن کا اظہار کریں۔ اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں لوگوں کا رہن سہن نہایت سادہ تھا، زنانہ مکانوں کے ساتھ مردانہ بیٹھکیں نہیں تھیں۔ ایسے میں قبل از وقت لوگوں کا جمع ہو جانا اہلِ خانہ کے لیے اذیت کا باعث ہوتا تھا۔ اس لیے اس بات سے روکا گیا کہ کھانے کے پکنے کے انتظار میں مت بیٹھو۔ آیت میں ناظرین، منتظرین کے معنی میں ہے اور اِنٰهُ میں اِنَا کھانا پکنے کو کہتے ہیں۔

اس کے بعد گھروں اور تقریبات میں آنے کے لیے صحیح طریقہ ارشاد فرمایا گیا۔ وہ یہ ہے کہ جب تمھیں بلایا جائے تو کھانے کے وقت پہنچو تاکہ میزبان کو کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

Marfat.com

اور جب کھانا کھا چکو تو وہاں سے منتشر ہو جاؤ، طویل باتیں چھیڑ کر وہاں نہ بیٹھے رہو۔ کیونکہ بعض دفعہ مہمانوں کا کھانے کے بعد دیر تک بیٹھے رہنا میزبان کے لیے باعث کلفت ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ میزبان کے لیے اس کے بعد کچھ اور ضروری مصروفیات ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جگہ کی تنگی کے باعث مہمانوں کو باری باری کھلایا جا رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ پہلے مہمانوں کے جانے کے بعد دوسرے مہمانوں کو کھانے پر بلایا جا سکے گا۔ اور اگر پہلے مہمانوں میں سے کچھ لوگ باتوں میں لگے بیٹھے رہیں تو میزبان کو بھی تکلیف ہوگی اور مہمان بھی اذیت محسوس کریں گے۔ ہاں اگر یہ اندازہ ہو سکے کہ میزبان کی خواہش ہے کہ مہمان دیر تک تشریف رکھیں تاکہ اس کی تقریب کے لیے رونق کا سامان بنیں اور جگہ کی کشادگی کے باعث کسی تنگی کا بھی اندیشہ نہ ہو۔ تو پھر دیر تک بیٹھنے اور باتوں میں لگے رہنے میں کوئی حرج نہیں۔

اس کے بعد نبی کریم ﷺ کی کریم النفسی اور مروت کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو بہت بلند و بالا خصلتوں اور عادتوں کا پیکر بنایا ہے۔ اس لیے تمہارا وقت سے پہلے آ بیٹھنا اور پھر دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے رہنا اور اجازت لیے بغیر اندر چلے آنا اس سے انھیں جگہ کی تنگی اور مردانہ اور زنانہ حصہ ایک ہونے کی وجہ سے جو اذیت پہنچتی تھی وہ اپنی کریم النفسی کے باعث اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے۔ تکلیف برداشت کر لیتے تھے لیکن مہمانوں سے کچھ کہنا لحاظ اور مروت کے خلاف سمجھتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ حق کے اظہار میں کسی کا لحاظ نہیں فرماتا۔ یہ باتیں اسلامی معاشرت کے نقطہ نگاہ سے بہت نقصان دہ ہیں اور ان ہی سے بہت سے مفاسد بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس وجہ سے وہ تمھیں ان باتوں سے آگاہ زمار ہا ہے تاکہ اسلامی معاشرہ انسانی خصائلِ حمیدہ کا صحیح ترجمان ثابت ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا معاشرہ جو ہمہ جہت تربیت کے بعد تمام نوعِ انسانی کے لیے ایک نمونے کا معاشرہ بنا۔ یہ صرف آنحضرت ﷺ کی تربیت کا اعجاز اور اسلامی اخلاق کا اثر تھا ورنہ اہلِ عرب اپنے عادات و اطوار میں اُس وقت کی دنیا میں سب سے زیادہ اجڈ اور غیر شائستہ تھے۔ وہ معاشرے کے بنیادی آداب سے بھی تہی دامن تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کی تربیت میں جس طرح نہایت حکیمانہ طریقہ اختیار کیا اسی طرح اپنے مزاج کے خلاف ان کی بہت سی ناشائستہ باتوں کو بھی برداشت کیا۔ اور جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں آپ اپنی کریم النفسی کے باعث لوگوں کی غلط باتوں پر ٹوکنا اور خاص طور پر گھر آئے ہوئے مہمانوں کو کسی

Marfat.com

بات پر تنبیہ کرنا خلافِ مروت سمجھتے تھے اس لیے آپ اذیت برداشت کرتے تھے لیکن کہنا پسند نہ تھا۔ آپ کے خادمِ خاص حضرت انس ابنِ مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے ولیمے میں سب لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے مگر دو تین حضرات بیٹھ کر باتیں کرنے میں لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور ازواجِ مطہرات کے یہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے کے بعد جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے مکان میں تشریف لائے۔ اس کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں اور اصلاحِ معاشرت کے ساتھ ساتھ پردے کے بھی چند احکام دیئے گئے۔ اور سورۃ النور میں ان احکام کی تکمیل کی گئی۔

پردے کے بارے میں چند احکام

سب سے پہلے جیسا کہ آیت کے آغاز میں گزرا گھروں میں بلا اجازت داخلے پر پابندی لگائی گئی۔ لیکن سببِ نزول چونکہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہوا اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں کا ذکر فرمایا گیا۔ اور مزید یہ بات کہ آپ کا گھر چونکہ تمام امت کے لیے ایک نمونہ تھا اس لیے ہر مسلمان یہ بات سمجھتا تھا کہ جو پابندی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے پر لگے گی وہی سارے مسلمانوں کی روش بن جائے گی۔ چنانچہ اس حکم کے بعد جیسے ہی ازواجِ مطہرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکائے گئے تو اس کی تقلید میں تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔

پردے کے سلسلے میں دوسرا حکم یہ دیا گیا کہ جب غیر مردوں کو عورتوں سے کوئی چیز مانگنے کی ضرورت پڑے تو وہ دندناتے ہوئے ان کے سامنے نہ چلے جائیں بلکہ پردے کی اوٹ سے مانگیں۔ بظاہر یہ بات بہت پابندی کی معلوم ہوتی ہے کہ معمولی معمولی بات کے لیے بھی پردے کا اہتمام کیا جائے۔ لیکن یہ کوئی تکلف نہیں بلکہ دل کو آفات سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک نہایت ضروری تدبیر ہے۔ آج کے لوگ انسانی احساسات کے حوالے سے کیسے ہی مفروضوں پر بات کریں لیکن جس نے دلوں کو پیدا کیا ہے وہ ان کی حقیقت کو سب سے زیادہ جانتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک بات تو یہ ارشاد فرمائی الا ان

Marfat.com

فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسدكله واذا فسدت الجسد كله الا وهی القلب ''خبردار انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے اگر وہ تندرست ہے تو سارا جسم تندرست ہے، اور جب اس میں فساد پیدا ہو جاتا ہے تو سارا جسم فاسد ہو جاتا ہے، خبردار وہ دل ہے۔'' یہی احساسات کا مرکز اور یہی انفعالات کا مورد ہے۔ یہیں سے جذبات ابھرتے اور یہیں جذبات بسیرا کرتے ہیں۔ اس لیے اسلام نے دل کی صحت پر بہت زور دیا ہے۔ اور اسی پر تمام اخلاقی صحت کو منحصر ٹھہرایا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ ہمارے آج کے تہذیب خوردہ لوگ اپنے کپڑوں کی صفائی کا تو بڑا اہتمام رکھتے ہیں۔ کہیں ایک شکن یا دھبہ بھی پڑ جائے تو برداشت نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے دل بداخلاقی اور سفلی جذبات کی گندگی میں اٹے رہیں تو انھیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ لیکن اسلام چونکہ کردار کی تعمیر اور اخلاق کی تطہیر کے لیے دل کی اصلاح کو بنیاد بناتا ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ کن کن راستوں سے دل میں برائی داخل ہوتی ہے اور وہ کون سی برائیاں ہیں جن کا اثر دل قبول کرتا ہے۔ اس لیے اس نے ضروری سمجھا کہ مرد اور عورت کے درمیان پردہ کرایا جائے۔ بے حجاب عورت اور بے باک نگاہیں دل کی بربادی کا سب سے بڑا سبب ہیں۔ مرد وزن کا اختلاط قلبی زندگی کی تمام دیواروں کو گرا دیتا ہے۔ دل انسانی جسم میں جس طرح جسمانی حیات کے لیے مرکز کی حیثیت رکھتا ہے، اسی طرح اخلاقی طہارت کے لیے بھی سب سے زیادہ قدر و قیمت رکھنے والا اور سب سے زیادہ حساس ہے۔ اس لیے اس کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے مردوں کے لیے گھروں میں آنے پر پابندی لگائی اور پھر مرد و عورت کے درمیان ایک اوٹ کھڑی کر دی کہ اگر ضروری بات بھی کہنے کا موقع آئے تو اوٹ کے پیچھے کھڑے ہو کر کی جائے۔ اور کوئی چیز مانگنی ہو تو حجاب کے پیچھے سے مانگی جائے۔

پردے کے سلسلہ میں تیسرا حکم یہ دیا گیا ہے کہ کسی مسلمان کے لیے یہ بات زیبا نہیں کہ جن باتوں سے روکا گیا ہے ان میں سے کسی کے ارتکاب سے آنحضرت ﷺ کو اذیت پہنچائے اور نہ آپ ﷺ کے بارے میں اور آپ کی ازواجِ مطہرات کے بارے میں کوئی ایسی بات دل میں لائے اور یا کوئی ایسی بات دلچسپی سے سنے جس سے آنحضرت ﷺ کی عزت و حرمت میں فرق آتا ہو۔ اور جیسے منافقین اور دشمنانِ دین آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کا اخلاقی تفوق ختم کرنے کے لیے خود گھڑتے اور اِدھر اُدھر پھیلاتے تھے۔ اس سے منافقین کو تنبیہ

Marfat.com

فرمایا گیا اور مسلمانوں کو بھی اور زیادہ محتاط رہنے کی ترغیب دی گئی۔

اس عبارت میں نہایت اہم نکتہ قابلِ توجہ ہے وہ یہ کہ اس آیتِ کریمہ میں اس سے پہلے دو دفعہ آنحضرت ﷺ کے لیے نبی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لیکن جب ایذائے رسول سے رکنے کا حکم دیا تو رسول کا لفظ استعمال فرمایا۔ اس سے شاید یہ تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ رسول اپنی قوم کے لیے خدا کی عدالت ہوتا ہے۔ اس کی تشریف آوری اتمامِ حجت اور نیکوں اور بدوں میں فیصلہ کر دینے کے لیے ہوتی ہے۔ اس لیے منافقین کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے رسول کو کسی طرح کی ایذا پہنچانا بھی کوئی معمولی بات نہیں۔ اس سے ان کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ ان کا حدود سے تجاوز ان کے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔

چوتھا حکم یہ دیا گیا کہ ازواجِ مطہرات کا آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد کسی سے نکاح جائز نہیں۔ کیونکہ اس سے پہلے یہ بات واضح کی جا چکی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ازواج کی حیثیت امت کی ماؤں کی ہے۔ اور ان کے ساتھ تعلق کی یہی نوعیت فطری بھی ہے اور عقلی بھی۔ فطری اس وجہ سے کہ حضور ﷺ کی ازواج کے لیے ہر امتی کے دل کے اندر احترام و عقیدت کا جذبہ اپنی حقیقی ماں کے مقابلے میں بدرجہا زیادہ ہوتا ہے۔ کوئی گیا گزرا شخص بھی اپنی ماں کے ساتھ نکاح کا تصور نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ ازواجِ رسول ﷺ کے ساتھ کوئی سوچنے کی زحمت بھی کرے۔

ازواجِ مطہرات کے ساتھ تعلق کی دوسری نوعیت عقلی ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ امت کی ماں ہونے کے ساتھ ساتھ امت کے سب ذکور و اناث کی معلمات بھی ہیں۔ اور اس منصب پر انھیں خود اللہ تعالیٰ نے مامور فرمایا ہے۔ اس منصب کا عقلی تقاضا یہ ہے کہ انھیں ماؤں ہی کے درجہ میں رکھا جائے۔ اور اسی درجے میں وہ اپنے فریضۂ منصبی کو صحیح طور پر ادا کر سکتی ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ جن باتوں سے ان آیات میں روکا گیا ہے ان میں سے ہر بات آنحضرت ﷺ کے حوالے سے نہایت اہمیت کی حامل ہے اور ان میں سے کسی ایک بات کا ارتکاب بھی نہایت خطرناک نتائج کا سبب ہو سکتا ہے۔

Marfat.com

40- پردے کے احکام میں ترتیب و تکمیل

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

گزشتہ مضمون میں وہ ہدایات ہیں جو سورۃ الاحزاب میں دی گئی ہیں لیکن ان کی تکمیل سورۃ النور میں کی گئی ہے۔

چنانچہ سب سے پہلے پردے کا حکم جاری فرمایا، ایک آزاد منش اور ایک بے قید معاشرے میں چونکہ پردے کا چلن عام کرنا آسان نہیں تھا، اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایمان اللہ تعالیٰ کے کسی حکم سے کبھی اِباء نہیں کرتا تھا لیکن اسلامی معاشرہ چونکہ تیزی سے دعوت کے مراحل طے کر رہا تھا اور جہاد کی قوت سے راستے کی رکاوٹیں اٹھتی جا رہی تھیں اور تیزی سے لوگ اسلام کے دائرے میں داخل ہو رہے تھے، اس لیے سب کے لیے ایک عام حکم نازل کر دینا اور اس کی پابندی کرانا آسان نہ تھا۔ چنانچہ اس کے لیے نمونے کے طور پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خانہ کو سب سے پہلے اس کا پابند ٹھہرایا اور مسلمان عورتوں کو ان کی پیروی کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلا حکم انھیں کو خطاب کر کے دیا گیا، لیکن اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ یہ حکم ان کے لیے خاص نہیں بلکہ اس میں تمام مسلمان عورتیں شامل ہیں۔ وہ احکام جو اہلِ بیت یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ خانہ کے لیے دیے گئے وہ سورۃ الاحزاب کی آیات ۳۲، ۳۳، ۵۳ اور ۵۵ میں بیان ہوئے ہیں۔

۲۔ دوسرے وہ احکام ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت کے ساتھ دوسری عام خواتین کو بھی دیے گئے اور ان میں یہ بتایا گیا کہ کسی مسلمان عورت کو جب گھر سے باہر قدم نکالنے کی ضرورت پیش آ جائے تو اس حالت میں اس کو کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے، یہ احکام سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ میں بیان ہوئے ہیں۔

۳۔ تیسرے وہ احکام ہیں جو عام مردوں اور عورتوں کو مخاطب کر کے گھروں کے اندر آنے جانے سے متعلق دیے گئے اور جن میں تفصیل کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان

Marfat.com

جب اپنے کسی بھائی کے گھر میں داخل ہو تو اس کو کن آداب وقواعد کی پابندی کرنی چاہیے اور گھر کی عورتوں پر ایسی حالت میں کیا پابندیاں عائد ہوتی ہیں، یہ احکام سورۃ النور کی پیشِ نظر آیات میں دیے گئے ہیں۔

سابقہ آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ بدکاری کے محرکات میں سب سے خطرناک محرک نظر بازی اور بدنگاہی ہے۔ کسی بھی مسلمان عورت کے باہر نکلنے پر حجاب اور نقاب کا حکم دے کر اس جرم پر پہرا بٹھا دیا گیا، لیکن ابھی تک ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا معاشرتی ضرورت کے تحت چونکہ باقی تھا اور جسے ختم بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن کچھ لوگ اس سے فائدہ اٹھا کر اسلامی معاشرے کی پاکیزگی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے تھے اور خود اپنے آپ کو بھی تباہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس محرک کو ختم کرنے کے لیے پہلے تو گھروں میں داخلے کے لیے استیناس اور استیذان کا حکم دیا اور مزید پابندیاں گھروں میں داخل ہونے کے بعد حسبِ ضرورت لگائی گئیں جن میں مردوں کے لیے غضِ بصر اور حفظِ فروج کی پابندیاں عائد کی گئی کیونکہ گھر میں داخل ہونے کے بعد اگر ان دو باتوں میں بھی بے احتیاطی کی جائے تو گناہ کے پیدا ہو جانے کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں۔ نزولِ قرآن کے وقت معاشرے کی جو کیفیت تھی اس میں مردانہ نشست گاہیں گھروں میں الگ نہیں ہوتی تھیں اور دیہات میں تو آج تک ہمارے یہاں بھی ایسا نہیں ہو سکا کیونکہ کوئی معاشرہ بھی اس حال کو صدیوں میں نہیں پہنچتا کہ اس کے مالی حالات اس کے ایک ایک فرد کو پرتکلف اور حسبِ ضرورت رہائش گاہ بنانے کی اجازت دے سکیں، تو ایسی صورتحال میں ضروری ہے کہ جب دور پار کے قرابتدار گھروں میں آئیں تو آنے والوں کو بعض آداب کی پابندی کرنی چاہیے۔ جن میں پہلا ادب غضِ بصر ہے۔ یعنی وہ گھر میں داخل ہوتے ہوئے اِدھر اُدھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نہ دیکھیں تاکہ کسی نامحرم پر ان کی نگاہ نہ پڑے اور نہ وہ اس طرح آنکھیں بند کر کے اندر داخل ہوں کہ ٹھوکر کھا کے یا الجھ کر گر جائیں۔ اس لیے مِنْ اَبْصَارِهِمْ کا لفظ استعمال کیا گیا۔ اس میں مِنْ تبعیض کے لیے ہے۔ یعنی راستہ دیکھنے کے لیے آنکھ کھلی رہے، لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے سے آنکھ بند رہے۔

گھروں میں داخل ہونے کے بعد کی احتیاطیں

پیشِ نظر آیتِ کریمہ کو سابقہ تین آیات کے ساتھ جب ہم ملا کر پڑھتے ہیں تو صاف

Marfat.com

معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ کریمہ اور بعد کی آنے والی آیتِ کریمہ میں جو احکام دیے گئے ہیں وہ اس صورت میں ہیں جبکہ دور پار کے عزیزوں میں سے کوئی مہمان تشریف لائیں۔ ظاہر ہے کہ وہ محرم تو نہیں ہوں گے تو ان کے لیے گھر میں داخل ہونے کے بعد متذکرہ بالا ہدایات کی پابندی ضروری ہے۔ لیکن اس صورت میں بھی صاحبِ خانہ کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ رشتے داروں میں بھی ہر شخص اخلاق کے اعتبار سے بھروسے کا آدمی نہیں ہوتا۔ اس لیے پہلے انھیں اطمینان کر لینا چاہیے کہ ہم جس مہمان کو اندر لا رہے ہیں اس کے سیرت و کردار پر کہاں تک بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ یہ احکام اس صورت میں ہیں جب مردوں اور عورتوں کی نشست گاہیں الگ الگ نہ ہوں۔ لیکن اگر دور پار کے عزیزوں اور یا اجنبیوں کے لیے الگ نشست گاہوں کا انتظام ہے تو پھر اسلام میں مطلوب یہ ہے کہ مردوں کو گھر کی عورتوں سے الگ بٹھایا جائے۔

اس آیت میں چونکہ سب سے پہلے غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں جس طرح نگاہ ایک بہت بڑی نعمت ہے، اسی طرح ایک بہت بڑی آزمائش بھی ہے۔ مرد و عورت کے درمیان برائی پیدا کرنے کے لیے یہ اولین قاصد کا کام دیتی ہے۔ اسی کے بہک جانے اور بے باک ہو جانے سے فواحش کے دروازے کھل جاتے ہیں اور اگر اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف کا پہرہ بٹھا دیا جائے تو انسان شیطان کے بہت سے فتنوں سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جنسی بگاڑ میں اس کی تاثیر کو دیکھتے ہوئے قرآن و سنت میں اس کے بارے میں ضروری ہدایات دی گئی ہیں۔ اگرچہ موقعہ کلام کے تقاضے کے تحت بہت زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں لیکن اس کے اثرات کی وسعت کو دیکھتے ہوئے ہم چاہتے ہیں کہ چند ضروری ہدایات کو ذکر کر دیا جائے۔

۱۔ کسی بھی مومن کے لیے حلال نہیں کہ وہ اپنی بیوی یا اپنی محرم خواتین کے سوا کسی دوسری عورت کو نگاہ بھر کر دیکھے۔ ایک دفعہ اچانک نظر پڑ جائے تو وہ معاف ہے۔ لیکن یہ معاف نہیں کہ آدمی نے پہلی نظر میں جہاں کوئی کشش محسوس کی ہو، وہاں پھر نظر دوڑائے۔ نبی کریم ﷺ نے اس طرح کی دیدہ بازی کو آنکھ کی بدکاری سے تعبیر فرمایا۔ ایک موقع پر حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مطابق نبی کریم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا یا علی لا تتبع

Marfat.com

النظرة النظرة فان لك الاولى وليست لك الاخرة ''اے علی! ایک نظر کے بعد دوسری نظر نہ ڈالنا۔ پہلی نظر تو معاف ہے، مگر دوسری معاف نہیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ نگاہ ابلیس کے زہریلے تیروں میں سے ایک تیر ہے، جو شخص مجھ سے ڈر کر اس کو چھوڑ دے گا، میں اس کے بدلے اسے ایسا ایمان دوں گا جس کی حلاوت وہ اپنے دل میں پائے گا۔ (طبرانی)

کسی کو اس سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان عورتیں چہرے پر نقاب ڈالتی ہوتیں تو غضِ بصر کا حکم دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بات کو کج فہمی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیونکہ امت کا تعامل اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ عہدِ نبوی سے لے کر آج تک شریعت کی پابندی کرنے والی خواتینِ اسلام نے ہمیشہ چہرے پر نقاب ڈالا ہے۔ غضِ بصر کا حکم دینے کی وجہ تو یہ ہے کہ چہرے کا پردہ عام طور پر رائج ہونے کے باوجود ایسے مواقع پیش آسکتے ہیں جبکہ اچانک کسی عورت اور مرد کا آمنا سامنا ہو جائے اور ایک پردہ دار عورت کو بھی بسا اوقات ایسی ضرورت لاحق ہوسکتی ہے کہ وہ منہ سے نقاب ہٹالے۔ اور پھر یہ بھی امرِ واقعہ ہے کہ مسلمان ملکوں اور معاشروں میں ہمیشہ غیر مسلم عورتیں بھی رہی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ ظاہر ہے کہ وہ تو بے پردہ ہی رہتی ہیں، حجاب یا نقاب استعمال نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ اور بھی مصلحتیں ہیں جن کی وجہ سے غضِ بصر کا حکم دیا گیا ہے۔

غضِ بصر میں استثناء

۲۔ غضِ بصر کا حکم تو واضح ہے لیکن اس سے وہ صورتیں مستثنیٰ ہیں جن میں کسی عورت کو دیکھنے کی کوئی حقیقی ضرورت پیش آجائے۔ مثلاً کوئی کسی عورت سے نکاح کرنا چاہتا ہو، اس غرض کے لیے عورت کے علم میں لائے بغیر اسے دیکھ لینے کی اجازت ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو نکاح سے پہلے اس کی ہدایت فرمائی۔ اسی طرح تفتیشِ جرائم کے سلسلے میں اگر کسی مشتبہ عورت کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہو تو اس کی بھی اجازت ہے۔ عدالت میں گواہی کے موقع پر قاضی کسی گواہ عورت کو دیکھنا چاہے یا علاج کے لیے طبیب مریضہ کو دیکھنا ضروری سمجھے تو شریعت نے اس کی بھی اجازت دی ہے۔

Marfat.com

حفظِ فروج کا مفہوم

اس آیتِ کریمہ میں دوسرا حکم جو دیا گیا ہے وہ حفظِ فروج کا ہے جس کا لفظی معنی شرمگاہوں کی حفاظت ہے، لیکن مراد اس سے شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی ہے۔ بظاہر تو اس لفظ سے یہ تأثر ملتا ہے کہ شاید ناجائز شہوت رانی سے روکا گیا ہے، لیکن حقیقت میں اس کی مراد میں وسعت پائی جاتی ہے۔ ناجائز شہوت رانی تو آخری بات ہے، لیکن جو چیزیں اس کے مقدمات کا درجہ رکھتی ہیں، ان سے روکنا بھی ان میں شامل ہے۔ مثلاً کسی مرد کے لیے اپنے ستر کو دوسروں کے سامنے کھولنے کی اجازت نہیں۔ اور مرد کے لیے ستر کی حدود آنحضرت ﷺ نے ناف سے گھٹنے تک مقرر فرمائی ہیں۔ دارقطنی کی روایت میں آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا، عورة الرجل مابين سرته الى ركبته ''مرد کا ستر اس کی ناف سے گھٹنے تک ہے۔'' حضرت جرھد اسلمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس میں ایک دفعہ میری ران کھلی ہوئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا اماأعلمت ان الفخذعورة ''کیا تمھیں معلوم نہیں ہے کہ ران چھپانے کی چیز ہے۔'' آنحضرت ﷺ نے ایک صحابی سے فرمایا احفظ عورتك الامن زوجتك اوماملكت يمينك ''اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرو، اپنی بیوی یا لونڈی کے سوا۔'' اس صحابی نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! اگر انسان تنہا ہو تو پھر اس کے متعلق کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔ (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

حفظِ فروج میں صرف یہی احتیاط کافی نہیں کہ آدمی اپنا ستر کھلنے نہ دے اور دوسرے کے ستر کو نہ دیکھے، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ایسا لباس نہ پہنے جس سے اعضائے مخصوصہ نمایاں ہوں۔ اور وہ لباس شرم وحیاء پیدا کرنے کی بجائے جنسی جذبات کو انگیخت کرنے والا ہو۔ آج کل جس طرح کا لباس عام طور پر نوجوانوں نے پہننا شروع کردیا ہے جس میں ستر پوشی کا جذبہ تو دور دور تک محسوس نہیں ہوتا، صرف زینت اور اظہارِ زینت کو مقصد بنالیا گیا ہے اور زینت بھی ایسی کہ جسے کوئی شرم وحیاء والی نگاہ دیکھنا پسند نہ کرے، لیکن مسلسل استعمال سے اب نگاہیں اس طرح عادی ہوگئی ہیں کہ وہ گھرانے جو شرم وحیاء کے پیکر سمجھے جاتے تھے اب ان گھروں میں بھی نوجوان بے ہودہ سے بے ہودہ لباس پہنتے ہیں اور کوئی برا محسوس نہیں کرتا۔

Marfat.com

ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ "یہ طریقہ ان کے لیے پاکیزہ ہے، بیشک اللہ باخبر ہے ان چیزوں سے جو وہ کرتے ہیں۔" گھروں کے اندر جن احتیاطوں کا حکم دیا گیا ہے اگر ان کی پابندی کی جائے تو گھروں کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے اور ہر طرح کے اخلاقی فساد سے محفوظ رکھنے کا سب سے اہم ذریعہ ہیں۔ البتہ اس میں یہ لازمی شرط ہے کہ میزبان اور مہمان ان احتیاطوں کی پابندی کرتے ہوئے ہمیشہ اس بات کو مستحضر رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری ہر حرکت کو دیکھ رہا ہے اور ہماری نیتوں تک سے آگاہ ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کے اعمال کی درستی کی ضمانت بن سکتا ہے اور اگر یہ تصور دل کا عقیدہ نہ بنے تو پھر نگاہ کی پاکیزگی اور دلوں کی طہارت کی کوئی چیز ضمانت نہیں بن سکتی۔

﴿وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِيْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِيْنَ غَيْرِ اُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِيْنَ لَمْ يَظْهَرُوْا عَلٰى عَوْرٰتِ النِّسَآءِ وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

"آپ ایماندار عورتوں کو حکم دیجیے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی عصمتوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کی چیزوں کا اظہار نہ کریں، مگر ان میں سے جو خود بخود ظاہر ہو جائیں اور اپنے گریبانوں پر اپنی اوڑھنیوں کی بُکل مار لیا کریں اور اپنی زینت کا اظہار نہ ہونے دیں مگر اپنے شوہروں کے لیے یا اپنے باپوں کے لیے یا اپنے شوہروں کے باپوں کے لیے یا اپنے بیٹوں کے لیے یا اپنے خاوندوں کے بیٹوں کے لیے یا اپنے بھائیوں کے لیے یا اپنے بھتیجوں کے لیے یا اپنی بہنوں کے بیٹوں کے لیے یا اپنے تعلق کی عورتوں کے لیے یا اپنے مملوکوں کے سامنے یا

Marfat.com

ایسے زیر کفالت مردوں کے سامنے جو عورت کے خواہشمند نہ ہوں یا ایسے بچوں کے سامنے جو عورتوں کی شرم والی چیزوں سے آگاہ نہیں، اور عورتیں اپنے پاؤں زمین پر مار کر نہ چلیں تا کہ معلوم ہو جائے وہ بناؤ سنگھار جو وہ چھپائے ہوئے ہیں اور اے ایمان والو! سب مل کر اللہ کی طرف رجوع کرو تا کہ تم فلاح پا جاؤ۔''

گھر کے اندر عورتوں کو ہدایات

اب اس آیتِ کریمہ میں گھروں میں نامحرموں کے آنے کی صورت میں ہدایات دی جا رہی ہیں۔ دو ہدایات تو وہی ہیں جو سابقہ آیتِ کریمہ میں مردوں کو دی گئی ہیں، یعنی غضِ بصر اور حفظِ فروج۔ البتہ حفظِ فروج کے حوالے سے کچھ مزید ہدایات دی گئی ہیں جو عورتوں کے لیے مخصوص ہیں اور جس سے یہ اندازہ کرنا کسی بھی صاحبِ علم اور صاحبِ ایمان کے لیے مشکل نہیں رہتا کہ اپنی شخصیت کی تعمیر اور حفاظت کے حوالے سے عورت اور مرد کے لیے احکام یکساں نہیں۔ مردوں کے لیے نگاہوں اور ستر کی جگہوں کی حفاظت کافی ہے۔ لیکن عورتوں کے لیے ان دونوں ہدایات کے ساتھ ساتھ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ:

1- اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں، بجز اس کے جس کے ظاہر کیے بغیر چارہ نہیں۔
2- اپنی اوڑھنیوں سے اپنے سینوں کو ڈھانپ لیا کریں۔
3- زمین پر پاؤں اس طرح نہ ماریں کہ مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔
4- درمیان میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے سامنے زینت کا اظہار ممنوع نہیں۔

اس طرح سے وہ قواعد و ضوابط بیان کر دیے گئے ہیں جن سے گھروں کے ماحول میں پاکیزگی کی امید کی جاسکتی ہے اور اسلامی معاشرے کو ایسے گھر میسر آ سکتے ہیں جو ایک طرف ان کے لیے ہر طرح کی بداخلاقی اور لادینیت کی یورش سے پناہ گاہ کا کام دیں گے اور دوسری طرف وہیں سے وہ نسلیں نکلیں گی جو اسلامی اخلاق کی پیکر اور اسلامی قوت کا ہراول دستہ ہوں گی۔

اب ہم آیتِ کریمہ میں ارشاد فرمودہ ہدایات میں سے ایک ایک کی وضاحت کرتے ہیں۔

1- سب سے پہلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ گھر کے اندر جب کوئی غیر محرم داخل ہو تو

Marfat.com

گھر میں موجود خواتین اپنی نگاہیں جھکا لیں تا کہ گزرنے والے مہمان پر ضرورت سے زیادہ نگاہ نہ پڑے۔

2- اپنی شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی کریں یعنی جب انھیں معلوم ہو کہ باہر سے کوئی مہمان آرہا ہے اور وہ نامحرم ہے تو اگر مکان میں عورتوں کے الگ بیٹھنے کی گنجائش ہو تو پھر اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ عورتیں الگ بیٹھیں اور مہمانوں کو الگ بٹھایا جائے۔ لیکن اگر مکان تنگ ہے اور مہمانوں نے وہیں سے گزر کے جانا ہے تو پھر وہ اپنی شرم کی جگہوں کی پردہ پوشی کریں، یعنی اپنے لباس کو درست کریں، اپنی بُکّل کو ٹھیک کر لیں۔ لباس اس طرح کا نہ ہو جو بجائے پردہ پوشی کے جذبات میں تحریک پیدا کرے۔ اس لیے نبی کریم ﷺ نے عورتوں کو باریک لباس پہننے سے روکا۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا جو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن ہیں جب انھیں باریک لباس میں دیکھا تو آپ ﷺ نے منہ پھیر لیا اور ارشاد فرمایا کہ جب لڑکی بالغ ہو جائے تو پھر اسے ایسا لباس نہیں پہننا چاہیے جس سے جسم جھلکتا ہو اور اس کے ہاتھ، پاؤں اور چہرے کے سوا سارا جسم محجوب ہونا چاہیے اور پھر آپ ﷺ نے کلائی اور ہاتھ کے جوڑ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ اس سے زیادہ کلائی کھلی نہیں ہونی چاہیے۔

3- تیسرا حکم یہ دیا کہ اپنی زینت کو ظاہر نہ ہونے دیں۔ بجز اس کے کہ جو خود بخود ظاہر ہو جائے۔ بعض لوگوں نے زینت سے مراد چہرہ لیا ہے حالانکہ میں پہلے یہ بات عرض کر چکا ہوں کہ سیاقِ کلام سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہاں حجاب اور نقاب کی بحث نہیں ہو رہی، اس کا حکم سورۃ الاحزاب میں ہے۔ یہاں بحث گھر کے پردے کی ہے۔ اس لیے جب ایک مومنہ گھر سے باہر قدم رکھتی ہے تو اسے بڑی چادر سے چہرے پر گھونگٹ ڈالنے کا حکم دیا گیا ہے جسے ادنائے جلباب کہتے ہیں۔ لیکن گھر میں پردے کے لیے ادنائے جلباب نہیں ضربِ خمار کا حکم دیا گیا ہے یعنی اوڑھنیوں سے بُکّل مارنے کا۔ اور ہر صاحبِ علم و عقل اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ خمار سے بُکّل مارنے میں چہرہ شامل نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے چہرے کو اس میں شامل کرنا تکلف کے سوا اور کچھ نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ یہاں زینت سے مراد بناؤ سنگھار کا سامان یعنی زیور لیا جائے۔ اور آیتِ کریمہ کے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ عورتوں کو چاہیے کہ گھر میں چلتے ہوئے زمین پر پاؤں زور سے نہ ماریں تا کہ ان کی مخفی زینت ظاہر نہ ہو۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مخفی زینت سے مراد وہ زیور ہے جو عورتیں پاؤں میں پہنتی ہیں جسے عام طور پر پازیب کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

4- چوتھا حکم یہ دیا گیا ہے کہ گھروں میں عورتیں اپنے دوپٹوں اور اوڑھنیوں سے بُکّل مار لیا کریں یعنی اپنے سینوں پر ڈال لیا کریں۔ صاحبِ کشاف اور بعض دوسرے ائمہ تفسیر نے یہ وضاحت کی ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں عورتیں اپنے سروں پر دوپٹہ لینے کا تکلف کرتی تھیں لیکن ایک دھجی اور چیتھڑے کی طرح دوپٹہ ان کے سر سے کمر پر لٹکتا رہتا اور سینے پر قمیض کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے قرآنِ کریم میں واضح طور پر ارشاد فرمایا کہ اس طرح اپنے سروں پر دوپٹے لیں جس سے سر بھی ڈھکا رہے، کمر بھی اور سینہ بھی چھپا رہے اور سینے کا ابھار چونکہ شرم کی جگہ ہے اس لیے بطورِ خاص اس پر دوپٹہ ڈالنے کا حکم دیا۔

انسانی سیرت و کردار میں جب بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو اس کا رجوع اسی جاہلیت کی طرف ہوتا ہے جس سے اسلام نے انسانوں کو نکالا ہے۔ آج بھی جو لوگ تہذیبِ مغرب کے زیر اثر اسلامی تہذیب سے برگشتہ ہیں ان کے گھروں کی خواتین اپنے طور اطوار میں اسی جاہلیت کی نمائندگی کر رہی ہیں۔ ان کے دوپٹے ان کے کندھوں پر جھولتے رہتے ہیں۔ وہ چاکِ گریباں اور سینے کے ابھار کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کو لازمۂ تہذیب سمجھتی ہیں۔

وہ لوگ جن کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں

متذکرہ بالا ہدایات کے بعد پروردگار نے ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے سامنے زینت کا اظہار ممنوع نہیں۔ جب ہم اس فہرست پر نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں جو قدرِ مشترک ہے وہ ان کا محرم ہونا ہے۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ان رشتوں کی خصوصیت نہیں بلکہ ان کے سامنے اظہارِ زینت کی اجازت کی علت ان کا محرم ہونا ہے۔ اور آنحضرت ﷺ کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر نہیں جبکہ آنحضرت ﷺ کے ارشاد کے مطابق ان کے سامنے اظہارِ زینت ممنوع نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بھی محرم رشتہ داروں میں شامل ہیں۔ اس فہرست میں جن لوگوں کو ذکر کیا گیا ہے یوں تو ان میں کوئی معنوی الجھن نہیں البتہ بعض الفاظ مصداق کے حوالے سے وضاحت طلب ضرور ہیں مثلاً اٰبَآئِهِنَّ، اٰبَآء، اَبٌ کی جمع ہے، اس کا معنی ہے باپ۔ لیکن یہاں یہ اپنے وسیع معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے مراد تمام اجداد و اعمام ہیں۔ ان میں دادا، پردادا اور نانا، پرنانا بھی شامل ہیں، لہٰذا ایک عورت اپنی ددھیال اور ننھیال اور اپنے شوہر کی

Marfat.com

ددھیال اور ننھیال کے ان سب بزرگوں کے سامنے اسی طرح آ سکتی ہے جس طرح اپنے والد اور اپنے خسر کے سامنے آ سکتی ہے۔

بھائیوں میں سگے اور سوتیلے اور ماں جائے بھائی سب شامل ہیں۔

بھائی بہنوں کے بیٹوں سے مراد تینوں قسم کے بھائی بہنوں کی اولاد ہیں۔ یعنی ان کے پوتے، پرپوتے اور نواسے، پرنواسے سب اس میں شامل ہیں۔

اَوْ نِسَائِهِنَّ :۔ اس کا لفظی ترجمہ ہے، ان کی عورتیں۔ اس میں مطلق عورتوں کا ذکر کرنے کی بجائے ان کی عورتیں فرمایا گیا ہے، جس کا معنی اپنی عورتیں بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک بات تو یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس سے ہر طرح کی عورتیں مراد نہیں لی جا سکتیں۔ کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو پھر صرف نساء کا لفظ استعمال کیا جاتا۔ اس لیے بعض اہلِ علم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس سے مراد صرف مسلمان عورتیں ہیں۔ غیر مسلم عورتیں خواہ وہ ذمی ہوں یا کسی اور قسم کی، ان سے مسلمان عورتوں کو اسی طرح پردہ کرنا چاہیے، جس طرح مردوں سے کیا جاتا ہے۔ انھوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک مکتوب سے بھی استدلال کیا ہے جو انھوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ مسلمانوں کی بعض عورتیں غیر مسلم عورتوں کے ساتھ حماموں میں جانے لگی ہیں حالانکہ جو عورت اللہ تعالیٰ اور یومِ آخر پر ایمان رکھتی ہے، اس کے لیے حلال نہیں کہ اس کے جسم پر اس کے اہلِ ملت کے سوا کسی اور کی نظر پڑے۔ یہ خط جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو ملا تو وہ ایک دم گھبرا کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے، خدایا جو مسلمان عورت محض گوری ہونے کے لیے ان حماموں میں جائے، اس کا منہ آخرت میں کالا ہو جائے۔

(ابن جریر، بیہقی، ابن کثیر)

بعض دیگر اہلِ علم کی رائے یہ ہے کہ اور یہی صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اس سے مراد اپنے میل جول اور تعلق اور خدمت کی عورتیں ہیں، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم۔ کیونکہ وہ جانی پہچانی اور بھروسے کی خواتین ہوتی ہیں۔ کیونکہ ہر قسم کی اجنبی عورتوں کے سامنے خواہ وہ مسلمان ہی ہوں اپنی زینت کا ظاہر کرنا فتنہ اور خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کی تائید ان روایات سے بھی ہوتی ہے جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کے پاس ذمی عورتوں کی حاضری کا ذکر آتا ہے۔ اس معاملے میں اصل چیز جس کا لحاظ کیا جانا چاہیے وہ مذہبی اختلاف نہیں بلکہ اخلاقی حالت ہے۔ شریف، باحیاء اور نیک اطوار عورتیں جو معروف اور قابلِ اعتماد خاندانوں سے تعلق

Marfat.com

رکھنے والی ہوں ان سے مسلمان عورتیں پوری طرح بے تکلف ہوسکتی ہیں، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہوں۔ لیکن بے حیاء، آبروباختہ اور بداطوار عورتیں خواہ مسلمان ہی کیوں نہ ہوں، ہر شریف عورت کو ان سے پردہ کرنا چاہیے، کیونکہ اخلاق کے لیے ان کی صحبت غیر مردوں کی صحبت سے کچھ کم تباہ کن نہیں۔

اَوْمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُنَّ اس سے بعض لوگوں نے لونڈیاں مراد لی ہیں اور بعض لوگوں نے لونڈیاں اور غلام دونوں مراد لیے ہیں، لیکن آج چونکہ غلاموں اور لونڈیوں کا وجود ختم ہوگیا اس لیے یہ بحث آج کی ضرورت نہیں رہی۔ علمی دلچسپی کے لیے دیگر تفاسیر دیکھی جاسکتی ہیں، لیکن عملی رہنمائی کے لیے چونکہ اس کی ضرورت باقی نہیں رہی اس لیے ہم اس سے صرفِ نظر کرتے ہیں۔

اَوِالتّٰبِعِيْنَ غَيْرِاُولِى الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ ''یعنی مردوں میں سے وہ مرد جو زیرِ کفالت ہوں اور جو عورت کی ضرورت کی عمر سے نکل چکے ہوں۔ یعنی ایک مسلمان عورت ان مردوں کے سامنے اظہارِ زینت کرسکتی ہے جو اس کے زیرِ کفالت ہوں یا اس کے بزرگوں کے زیرِ کفالت ہوں اور اپنی اس حیثیت کی وجہ سے وہ حدود سے تجاوز کا تصور بھی نہ کرسکتے ہوں اور دوسری یہ بات کہ وہ اپنی عمر یا جسمانی عدمِ اہلیت یا اپنی کمزوری یا فقر و مسکنت کے باعث یہ طاقت اور جرأت نہ رکھتے ہوں کہ وہ صاحبِ خانہ کی بیوی، بیٹی، بہن یا ماں کے متعلق کوئی بری نیت دل میں لاسکیں۔ لیکن گھر کے وہ ملازم جنھیں ان کی تنخواہ ایک طرح کی جرأت دلاتی ہے پھر ان کی مناسب عمر اور صحت جنسی جذبات پر آمادہ کرسکتی ہے ان کے سامنے عورتوں کا بے پردہ آنا اور اظہارِ زینت کرنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ان مخنثین سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا ہے جو اگرچہ گناہ پر قادر نہیں، لیکن کسی حد تک جنسی خواہشات کے باعث عورتوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بخاری اور مسلم اور بعض دیگر کتب میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا گیا ہے کہ مدینہ طیبہ میں ایک مخنث تھا جسے ازواجِ مطہرات اور دوسری خواتین غَيْرِاُولِى الْاِرْبَةِ میں شمار کرکے اپنی ہاں آنے کی اجازت دے دیتی تھیں۔ ایک روز جب نبی کریم ﷺ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لے گئے تو آپ ﷺ نے اس کو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے بھائی عبداللہ بن امیہ سے باتیں کرتے سن لیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کل اگر طائف فتح ہوجائے تو غیلان ثقفی کی بیٹی بادیہ کو حاصل کیے بغیر نہ رہنا، پھر اس نے بادیہ کے حُسن اور اس کے جسم کی تعریف کرنی شروع کی۔ اور اس کے ایک ایک عضو کی صفت

Marfat.com

بیان کر ڈالی نبی کریم ﷺ نے یہ باتیں سنیں تو فرمایا "خدا کے دشمن تو نے تو اس میں نظریں گاڑ دیں۔" پھر آپ ﷺ نے حکم دیا کہ اس سے پردہ کرو، آئندہ یہ گھروں میں نہ آنے پائے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے اسے مدینے سے باہر نکال دیا اور دوسرے مخنثوں کو بھی گھروں میں آنے سے منع فرما دیا کیونکہ ان کو مخنث سمجھ کر عورتیں ان سے احتیاط نہ کرتی تھیں اور وہ ایک گھر کی عورتوں کا حال دوسرے مردوں سے بیان کرتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غَیْرِ اُوْلِی الْاِرْبَۃ ہونے کے لیے صرف یہ بات کافی نہیں کہ ایک شخص جسمانی طور پر بدکاری کے قابل نہیں ہے۔ اگر اس میں دبی ہوئی صنفی خواہشات موجود ہیں اور وہ عورتوں سے دلچسپی رکھتا ہے تو بہر حال وہ بہت سے فتنوں کا موجب بن سکتا ہے۔

بوڑھے ملازمین کے بارے میں بھی یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے بڑھاپے اور کمزوری کے باعث اس قابل ہیں کہ انھیں غَیْرِ اُوْلِی الْاِرْبَۃ کا مصداق سمجھا جائے، لیکن یہ بات دیکھنا بہت ضروری ہے کہ صنفِ نازک کے بارے میں ان کے احساسات کا حال کیا ہے اور کیا وہ اپنی نجی مجلسوں میں صنفِ نازک کے اوصاف کو گفتگو کا موضوع بناتے ہیں یا نہیں۔ جب تک اس حوالے سے اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک انھیں گھروں کے اندر آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔

اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ "یا وہ بچے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہ ہوں۔" یعنی ان بچوں کے سامنے عورتیں اظہارِ زینت کر سکتی ہیں جن میں ابھی صنفی احساسات بیدار نہ ہوئے ہوں۔ رہی یہ بات کہ صنفی احساسات بچوں میں کس عمر میں بیدار ہوتے ہیں۔ اصولی طور پر تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب تک بچہ نابالغ ہے وہ بہت حد تک صنفی ضروریات سمجھنے سے قاصر رہتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بلوغ سے پہلے بھی بچوں میں صنفی احساسات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کے لیے کسی عمر کا تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ جن بچوں کا ماحول نہایت پاکیزہ ہو اور ان کی تعلیم تزکیۂ نفس کے لیے معاون ہو اور ان کے گھروں میں ٹی وی اور اس طرح کی دوسری سہولتیں میسر نہ ہوں اور ان کے دوستوں اور ہمجولیوں میں بگڑے ہوئے بچے موجود نہ ہوں تو ایسے بچے تو یقیناً بلوغ کے قریب پہنچ کر ان احساسات سے آشنا ہوتے ہیں۔ لیکن جن تعلیمی اداروں میں جنس کو سبجیکٹ کے طور پر پڑھایا جاتا ہو اور جن کے گردوپیش میں صنفی محرکات پھیلے ہوئے ہوں اور جن کا ماحول اور جن کے

Marfat.com

بڑے اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہوں وہ تو دس گیارہ سال کی عمر میں بھی ان باتوں سے آشنا ہو جاتے ہیں۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں شروع میں تو بچوں کو ہر وقت عورتوں کے یہاں آنے جانے کی اجازت تھی لیکن بعد میں تین اوقات میں ان کے اوپر بھی پابندی لگا دی گئی۔ بلاشبہ عرب کا معاشرہ ایک بگڑا ہوا معاشرہ تھا۔ لیکن ان میں بھی غیرت کا کسی حد تک تصور پایا جاتا تھا۔ اس لیے وہ اپنے بچوں میں ہر طرح کی انارکی کو پسند نہیں کرتے تھے، لیکن آج کا مغرب اور ان کے زیرِ اثر مشرق میں رہنے والے متغربین ہر طرح کی اخلاقی حدود سے آزاد ہو چکے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو اگر اپنے بچوں کی صالح تربیت منظور ہے تو انھیں صرف ان کے ظاہری اعمال نہیں بلکہ ان کے احساسات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔

مخفی زینت کے اظہار کی ممانعت

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِينَ مِنْ زِينَتِهِنَّ ''وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلیں تاکہ ان کی مخفی زینت ظاہر ہو جائے۔'' جو ذوق زینت کو پسند کرتا ہے اس کے اندر زینت کا اظہار ایک فطری بات ہے۔ ایسا ذوق مردوں میں بھی رکھا گیا ہے اور عورتوں میں بھی، لیکن عورتوں میں یہ جذبہ مرد کی نسبت زیادہ ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ عورت سرتاپا حُسن ہے اور اسی نے اس کے اندر ایک کشش پیدا کی ہے جس کے جواب میں مرد اسے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اسؔ کے اندر یہ فطری جذبہ نہ ہوتا تو مرد جس طرح اس کے لیے بیتاب ہوتا ہے یہ بیتابی کبھی پیدا نہ ہوتی۔ اسلام نے اس جذبے کی تحسین فرمائی ہے۔ البتہ اس کے لیے ایک مخصوص دائرہ اور ایک مخصوص محل متعین کر دیا ہے۔ جب یہ جذبہ اس دائرے سے باہر نکلتا ہے تو یہیں سے اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس آیتِ کریمہ میں ان رشتوں کی ایک فہرست دی گئی ہے جن کے سامنے اس جذبے کا اظہار ہو سکتا ہے، لیکن جب گھر میں نامحرم موجود ہوں اور خاتونِ خانہ کو ان کے پاس سے گزرنا پڑے تو اسی جذبے کو حدود میں رکھنے کے لیے حکم دیا کہ پاؤں کو زمین پر زور سے مار کر نہ چلو تاکہ تم نے اگر اپنے پاؤں میں کوئی زیور پہن رکھا ہے تو اس کی کھنک نامحرموں کے کانوں تک نہ پہنچے۔ زیور پہننے پر اعتراض نہیں لیکن نامحرموں تک اس کے اظہار پر اعتراض ہے۔ یہی اسلام کا وہ اعتدال ہے جس سے اخلاقِ صالحہ وجود میں آتے ہیں۔

Marfat.com

زینت کے مفہوم میں وسعت

نبی کریم ﷺ نے اس حکم کی حقیقت کو کھولتے ہوئے اسے زیوروں کی جھنکار تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس سے یہ اصول اخذ فرمایا کہ نگاہ کے سوا دوسرے حواس کو مشتعل کرنے والی چیزیں بھی اس مقصد کے خلاف ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو اظہارِ زینت سے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے عورتوں کو حکم دیا کہ ایسی خوشبو لگا کر باہر نہ نکلیں جس کی مہک دوسروں تک بھی پہنچتی ہو۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اذا استعطرت المرأة فمرت علی القوم لیجدوا ریحها فهی کذا وکذا قال قولا شدیدا ۔

"جو عورت عطر لگا کر راستے سے گزرے تا کہ لوگ اس کی خوشبو سے لطف اندوز ہوں تو وہ ایسی اور ایسی ہے اور آپ ﷺ نے اس کے لیے بڑے سخت الفاظ استعمال فرمائے۔" (ترمذی، ابوداود، نسائی)

اسی طرح آپ ﷺ نے اس بات کو بھی پسند نہیں فرمایا کہ عورتیں بلاضرورت اپنی آواز مردوں کو سنائیں۔ کوئی ضرورت پیش آ جائے تو پروردگار نے بات کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن جہاں کوئی دینی یا اخلاقی ضرورت درپیش نہ ہو وہاں اس کو پسند نہیں کیا گیا۔ نماز میں اگر امام بھول جائے تو مردوں کو حکم ہے کہ سبحان اللہ کہیں، لیکن اگر عورتیں امام کے پیچھے ہوں اور انھیں امام کی غلطی پر تنبیہ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو انھیں بولنے کی بجائے ایک ہاتھ پر دوسرا ہاتھ مارنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اسی کو تصفیق کہا گیا ہے۔

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا کہ یہ ہدایات چونکہ پورے مسلم معاشرے کی اصلاح و تطہیر کے لیے دی گئی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ معاشرے کا ایک ایک فرد اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے۔ سب مل کر اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کریں اور اس سلسلے میں جو احکام دیے گئے ہیں انھیں محض اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم پر یقین رکھتے ہوئے زندگی کا رہنما بنائیں۔ اس صورت میں امید کی جا سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں فوز و فلاح سے نوازے۔

Marfat.com

41- چند غور طلب اور فیصلہ کن باتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿اَفَمَنْ یَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ الْحَقُّ کَمَنْ ھُوَاَعْمٰی اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُوْلُوا الْاَلْبَابِ﴾

(تو کیا جو شخص جانتا ہے کہ آپ پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے آپ کے رب کی طرف سے وہ حق ہے۔ وہ اس شخص جیسا ہوسکتا ہے جو اندھا ہے۔ نصیحت صرف عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔) (سورۃ الرعد:۱۹)

اس آیتِ کریمہ میں نبی کریم ﷺ اور مسلمانوں کو تسلی دی جارہی ہے۔ اور قریش مکہ کو آئینہ دکھانا مقصود ہے۔ قرآنِ کریم نے آنحضرت ﷺ کی تبلیغ ودعوت کے انداز کو اور کفار کی ہدایت کے لیے آپ ﷺ کی دلسوزی کو جس طرح بیان فرمایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ﷺ لوگوں کی ہدایت کا کام محض ایک ذمہ داری سمجھ کر ادا نہیں فرما رہے تھے بلکہ لوگوں کی بھلائی اور ان کی زندگیوں میں خوش اطواری کا ورود اور آخرت کی فکر پیدا کرنے کی طلب آپ ﷺ پر اس طرح حاوی ہوگئی تھی کہ آپ ﷺ کی زندگی کے تمام معمولات اور آپ ﷺ کے تمام احساسات پر اس نے غلبہ پالیا تھا، جو کافر ایمان لانے سے انکار کرتا تھا، آپ ﷺ کو چونکہ یقین تھا کہ اس کا انجام جہنم میں جلنا ہے تو آپ محسوس کرنے لگتے تھے کہ یہ شخص اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ آگ کا ایک بڑا الاؤ ہے جو اس کا منتظر ہے اور یہ اپنی حماقت سے اس میں کود جانا چاہتا ہے۔ میں چونکہ اس کی تباہی اور بربادی دیکھ رہا ہوں اور میری اسے بچانے کی تمام کوششیں ناکام ہورہی ہیں تو آپ کی طبیعت پر ایک غیر معمولی بار پڑتا تھا اور آپ کی روح زخمی ہونے لگتی تھی۔ اور آپ ﷺ کی بالکل وہی کیفیت ہوتی تھی جو ایک ہمدرد انسان کی آگ میں جلتے ہوئے آدمی کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ مزید پریشانی کی بات یہ تھی کہ کبھی کبھی

Marfat.com

آپ ﷺ محسوس کرنے لگتے کہ قریش مکہ کا ہدایت قبول نہ کرنا اور خطرناک انجام کی طرف بڑھتے چلے جانا تبلیغ و دعوت میں شاید میری کسی کوتاہی کا نتیجہ ہے۔ اور میں شاید ان کو ہدایت دینے میں وہ محنت، وہ توجہ، وہ ہمدردی و غمگساری بروئے کار نہیں لا سکا جس کی انھیں ضرورت تھی۔ چنانچہ وہ ذاتِ خداوندی جو دلوں کے بھیدوں سے واقف ہے وہ آنحضرت ﷺ کے اس احساس کے پیشِ نظر جس نے آپ ﷺ کو مضمحل کرکے رکھ دیا تھا تسلی دینے کی ضرورت محسوس کرتی ہے اور جابجا قرآنِ پاک میں ہم اسی حوالے سے تسلی پر مشتمل آیات کو نازل ہوتا ہوا دیکھتے ہیں۔ چنانچہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں بھی نہایت دلنواز انداز میں آپ ﷺ کو اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ قریش مکہ کا راہ راست نہ اختیار کرنا آپ ﷺ کی کسی کوتاہی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی بدنصیبی کا نتیجہ ہے۔ انھیں آپ ﷺ نے باقی انسانوں کی ہی طرح ہر ممکن طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنے دل و دماغ میں جو بُت سجا رکھے ہیں اور اپنے معمولات جن کاموں کی نذر کر رکھے ہیں اور اپنی ترجیحات جن حوالوں سے متعین کر رکھی ہیں اور اپنی خواہشات جن بداطواریوں کے تابع کر رکھی ہیں اس نے ان کے اندر ایک نئی شخصیت پیدا کر دی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کی عقلیں ماؤف ہوگئی ہیں، ان کے حواس نے کام کرنا چھوڑ دیا ہے۔ یہ کہنے کو بینا ہیں لیکن حقیقت میں اندھے ہیں۔ یہ دنیا کی ہر حقیقت کو دیکھتے ہیں لیکن آخرت کی حقیقت ان کی نگاہوں سے مخفی رہتی ہے۔ یہ حواس کی زندگی کو عقل کی زندگی سمجھتے ہیں اور آنکھ کی روشنی کو دل کی روشنی پر ترجیح دیتے ہیں۔ جس طرح آنکھ کا اندھا بار بار ٹھوکر کھا کے گرتا ہے اور اسے منزل تک پہنچنا کبھی نصیب نہیں ہوتا اسی طرح دل کا اندھا بھی حقائق کی شناخت سے ہمیشہ محروم رہتا ہے۔ وہ ہر چیز کے ظاہر کو جانتا ہے لیکن اس کے باطن تک اترنا اسے کبھی نصیب نہیں ہوتا۔ وہ حیوانی زندگی کا اسیر ہو کر انسانی زندگی سے بے خبر رہتا ہے۔ اس کا میدانِ عمل پیٹ کی ضرورتوں تک محصور ہو جاتا ہے۔ وہ انسانیت کی ضرورتوں کا شعور کبھی پیدا نہیں کر سکتا۔ اس لیے اقبال بار بار ترغیب دیتا ہے:

دل کا نور کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

ان لوگوں کے دل چونکہ اندھے ہو چکے ہیں اور اپنی مسلسل بداعمالیوں سے ان کے دلوں کا نور بجھ چکا ہے۔ یہ سبب ہے جس کی وجہ سے آپ ﷺ کی دعوت ان کے دلوں تک

Marfat.com

نہیں اتر رہی۔ وہ پیٹ کی ضرورتوں کو تو سمجھتے ہیں لیکن دل کی ضرورتوں کو سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ آپ ﷺ انہیں جو روشنی دکھانا چاہتے ہیں وہ اسے دیکھنے کی صلاحیت کھو چکے ہیں۔ اس لیے آپ کی دعوت کو قبول نہ کرنا وہ سراسر ان کے بے صلاحیت ہونے کا نتیجہ ہے، آپ ﷺ کی دعوت میں کوئی کمی نہیں۔

ساتھ ہی ساتھ مشرکین کو آئینہ دکھایا جا رہا ہے کہ تم آنحضرت ﷺ کی دعوت کو رد کر کے یہ سمجھتے ہو کہ تم نے شاید کوئی کارنامہ انجام دیا ہے حالانکہ آنحضرت ﷺ کی دعوت انسانیت کی پکار ہے۔ انسانوں کی پیاسی روح کا جواب ہے۔ وہ تمھارے روشن مستقبل کی نوید ہے، وہ تمھاری فوز وفلاح کی ضمانت ہے۔ تم نے دن کی روشنی چھوڑ کر رات کی تاریکیوں کو پسند کیا۔ تمھیں اندازہ ہی نہیں کہ تم کس طرح حوادث کو دعوت دے رہے ہو۔ تم چونکہ دانشِ نورانی کی دولت سے تہی دامن ہو اس لیے دانشِ برہانی ہی کو زندگی کی اساس اور زندگی کی رہنما سمجھتے ہو، تمھیں معلوم نہیں کہ علم و دانش انسان کا عظیم سرمایہ ہے۔ لیکن جب یہی دانش، دانشِ نورانی سے الگ ہو جاتی ہے تو پھر اس دانش کا کام اتباعِ ہویٰ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ ہوائے نفس کی وکیل بن کر انسانی اقدار کی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس کے بعد وضاحت سے بتایا کہ حقیقی عقلمند کون لوگ ہیں۔

﴿الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۝ وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَیَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ﴾ (سورۃ الرعد: ۲۰۔۲۱)

”جو اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں اور اپنے پیمان کو توڑتے نہیں۔ اور جو اس چیز کو جوڑتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے۔ اور اپنے رب سے ڈرتے رہتے ہیں اور سخت حساب کا اندیشہ رکھتے ہیں۔“

اولوا الالباب کی پہلی صفت

وہ عقلمند جو اللہ تعالیٰ کے قرآن سے فائدہ اٹھاتے اور اللہ تعالیٰ کے دین کو قبول کرتے ہیں ان کی مختلف صفات ہیں۔ ان میں پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کرتے

Marfat.com

ہیں اور اس کے میثاق کو کبھی توڑنے کی جرأت نہیں کرتے۔ اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جسے عہدِ الست کہا جاتا ہے۔

عہدِ الست کا مفہوم

عہد کے الفاظ پر غور کیجیے، پروردگار نے انسانوں سے پوچھا کہ کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ عہد لیتے ہوئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ میں تمھارا خدا نہیں ہوں؟ یعنی پروردگار نے انسانوں سے اپنے اللہ تعالیٰ ہونے کا عہد نہیں لیا بلکہ اپنے رب ہونے کے بارے میں پوچھا اور سب نے اقرار کیا کہ ہاں آپ ہی ہمارے رب ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب پروردگار نے نوعِ انسانی سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا تو یہ بات از خود انسانوں پر واضح ہوگئی کہ جس عظیم ذات کے لیے ہم ربوبیت کا عہد کررہے ہیں وہی ہمارا اللہ تعالیٰ ہے اور یہ ایسی حقیقت تھی جس کا عہد لینے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ گمراہی کی ابتداء جب بھی ہوئی ہے وہ اللہ تعالیٰ کے انکار سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی ربوبیت کے انکار سے ہوئی ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے کبھی اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کیا ہو اور اگر کبھی پروپیگنڈے یا غلط تعلیم کے زور سے زبانوں پر انکار جاری کر بھی دیا جائے تو حقیقت میں انسانی فطرت اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ جب کبھی موقع آتا ہے اس کا اظہار ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ تاریخ میں ہم جتنی قوموں کا ذکر پڑھتے ہیں وہ مختلف قسم کے شرک میں تو ملوث رہی ہیں لیکن کبھی کسی قوم کے بارے میں تاریخ نے یہ نہیں لکھا کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار کر دیا۔ ایک بڑی ذات جو کائنات کا مبداء و معاد ہے اسے ہر قوم نے قبول کیا چاہے اس کا نام کچھ بھی رکھا ہو۔ البتہ اس کے نیچے بے شمار رب بنا لیے کیونکہ ان کا گمان یہ تھا کہ ایک ایسی ذات جو آسمانوں کی بلندیوں پر متمکن ہے زمین کے آخری گوشے تک بسنے والے انسانوں کے حالات سے نہ آگاہ ہوسکتی ہے اور نہ ان کے معاملات میں مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اس لیے وہ اپنے اختیارات اپنے ماتحتوں میں تقسیم کر دیتی ہے تاکہ دنیا کا نظام چلتا رہے۔ یہیں سے شرک کی ابتداء ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں یاد دلایا جارہا ہے کہ ہم نے پہلے دن انسانوں سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم میرے سوا کسی اور کو رب نہ ماننا یعنی میری ذات کے اقرار کے ساتھ ساتھ یہ بھی حرکت نہ کرنا کہ میرے اختیارات اور میری صفات میں کسی اور کو شریک کردو۔ مشرکین مکہ دنیا

Marfat.com

بھر کے مشرکین کی طرح اسی گمراہی کا شکار تھے حتیٰ کہ بنی اسرائیل بھی حاملِ کتاب ہونے کے باوجود اس گمراہی سے محفوظ نہیں تھے اور آج کا انسان بھی روشنی، علم و ہنر کے باوجود اسی گمراہی کا شکار ہے۔ انھیں اللہ تعالیٰ کے وجود سے انکار نہیں اس کی یاد بھی کسی نہ کسی حد تک زندہ رہتی ہے۔ لیکن حلت و حرمت کا اختیار صرف اسی کے پاس ہے۔ اطاعتِ مطلقہ صرف اسی کا حق ہے۔ یہ وہ بات ہے جسے دنیا کی اکثریت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس کی ان صفات کو نہ جانے کن کن قوتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کہیں یہ اختیار پارلیمنٹ کو دیا گیا ہے، کہیں بادشاہت کو، کہیں آمریت کو اور کہیں خواہشِ نفس کو۔ بنی اسرائیل بھی اسی گمراہی کا شکار تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو مانتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا اختیار انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو دے رکھا تھا۔ عدی ابنِ حاتم طائی جب مسلمان ہونے کے لیے مدینہ آئے اور اپنے اطمینان کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے آپ ﷺ سے پوچھا کہ میں نے مسلمانوں سے یہ سنا ہے کہ قرآنِ کریم میں اہلِ کتاب کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ انھوں نے اپنے احبار اور رہبان کو رب بنا لیا ہے۔ میں عیسائی ہوں اس لیے میں اہلِ کتاب کے عقائد کو جانتا ہوں۔ ہم نے کبھی اپنے علما اور پیشواؤں کو رب نہیں بنایا، یہ سراسر ہم پر الزام ہے۔ آپ ﷺ نے عدی سے سوال کیا کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا حرام؟ کیا جائز ہے اور کیا ناجائز؟ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں ہونا چاہیے؟ اس کا فیصلہ آپ اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کرتے ہیں یا اپنے علماء اور اپنے پیشواؤں کو آپ نے یہ اختیار دے رکھا ہے کہ وہ کتاب اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر جو فیصلہ بھی دے دیں آپ اس کو دین کا درجہ دے دیتے ہیں؟ عدی نے جواب دیا کہ ہم نے یہ اختیارات واقعی اپنے علماء کو دے رکھے ہیں وہ اگر ایسا فیصلہ بھی کر دیں جو کتابِ خداوندی سے یکسر متصادم ہو تو ہم کتاب اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے بلکہ انھیں کے فیصلوں کی اطاعت کرتے ہیں۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا یہی معنی ہے کسی کو رب بنانے کا۔ مطلق قانون سازی، غیر مشروط حاکمیت اور غیر مشروط اطاعت یہ سراسر پروردگار کا حق ہے کیونکہ وہ ہمارا رب ہے جب یہ حق کسی اور کو دیا جائے گا تو وہ بھی رب بن جائے گا۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں اسی بات کی یاد دہانی کی جا رہی ہے کہ ہم نے تم سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ تم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا رب نہیں بناؤ گے لیکن تم نے جا بجا اس کے مقابلے میں رب بنا لیے جہاں منفعت کی امید نظر آئی یا کسی سے نقصان کا خوف ہوا تو اس کو اپنا رب بنا لیا۔ چاہے

Marfat.com

وہ دودھ دینے والی گائے ہو، پیاس بجھانے والا پانی ہو، سایہ دینے والا پیپل کا درخت ہو یا ضروریاتِ زندگی کی کفالت کرنے والی دولتِ دنیا ہو یا تختِ اقتدار پر فائز انسان ہوں یا تقدس کے پیکر ہوں ان میں سے ہر ایک چونکہ فیض رسانی اور فائدہ پہنچانے کی کسی نہ کسی صورت میں صلاحیت رکھتا ہے اس لیے اس کو ربوبیت کی سند دے دی گئی اور اگر کہیں سے خوف محسوس ہوا مثلاً سیلاب کی صورت میں تباہی پھیلانے والا پانی، کشتیوں کا راستہ روکنے والی چٹانیں، ڈسنے والے ناگ، تختِ اقتدار پر مسند نشیں فرعون اور نمرود، فضاء میں کڑکنے والی بجلیاں اور بادل، مظاہرِ فطرت اور مظاہرِ قدرت اور ایسی تمام زمینی اور آسمانی قوتیں جو انسان کے لیے خوف اور وحشت کا سبب بن سکتی تھیں ان سب کو ربوبیت کی مسند پر فائز کر دیا گیا۔

امتِ مسلمہ جو قیامت تک کے لیے اس عہد کی منادا اور مبلغ بنا کر اٹھائی گئی ہے خود اس کا حال دیکھئے کہ پورے عالمِ اسلام میں ایک ملک بھی ایسا نہیں جسے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت یعنی اس کی حاکمیتِ مطلقہ کا عملی طور پر اعتراف ہو۔ ہر جگہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی نہ کسی حد تک مسلمانوں میں عبادات کا عمل جاری ہے، اخلاقیات زندہ ہیں، انفرادی سطح پر نیکی سے وابستگی باقی ہے تو اسلامی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بس یہی کچھ کافی ہے کوئی ضروری نہیں کہ ملک میں اسلامی قانون بھی نافذ ہو بلکہ مسلمانوں میں ایک ایسی معتدبہ تعداد بھی موجود ہے جو سرے سے اسلامی قانون کے وجود ہی کی منکر ہے حالانکہ اگر اسلامی قانون کے وجود سے انکار کر دیا جائے تو اس سے آپ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام کا اجتماعیت سے کوئی رشتہ نہیں ہم انفرادی زندگی میں مسلمان ہیں اور ہمیں اسلام کی انفرادی زندگی کی ہدایات پر عمل کرنا چاہیے۔ رہے اجتماعی ادارے تو ان کے لیے ہمیں اللہ تعالیٰ نے آزاد چھوڑا ہے انھیں اپنی صوبدید کے مطابق جس طرح بھی چلایا جائے اس کا اسلام سے یا اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وہ گمراہی ہے جس کے ازالے کے لیے اللہ تعالیٰ نے تخلیقِ انسانی کے آغاز میں یہ عہد لیا تھا اور قرآنِ کریم میں وضاحت کے ساتھ اس کی یاد دہانی کرائی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ یہ عہد کہاں لیا گیا تھا اور اس کی کیفیت کیا تھی؟ حضرت عبداللہ تعالیٰ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالے سے یہ بیان کیا جاتا ہے کہ یہ عہد حضرت آدم علیہ السلام کے زمین پر بھیجنے کے بعد عالمِ ارواح میں لیا گیا تھا لیکن بعض دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقع پر پیش آیا۔ اس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا اور زمین پر انسان کی خلافت کا

Marfat.com

اعلان کیا گیا اسی طرح پوری نسل آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور بخش کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی۔ حضرت ابی ابن کعب رضی اللہ عنہ نے غالباً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کر کے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس مضمون کی بہترین شرح ہے وہ فرماتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور (ایک ایک قسم یا ایک ایک دور کے) لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انھیں انسانی صورت اور گویائی کی طاقت عطا کی، پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انھیں جب اپنے اوپر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے عرض کیا ضرور آپ ہمارے رب ہیں۔ تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمھارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ سکو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحقِ عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے۔ تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا۔ میں تمھارے پاس اپنے پیغمبر بھیجوں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو، یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں، آپ کے سوا کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔''

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ ازلی میثاق فی الواقع عمل میں آیا بھی تھا تو کیا اس کی یاد ہمارے شعور اور حافظہ میں موجود ہے اور کیا ہم میں سے کوئی شخص بھی یہ جانتا ہے کہ آغازِ آفرینش میں وہ اپنے خدا کے سامنے پیش کیا گیا تھا اور اس سے یہ عہد لیا گیا تھا اور اگر کسی کو یاد نہیں تو پھر یہ عہد ہمارے خلاف حجت کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف باتیں کہی جا سکتی ہیں جن کا تعلق خارجی شواہد سے بھی ہے اور انسان کے اندر دبے ہوئے احساس سے بھی۔ جہاں تک خارجی شواہد کا تعلق ہے اس سلسلے میں گزارش ہے کہ خود انسانوں میں بہت سے ایسے افراد بھی ہیں جنھوں نے یہ اقرار کیا ہے کہ ہمیں یہ عہد پوری طرح یاد ہے۔ حضرت ذوالنون مصری نے فرمایا کہ یہ عہد و میثاق مجھے ایسا یاد ہے گویا اس وقت سن رہا ہوں اور بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جس وقت یہ اقرار لیا گیا میرے آس پاس میں کون

Marfat.com

کون لوگ موجود تھے، ہاں یہ ظاہر ہے کہ ایسے افراد شاذ و نادر کے درجہ میں ہیں، اس لیے عام لوگوں کے سمجھنے کی بات یہ ہے کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جو بالخاصہ اثر رکھتے ہیں، چاہے وہ کام کسی کو یاد رہے یا نہ رہے بلکہ اس کی خبر بھی نہ ہو مگر وہ اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، یہ عہد و اقرار بھی ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے کہ دراصل اس اقرار نے ہر انسان کے دل میں معرفتِ حق کا ایک بیج ڈال دیا جو پرورش پا رہا ہے چاہے اس کو خبر ہو یا نہ ہو، اور اسی بیج کے پھل پھول ہیں کہ ہر انسان کی فطرت میں حق تعالیٰ کی محبت وعظمت پائی جاتی ہے خواہ اس کا ظہور بت پرستی اور مخلوق پرستی کے کسی غلط پیرایہ میں ہو، وہ چند بدنصیب لوگ جن کی فطرت ہی مسخ ہو کر ان کا عقلی ذائقہ خراب ہو گیا اور میٹھے کڑوے کی پہچان جاتی رہی ان کے علاوہ باقی ساری دنیا کے اربوں انسان اللہ تعالیٰ کی دھن اور خیال اور عظمت سے خالی نہیں، چاہے مادی خواہشات میں مبتلا ہو کر یا کسی گمراہ سوسائٹی میں پڑ کر وہ اس کو بھلا دیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے؟

كُلُّ مُوْلُوْدٍ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ وَفِىْ بَعْضِ الرِّوَايَاتِ عَلٰى هٰذِهِ الْمِلَّةِ۔ (اخرجه البخاری و مسلم)

ہر پیدا ہونے والا دین فطرت یعنی اسلام پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے ماں باپ اس کو دوسرے خیالات میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بندوں کو حنفی یعنی ایک خدا کا ماننے والا پیدا کیا ہے پھر شیاطین ان کے پیچھے لگ گئے اور ان کو اس صحیح راستہ سے دور لے گئے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان اپنے سارے بگاڑ کے باوجود جب کبھی حالات کی گرفت میں آتا ہے اور اس کے مزعومہ سہارے ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگتے ہیں تو پھر آخر ایک وقت آتا ہے کہ وہ تنہائی میں اس ان دیکھی ذات کو پکارتا ہے جسے اس کی عقل و دانش نے آج تک قبول کرنے سے انکار کیا تھا چونکہ اس کی عقت پر آج تک خواہشات، مفادات، وضعی علوم اور جدید فلسفوں کے پردے پڑے ہوئے تھے جس نے اس کی فطرت کو دبا رکھا تھا جیسے ہی تندیِ حالات کا ایک تیز جھونکا ان پردوں کو اٹھا کر دور پھینکتا ہے اور اس کی اصلی فطرت کو کام کرنے کا موقع ملتا ہے تو اس کے تحت الشعور دبا ہوا اللہ تعالیٰ کا تصور ابھر کر سامنے آ کھڑا ہوتا ہے اور یہ اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتا ہے اگر تھوڑا سا بھی تأمل کیا جائے تو یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ اسی عہدِ الست کی صدائے بازگشت ہے۔

Marfat.com

دوسرا مطلب اس کا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کلمۂ شہادت پڑھنے کے بعد جب دائرۂ اسلام میں داخل ہوجاتا ہے تو اس کلمے کے صورت میں دراصل وہ اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی الوہیت تسلیم نہیں کرے گا اور محمد کریم ﷺ کے سوا کسی کو اللہ تعالیٰ کا رسول نہیں مانے گا۔ یہ وہ عہد ہے جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی پوری طرح سمٹ جاتی ہے۔ اس کا کوئی گوشہ بھی اس کی وسعت سے باہر نہیں رہتا کیونکہ الوہیت میں حاکمیتِ مطلقہ، اطاعتِ کاملہ، ہمہ گیر بندگی اور عبدیتِ راسخہ کے تمام مفاہیم و جذبات شامل ہیں۔ اور انسانی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی عملداری سے باہر نہیں۔ وہ عقلمند لوگ جن کی آنکھیں روشن ہیں اور جو رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھتے ہیں وہ ایسے ہی خیالات اور تصورات کے حامل ہوتے ہیں اور وہ ان پختہ تصورات میں کبھی شکست وریخت پیدا نہیں ہونے دیتے۔

دوسری صفت

اگلی آیتِ کریمہ میں فرمایا: کہ ان عقلمندوں کی صفات میں سے دوسری صفت یہ ہے کہ وہ جس طرح اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پاسداری کرتے ہیں اور ان کی بجاآوری میں کبھی تساہل سے کام نہیں لیتے اسی لیے بندوں کے جو حقوق ان پر بربنائے رشتۂ رحم عائد ہوتے ہیں ان کو بھی پوری فیاضی سے ادا کرتے ہیں۔ وہ جس طرح انسانیت کے رشتے کا پاس رکھتے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر وہ حقِ قرابت کی ادائیگی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اس معاملے میں بالکل آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور قرآنِ پاک کے فرامین کی تصویر ہیں۔ اس سلسلے میں آنحضرت ﷺ نے جو ارشادات فرمائے ہیں ان میں سے چند ایک کا ذکر اس اہم حقیقت کو سمجھنے کے لیے مدو معاون ہوسکتا ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے جسے بخاری نے روایت کیا:

لَيْسَ الْوَاصِلُ الْمُكَافِئُ وَلٰكِنَّ الْوَاصِلُ اِذَا اَنْ قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا۔

صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ اگر اس سے قطع تعلقی کی جائے تو پھر بھی وہ اس کو جوڑتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قال قال رجل يارسول الله من احق بحسن صحابتي

Marfat.com

قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال امك قال ثم من قال ابوك۔

کہ ایک شخص نے عرض کیا: یارسول اللہ ﷺ! میرے بہترین سلوک کا کون زیادہ مستحق ہے۔ فرمایا: تیری ماں۔ عرض کی، اس کے بعد کون؟ فرمایا: تیری ماں۔ پھر سوال کیا اس کے بعد، چوتھی مرتبہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: تیرا باپ۔

حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان من ابر البر صلة رجل اهل ود ابیه بعده ان یولی۔

حضور ﷺ نے فرمایا: کہ کسی آدمی کا اپنے باپ کے دوستوں کے ساتھ حُسنِ سلوک کرنا سب سے بڑی نیکی ہے۔

ایک موقع پر آنحضرت ﷺ سے پوچھا گیا، سب سے بہتر صدقہ کیا ہے؟ فرمایا: ایک بے مایہ آدمی کا اپنا پیٹ کاٹ کر اپنے ایک ایسے عزیز کو دینا جو اس کا نام لینے کا بھی روادار نہ ہو۔

ان احادیث سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اسلام نے صلہ رحمی پر کس قدر زور دیا ہے اور حقِ قرابت کی ادائیگی کی کس حد تک تاکید کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے خاندان اسلامی ریاست کی اساس ہے۔ خاندان جس قدر باہم پیوست، مضبوط اور توانا ہوگا، اسی قدر اسلامی معاشرہ اور اسلامی ریاست مضبوط اور توانا ہوگی۔ جس خاندان میں عزتِ نفس کی پرواہ کی جاتی ہو اور ہر شخص کو احترام میسر ہو اس معاشرے کے باہمی تعلقات ہر طرح کی الجھنوں اور اڑچنوں سے پاک ہوتے ہیں۔ اس کا ایک ایک فرد اپنے سے زیادہ دوسروں کے دکھ درد کا محافظ ہوتا ہے۔ وہ اپنے بارے میں بعد میں سوچتا ہے، اپنے عزیزوں کے بارے میں پہلے سوچتا ہے اور اس میں بھی حیران کن بات یہ ہے کہ ایسے معاشرے کے تمام لوگ آپس میں جو بھلائیاں کرتے ہیں اور ایثار و مروت سے کام لیتے ہیں، تو وہ اس طرح کسی پر احسان نھیں کرتے بلکہ وہ اپنے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ ہمارے ارادوں میں کوئی کمزوری واقع نہ ہو، ہم کسی خودغرضی اور ریا کی گرفت میں نہ آجائیں۔ وہ جب کسی کی مدد کرتے ہیں تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ سے چاہتے ہیں اور مدد لینے والے کے شکرگزار ہوتے ہیں کہ اس نے اسے اس

Marfat.com

قابل سمجھا۔ قرآنِ کریم نے ان کے حُسنِ سلوک کی تصویر کشی کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَانُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ اِنَّا نَخَافُ مِنْ رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوْسًا قَمْطَرِيْرًا﴾

(۸-۱۰)

اپنے بہتر سے بہتر سلوک کے باوجود اس بات سے اندیشہ ناک رہتے ہیں کہ کہیں ان سے بری طرح حساب نہ لیا جائے۔ لوگوں کے ساتھ ان کے معاملات کو اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر رکھ کر نہ جانچا جائے۔ ہر ایثار کے پیچھے جو محرکات کام کرتے ہیں ان کی بخیہ گری نہ کی جائے کیونکہ انسان کی فطرت ہے کہ ؂

چلے بچ کر کوئی کتنا وہ ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

﴿وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (سورۃ الرعد: ۲۲)

''اور جو لوگ اپنے رب کی رضا جوئی میں ثابت قدم رہے اور جنھوں نے نماز کا اہتمام رکھا اور جو کچھ ہم نے ان کو بخشا اس میں سے سراً اور علانیۃً خرچ کیا اور جو بدی کو بھلائی سے دور کرتے ہیں، انجام کار کی کامیابی انھی کے لیے ہے۔''

تیسری صفت

اولوالالباب کی کچھ مزید صفات بیان فرمائی جارہی ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ جو اپنے رب کی خوشنودی کی راہ میں جو مشکلات پیش آتی ہیں ان پر صبر کرتے ہیں۔ صبر کا معنی ہوتا ہے جم جانا، اڑ جانا اور استقامت دکھانا اور پابندی کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے لیے وہ جب اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تو انھیں قدم قدم پر ایسے حالات سے واسطہ پڑتا ہے جنھیں برداشت کرنا آسان نہیں ہوتا۔ کبھی تو اقتدار اپنے اقتساب کی زنجیروں میں جکڑ دینا چاہتا ہے اور کبھی بگڑا ہوا معاشرہ اسے اپنے اندر سے نکال

Marfat.com

پھینکنا چاہتا ہے۔ کبھی خواہشاتِ نفس زنجیرِ پا بن جاتی ہے اور کبھی بیوی بچوں کی فرمائشیں دل خون کرنے لگتی ہیں، کبھی اس کی منصبی قوت اس کے لیے حرام ذرائع کو آسان کر دیتی ہے۔ ایسی صورت میں حرام ذرائع سے بچنا اور حلال پر اکتفا کرنا بہت بڑا امتحان بن جاتا ہے۔ ایسے تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی، شیطان کی پیروی سے گریز، خواہشاتِ نفس کی اطاعت سے انکار کرنے کے لیے صبر کی بہت بڑی قوت درکار ہوتی ہے۔ استقامت کا ایسا جوہر جوان تمام محرکات کے سامنے دیوار بن کر حائل ہو جائے اللہ تعالیٰ کے یہ نیک بندے اپنے ایمان و عمل سے ہر ہر قدم پر یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی رضا سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہیں۔ نفس کے بہلاوے ہمارے صبر کو شکست نہیں دے سکتے۔

برو ایں دام بر مرغِ دگر نہ
کہ عنقارا بلند است آشیانہ

چوتھی صفت

مزید یہ بھی فرمایا گیا کہ ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جب نماز پڑھتے ہیں تو فرائض، واجبات، سنن اور آداب کی پابندی کرتے ہیں۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اصحابِ اقتدار میں سے ہیں تو وہ اپنے دائرہ اقتدار میں احکامِ صلوٰۃ کا نفاذ کرتے ہیں۔ مسجدیں تعمیر ہوتی ہیں، آئمہ اور مؤذنوں کا تقرر ہوتا ہے، مساجد دین کے مراکز میں تبدیل ہو جاتی ہیں، ان کی دیکھ بھائی اور حفاظت کے لیے، مناسب عملہ مقرر ہوتا ہے، اپنے دائرہ اختیار میں ترکِ نماز جرم قرار دیا جاتا ہے، مسلمانوں کے دل و دماغ میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ نماز دراصل تذکیر بھی ہے اور عہدِ وفا کی تعمیر بھی۔ اس کی پابندی جس طرح اللہ تعالیٰ کے رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بناتی ہے اسی طرح بعض دیگر مکارمِ اخلاق کی تعمیر کا ذریعہ بھی بنتی ہے۔

پانچویں صفت

ان برگزیدہ لوگوں میں مزید ایک صفت یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو کچھ دے رکھا ہے اس میں سے سراً و علانیۃً دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ موقع

Marfat.com

چھپا کے دینے کا ہو یا کھلے عام دینے کا ان کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ ''سراً'' سے مراد زکوٰۃ کے علاوہ صدقاتِ نافلہ کی ادائیگی ہے اور ''علانیۃً'' سے مراد زکوٰۃ ہے کیونکہ اموالِ ظاہرہ میں سے زکوٰۃ سب کے سامنے ادا ہونی چاہیے تاکہ دوسرے لوگوں کو بھی زکوٰۃ ادا کرنے کی طرف رغبت ہو اور انھیں اپنے فرض کا احساس ہو سکے، لیکن اموالِ باطنہ میں سے عطیات دیتے ہوئے عزتِ نفس کی پاسداری ضروری ہے اور وہ ہمیشہ اس کا لحاظ کرتے ہیں کہ کسی کی مدد کرتے ہوئے نہ اس کی عزتِ نفس پر چوٹ پڑے اور نہ اس کی حیثیت عرفی مجروح ہو۔

چھٹی صفت

مزید ان کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ برائی کو برائی سے نھیں بلکہ اس کو نیکی اور بھلائی سے دفع کرتے ہیں۔ وہ شر کا مقابلہ شر سے نھیں بلکہ خیر ہی سے کرتے ہیں۔ وہ ظلم کے مقابلے میں ظلم نھیں انصاف کرتے ہیں۔ دوسرے ان کے خلاف اگر جھوٹ بولیں تو وہ تب بھی اپنے سچ پر آنچ نھیں آنے دیتے۔ وہ خیانت کے مقابلے میں دیانت کا بول بالا کرتے ہیں۔ وہ آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد کی صحیح پیروی کرتے ہیں۔

> لا تکونوا امعة تقولون اِن احسن الناس احسنا و اِن ظلمونا ظلمنا۔ ولکن وطّنوا انفسکم، ان احسن الناس ان تحسنوا و ان اساؤا فلا تظلموا۔
>
> تم اپنے طرزِ عمل کو لوگوں کے طرزِ عمل کا تابع بنا کر نہ رکھو۔ یہ کہنا غلط ہے کہ اگر لوگ بھلائی کریں گے تو ہم بھلائی کریں گے اور لوگ ظلم کریں گے تو ہم بھی ظلم کریں گے۔ تم اپنے نفس کو ایک قاعدے کا پابند بناؤ۔ اگر لوگ نیکی کریں تو تم نیکی کرو۔ اور اگر لوگ تم سے بدسلوکی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔

جن لوگوں میں یہ صفات پائی جاتی ہیں وہ اس قابل ہیں کہ انھیں آخرت کی راحتیں نصیب ہوں۔ آیتِ کریمہ میں عقبٰی کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کا لغوی معنی ہوتا ہے، پیچھے آنا۔ کیونکہ ہر فعل کی جزاء اس کے پیچھے آتی ہے۔ اَعُقبَہ کا معنی ہے جازاہ۔ اگر جزاء اچھی ہو تو اس کے لیے العقبۃ، العقبٰی، العاقبہ کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور اگر جزاء بُری ہو تو اس کے لیے

Marfat.com

العقوبۃ، المعاقبۃ اور العقاب کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ يَّدْخُلُوْنَهَا وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يَدْخُلُوْنَ عَلَيْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ ۝ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾

(سورۃ الرعد: ۲۳۔۲۴)

''سدا بہار باغات جن میں وہ داخل ہوں گے اور وہ بھی جو اس کے اہل بنیں گے، ان کے آباؤ اجداد، ان کی ازواج اور ان کی اولاد میں سے اور فرشتے ہر دروازے سے ان پر داخل ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ آپ لوگوں پر سلامتی ہو۔ بوجہ اس کے جو تم نے صبر کیا۔ بس کیا ہی خوب ہے انجام کار کی کامیابی۔''

ایسے اولوالالباب کا انجام

گزشتہ آیات میں اولوالالباب کی صفات بیان کرنے کے بعد پروردگار نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ آخرت کی راحتیں اور انجام کار کی کامیابی عطا فرمائے گا۔ اب اس آیتِ کریمہ میں اس کی تھوڑی سے تفصیل بیان کی گئی ہے کہ انھیں ایسے سدا بہار باغات دیے جائیں گے جن پر کبھی خزاں کا سایہ بھی نہیں پڑے گا۔ بہار تو یہاں بھی آتی ہے اور بہار کے دنوں میں کیفیت یہ ہوتی ہے۔

جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں
لہو کی ہے گردش رگِ سنگ میں

لیکن اِس بہار کو اُس بہار سے کوئی نسبت نہیں۔ یہاں کی بہار زوال اور خزاں سے محفوظ نہیں۔ یہاں جو کلی کھلتی ہے وہ مرجھاتی بھی ہے اور جو پھول مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے اس کی پتیاں بکھرتی بھی ہیں، جو زمین مخملی لباس پہنتی ہے، وہاں چند دنوں کے بعد خاک بھی اڑتی ہے، لیکن قیامت کے دن جن باغوں میں یہ خوش نصیب داخل ہوں گے ان کی بہار پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ وہاں کی خوشیاں ناپائیدار نہیں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ انھیں ایسی خوشیاں بھی عطا کرے گا، عام ذہنوں تک جن کی رسائی بھی آسان نہیں۔ مثلاً ایک مہمان کے لیے حوصلہ مند

Marfat.com

اور خوش اخلاق میزبان قسم قسم کے خوانِ نعمت سجاتا ہے اور ہر طرح سے مہمان کی لذتِ کام و دہن کا لحاظ رکھتا ہے۔ لیکن اس کی طرف تو کبھی دھیان بھی نہیں جاتا کہ اس کے ساتھ ایسے لوگوں کو ٹھہرایا جائے جن کا قیام اس کے لیے خوشی کا باعث ہو۔ جنت میں پروردگار ان خوش نصیبوں کے لیے اس بات کا بھی اہتمام کرے گا کہ جن لوگوں کا قرب ان کی خوشیوں میں اضافہ کرسکتا ہے اور جنھیں یہ اپنے وجود کا حصہ سمجھتے ہیں وہ بیشک جنت کے اس مقام میں رہنے کے قابل نہ ہو جس مقام میں یہ خوش نصیب ہوں گے۔ لیکن محض ان کی دلجوئی اور خوشی کے لیے ان کے آباؤ اجداد، ان کی بیویوں اور ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دی جائے گی تاکہ ان کی خوشیاں ادھوری نہ رہیں اور ان کی مسرتوں میں کسی قسم کا جھول نہ رہے۔

ان کا اعزاز

پھر ان کامیاب لوگوں کے اعزاز کو بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ان کی عزت افزائی اور ان کی تحسین و تعریف کے لیے اللہ تعالیٰ فرشتوں کو حکم دے گا، وہ جنت کے بیشمار دروازوں میں سے ایک ایک دروازے سے داخل ہوں گے اور انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کا پیغام دیں گے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا اظہار بھی کریں گے کہ تمھیں یہ سب کچھ اس لیے عطا ہو رہا ہے کیونکہ تم نے دنیا میں ہر مصیبت کے مقابلے میں، ہر بہلاوے کو رد کرنے میں اور بُرائی کے ہر محرک کو ناکام کرنے میں جو صبر دکھایا ہے آج پروردگار تمھیں اس کا بھرپور صلہ عطا فرما رہے ہیں۔ اور ذرا آنکھیں کھول کر دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو تمھیں صلہ اور انعام عطا فرمایا ہے وہ تمھارے انجام کی کامیابی ہے جس کی فکر نے تمھیں زندگی میں عیش سے دور رکھا تھا۔

Marfat.com

42- کلمہ طیبہ اور کلمہ خبیثہ کا تقابل اور دونوں کے فطری اور طبعی نتائج

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم

﴿اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ O تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ م بِاِذْنِ رَبِّھَا وَیَضْرِبُ اللّٰہُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّھُمْ یَتَذَکَّرُوْنَO وَمَثَلُ کَلِمَۃٍ خَبِیْثَۃٍ کَشَجَرَۃٍ خَبِیْثَۃِ نِ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْاَرْضِ مَالَھَا مِنْ قَرَارٍ﴾ (سورۃ ابراھیم : ٢٤-٢٥-٢٦)

(کیا آپ نے غور نھیں کیا کہ کس طرح تمثیل بیان فرمائی ہے اللہ تعالیٰ نے کلمہ طیبہ کی۔ وہ ایک شجرہ طیبہ کے مانند ہے جس کی جڑ زمین میں اتری ہوئی ہے اور جس کی شاخیں فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ وہ اپنا پھل ہر فصل میں اپنے رب کے حکم سے دیتا ہے اور بیان فرماتا ہے اللہ تعالیٰ مثالیں لوگوں کے لیے تا کہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ اور مثال کلمہ خبیثہ کی ایسی ہے جیسے ایک ناپاک درخت، اسے اکھاڑ لیا جائے زمین کے اوپر سے اور اس سے کچھ بھی قرار نہ ہو۔)

اس آیتِ کریمہ میں نہایت محکم انداز میں انسانی ہدایت کے لیے چند بنیادی باتیں ارشاد فرمائی گئی ہیں۔ ہم ان باتوں کو ایک ترتیب سے عرض کرتے ہیں۔

1- کلمہ طیبہ کیا ہے؟ نبی کریم ﷺ نے لاالہ الااللہ کو کبھی کلمہ طیبہ سے یاد فرمایا ہے اور کبھی اسے الکلمۃ الجامعۃ کہا ہے۔ یعنی وہ کلمہ جسے پڑھ کر آدمی دائرۂ اسلام میں داخل ہوتا ہے، جو ایمان کی بنیاد اور ایمان کی علامت ہے۔ آپ ﷺ نے اسی کلمہ کے بارے میں مختلف باتیں ارشاد فرمائیں۔ قبائل کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے ہوئے اسی کلمے کو پیش

Marfat.com

فرمایا اور یہ کہا کہ اگر تم اسے قبول کرلو فَهُوَ حَظُّكُمْ فِي الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ تو یہی تمھاری دنیوی قسمت ہے اور یہی اخروی۔ یعنی اسی کلمے کی بدولت تمھیں دنیا میں عزت حاصل ہوگی اور اسی کی بدولت آخرت میں سرخروئی نصیب ہوگی۔ بعض دوسرے مواقع پر لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم یہ کلمہ مجھے قبول کرکے دے دو تو اسی سے تم عربوں کے مالک بن جاؤ گے اور اسی سے عجم تمھارے سامنے جھک جائیں گے۔ یعنی عرب و عجم کی حکمرانی تمھارے قدموں میں ہوگی، اگر تم نے اس کلمے کا حق ادا کردیا۔ اسی کو کلمۂ توحید بھی کہا جاتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ اس کلمے سے مراد تو لاالہ الااللہ ہے یعنی یہ بنیادی عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اِلٰہ نہیں کہ جس کے سامنے سر جھکایا جاسکے۔ جس سے علی الاطلاق مرادیں مانگی جاسکیں جس کی محبت اور نفرت انسانی تعلقات کا حوالہ ہو، جس کی غیر مشروط اطاعت واجب ہو، جو حاکمیت مطلقہ کا حق رکھتا ہو، جس کے مقابلے میں کسی کو قانون سازی کا حق نہ ہو۔ یہ وہ بنیادی تصورات ہیں جو اس کلمے کی صفات ہیں یا اس کے بنیادی اجزاء۔

2- اس کلمہ کی جلالتِ قدر اور تاثیر کلی میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس کے ساتھ شرط یہ ہے کہ اس کلمہ کو شجرۂ طیبہ کی حیثیت حاصل ہے۔ شجرۂ طیبہ کی دو صفات ہیں۔ اس کی جڑیں پاتال میں اتری ہوئی ہوتی ہیں اور اس کی شاخیں فضائے آسمانی میں لہراتی ہیں۔ وہ زمین سے بھی غذا لیتا ہے اور آسمان سے بھی۔ نظریات فاسدہ کا کوئی طوفان اس کی جڑیں نہیں ہلاسکتا۔ اور خواہشات کا کوئی ہیجان اس کی بلندیوں پر غالب نہیں آسکتا۔ یہ کلمہ ایک مومن کے دل کی آواز ہے، اس کے دل کی دھڑکن ہے اور اس کے جسم کی روح ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرح اگر کوئی دشمنِ حق کسی مومن کے سینے پر سِل رکھ کر اس کلمے کو اس کے سینے سے نکال نہیں سکتا۔ جیسے جیسے اسے اذیت دی جائے گی اس سے نکلنے والی آواز اللہ تعالیٰ احد کے سوا کچھ نہیں ہوگی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن کی طرح عمر رضی اللہ عنہ جیسے پُرہیبت آدمی کے سامنے کسی کمزوری کے اظہار کی بجائے یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ:

بہن بولی عمرؓ ہم کو اگر تو مار بھی ڈالے
شکنجوں میں کسے یا بوٹیاں کتوں سے نچوالے
مگر اس دین حق سے ہم تو ہرگز پھر نہیں سکتے
بلندی معرفت کی مل گئی ہے گر نہیں سکتے

Marfat.com

جب یہ کلمہ دل میں اتر جاتا ہے تو سمجھئے کہ ایک شجرۂ طیبہ ہے جو زمین کی پاتال میں اتر گیا۔ اب عقل اور فطرت سے اس کا رشتہ قائم ہو گیا۔ وہ برابر ان سے غذا بھی حاصل کرتا ہے اور ان میں پختگی کا باعث بھی بنتا ہے۔

3- شجرۂ طیبہ کی مانند اس کی اڑان اور اس کی پرواز وسعت آسمانی تک ہوتی ہے۔ آسمان سے برابر ترشحات نازل ہوتے ہیں۔ قدرت کا فیضان اس کے اندر وہ سوز و گداز پیدا کرتا ہے جسے خشیتِ الٰہی اپنا مسکن بنا لیتی ہے۔ فلسفے کی اڑان گھائیاں اور شیطنت کی کہانت سامانیاں اس پر اثر انداز ہونے سے قاصر ہو جاتی ہیں۔

4- شجرۂ طیبہ کی مانند اس کا سایہ گھٹنے میں نہیں آتا، اس کے پھلوں کی مٹھاس کبھی بگڑنے نہیں پاتی، اس کے پھلوں کا رسیلا پن کبھی گدلا نہیں ہونے پاتا، اس پر کبھی خزاں اثر انداز نہیں ہوتی، اس کے اثرات اور اس کے نتائج ابدی اور دائمی ہیں جس پر طبائع کے موسم بھی اثر نہیں ڈال سکتے۔

یہ نغمہ فصل گل و لالہ کا نہیں پابند
بہار ہو کہ خزاں لا الہ الا اللہ

گوشت پوست کا انسان اسی کلمۂ طیبہ سے پہاڑوں جیسا استقلال سیکھتا ہے۔ اس کی اشکِ سحر گاہی سے عبادت میں نور پیدا ہوتا ہے، شیطانی قوتوں کے مقابلے میں اس کا ذکر شمشیر برہنہ بن کے ابھرتا ہے جو باطل کی قوتوں کو تار تار کر کے رکھ دیتا ہے۔ چنانچہ یہی وہ کلمۂ طیبہ آنحضرت ﷺ لے کر آئے اور چند ہی سالوں میں جاہلیت کی دھوپ کے جلے ہوئے لوگ اس کے گھنے سائے میں پناہ لینے لگے۔ دکھوں کے ستائے ہوئے لوگوں کو اسی کلمۂ طیبہ کے حامل دلوں نے آسودگی مہیا کی، اسی کا فیضانِ رحمت دیکھتے ہی دیکھتے جزیرۂ عرب پر گھنگور گھٹا کی طرح چھا گیا، انسانیت کے مقدر کی وہ سحر طلوع ہوئی جس کی امید میں انسانیت نے صدیاں گزاری تھیں۔ جب تک مسلمان کا اصل سرمایہ یہی کلمہ طیبہ رہا تو وہ باطل کے مقابلے میں سب سے بڑی قوت اور دکھوں کے مقابلے میں سب سے بڑی رحمت تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو کل بھی انسان کی ضرورت تھی اور آج بھی انسان کی ضرورت ہے۔

نثار سیدِ کونین پر مرے ماں باپ
سبق دیا بھی تو کیا لا الہ الا اللہ

Marfat.com

کلمۂ خبیثہ کی وضاحت

اس کے مقابلے میں وہ کلمۂ خبیثہ جس کے پھل کفر، شرک اور ان پر مبنی عقائد و نظریات ہیں۔ اس کی مثال اس شجرۂ خبیثہ کی طرح ہے جس میں نہ پھول ہے، نہ پھل، نہ سایہ نہ غذا۔ ہاتھ لگایئے تو اس کے کانٹے ہاتھوں کو زخمی کرتے ہیں اور چکھیے تو زبان زہر آلود ہو جائے۔ اس کے قرب سے وہ بو اٹھے جس سے قوتِ شامہ ماؤف ہو کر رہ جائے۔ ایسے کلمات مختلف ادوار میں سر اٹھاتے رہے، ایسے جھاڑ جھنکار نہ جانے کتنی دفعہ انسانیت کی منزل کھوٹی کر چکے۔ تاریخ میں ان کے بے شمار نام ہیں، لیکن آج انھیں کی ترقی یافتہ شکل ہے جو انسانیت کے لیے سب سے زیادہ مہلک ثابت ہو رہی ہے، لیکن پراپیگنڈا اور ذرائع ابلاغ کا طلسم ایک ایسی مصیبت ہے جس نے ذہنوں کو پراگندہ بھی کیا ہے اور ماؤف بھی۔ لیکن ان سے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جس طرح مزدکیت اپنی موت مر گئی اسی طرح اشتمالیت اور اشتراکیت بھی دم توڑتی جا رہی ہے اور جس طرح ساہوکاری نظام گالی بن چکا ہے اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی اپنی جگہ چھوڑتا نظر آتا ہے کیونکہ یہ وہ شجراتِ خبیثہ ہیں جنھوں نے زمین کے اوپر ایک ہنگامہ مچا رکھا ہے لیکن ان کی جڑیں گہری نہیں۔ انتظار اس کا ہے کہ کب ان کو اکھاڑنے والے ہاتھ تیار ہوتے ہیں، کب وہ نسل اٹھتی ہے جو کلمۂ طیبہ کے سوز سے بہرہ ور ہو کر انسانوں کی بھلائی کے لیے ان کو جڑ سے اکھاڑنے کے لیے اٹھے گی۔ اس وقت دنیا کو معلوم ہو جائے گا کہ اس سراب کی فی الحقیقت کوئی حقیقت نہ تھی اور یہ درختوں کا رس چوسنے والی وہ خوبصورت آکاس بیل تھی جس کی زمین پر کوئی جڑ نہ تھی۔

﴿يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ وَيُضِلُّ اللّٰهُ الظّٰلِمِيْنَ وَيَفْعَلُ اللّٰهُ مَا يَشَآءُ﴾

(سورۃ ابراھیم: ۲۷)

''اللہ تعالیٰ ثباتِ قدم عطا فرمائے گا ان لوگوں کو جو ایمان لائے اس پختہ قول کی برکت سے دنیا کی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کے اعمال رائیگاں کردے گا۔ اور اللہ تعالیٰ جو چاہے کرتا ہے۔''

Marfat.com

کلمہ طیبہ مومن کے لیے ثباتِ قدم کا باعث ہے

مذکورہ بالا آیات میں جس کلمۂ طیبہ کا ذکر ہوا ہے وہی کلمہ ہے جو ایک مومن کے ایمان کا ذریعہ اور اس کی سیرتِ صالح کا ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے ہر مومن کو ثبات و استقامت بخشتا ہے۔ اس پر یقین و ایمان جس درجے کا ہوگا اسی درجے کی نصرت و اعانت آزمائشوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے میسر آئے گی۔ جس خوش نصیب کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کا استحضار نصیب ہو جاتا ہے، شیطان کا کوئی پھندا اس پر کارگر نہیں ہوتا۔ اور نبی کریم ﷺ کی سنت اس کے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں پاتی۔ حتیٰ کہ قبر اور حشر میں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق دستگیری فرمائے گی۔ قبر ایک مومن کے لیے پہلا مرحلہ ہے اور نہایت نازک مرحلہ ہے۔ چنانچہ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق ہی ایک مومن کے کام آئے گی اور حدیث شریف میں اسی آیت کے حوالے سے اسے بیان فرمایا گیا ہے۔ حضرت براء بن عازب سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا المسلم اذا سئل فی القبر یشهدان لا اله الا الله وان محمدا رسول الله فذلك قول الله تعالی یثبت الله الذین امنوا لایة یعنی قبر میں جب ایک مسلمان سے اس کے رب اور اس کے رسول اور اس کے دین کے متعلق سوال کیا جائے گا تو وہ جواب میں کہے گا اشهدان لااله الا الله وان محمدا رسول الله اور یہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمایا یثبت الله الذین امنو الایة اور حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے قال کان النبی صلی الله علیه وسلم اذا فرغ من دفن المیت وقف علیه فقال استغفروا لاخیکم ثم سلواله التثبت فانه الآن یسئال یعنی حضور ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب میت کو دفن کرنے سے فارغ ہوتے تو اس کے قریب کھڑے ہو جاتے اور سب کو فرماتے، اپنے بھائی کے لیے استغفار کرو اور اس کے لیے ثابت قدمی کی دعا مانگو کیونکہ اب اس سے پوچھا جا رہا ہے۔ حضرت سہل بن عمار فرماتے ہیں کہ میں نے یزید بن ہارون کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا۔ میں نے پوچھا سنایئے اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ انھوں نے کہا قبر میں میرے پاس دو بڑے خوفناک اور سخت فرشتے آئے اور مجھ سے دریافت کیا مادینك و من ربك و من نبیك تیرا دین کیا ہے، تیرا رب کون ہے اور تیرا نبی کون ہے؟ فاخذت بلحیتی

Marfat.com

البیضاء وقلت المثلی یقال ھذا وقدعلمت الناس جوابکما ثمانین سنۃ میں نے اپنی سفید داڑھی کو پکڑ کر کہا کیا میرے جیسے شخص سے تم اس قسم کے سوالات پوچھتے ہو۔ ۸۰ سال تک لوگوں کو تمھارے انھیں سوالات کے جوابات پڑھاتا رہا ہوں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جن دلوں میں کلمہ طیبہ اتر چکا ہے اللہ تعالیٰ کس طرح اس کلمہ طیبہ کے ذریعے قبر میں بھی انھیں ثابت قدمی عطا فرماتا ہے اور اسی طرح آخرت میں بھی اسی کلمے کی برکت سے ثباتِ قدم اور استقامت عطا فرمائے گا۔

Marfat.com

43- عدل احسان اور اہلِ قرابت کے حقوق اور بے حیائی گمراہی اور سرکشی سے متعلق احکام و ہدایات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ج يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾(سورة النحل: ٩٠)

(بیشک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا اور اہلِ قرابت کو دیتے رہنے کا اور روکتا ہے بے حیائی، برائی اور سرکشی سے۔ تو وہ تمھیں نصیحت کرتا ہے تا کہ تم نصیحت قبول کرو۔)

سابقہ آیات سے ربط

ہم جانتے ہیں کہ سورۃ النحل مکی سورت ہے اور مکی سورتوں کا اصل موضوع عقائد کی اصلاح ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام مکی سورتوں میں توحید، رسالت اور آخرت پر مختلف اسالیب سے اس طرح زور دیا جاتا ہے کہ وہ دل و دماغ میں اترنے لگتے ہیں اور پھر مشرکین کی جانب سے اعتراضات کیے جاتے ہیں یا سوالات اٹھائے جاتے ہیں تو ان کا جواب دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سورت میں بھی انھی موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ البتہ گزشتہ رکوع کے آخر میں قریشِ مکہ کو ایک چونکا دینے والی بات کہی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قیامت کے دن جب تمام امتوں کا فیصلہ کیا جا رہا ہو گا تو فیصلے کا دارومدار اس بات پر آ کر ٹھہرے گا کہ جو رسولؑ ان امتوں کی طرف بھیجے گئے تھے، انھیں گواہی کے لیے بلایا جائے تا کہ معلوم ہو کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کا

Marfat.com

پیغام اپنی امتوں تک پہنچایا تھا یا نہیں، پھر اسی گواہی پر امتیں اپنے انجام کو پہنچ جائیں گی۔ چنانچہ قریشِ مکہ سے یہ کہا گیا کہ تمھارے فیصلے کے لیے نبی کریم ﷺ کو بطور گواہ اٹھایا جائے گا اور آپ ﷺ سے پوچھا جائے گا کہ کیا آپ ﷺ نے تبلیغ و دعوت کا حق ادا کیا۔ ادائے امانت میں کوئی کمی تو نہیں چھوڑی اور اپنی خیر خواہی میں کوئی دقیقہ چھوٹنے تو نہیں پایا۔ چنانچہ جب آپ ﷺ پوری طرح گواہی دے چکیں گے تو تب اللہ تعالیٰ تمھیں جہنم میں بھیجنے کا حکم دے گا۔ سوچ لو، کہ آج جس کی بات تمھیں سننا گوارا نہیں اور جس کے لیے تم نے مکے کی سرزمین کو "ایذا رسانی کی بھٹی میں تبدیل کر دیا ہے۔ قیامت کے دن اسی پیغمبر کی گواہی پر تمھارے فیصلے کا دارومدار ہے اور مزید یہ بھی فرمایا کہ پیغمبر جو دعوت لے کے آتا ہے اس کی سند اور اس کی تفصیل کے طور پر اللہ تعالیٰ ان پر کتابیں بھی اتارتا ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ پر ایک ایسی کتاب اتاری گئی ہے جس میں ہر دینی ضرورت کا بیان اور زندگی کے ہر شعبے میں ہدایت کا سامان اور اس کے نتیجے میں ایمان لانے والوں کے لیے رحمت اور بشارت بنا کے بھیجی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ جب یہ آیت اتری ہے تو قرآنِ کریم کامل شکل میں نازل ہو چکا تھا کیونکہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآنِ کی تکمیل تو 23 سالوں میں ہوئی ہے جس کے ساتھ ہی آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کی بھی تکمیل ہوگئی۔ البتہ اس وقت قرآنِ کریم مکی زندگی کی ضرورتوں کے مطابق نازل ہو چکا تھا اور عقائد کی ایک ایک ضرورت کو پورا کیا جا رہا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی خیالات میں جہاں جہاں دراڑیں پڑسکتی ہیں ان کے بارے میں بھی ہدایات دی جا رہی تھیں بلکہ میں یہ عرض کروں گا کہ اگرچہ مکی سورتوں میں ہمیں احکام نظر نہیں آتے۔ البتہ جہاں تک مکارمِ اخلاق کا تعلق ہے اس کا نزول تو نزولِ وحی کے فوراً بعد شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے جو نجاشی کے سامنے تقریر کی ہے اس میں بتایا ہے کہ حضور ﷺ ہمیں مکارمِ اخلاق کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ ﷺ اجتماعی زندگی کا قانون تو انھیں نہیں دے رہے تھے کہ ابھی ریاست قائم نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اسلامی معاشرہ بھی وجود میں نہیں آیا تھا۔ لیکن افرادِ انسانی کے طور اطوار کی درستی کے لیے جس اخلاقی تعلیم کی ضرورت تھی اور دماغوں اور دلوں کے تزکیہ کے لیے جن آداب کی ضرورت تھی وہ یقیناً مہیا کیے جا رہے تھے۔ قرآنِ کریم کی اس ترتیب اور اس اسلوب کو اگر سامنے رکھا جائے تو پھر یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہتا کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں جن اخلاقی اقدار کا ذکر کیا جا رہا ہے اس

Marfat.com

کا ربط سابقہ آیات سے کیا ہے۔ اور مزید یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آخری رسول ﷺ آخری دین کی جس دعوت کو تمھارے سامنے پیش کر رہا ہے وہ محض چند اصول اور نظریات کا نام نھیں بلکہ وہ ایک ایسی تربیت گاہ ہے جس میں ہر بات واضح کی جاتی ہے کہ ان اصولوں کی بنیاد پر تیار ہونے والا انسان، انسانی معاشرہ اور اسلامی ریاست کو چلانے والے افراد کس مزاج، کن عادات اور کونسی کی خوبیوں کا مرقع ہیں تا کہ اس سے تمھیں اندازہ کرنے میں آسانی ہو کہ انسانوں کے جس معاشرے میں آپ رہ رہے ہیں اور جس میں سوائے نفرتوں کے کوئی چیز دکھائی نھیں دیتی اِس معاشرے میں اور اُس معاشرے میں جو اسلام پیدا کرنا چاہتا ہے اس کے بنیادی اخلاق اس آیت میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان دونوں معاشروں میں آخر کیا فرق ہے؟

اس آیت کی اہمیت

آیتِ کریمہ میں تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے کہ اور تین باتوں سے روکا گیا ہے، لیکن اخلاقی ستاروں کی اس کہکشاں پر جتنا آدمی غور کرتا ہے، حیرت میں ڈوبتا چلا جاتا ہے کہ جن بنیادی اخلاقیات کا حکم دیا گیا ہے وہ تمام اخلاق کی اساس معلوم ہوتے ہیں اور جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ تمام منکرات کی جڑ معلوم ہوتے ہیں۔ اسلام کا تمام تر اخلاقی نظام انھیں اوامر و نواہی سے پھوٹتا ہے۔ اور پھر یہ کہ جس اعجاز اور جامعیت کے ساتھ ان 6 باتوں کو بیان فرمایا گیا ہے وہ بجائے خود حیران کر دینے والی بات ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے کے بڑے بڑے کافر جو اپنی فصاحت و بلاغت میں عرب بھر میں سند کی حیثیت رکھتے تھے، جب ان میں سے کسی کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی تو وہ حیران اور گنگ ہو کر رہ گیا۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے یہ آیت ولید بن مغیرہ کو پڑھ کر سنائی تو اس نے کہا یَا اِبْنَ اَخِیْ اَعِدْ، میرے بھتیجے ایک بار پھر پڑھ کر سناؤ۔ آپ ﷺ نے پھر اسے پڑھا، تو وہ کٹر دشمن ہونے کے باوجود کہنے لگا واللہ ان له لحلاوة وان عليه لطلاوة وان اصله لمورق واعلاه لمثمر وماهو بقول بشر بخدا یہ تو بڑی شیریں ہے، اس کا ظاہر بڑا رنگین ہے، اس کا تنا پتوں والا ہے اور اس کی شاخیں پھلوں سے لدی ہیں، بخدا یہ کسی بشر کا کلام نھیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا، یہ قرآن کی جامع ترین آیت ہے۔ اس میں

Marfat.com

ہر وہ اچھی چیز مذکور ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح ہر وہ بری چیز موجود ہے جس سے اجتناب ضروری ہے۔ اب ہم اس آیت میں مذکور اوصاف میں سے ایک ایک وصف کو ذکر کرتے ہیں۔

عدل کا مفہوم

1- سب سے پہلے جس بات کا حکم دیا گیا ہے، وہ ہے عدل۔ اس کا مفہوم سمجھنے میں بعض دفعہ کوتاہی کی جاتی ہے۔ عام طور پر اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے، انصاف اور برابری۔ پھر اسی سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ انصاف کا معنی ہوتا ہے، لین دین میں نصف نصف کر دینا۔ اس معنی سے یہ مفہوم اخذ کیا گیا ہے کہ دو آدمی ہوں یا دو گروہ، ان کے درمیان حقوق کی تقسیم نصف نصف کی بنیاد پر ہونی چاہیے حالانکہ ہر عقل رکھنے والا آدمی جانتا ہے کہ حقوق ہمیشہ نصف نصف کی بنیاد پر تقسیم نہیں ہوتے۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو زندگی کے بیشتر شعبے فساد کا شکار ہو جائیں۔ اسی طرح اس سے یہ بات بھی اخذ کی گئی ہے کہ عدل کا معنی ہے مساویانہ تقسیمِ حقوق، حالانکہ یہ بات بھی سراسر فطرت کیخلاف ہے۔ مثلاً والدین اور اساتذہ کے درمیان معاشرتی اور اخلاقی مساوات، اسی طرح اعلیٰ درجے کی خدمات سرانجام دینے والوں اور کم تر درجے کی خدمت ادا کرنیوالوں کے درمیان معاوضوں کی مساوات کو کون مبنی بر حق کہہ سکتا ہے۔ اس لیے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ عدل کا مفہوم نہ انصاف ہے اور نہ برابری بلکہ عدل دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو اور دوسرا یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔ قرآنِ کریم اس بات کا حکم دیتا ہے کہ ہر شخص کو اس کے اخلاقی، معاشرتی، معاشی، قانونی اور سیاسی و تمدنی حقوق پوری ایمانداری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے اس حوالے سے ایسی روشن مثالیں چھوڑی ہیں جس پر بجا طور پر مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ اسلامی شریعت نے جس طرح انسانوں میں حقوق کی تقسیم کی ہے اور حقوق میں جو توازن اور تناسب ملحوظ رکھا ہے، جدید دنیا آج تک اس کا صحیح ادراک نہیں کر سکی۔ اور پھر جس بے لاگ طریقے سے اسلامی عدالتیں عام انسانوں کو عدل مہیا کرتی رہی ہیں، وہ بجائے خود مسلمانوں کے لیے بہت بڑا سرمایہ ہے۔ آج کون سا ملک ہے جس میں حکمرانوں کو عموماً عدالتوں میں حاضری سے مستثنیٰ نہ رکھا گیا ہو اور کتنے ملک

Marfat.com

ہیں جہاں غریب کے دعوے پر کسی امیر یا حکمران کو سمن جاری کیے جاتے ہیں۔ اب تو اندھیر نگری کا عالم یہ ہے کہ بڑی قومیں جو دنیا کو اپنے طریقے سے چلانا چاہتی ہیں انھوں نے اپنے لیے زبردستی کچھ حقوق خاص کر لیے ہیں۔ جس ملک کے وسائلِ دولت پر چاہیں قبضہ کر لیں۔ اگر کوئی قوم مدافعت کے لیے کھڑی ہو جائے تو ان کا خون خاک کا رزق بنا دیا جاتا ہے۔ آج مسلمان ہونا سب سے بڑا جرم کہلاتا ہے جبکہ مسلمانوں نے عدل کے ہر راستے میں ایسی ہر تقسیم کو مٹا ڈالا تھا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی عدالت میں ایک یہودی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے خلاف کیس کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس بات پر ناگواری کا اظہار کیا کہ امیر المومنین رضی اللہ عنہ نے مجھے تو کنیت سے پکارا اور یہودی کا نام لے کر۔ اس سے یقیناً یہودی کو یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اسلام شاید یہودی کو عدالتی معاملے میں مسلمان کے برابر نہیں سمجھتا۔ اگر آپ رضی اللہ عنہ نے مجھے کنیت سے پکارا تھا تو اسے بھی کنیت سے پکارنا چاہیے تھا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ نے ترکستان کے گورنر کو حکم دیا کہ تم نے چونکہ اسلامی احکام کے مطابق یہ علاقہ فتح نہیں کیا اور غیر مسلموں کے سامنے باقاعدہ اسلام پیش نہیں کیا گیا، اس لیے جتنا علاقہ فتح ہو چکا ہے وہ سب خالی کر دیا جائے۔ چنانچہ اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ از سرِ نو مسلمانوں نے اس علاقے کے غیر مسلموں کے سامنے اسلام پیش کیا اور یہ صاف صاف کہا کہ اگر تم اسلام قبول کر لیتے ہو تو تم ہمارے بھائی ہو اور یہ ریاست تمھارے پاس رہے گی۔ بصورت دیگر ہم تم پر چڑھائی کریں گے اور پھر جو تلوار فیصلہ کرے گی، اس پر عمل ہوگا۔ اس طرح کے عدل کے واقعات مسلمانوں کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں تلاش نہیں کیے جا سکتے۔

احسان کا مفہوم

2- دوسری چیز جس کا حکم دیا گیا ہے، وہ احسان ہے۔ احسان کا معنی ہے، کسی چیز کو بہتر سے بہتر صورت دینا، خوبصورت سے خوبصورت تر بنانا، خوب تر کی تلاش میں ہمیشہ مدارج ہوتے ہیں۔ آخری درجے تک کسی بھی چیز کو پہنچانے کی کوشش کرنا، یہ احسان ہے۔ عدل تو صرف حقوق میں توازن اور تناسب کو کہتے ہیں، لیکن اس سے آگے بڑھ کر حقوق کی ادائیگی میں حُسن پیدا کرنا، دوسرے کے جذبات کا زیادہ سے زیادہ لحاظ کرنا، خیر خواہی اور مروت کے جذبات کو حقوق کا لازمی حصہ بنا دینا اور معاملات کی دنیا میں فیاضی اور حُسنِ سلوک کو لازمی ٹھہرانا

Marfat.com

یہ سب احسان کے اجزا ہیں۔ اسلام نے زندگی کے تمام شعبوں میں جو آسودگی پیدا کی ہے اس کا اصل حُسن احسان سے پیدا کیا ہے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے لیے نہایت درخشاں مثالیں بھی چھوڑی ہیں۔ مثلاً عبادت کے حوالے سے جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ احسان کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ نہ ہو سکے تو یہ تو واقعہ ہے کہ وہ تمھیں دیکھ رہا ہے۔ عبادت کی آخری حد ایک انسان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ عبادت کرتا ہوا خدا کو دیکھے اور یا اس بات پر یقین رکھے کہ خدا اسے دیکھ رہا ہے۔

معاملات کی دنیا کا احسان کیا ہے اور معاملات میں حُسن کس چیز سے پیدا ہوتا ہے۔ سیدنا حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے اور ان کا غلام دسترخوان پر مہمانوں کے لیے کھانا چن رہا تھا۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ تشریف فرما تھے۔ نہ جانے اس کا پاؤں کس طرح الجھا کہ اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا گرم شوربے کا پیالہ اچھلا اور حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی کمر پر آ کر گرا۔ شوربے کی حدت سے یقیناً ناقابلِ بیان تکلیف ہوئی ہوگی۔ آپ رضی اللہ عنہ نے نہایت غصے سے اس کی طرف دیکھا، وہ غلام بھی خاندانِ نبوت میں پلا ہوا نوجوان تھا۔ اس نے فوراً ایک آیت کا ایک جملہ پڑھا وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ کہ جو متقی لوگ ہیں، ان کی ایک صفت یہ ہے کہ وہ غصہ پی جایا کرتے ہیں۔ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے فوراً نگاہیں جھکا لیں۔ اس نے دوسرا جملہ پڑھا وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ اور وہ لوگوں کو معاف کر دیا کرتے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا کہ جا میں نے تجھے معاف کیا۔ غلام نے دیکھا کہ لوہا گرم ہے بس ایک اور چوٹ لگانے کی ضرورت ہے۔ اس نے آیت کا آخری جملہ پڑھا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ اور اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ ہزارہا روپے قیمت رکھنے والا غلام ایک لمحے میں آزاد ہو گیا۔ یہ ہے معاملات کی دنیا کا احسان، کہ خطا کرنے والا نوازا جا رہا ہے، صرف اس لیے کہ ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ سے ہمیں ایک اور حیرت انگیز مثال ملتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی سے جو کی ایک مقدار قرض لی اور واپسی کا وقت مقرر ہو گیا۔ یہودی واپسی کے وقت سے بہت پہلے مطالبے کے لیے آ پہنچا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اتنا فرمایا کہ ابھی تو

Marfat.com

ادائیگی کا وقت نہیں آیا، لیکن وہ اپنے مطالبے پر اڑا رہا، حتیٰ کہ اس نے بدتمیزی شروع کر دی۔ لیکن آپ ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا، سر جھکا کے بیٹھے رہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی دم بخود دیکھ رہے تھے کہ آنحضرت ﷺ کوئی جواب نہیں دے رہے ہیں اور ہمارا از خود بولنا کہیں گستاخی نہ سمجھا جائے۔ وہ ظالم اس سے اور دلیر ہوا اور یہاں تک کہہ گزرا کہ تم جو آلِ عبدالمطلب ہو، تم تو سدا کے نادہندہ ہو، تم قرض لینا جانتے ہو لیکن تمھیں واپسی کی فکر نہیں ہوتی۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر پائے، آپ رضی اللہ عنہ نے اس یہودی کا گریبان پکڑ لیا اور نہایت برہمی سے اس کو ڈانٹا۔ اب آنحضرت ﷺ نے سر اٹھایا، بجائے یہودی کو کچھ کہنے کے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سختی سے کہا کہ اسے چھوڑ دو۔ تم نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے، تمھیں چاہیے تھا کہ اسے بھی سمجھاتے اور مجھے بھی سمجھاتے کہ آپ ﷺ نے اگر قرض لیا تھا تو آپ کو ادائیگی کی فکر کرنی چاہیے تھی۔ تم نے جو سختی کی ہے اب اس کا تدارک اس طرح ہو سکتا ہے کہ جتنا غلہ ہم نے اس سے قرض لیا ہے، اس کا ایک چوتھائی اسے زائد ادا کرو۔ اصل غلہ قرض کا بدلہ ہوگا اور زائد احسان ہوگا۔ یہودی وہاں سے اٹھا کسی چشمے پر غسل کیا اور واپس آ کر کہنے لگا کہ محمد (ﷺ) مجھے کلمہ پڑھاؤ، میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ میں کتاب کا عالم ہوں، ہماری کتاب میں نبی ﷺ آخرالزماں کی جو علامتیں لکھی گئی ہیں، وہ سب میں آپ ﷺ میں اب تک دیکھ چکا تھا، صرف ایک علامت باقی تھی کہ نبی ﷺ آخرالزماں کا حلم اور بردباری گستاخیاں کرنے والوں کو شکست دے دے گی۔ آج میں نے یہ علامت بھی دیکھ لی۔ اس لیے مسلمان ہوتا ہوں۔

مثالیں بہت ہیں سمجھنے کے لیے یہ بھی کافی ہیں۔ اس سے اندازہ کر لینا مشکل نہیں رہتا کہ ادائے حقوق کے علاوہ معاشرے کو خوبصورت بنانے اور افرادِ معاشرہ میں محبت اور آشتی کے پھول اگانے کے لیے ضروری ہے کہ عدل کے ساتھ ساتھ احسان پر بھی عمل کیا جائے۔

اہلِ قرابت کو دینے کا حکم

3- اس آیتِ کریمہ میں تیسری جس بات کا حکم دیا گیا ہے وہ غریب اہلِ قرابت کی مدد کرنے کا ہے۔ قرآنِ کریم کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک انسانی اصلاح کا دارومدار دو باتوں کی اصلاح پر ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کا تعلق اپنے اللہ تعالیٰ سے درست ہو جائے۔ اس کا سر اس کے آستانے کے سوا کسی اور آستانے پر نہ جھکے۔

Marfat.com

وہ اس کی ذات وصفات پر ایسا یقین رکھے کہ اس کا دل صرف اسی کی محبت سے معمور ہو، وہ اسی کے خوف سے لرزے، اسی کا تقویٰ اختیار کرے، اسی پر بھروسہ رکھے اور اپنی ہر ضرورت کے لیے اسی کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور اسی کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارے۔
دوسری چیز یہ ہے کہ انسان کا انسان سے تعلق درست ہو۔ وہ دوسرے انسان کے بارے میں اسی ہمدردی اور فکرمندی کے ساتھ سوچے جیسے اپنی ذات کے بارے میں سوچتا ہے۔ انسانی رشتوں کی عظمت کا لحاظ کرے اور قدرت نے مختلف ذمہ داریوں کے حوالے سے انسانوں میں جو واحدے (یونٹ) قائم کیے ہیں ان کی پاسداری کرے۔ انسانوں میں سب سے پہلا واحدہ آدمی کا اپنا گھر ہے جس میں اس کے بیوی بچے اور اس کے والدین ہیں یہ حقیقی اور مکمل طور پر اس واحدے کے تمام افراد کی ضرورتوں کا ذمہ دار ہے۔ اس کے بعد دوسرا واحدہ اہلِ قرابت کا ہے۔ ان میں مختلف درجات ہیں جو شخص قرابت کے اعتبار سے قریب ہے وہ ذمہ داری کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اور جو قرابت کے اعتبار سے دور ہے، وہ ذمہ داری کے اعتبار سے بھی دور ہے۔ ماں باپ اور بیوی بچوں کے بعد سب سے پہلا تعلق اہلِ قرابت کا ہے، اس لیے انھیں دوسرے واحدے کا درجہ دیا گیا ہے اور ان کی ذمہ داریوں کو پہلے واحدے کے بعد سب سے اہم تر قرار دے کر یہاں اس کا حکم دیا گیا ہے۔ اہلِ قرابت کے تعلق ہی کو صلہ رحمی کہتے ہیں اور اس کی تاکید جس طرح قرآن وسنت میں کی گئی ہے وہ قرآن وسنت کے ہر طالب علم پر پوری طرح عیاں ہے۔ آنحضرت ﷺ نے یہاں تک فرمایا لایدخل الجنة قاطع ''قطع رحمی کرنے والا جنت میں نہیں جائے گا۔'' اور مزید یہ بات کہ اہلِ قرابت کی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے صرف نصیحت پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ یہ تاکید فرمائی کہ ہر صاحبِ استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذات اور اپنے بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔ ہر خوشحال آدمی اس بات کا پابند ٹھہرایا گیا ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں میں برابر نظر رکھے کہ ان میں کوئی شخص بنیادی ضروریات سے تہی دامن تو نہیں۔ اس کے نزدیک یہ بات انتہائی ناپسندیدہ ہے کہ خوشحال افراد تو عیش وعشرت کی زندگی گزاریں اور غریب اہلِ قرابت نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہوں۔ قرابت داری چونکہ ایک واحدہ ہے، اس لیے اس واحدے کی ہر کڑی دوسری کڑیوں سے پیوست رہنی چاہیے اور کہیں بھی شکست وریخت کا عمل سب کے لیے فکرمندی کا باعث ہونا چاہیے۔ اسلامی احکام کی روح کو دیکھتے ہوئے

Marfat.com

صاف محسوس ہوتا ہے کہ خاندان کے غریب افراد کو سنبھالا دینا، خاندان کے خوشحال افراد کی ذمہ داری ہے۔ اسلامی حکومت اس بات کی ذمہ دار ٹھہرائی گئی ہے کہ وہ مسلمان معاشرے کے عناصرِ ترکیبی پر نظر رکھے اور ہر عنصر کو اپنے حقوق ادا کرنے کا پابند بنائے۔ اسلام میں جس طرح میراث میں صرف بیوی بچوں اور والدین ہی کو شامل نہیں کیا بلکہ ذوی الارحام کو بھی شامل فرمایا ہے۔ اسی طرح ذوی الارحام کی ذمہ داریاں بھی ان پر ڈالی ہیں۔ خلفائے راشدین نے آنحضرت ﷺ کے ایسے ہی ارشادات سے ان ذمہ داریوں کو سمجھا اور اس کے مطابق فیصلے فرمائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک یتیم بچے کے چچازاد بھائیوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی پرورش کے ذمہ دار بنیں۔ اور ایک دوسرے یتیم کے حق میں فیصلہ کرتے ہوئے آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر اس کا کوئی بعید ترین رشتہ دار بھی موجود ہوتا تو میں اس پر اس کی پرورش لازم کر دیتا۔ غور فرمایئے، جس معاشرے میں عدل کی کارفرمائی ہو اور کسی حق تلفی اور حق شکنی کو برداشت نہ کیا جاتا ہو بلکہ معاشرے کا ہر فرد آگے بڑھ کر اس طرح دوسروں کے حقوق ادا کرنے کی فکر میں ہو کہ جس سے ایثار کی روح جھلکتی دکھائی دیتی ہو، اور احسان کا جذبہ مہکتا ہو اور تمام افرادِ معاشرہ اپنے اہلِ قرابت کو اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوں اور ہر غم اور خوشی میں چھوٹے بڑے برابر ایک ہی جذبہ سے شریک ہوتے ہوں تو یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس معاشرے میں محبت اور آشتی کے کیسے پھول کھلتے ہوں گے۔ اور کس قدر خوشحالی، آسودگی اور اطمینان کی گھٹا ان کے سروں پر سایہ کناں رہتی ہوگی۔

فحشآء کا مفہوم

اوپر کی تین بھلائیوں کے مقابلے میں تین بُرائیوں سے روکا گیا ہے۔ یعنی تین باتوں کا حکم دیا گیا ہے، جس سے اسلامی معاشرہ جنت بن سکتا ہے۔ اور تین باتوں سے روکا گیا ہے، جن سے رکنے میں اسلامی معاشرے کے لیے عافیت کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ ان تین میں سے پہلی بُرائی فحشآء ہے۔ کل قبیح من قول و فعل ہر وہ کام اور ہر وہ بات جو قبیح ہو اسے فحشآء کہتے ہیں۔ اس کا اطلاق تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال پر ہوتا ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ ہر وہ بُرائی جو اپنی ذات میں نہایت قبیح ہو اسے فحش یا فحشآء کہتے ہیں۔ مثلاً بخل، زنا، برہنگی، عریانی، عملِ قومِ لوط، محرمات سے نکاح کرنا، چوری، شراب نوشی، بھیک

Marfat.com

مانگنا، گالیاں بکنا اور بدکلامی کرنا وغیرہ۔ اسی طرح علی الاعلان بُرے کام کرنا اور بُرائیوں کا پھیلانا بھی فحش ہے۔ مثلاً جھوٹا پروپیگنڈا، تہمت تراشی، پوشیدہ جرائم کی تشہیر، بدکاریوں پر ابھارنے والے افسانے اور ڈرامے اور فلم اور عریاں تصاویر، عورتوں کا بن سنور کر منظرِ عام پر آنا، علی الاعلان مردوں اور عورتوں کے درمیان اختلاط ہونا اور سٹیج پر عورتوں کا ناچنا اور تھرکنا اور نازو انداز کی نمائش کرنا وغیرہ۔ (تفہیم القرآن)

قومیں جب زوال کا شکار ہوتی ہیں تو ان کے زوال کی انتہا یہ ہوتی ہے کہ ان میں سے کچھ لوگ بے حیائی کے کاموں پر اس قدر دلیر ہو جاتے ہیں کہ انھیں نہ اللہ تعالیٰ کا خوف رہتا ہے اور نہ بندوں سے حیا رہتی ہے بلکہ وہ اپنی بے حیائی پر اتراتے اور اسے اپنی ترقی کی علامت سمجھتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ ہماری عید اس دن ہوتی ہے جس دن ہم گناہ کے ہر تصور سے محفوظ رہیں، لیکن ان لوگوں کے لیے وہ گھڑی، وہ وقت، وہ دن اور وہ رات انتہائی اذیت ناک ہوتی ہے جب ان کے سفلی جذبات کی تسکین کا سامان نہیں ہوتا۔

اور بیشتر لوگ وہ ہوتے ہیں جنھیں حیا اور بے حیائی اور نیکی اور بُرائی کی علامت بھول جاتی ہے۔ اور ان کے اندر سے یہ احساس مر جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی فرق ہے بھی یا نہیں۔ وہ گناہ کو صواب اور صواب کو گناہ سمجھتے ہیں۔ انھیں اچھائی سے خوشی نہیں ہوتی اور بُرائی سے افسوس نہیں ہوتا۔ ان کے اندر ایک نیا معدہ اور نیا دل وجود میں آتا ہے جس سے ان کی ساری زندگی متاثر ہوتی ہے۔ آج جب ہم اپنی اجتماعی اور ملکی زندگی کو دیکھتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم زوال کی تکمیل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ کل تک جو چیز گناہ تھی اور شریف گھرانوں میں جس کا تصور بھی داخل نہیں ہو سکتا تھا، آج وہ ہر گھر کی زینت بن چکا ہے۔ بے حیائی ہماری خواب گاہوں تک پہنچ گئی ہے۔ مرد و زن کا اختلاط اب بُرائی نہیں فیشن بن گیا ہے۔ والی اللہ المشتکیٰ۔

منکر کا مفہوم

دوسری چیز جس سے منع کیا گیا ہے وہ منکر ہے۔ منکر کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ وہ معروف کا ضد ہے۔ معروف ان تمام اچھی باتوں کو کہتے ہیں جس کا ہر اچھی سوسائٹی میں چلن ہو۔ اور عقلِ سلیم جس کے صحیح ہونے پر ناطق ہو۔ وہ مزاج جو شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہو وہ

Marfat.com

اسے قبول کرنے سے انکار نہ کرے۔ اس کے مقابلے میں منکر وہ ہوگا جو کسی اچھی سوسائٹی کا چلن نہ بن سکے، جسے عقلِ سلیم قبول کرنے سے انکار کرے۔ اور شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا مزاج اس سے کراہت محسوس کرے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ منکر وہ ہے جسے تمام سابقہ شریعتوں نے ناپسند کیا اور یا ماانکرہ الشرع بالنھی عنه جس چیز کو شریعت اسلامی نے ناپسند بھی کیا ہو اور اس سے روکا بھی ہو۔ اس میں وہ تمام مکروہ چیزیں آجاتی ہیں جن سے آنحضرت ﷺ نے روکا یا آپ ﷺ نے انھیں ناپسند فرمایا۔ چاہے آپ ﷺ کی ناپسندیدگی نص صریح سے ثابت ہو یا دلالت واقتضا سے۔

بغی کا مفہوم

تیسری چیز جس سے روکا گیا ہے، وہ ہے بغی۔ جس کے معنی سرکشی، تعدی، اپنی حد سے تجاوز کرنا اور دوسرے کے حقوق پر دست درازی کرنا۔ کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی طاقت اور اپنے زور واثر سے ناجائز فائدہ اٹھا کر دوسروں کو دبانے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسی صورت میں اس کا تعلق حقوق العباد سے ہوگا۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اپنی حدود کو نھیں پہچانتا اور اپنی بندگی کی حد کو پھلانگتا ہوا الوہیت کی حدود میں داخل ہوجاتا ہے اور شرعی احکام کی پابندی کی بجائے اپنے احکام چلانے کی کوشش کرتا ہے یا ہوائے نفس کو اپنا معبود بنالیتا ہے۔ یہ تمام سرکشی کی صورتیں ہیں جس سے بندگی کا تصور پامال ہوجاتا ہے۔

Marfat.com

44- مسلمانوں کو جہاد کی اجازت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

﴿اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّھُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصْرِھِمْ لَقَدِیْرُ ○ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّا اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰہِ النَّاسَ بَعْضَھُمْ بِبَعْضٍ لَّھُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْکَرُ فِیْھَا اسْمُ اللّٰہِ کَثِیْرًا وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ﴾

(اجازت دے دی گئی ان لوگوں کو جن کے خلاف جنگ کی جارہی ہے۔اس سبب سے کہ ان پر ظلم ہوا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے۔ جو لوگ اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے صرف اس جرم میں کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔اور اگر اللہ لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو تمام خانقاہیں، گرجے، کنیسے اور مسجدیں جن میں اللہ کا کثرت سے نام لیا جاتا ہے سب مسمار کردیے جاتے۔اور بے شک اللہ ان لوگوں کی مدد فرمائے گا جو اس کی مدد کریں گے۔ بے شک اللہ قوی اور غالب ہے۔)

نبی کریم ﷺ نے کوہِ صفا پر کھڑے ہوکر جب اپنی قوم کو اللہ کی توحید کی دعوت دی اور انھیں یاد دلایا کہ تمھیں اللہ نے اس زمین پر ایک خاص مقصد کے لیے پیدا فرمایا ہے اور تمھاری اس زمین پر ایک خاص حیثیت ہے اور اس حیثیت کے مطابق تم ذمہ داریاں ادا کرنے کے پابند ٹھہرائے گئے ہو۔ایک دن ایسا آنے والا ہے جب تمھاری مقصدی اور منصبی ذمہ داریوں کے

Marfat.com

حوالے سے تم سے جواب طلب کیا جائے گا۔ زندگی جیسی قیمتی نعمت سے فائدہ اٹھانے کے حوالے سے ایک ایک لمحے کا حساب ہوگا اور تمھیں جو ضابطۂ حیات عطا کیا گیا ہے اس کے ایک ایک حکم پر عمل کے حوالے سے نامہ عمل دیکھا جائے گا۔ اہلِ مکہ نے جیسے ہی آنحضرت ﷺ کی اس طرح کی باتیں سنیں اور ان کی دعوت کا جائزہ لیا تو چند سعید لوگوں کے سوا باقی لوگوں نے بجائے اسے قبول کرنے کے اپنے لیے اسے دشمنی کا پیغام سمجھا۔ جب انھیں بتایا گیا کہ تم اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی اولاد اور ملتِ ابراہیم کا وارث سمجھتے ہو جبکہ اس کی بنیاد توحید تھی اور اللہ کا یہ گھر اسی توحید کا مرکز بنایا گیا تھا اور یہیں سے ایک امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے اور آخری رسول کے مبعوث کیے جانے کی دعائیں کی گئی تھیں۔ لیکن تم نے اس پوری تاریخ کو بدل کر شرک کی بنا ڈالی ہے۔ توحید کے مرکز کو تیرتھ یاترا میں تبدیل کر دیا ہے۔ جہاں صرف اللہ کی عبادت ہوتی تھی وہاں تم نے بت پرستی کو رواج دیا ہے۔ تم نے نہ صرف ابراہیم کے نام کو بٹہ لگایا بلکہ ملتِ ابراہیم کے پرخچے اڑا دیے۔ تو وہ بجائے اس کے کہ اپنے جرائم کو سمجھتے اور اپنی غلطیوں کا ادراک کرتے انھوں نے اسے اپنے اور اپنے آباؤ اجداد پر ایک الزام سمجھا اور وہ آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کی دشمنی پر تل گئے اور رفتہ رفتہ ان کی یہ دشمنی شرافت کی تمام حدود سے نکل گئی۔ قرابت داری کو بھول گئے، قبائل کے آداب کو بھی نظر انداز کر دیا اور اس حد تک مسلمانوں پر مشقِ ستم کی کہ ظلم اور بربریت کا کوئی ایسا زخم نہیں جو مسلمانوں کو نہ لگایا گیا ہو۔ دہکتے انگاروں پر اسلام کے جانثاروں کو لٹایا گیا، تپتی ہوئی چٹانوں پر ننگے جسموں کو گھسیٹا گیا، آگ کی دھونی دی گئی، تلواروں اور تیغوں کے زخم لگائے گئے۔ ابوجہل جیسے بدقماش انسان نے ایک مومنہ کے اندامِ نہانی میں نیزہ مار کر اسے قتل کر دیا۔ آنحضرت ﷺ کے قتل کے منصوبے باندھے جانے لگے۔ مسلمانوں نے روز روز کی اس اذیت رسانی سے نجات حاصل کرنے اور آزادی سے اللہ کا نام لینے کے لیے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ کے ظالموں نے مدینہ منورہ میں بھی ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ چراگاہوں پر شب خون مارے جانے لگے، جو جانور ہاتھ آتے انھیں لے اڑتے اور اکا دکا محافظوں کو قتل کر کے بھاگ جاتے۔

مسلمان مسلسل مکہ معظمہ میں تیرہ سالوں تک ان قیامتوں کا سامنا کرتے رہے۔ بڑی سے بڑی مصیبت پر صبر کی تصویر بنے اللہ کی رضا کو دیکھتے رہے۔ اب جبکہ ہجرت کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو ایک مرکز عطا فرمایا اور مسلمانوں کی ایک تنظیمی ہیئت وجود میں آئی تو مسلمانوں میں

Marfat.com

بیت اللہ سے محرومی کا ایک شدید احساس پیدا ہونے لگا اور قریش کے مظالم کے خلاف ردعمل نے ایک اضطراب کی شکل اختیار کرلی اور دلوں میں یہ بات مچلنے لگی کہ کاش! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں قتال کی اجازت ہوتی تو ہم اللہ تعالیٰ کے گھر کو واگزار کراتے اور ظالموں سے ظلم کا انتقام لیتے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان احساسات کی قدر فرمائی اور مسلمانوں کی شیرازہ بندی، امیر کی اطاعت اور مرکزِ اسلام جیسی بنیادی ضرورتوں کے پورا ہوجانے کے بعد قتال کی اجازت دے دی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں صرف اجازت دی گئی ہے تاکہ مسلمان اس کے لیے تیاری کی فکر کریں اور اس بات کا اطمینان رکھیں کہ اجازت مل جانے کے بعد عملی طور پر قتال کا حکم اب بہت دور نہیں۔ بعض اہلِ علم کی تحقیق کے مطابق یہ آیتِ کریمہ ذی الحج ایک ہجری میں نازل ہوئی اور قتال کا حکم جنگِ بدر سے کچھ پہلے رجب یا شعبان دو ہجری میں نازل ہوگیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح پہلے صرف اجازت دی گئی تاکہ طبیعتوں کا اضطراب ختم ہو اور ولولوں کی دنیا آباد ہونے لگے اسی طرح جب قتال کا حکم آیا تو پہلے صرف دفاعی جنگ کی اجازت دی گئی اور ارشاد فرمایا: وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ ''تم اللہ کے راستے میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں''۔ پھر حکم آیا: كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ''تم پر قتال فرض کردیا گیا ہے حالانکہ وہ تمھارے لیے ناپسندیدہ ہے'' اور فتح مکہ کے بعد حکم نازل ہوا وَاقْتُلُوهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوهُمْ ''اور انھیں قتل کرو جہاں بھی انھیں پاؤ''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملی نقطہ نگاہ سے جیسے جیسے ضرورت پیدا ہوتی گئی ویسے ویسے جنگ کے حکم میں بھی وسعت آتی گئی ہے اور اب جبکہ تکمیلِ دین ہوچکی اور جہاد وقتال کے تمام احکام سامنے آگئے تو اب یہ بحثیں بے کار ہیں کہ جنگ دفاعی ہونی چاہیے یا اقدامی؟ اسلام نے کیا ایک کی اجازت دی ہے یا دونوں کی؟ جو شخص بھی کھلے دل و دماغ سے قرآنِ کریم کو پڑھے گا اسے صاف نظر آئے گا کہ حالات کے مطابق اللہ تعالیٰ نے کفر کی طاقت توڑنے اور کبھی ظالم کا ہاتھ روکنے کے لیے ہر طرح کی جنگ کی اجازت دی ہے۔

اجازت کا سبب

یہ بات بھی واضح کردی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت کیوں دی ہے۔ مسلمان اپنی جان اور ایمان بچا کر اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کرکے اپنے

Marfat.com

وطن اور اپنے گھروں سے نکلے تھے۔ لیکن ان ظالموں نے مدینہ میں بھی ان کو آرام سے بیٹھنے نہ دیا۔ بار بار حملے کرتے، چراگاہیں لوٹتے، اکادکا لوگوں کو قتل کرتے، اور ساتھ ہی ساتھ مدینہ کے سربرآوردہ لوگوں کو اکساتے کہ یہ مسلمان ہمارے بھگوڑے ہیں انھیں مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم تمھارے خلاف بھی طاقت استعمال کریں گے۔ عبداللہ بن ابی کو نہایت تہدید آمیز خط لکھا گیا۔ کعب بن اشرف کے ساتھ سازش کا تانا بانا بنا گیا۔ چنانچہ انہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی ہے جن سے کفارِ مکہ لڑائی کرنا چاہتے ہیں اور آرام سے بیٹھنے نہیں دیتے اور جنھیں برسوں تک ظلم کا نشانہ بنایا گیا۔

مسلمان اگرچہ نبی کریم ﷺ کی قیادت میں نہایت تیزی سے ایک امت کی شکل اختیار کرتے جارہے تھے۔ انھیں نہایت بے دار مغز اور صالح قیادت میسر تھی۔ مدینہ کی بستی ان کے لیے ایک مرکز کی شکل اختیار کرچکی تھی۔ مسلمانوں کا ایک ایک فرد اپنے اندر حیات افروز اولوالعزمیوں سے معمور دنیا آباد کرچکا تھا۔ ان میں سے ہر شخص اپنے تئیں ایک انجمن تھا۔ وہ نفع و ضرر کے پرانے پیمانوں سے رشتہ توڑ چکے تھے۔ آنحضرت ﷺ کا کامل اتباع اور اللہ پر بھروسہ اور اعتماد ان کی زندگی کا عنوان بن چکا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود وہ بہرحال جنگ کی تباہ کاریوں کا سامنا کرنے کی بظاہر ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مدینہ ایک قصبہ سے زیادہ وسعت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے وسائل نہایت محدود تھے۔ مسلمانوں کی افرادی قوت کسی بڑے طوفان کا سامنا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ ان کے معاشی ذرائع اس قابل نہ تھے کہ وہ کسی جنگ کا بوجھ اٹھا سکتے۔ قریشِ مکہ شاید ان کی ظاہری حالت کو دیکھ کر دلیر ہوئے جارہے تھے۔ پروردگار نے اس پوری صورتحال کو ایک جملے کے ساتھ الٹ ڈالا کہ قریش اور دشمنوں کی نگاہ میں صرف مسلمانوں کی ظاہری حالت ہے اور وہ انھیں کے حالات کو دیکھتے ہوئے اپنی دشمنی اور ایذا رسانی کو وسعت دیتے جارہے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ مسلمان تو خدائی فوجدار ہیں۔ وہ بتوں سے تعلق توڑ چکے، قبیلوں سے منہ موڑ چکے، اور بڑی سے بڑی قوت کو پاؤں کی ٹھوکر سے اچھال چکے، اور ایک نئی زندگی کے پیامبر بن کر اٹھے ہیں۔ اس لیے ان کی پشت پر دنیا کی بے شک کوئی قوت نہیں لیکن وہ جس کے نام اور جس کے پیغام کے لیے سب کچھ قربان کرچکے ہیں وہ ان کی پشت پر ہے اور اس نے یہ ذمہ داری لے لی ہے کہ ہم مسلمانوں کی مدافعت کریں گے۔ اس میں مسلمانوں کو حد درجہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ تمھیں دشمن کی قوت سے اثر قبول کرنے کی ضرورت نہیں اللہ کی قوت تمھارے ساتھ

Marfat.com

ہے اور دشمن کو وارننگ دی گئی ہے کہ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ تمھاری لڑائی مسلمانوں سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے خدا سے ہے اور ان کا خدا ان کی مدد کرنے کی قدرت رکھتا ہے۔ تم ساری دنیا کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لو تو اللہ کی قدرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہو۔

آیت کے آغاز میں فرمایا گیا ہے کہ جن لوگوں کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن پر اب تک ظلم کیا گیا ہے اور وہ اس ظلم کے ہاتھوں تنگ آکر اپنی جان اور ایمان بچانے کے لیے اپنے گھروں کو چھوڑ کر نکلے ہیں۔ اب دوسری آیت میں مسلمانوں پر کیے جانے والے مظالم کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔

انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ بڑے سے بڑا ظلم برداشت کر لیتا ہے لیکن وہ حتی الامکان اپنا گھر چھوڑنا پسند نہیں کرتا۔ گھر انسان کی عزت کی علامت اور اس کی حفاظت کا حصار ہے۔ اس کے چھن جانے کے بعد آدمی کی کوئی پناہ گاہ نہیں رہتی۔ کوئی اس کا حوالہ نہیں رہتا۔ کسی کے گھر چھوڑ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے زندہ رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ صحابہ کرام کا اپنے گھروں اور وطن کو چھوڑنا ایسے ہی تمام مصائب کا نتیجہ تھا اور ایسے ہی بے پناہ مظالم تھے جس نے مسلمانوں کو ہجرت پر مجبور کیا تھا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان سے وطن چھڑا لیا گیا، گھر چھین لیا گیا، لیکن ان کا کوئی قصور نہیں بتایا گیا کیونکہ وہ اپنے معاملات اور سیرت و کردار میں ان لوگوں سے ہزار ہا درجہ بہتر تھے، ان کا قصور اگر کوئی تھا تو صرف یہ کہ انھوں نے شرک کی تمام آلودگیوں سے منہ پھیر کر اور شرک کے ہر آستانے سے سر اٹھا کر صرف اللہ کو اپنا رب قرار دیا تھا۔

خونے نہ کردہ ایم و کسے را نہ کشتہ ایم
جرم ہمیں کہ عاشقِ روئے تو گشتہ ایم

قریش خوب جانتے تھے کہ ربنا اللہ کہنے کا مطلب کیا ہے۔ اللہ کی ربوبیت کا یقین اللہ کے سوا ہر پرستش اور ہر اطاعت سے انسان کو آزاد کر دیتا ہے۔ اللہ کی ربوبیت کے فیضان میں چونکہ کوئی تخصیص نہیں اس کے سورج کی روشنی جس طرح محلات میں پہنچتی ہے اسی طرح غریب کے جھونپڑے کو بھی منور کرتی ہے، تو اس کی ربوبیت کا یقین رکھنے والا انسانوں میں ہر طرح کی تقسیم اور ہر طرح کے تفاوت سے بغاوت کر دیتا ہے۔ اس لیے قریش خوب سمجھتے تھے کہ یہ بظاہر درویش صفت لوگ اپنے اندر کیسے طوفانوں کی طاقت رکھتے ہیں اور کس قدر بے پناہ تبدیلیوں کا پیغام بن کر اٹھے ہیں۔

Marfat.com

جہاد کی حکمت

وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ آیتِ کریمہ کے اس حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی نہایت زریں حکمت بیان کی ہے اور اسی میں مسلمانوں کو قتال کی جو اجازت دی گئی ہے اس کی وجہ بھی ذکر کی گئی ہے۔ انسانی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حق و باطل اور خیر و شر کی آویزش ہمیشہ انسانوں میں جاری رہی ہے۔ پہلے انسان حضرتِ آدم کو اللہ نے خیر کا نمائندہ بنا کر بھیجا تھا اور ان کے ساتھ ہی ابلیس خیر کی قوتوں کو ناکام کرنے اور شر کی تخم ریزی کے لیے زمین پر اترا تھا۔ ہر دور میں نبی آتے رہے اور خیر کی قوت کی نمائندگی اور اس کے احیاء کے لیے کوششیں کرتے رہے اور ابلیس نے ہمیشہ اپنے منفی کردار کے ذریعے نبوت کی کوششوں کو ناکام کرنے کے لیے ہر طرح کے حربوں سے کام لیا۔ برائی کے بڑے بڑے گروہ وجود میں آئے اور بعض دفعہ تخت و تاج کی قوتیں اس کے لیے استعمال ہوتی رہیں۔ جنھوں نے اپنی حکومت اور وسائل سے کام لے کر برائی کی قوتوں کو سرافراز کیا اور نیکی کے لیے جینا مشکل کر دیا۔ خیر و شر کے اس امتیاز کو دیکھتے ہوئے بعض کمزور طبیعتوں نے رہبانیت اور ترکِ دنیا کا راستہ اختیار کیا اور اس طرح سے خیر کی قوتوں کو مزید کمزور کر دیا۔ چنانچہ اللہ کی زمین کو فساد سے بچانے اور انسانیت کو تباہی سے محفوظ کرنے کے لیے اللہ نے مختلف ادوار میں اپنے پیغمبروں کے ذریعے جہاد و قتال کا حکم دیا تاکہ ایسی شیطانی قوتوں کو جو بڑے بڑے دھڑوں کی صورت میں منظّم ہو چکی ہیں اور بعض جگہ تخت پر متمکن ہو کر اپنے وسائل کو برائی کے پھیلانے اور نیکی کو ختم کرنے میں بروئے کار لا رہی ہیں، سرنگوں کرنے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ تاریخ کے مختلف ادوار میں ہم حق و باطل کی اس کشمکش کو حرب و ضرب کی قوت میں ڈھلتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس میں اگر ایک طرف ہمیں فرعون اور نمرود اور ہامان اور شداد برائی کے نمائندوں کے طور پر نظر آتے ہیں تو دوسری طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام نبرد آزما دکھائی دیتے ہیں۔ حضرتِ طالوت حضرت داؤد اور حضرت سلیمانِ علیہم السلام کو خیر کے نمائندوں کی صورت میں خیر اور نیکی کو سربلند کرتے اور بدی کی قوتوں کو سرنگوں کرتا ہوا دیکھتے ہیں۔ یہی حق و باطل کی آویزش ہے جو مختلف ناموں سے ہمیشہ جاری رہی اور اسی نے مدینہ منورہ میں جہاد و قتال کی نئی تاریخ رقم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اپنی حقیقت میں یہ کوئی نئی بات نہیں بقول اقبال ؎

Marfat.com

نہ ستیزہ گاہِ جہاں نئی نہ حریفِ پنجہ شکن نئے
وہی قوتِ اسداللّٰہی وہی مرجبی وہی عنتری

یہی جہاد وقتال کی وہ قوت ہے جس نے ہمیشہ خیر اور نیکی کے مراکز اور عبادت گاہوں کا تحفظ کیا ہے۔ اس لیے یہاں فرمایا گیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس طرح نیک لوگوں کے ذریعے برائی کی قوتوں کی سرکوبی نہ کرتا تو دنیا میں کوئی خانقاہ، کوئی عبادت گاہ اور کوئی مسجد باقی نہ رہتی۔

عبادت گاہوں کے لیے جو الفاظ قرآنِ کریم نے استعمال کیے ہیں ان کی وضاحت بہت ضروری ہے۔

الفاظ کی وضاحت

صَوَامِعُ: صَوْمِعَةٌ کی جمع ہے۔ صَوْمِعَةٌ اس جگہ کو کہتے ہیں جو بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی آبادی سے دور کسی خاموش گوشے میں واقع ہو، جہاں راہب اور سنیاسی اور تارک الدنیا فقیر رہتے ہیں اور عبادت کے لیے خلوت اور گوشہ نشینی کی زندگی گزارتے ہیں۔ اسی مناسبت سے اس کا ترجمہ ''خانقاہ'' کر دیا جاتا ہے اور یہ موزوں بھی معلوم ہوتا ہے۔

بِیَعٌ: بِیعَةٌ کی جمع ہے۔ یہ یہود ونصاریٰ دونوں کی عبادت گاہوں کے لیے آتا ہے۔ لیکن آگے یہودیوں کی عبادت گاہ کے لیے الگ لفظ آرہا ہے۔ اس لیے قرینہ دلالت کررہا ہے کہ یہاں اس سے مراد صرف نصاریٰ کی عبادت گاہ ہے۔ جسے ''گرجا'' کہا جاتا ہے۔ نصاریٰ میں چونکہ رہبانیت کے نظام کی وجہ سے خانقاہوں اور گرجوں دونوں کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے شاید اس لیے سب سے پہلے ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

صَلَوَات: صَلَاة کی جمع ہے۔ یہ لفظ یہود کے کنیسوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہودیوں کے یہاں اس کا نام ''صلوتا'' تھا۔ جو آرامی زبان کا لفظ ہے۔ بعید نہیں کہ انگریزی لفظ ''Salute'' اور ''Salutation'' اسی سے نکل کر لاطینی میں اور پھر انگریزی میں پہنچا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ حق وباطل کی یہ کشمکش جو عبادت گاہوں اور گلی کوچوں سے نکل کر بارہا رزم وبزم کے میدان گرم کرتی رہی ہے اور تاریخ اس کی مکمل شہادت دیتی ہے۔ البتہ! جس دور میں کسی بھی واجب الاحترام پیغمبر کی دعوت کے نتیجے میں کوئی قابلِ ذکر امت وجود میں نہ آسکی تو

Marfat.com

وہاں تو بات دعوت سے آگے نہ بڑھ سکی۔لیکن جب بھی دعوت نے ایک نئی امت پیدا کی ہے تو پھر کفر کے ساتھ پنجہ آزمائی ضرور ہوئی۔اس لیے اقبال نے کہا

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لیکن عیسائیت نے چونکہ پٹڑی سے اترنے کے بعد رہبانیت کو اپنی منزل بنالیا تو بجائے اس کے کہ عیسائی قوم کے دانشور اپنی اس کمزوری کو سمجھتے اور قوموں کے مزاج کی صحیح تشخیص کرتے ان کے نام نہاد مستشرقین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ حضرت محمد ﷺ کی زندگی مکہ میں تو ایک پیغمبر کی زندگی تھی لیکن مدینہ میں آ کر ایک حکمران کی زندگی بن گئی۔وہ درویشی اور مسکینی کو پیغمبر کی زندگی سمجھتے ہیں۔لیکن جب خیر،طاقت کی صورت اختیار کرتی ہے تو وہاں انھیں حکمرانی نظر آتی ہے۔اقبال نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے ٹھیک کہا

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا
چلی کچھ نہ پیرِ کلیسا کی پیری
ہوئی دین و دنیا میں جس دم جدائی
ہوس کی امیری ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا
فقیری ہے آئینہ دارِ نذیری

آیت کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اللہ مسلمانوں کی مدد کرے گا کیونکہ اس کا قانون یہ ہے کہ جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔یعنی جو اس کے دین کی سربلندی کے لیے ہر طرح کی قربانی دیتا ہے۔ضرورت پڑے تو میدانِ جنگ میں خون دیتا اور سر کٹواتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔اب چونکہ مسلمان اللہ کے دین کی سربلندی اور اللہ کے گھر کی عظمت کو بحال کرنے کے لیے سردھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ ان کی مدد نہ کرے اور لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ مسلمان بے شک کمزور صحیح لیکن اللہ قوت والا ہے،غالب ہے۔اس کی تائید و نصرت کے بعد مسلمان بھی اس دھرتی کی غالب قوت بن جائیں گے۔

Marfat.com

45- امتِ مسلمہ کا منصب

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ
﴿یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّکُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! رکوع کرو اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی بندگی کرو اور بھلائی کے کام کرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔)

پیشِ نظر آیات خاتمۂ سورۃ کی آیات ہیں۔ اس سے پہلے مشرکینِ مکہ کی بداعمالیوں اور حدود پامالیوں کے حوالے سے یہ بات واضح کی گئی ہے کہ اللہ نے اپنا گھر ان کی تولیت میں دیا تھا کیونکہ یہ اپنے عظیم باپ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ذمہ داریوں کے وارث تھے لیکن انھوں نے اس کا حق ادا کرنا تو دور کی بات ہے اللہ کے گھر کی عظیم حیثیت کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا ہے۔ اسے اللہ نے توحید کا مرکز بنایا تھا حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے وہاں سے ایک امتِ مسلمہ کے اٹھائے جانے کی دعائیں کی تھیں۔ لیکن انھوں نے تین سو ساٹھ بتوں کا اسے مرکز بنا دیا۔ توحید کا وہ مرکز شرک کی آماجگاہ بن گیا۔ اگرچہ انھوں نے حجاج کی خدمت کی اور اللہ کے گھر کے احترام کو باقی رکھنے کے لیے مقدور بھر کوششیں کیں۔ لیکن اس کی اصل حیثیت اور اس گھر کی تعمیر کے مقاصد کو بالکل تباہ و برباد کر دیا اسی کو پروردگار نے ان کی خیانت اور کفرانِ نعمت قرار دیا ہے۔ اور یہ فرمایا کہ ان کی ان حرکتوں کی وجہ سے اب ہم انھیں بیت اللہ کی تولیت کے عظیم منصب سے معزول کر رہے ہیں اور اب یہ ذمہ داری اس نوزائیدہ امت کو سونپی جا رہی ہے جو اس گھر کی عظمت کو سمجھتی اور اس کی تعمیر کے مقاصد کو پہچانتی ہے۔

مطلوبہ صفات کی تیاری کی ہدایت

پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں مسلمانوں سے براہِ راست خطاب فرما کر انھیں اس عظیم

Marfat.com

ذمہ داری کی ادائیگی کے لیے اپنے اندر جن صفات کا پیدا کرنا ضروری ہے ان کی طرف توجہ دلائی جارہی ہے۔سب سے پہلی بات یہ فرمائی ہے کہ رکوع کرو اور سجدہ کرو۔سجدہ کرو چونکہ امر کا صیغہ ہے اس لیے اس سے امامِ شافعی اور بعض دوسرے جلیل القدر علماء نے یہ سمجھا کہ یہ آیتِ سجدہ ہے اور اس آیت کے پڑھنے والے کے لیے سجدہ ادا کرنا ضروری ہے۔اور اس سے انھوں نے ایک تو"اسجدوا"کے لفظ سے استدلال کیا اور دوسری بات انھوں نے یہ کہی کہ حضرت عقبہ بن عامر کی روایت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ انھوں نے آنحضرت ﷺ سے پوچھا کہ کیا اس سورۃ کو اللہ نے دو سجدوں سے فضیلت عطا فرمائی ہے۔تو آپ نے فرمایا: ہاں۔تو اس کا مطلب واضح ہے کہ یہ آیت سجدے کی آیت ہے۔اور تیسری دلیل ان کی یہ ہے کہ ابنِ ماجہ کی روایت میں حضرت عمرو بن عاص کہتے ہیں کہ نبیِ کریم ﷺ نے ان کو سورۃ حج میں دو سجدے سکھائے تھے۔

اس کے جواب میں احناف کی رائے یہ ہے کہ یہ آیت آیتِ سجدہ نہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں صرف سجدے کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ رکوع کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اور جہاں یہ دونوں حکم اکٹھے آتے ہیں اس کا مطلب نماز ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا وقوع نماز ہی میں ہوسکتا ہے۔اور جہاں تک احادیث کا تعلق ہے احناف کے نزدیک ان میں سے کسی حدیث کی سند پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی اور جہاں تک اقوالِ صحابہ کا تعلق ہے انھوں نے حضرت عبداللہ ابنِ عباس کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ سورۃ حج میں دو سجدے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پہلا سجدہ لازمی ہے اور دوسرا سجدہ تعلیمی ہے۔

نماز کا حکم

اس امت کو اس مقصد پر فائز کرتے ہوئے پہلا حکم یہ دیا گیا ہے کہ تم رکوع و سجود کرو یعنی نماز پڑھو۔اور ہم اس پہلے بھی آیت نمبر ۴۱ میں پڑھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان مسلمانوں کی جنھیں وہ اقتدار دینا چاہتا ہے پہلی صفت یہ بیان کرتا ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔نماز درحقیقت صرف ایک عبادت نہیں بلکہ اس عبادت میں وہ تمام حقائق جمع کردیے گئے ہیں جس کے نتیجے میں اسلامی زندگی وجود میں آتی ہے۔دنیا کی امامت و سیادت کا منصب اپنے اندر بڑی نزاکت رکھتا ہے جہاں یہ ذمہ داری ہے وہاں خلافت کی صورت میں اقتدار کا راستہ بھی ہے اور

Marfat.com

اقتدار ایک ایسی نازک ذمہ داری اور ایک ایسی کٹھن آزمائش ہے کہ جس شخص کی سیرت و کردار میں معمولی سی بھی خرابی موجود ہو وہ کبھی بھی اقتدار کی ذمہ داریوں کو باحسن طریق ادا نہیں کر سکتا اور پھر اسلامی اقتدار کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ درحقیقت اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کو قائم کرنا ہے۔ نیکیوں کو فروغ دینا اور برائیوں کو ختم کرنا ہے۔ ایسی ذمہ داری صرف وہ شخص یا وہ قوم ادا کر سکتی ہے جو اپنے آپ کو اللہ کی چاکر سمجھتی ہو۔ اس کی فکر اور اس کی قوتِ عمل پر اللہ کی حاکمیت کی چھاپ لگی ہو اور نماز اس راستے پر چلنے کی وہ روشنی مہیا کرتی ہے جس کے بعد ذمہ داری کا سفر آسان ہو جاتا ہے۔ آدمی جب ہاتھ اٹھا کر نیت باندھتا ہے تو وہ ساری دنیا سے ہاتھ اٹھا لیتا ہے اور نیت باندھ کر جب وہ اللہ کی حمد و ثنا کرتا ہے تو اللہ سے عہدِ وفا باندھتا ہے اور عہد کرتا ہے کہ میرا قیام میرا رکوع اور میرا سجود صرف تیرے لیے اور تیرے دین کی سربلندی کے لیے ہوگا۔ اقتدار آدمی میں خواہشات کو ابھارتا، دل و دماغ میں رعونت اور تکبر کا خناس پیدا کرتا اور اپنے مفادات کو ترجیح دینے کا راستہ دکھاتا ہے اور نماز ان تمام چیزوں سے صرف اللہ کے لیے دستبرداری کا پیغام دیتی ہے۔ ایک طرف تو وہ دنیا کی ہر طاقت سے سر اٹھانے کی تعلیم دیتی اور ہر آستانے کو پاؤں کی ٹھوکروں پر اچھالنے کی ترغیب دیتی ہے اور دوسری طرف اللہ کے لیے عجز و نیاز پیدا کرتی اور سب کچھ اس کے راستے میں قربان کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔

اللہ کی اطاعت

اس کے بعد فرمایا: وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ۔ یہاں عبادت اطاعت کے معنی میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں جس طرح نماز اللہ کے لیے ہی پڑھنی ہے، اسی کے لیے سر جھکانا ہے اور زندگی کے ہر معاملے میں اسی کا طاعت کرنی ہے۔ اللہ سے تمھارے تعلق کا مفہوم یہ ہرگز نہیں کہ وہ مسجد کی فضا تک محدود ہو کر رہ جائے۔ بلکہ تم اپنے رب کی عبادت کے ساتھ ساتھ اطاعت کے بھی پابند ٹھہرائے گئے ہو۔ جس طرح تمھارا قیام رکوع اور سجود صرف اسی کے لیے ہے اسی طرح تمھاری زندگی کا ہر شعبہ اسی کے علم کی روشنی میں منور ہونا چاہیے۔ آئین اور قانون تمھارے لیے وہی قابلِ قبول ہے جسے قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے۔ تمھاری معاشرت، معیشت، سیاست اور حکومت کی ترجیحات وہی ہیں جو اللہ کے دین نے تمھارے لیے مقرر کر دی ہیں۔

Marfat.com

خلقِ خدا کی خدمت

وَافْعَلُوا الْخَیْرَ: ''اور بھلائی کے کام کرو''۔ اس حکم نے پہلے دونوں احکام کے ساتھ مل کر زندگی کے تمام دوائر کو مکمل کر دیا۔ جس طرح عبادت اللہ کی اور اطاعت بھی اسی کی، اسی طرح خدمت تمام نوعِ انسانی کی۔ بھلائی کے کام اپنے اندر بہت وسعت رکھتے ہیں اور ان کا تعلق صرف مسلمانوں سے نہیں بلکہ پوری نوعِ انسانی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو چونکہ امامت و سیادت دینے کا فیصلہ کر لیا ہے تو جس طرح ان کی توجہ اور خدمت کے مستحق مسلمان ہیں اسی طرح وہ لوگ بھی ہیں جو اگرچہ دائرۂ اسلام میں داخل نہیں لیکن مسلمانوں کی مملکت میں رہنے کے باعث ہر طرح کی بھلائی کے مستحق ہیں بلکہ اسلام تو ان لوگوں کے ساتھ بھی بھلائی کا حکم دیتا ہے جو مملکتِ اسلامیہ کے باسی نہ ہوں۔ ان کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو ان تک اللہ کے دین کی دعوت پہنچانا اور اگر وہ کسی ابتلا میں مبتلا ہوں تو ان کی مدد کرنا اس حکم میں شامل ہے۔ مکہ معظمہ میں جب قحط پھیلا، باوجود اس کے کہ اہلِ مکہ مسلمانوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔ لیکن جب انھوں نے آنحضرت ﷺ سے بھوک سے مرتے ہوئے لوگوں کی مدد کی درخواست کی تو آنحضرت ﷺ نے امکانی حد تک ان کی مدد فرمائی اور انھیں بھوک کی اذیت سے بچایا۔ آخر میں فرمایا کہ اگر تم ان تمام ذمہ داریوں کو ادا کرنے کی کوشش کرو تو اس بات کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ تمھیں دنیوی اور اخروی فوز و فلاح سے نوازے۔

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ ھٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَي النَّاسِ ښ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۭ هُوَ مَوْلٰىكُمْ ۚ فَنِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ﴾

(اور اللہ کی راہ میں سرتوڑ کوشش کرو جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے۔ اس نے تم کو چن لیا ہے (حق کی پاسبانی اور اشاعت کے لیے) اور دین کے معاملے میں اس نے تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔ اپنے باپ ابراہیم

Marfat.com

کی ملت کی پیروی کرو اسی نے تمھارا نام مسلم رکھا اس سے پہلے (اور اس قرآن میں بھی تمھارا نام مسلم ہے) تا کہ رسول تم پر اللہ کے دین کی گواہی دیں اور تم دوسرے لوگوں پر اس کی گواہی دو اور نماز کا اہتمام رکھو اور زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ کے دامنِ رحمت کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ وہی تمھارا کارساز ہے۔ پس وہ بہترین کارساز ہے اور بہترین مدد فرمانے والا ہے۔)

گزشتہ آیتِ کریمہ میں ان باتوں کا حکم دیا گیا جو امامت وسیادت کے لیے بنیادی صفات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ امتِ مسلمہ کو انفرادی اور اجتماعی طور پر اگر امامت کا فرض انجام دینا ہے تو متذکرہ بالا صفات اپنے اندر پیدا کرنا ازبس ضروری ہیں۔ پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان صفات کی تیاری کے بعد تمھیں جو اصل کام کرنا ہے وہ اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے سرتوڑ کوشش کرنی ہے۔ اس لیے اس آیتِ کریمہ کے آغاز میں صرف جہاد کا حکم نہیں دیا گیا بلکہ حَقَّ جِهَادِهِ کی قید لگائی گئی ہے۔ یعنی اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے ایسی جدوجہد درکار ہے جس میں نہ کسی تساہل کا دخل ہو، نہ کسی تحفظِ ذہنی کا، نہ اس میں مصلحت راستہ روکے، نہ حالات کا دباؤ دامن گیر ہو سکے۔

جہاد کا مفہوم اور اس کی اقسام

اس جہدِ مسلسل کے حوالے سے جب ہم غور کرتے ہیں اور اہلِ لغت سے جہاد کا معنی معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت حد تک اس کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ علامہ راغب لفظِ جہاد کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الجهاد والمجاهدة استفراغ الوسع في مدافعة العدو۔
"یعنی دشمن کا مقابلہ کرنے میں اپنی ہر امکانی قوت صرف کر دینے کو جہاد اور مجاہدہ کہتے ہیں"۔

مزید فرماتے ہیں کہ جہاد کی تین قسمیں ہیں۔
۱۔ مجاهدة العدو الظاهر (ظاہری دشمن سے جہاد)
۲۔ مجاهدة الشيطان (شیطان سے جہاد)

Marfat.com

۳۔ مجاھدۃ النفس اور (اپنے نفس کے خلاف جہاد)

اس آیت میں تینوں قسم کے جہاد شامل ہیں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد ہر ایسی انتہائی کوشش کا نام ہے۔ جس میں اللہ کے کلمے کی سربلندی کے راستے میں حائل ہونے والی ہر رکاوٹ کو ختم کرنا پیشِ نظر ہو۔ سرسری نگاہ میں محسوس ہوتا ہے کہ جو قوتیں اسلام کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں ان کی طاقت کو توڑنا اور انھیں مغلوب کرنا جہاد کا مقصد ہے۔ لیکن اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو اس جہاد اور مجاہدے کا اولین ہدف آدمی کا اپنا نفسِ امارہ ہے۔ جو ہر وقت اللہ سے بغاوت کرنے کے لیے زور لگاتا رہتا ہے اور آدمی کو ایمان واطاعت کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ جب تک اس کو مسخر نہ کیا جائے باہر کا کوئی مجاہدہ اعلائے کلمۃ الحق کا سبب نہیں بن سکتا بلکہ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ بعض دفعہ باہر کے دشمن کو زیر کرلیا جاتا ہے۔ لیکن اپنی خواہشات اور مفادات کی ہوس خود مجاہد کو زیر کرلیتی ہے۔ جان پر کھیل کو جو بازی جیتی جاتی ہے اسے بڑی آسانی سے ہار دیا جاتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جاھدوا اھواء کم کما تجاھدون اعداء کم ''اپنے ظاہری دشمنوں سے تم جس طرح جہاد کرتے ہو اسی طرح اپنی نفسانی خواہشات کے خلاف بھی جہاد کرو'' بلکہ اس کی اہمیت کو واضح کرنے کے لیے ایک جنگ سے واپس آنے والے غازیوں سے نبیِ کریم ﷺ نے فرمایا: قدمتم خیر مقدم من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر ''تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف واپس آگئے ہو''۔ عرض کیا گیا وہ بڑا جہاد کیا ہے؟ فرمایا: مجاھدۃ العبد ھواہ ''آدمی کی خود اپنی خواہشِ نفس کے خلاف جدوجہد''۔

جہاد کے حکم کا سبب

سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کو ایسی سرتوڑ کوشش کرنے کا حکم کیوں دیا جارہا ہے؟ اس کا سبب بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: هُوَ اجْتَبٰكُمْ ''اس نے تمھیں چن لیا ہے''۔ یعنی تمھیں کلمۂ حق کی سربلندی کے لیے انتہائی جدوجہد کرنے کا حکم اس لیے دیا جارہا ہے کہ اللہ نے تمھیں اس عظیم مقصد کے لیے انتخاب کرلیا ہے۔ قریش اور یہود اس منصب سے معزول کردیے گئے اور ان کی جگہ تمھیں یہ اعزاز بخشا جارہا ہے۔ دیکھنا! اس عظیم منصب کی لاج رکھنا اور اس منصب کی ذمہ داریوں کو پورے عزم وجزم کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرنا۔

Marfat.com

دین میں حرج نہ ہونے کا مفہوم

وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ''اللہ نے تمھیں جس دین کی سربلندی کے لیے علم اٹھانے کا حکم دیا ہے اور جس عظیم منصب کا بارتم پر ڈالا جارہا ہے اس کے بارے میں تمھیں اطمینان رکھنا چاہیے کہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے تم کوئی مشکل محسوس نہیں کروگے۔ جس طرح یہود نے اپنے دین میں خانہ ساز احکام کا اضافہ کر کے اپنے لیے مشکلات پیدا کی تھیں اللہ تعالیٰ نے اس دین کو ان مشکلات سے محفوظ رکھا ہے۔ اس دین میں ایسی کوئی بات نہیں جس کو قبول کرنے کے بعد تمھاری مادی، علمی اور روحانی ترقی کی راہیں مسدود ہوجائیں۔ صحابہ کرام کو براہِ راست اس منصب کے لیے چنا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس منصب کی جس طرح ذمہ داریاں ادا کیں اور اس کی نزاکتوں کو جس طرح ملحوظ رکھا اس کا نتیجہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے صرف ان کے لیے فتوحات کے دروازے نہیں کھولے بلکہ انھوں نے اس دین کے حوالے سے دنیا کو علم آشنا بنایا۔ تہذیب اور تمدن کی بنیادیں فراہم کیں۔ ایک ایسا آئین دیا جس نے انسانوں کو زندگی کے ہر مرحلے میں آسانیاں مہیا کیں۔ عدالتوں کا ایسا نظام دیا کہ دیکھتے ہی دیکھتے انصاف کا چلن عام ہوگیا۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ہمارا آج کا تعلیم یافتہ نوجوان دین کو اپنی ترقی کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ ترکی نے اپنی نادانی کی وجہ سے صرف ان بدگمانیوں کے باعث یا سازش کا شکار ہوکر اپنے ہاتھوں خلافت تارتار کردی اور عالمِ اسلام کو کوچۂ سیاست میں بے یارومددگار چھوڑ دیا۔

مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَٰهِيمَ ''جس دین کی حفاظت، نصرت اور علم برداری اور جس گھر کی تولیت تمھارے سپرد کی جارہی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں اور نہ یہ کوئی نیا دین ہے بلکہ یہ وہی چیز ہے جسے تم ملتِ ابراہیم کے نام سے یاد کرتے ہو اور آج تک اس کی عظمت کے گیت گاتے ہو۔ یوں تو ہر نبی کی ملت اسی دین کی عکاس رہی کیونکہ ہر دور میں دین کی بنیادوں میں کبھی تبدیلی نہیں ہوئی۔ مرورِ زمانہ سے انسانوں کی ضروریات بدلیں تو آنے والی شریعت میں نئے احکام کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن جن بنیادی صداقتوں پر دین کی بنیاد اٹھائی گئی تھی۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یہاں باقی انبیاءِ کرام کا ذکر چھوڑ کر صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اہلِ عرب انھیں کی ملت سے واقف تھے اور قریش اپنے آپ کو ان کی اولاد سمجھتے

Marfat.com

تھے اور مزید یہ بات بھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ تمام قابلِ ذکر مذاہب سے پہلا کا زمانہ ہے۔ یہودیت کا آغاز حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے ہوا اور عیسائیت کا حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام سے رہے مشرکینِ عرب تو انھیں بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ ان کے ہاں بت پرستی کا رواج عمرو بن لحی سے شروع ہوا۔ جو بنی خزاعہ کا سردار تھا اور موآب کے علاقہ سے ''ہبل'' نامی بت لے کر آیا تھا اور اس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ حضرت مسیح علیہ السلام سے پانچ چھ سو سال پہلے کا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی کہ یہودی، عیسائی، صابی اور اہلِ عرب تمام حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو آج بھی اپنا مقتدا تسلیم کرتے ہیں۔ اس لیے جب ان کی ملت کا ذکر کیا گیا جو ان ملتوں میں سے کسی ملت کے پیرو نہ تھے تو لامحالہ وہی ملت اصل ملتِ حق ہے اور نبی کریم ﷺ اسی ملت کو زندہ کرنے اور اسی کو زیادہ جامع حیثیت سے پیش کرنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔

ممکن ہے ملتِ ابراہیمی کے ذکر نے اس بات کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو کہ مسلمانوں کو کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لیے جس جہاد کا حکم دیا جارہا ہے اس کا عملی نمونہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے۔ انھوں نے جس طرح قدم قدم پر صرف اللہ کی رضا کے حصول اور اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے قربانیاں دیں، یہ درحقیقت وہ ملتِ ابراہیمی ہے جس کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی جارہی ہے۔

هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ مِنْ قَبْلُ وَفِیْ هٰذَا: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تمھارا نام اس سے پہلے مسلمان رکھا تھا۔ یعنی جب انھوں نے اللہ کا گھر تعمیر کیا اور پھر یہ دعا مانگی کہ یا اللہ ہماری اولاد میں سے ایک امتِ مسلمہ اٹھانا اور مزید یہ کہ ان کی طرف اپنا آخری رسول بھیجنا۔ اس طرح سے انھوں نے آخری امت کو امتِ مسلمہ کا نام دیا تھا اور یہ بھی اس مین اشارہ موجود ہے کہ یہی دین درحقیقت ملتِ ابراہیمی ہے جس کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

امتِ مسلمہ کے وجود کا مقصد

لِیَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِیْدًا عَلَیْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ: یہ ہے وہ مقصد جس کے لیے امتِ مسلمہ کو چنا گیا ہے اور اسی مضمون کو سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۱۴۲ میں بھی بیان کیا گیا ہے اور وہاں ہم تفصیل سے گفتگو کرچکے ہیں۔ یہاں اسی مقصد کو مزید تاکید کے

Marfat.com

ساتھ بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس منصب پر فائز کیا گیا تھا۔ بعد میں بنی اسرائیل اس منصب پر فائز ہوئے اور اسی منصب کا ایک حصہ یعنی اللہ کے گھر کی تولیت قریش کو ملا۔ لیکن دونوں نے جس طرح نااہل ہونے کا ثبوت دیا وہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر دلیل لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ اب انھیں معزول کر کے مسلمانوں کو امامت وسیادت کے اس منصب پر فائز کیا جا رہا ہے اور انھیں بتایا جا رہا ہے کہ اب قیامت تک تمھارا کام یہ ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ نے شہادت حق کے اس عظیم فریضہ کو زندگی کا ہر دکھ اٹھا کر انتہائی امانت ودیانت کے ساتھ اس طرح ادا کیا کہ اس کے مبہمات کو کھولا، اس کے مجملات کو واضح کیا، اس کے احکام کو عملی زندگی پر منطبق کر کے دکھایا۔ ملی زندگی کے ناگزیر شعبوں کو عملی شکل دی۔ ریاست وحکومت کی تشکیل فرمائی۔ اس کو ایک نظام عطا کیا۔ اخلاقی، قانونی، تہذیبی، تمدنی، حتی کہ حربی اداروں کو بھی اس طرح منظم کیا کہ قیامت تک کے لیے اسلام کے بنیادی احکام کو عملی شکل میں متشکل فرما کر تمام اجتماعی ضرورتوں کے حوالے سے شہادتِ حق کا پیکر بنا دیا اور پھر یہی فریضہ امت کے حوالے کر کے انھیں اس کی ادائیگی کا ذمہ دار ٹھہرایا۔

آخر میں پھر اقامتِ صلوٰۃ اور اہتمامِ زکوٰۃ کا حکم دیا کیونکہ ان دونوں کے بغیر شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کرنا بہت مشکل تھا کیونکہ پورے دین کی عمارت ان دونوں ستونوں پر قائم ہے۔ امت کا مقتدر طبقہ اگر خشوع وخضوع کے ساتھ اللہ کے سامنے جھکنے سے انکار کر دیتا ہے اور وہ اپنے مالیاتی نظام کو زکوٰۃ کی پاکیزگی کا پابند نہیں کرتا تو شہادتِ حق کا فریضہ ادا ہونا تو دور کی بات ہے اس کا تصور بھی گدلا کر رہ جائے گا۔

مزید فرمایا کہ شہادتِ حق کی ادائیگی کے لیے یہ ضروری ہے کہ اللہ کو یعنی اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو کیونکہ حالات کے ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی مختلف تبدیلیوں سے آشنا ہوگی۔ بیرونی اثرات اپنا کام کریں گے۔ کمزور طبیعتیں ان کا سہارا لے کر مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کو مسموم کرنے کی کوشش کریں گی۔ ان کا مقابلہ کرنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اللہ پر توکل میں کمی نہ آنے پائے اور اللہ کی رسی یعنی اس کے دین کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ پھر امید کی جا سکتی ہے کہ امتِ مسلمہ اپنے فرض کی ادائیگی میں بہانے تلاش کرنے کی بجائے عزم وجزم کے ساتھ اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہونے کی کوشش کرے گی۔ لیکن اگر

Marfat.com

اس کے تصورات میں کہیں کمزوری لاحق ہوگئی اور اس نے اللہ کی بجائے دوسرے سہاروں کی طرف دیکھنا شروع کردیا تو پھر معاملہ مخدوش ہوکر رہ جائے گا۔اس لیے یہ بات ازبس ضروری ہے کہ اس بات کا یقین دلوں سے نکلنے نہ پائے کہ اللہ ہی بہترین کارساز اور وہی بہترین مددگار ہے۔اگر اس کی کارسازی ہمیں میسر ہے اور اس کی پشت پناہی ہمیں حاصل ہے تو پھر دنیا ہزار کوشش کے باوجود ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور اگر ایسا نہیں تو پھر ہم ساری کوششوں کے بعد بھی منزلِ مقصود حاصل کرنے میں ناکام رہیں گے۔

Marfat.com

46- حضرت سلیمان علیہ السلام کی شخصیت کا ایک پہلو اور مسئلۂ تصویر کی وضاحت

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى مَنْ لَّا نَبِيَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَانِ الرَّحِيْمِ

﴿يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَايَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ﴾

(اور وہ اس کے لیے بناتے تھے جو کچھ وہ چاہتا تھا، اونچی عمارتیں، تصویریں، حوضوں کے مانند لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگیں، اے آلِ داوٗد عمل کرو شکر کے طریقے پر اور میرے بندوں میں شکرگزار تھوڑے ہی ہیں۔)

جنات کے مسخر کرنے سے عام طور پر جو تأثر ابھرتا ہے وہ پیشہ ور عاملوں یا کاہنوں کا ہے۔ اور ان خرافات کی طرف ذہن جاتا ہے جنھیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ لیکن پیشِ نظر آیتِ کریمہ میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے جو کام لیے وہ سب تعمیری اور تمدنی کام تھے۔ ان کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے فاسد اغراض کے لیے استعمال نہیں کیا۔ چنانچہ جن حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے محرابیں بناتے تھے۔ محراب سے مراد بڑی عمارت بھی ہوسکتی ہے اور عمارت کا سب سے نمایاں حصہ جسے عام طور پر محراب سے یاد کیا جاتا ہے وہ بھی ہوسکتا ہے۔ کیونکہ آپ نے جنات سے تعمیری آرٹ کا کام بھی لیا۔ اور اس کا اظہار محراب پر ہی ہوسکتا ہے۔ اور آپ نے ہیکل کی طرح بڑی بڑی ایسی عمارتیں بھی بنوائیں جن کی تعمیر بظاہر انسانوں سے بہت مشکل تھی۔ اس لیے میرا ناقص گمان یہ ہے کہ

Marfat.com

محاریب سے محرابیں بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور بڑی بڑی عمارتیں بھی۔ جبکہ لغوی اعتبار سے اس لفظ کا اطلاق دونوں پر ہوتا ہے۔

تماثیل کے مفہوم کی وضاحت

آپ نے جنات سے تماثیل بھی بنوائیں، یہ تمثال کی جمع ہے۔ تمثال کسی چیز کی مصور یا کندہ کی ہوئی چیز کی شبیہہ یا اس کے پیکر یا مجسمہ کو کہتے ہیں۔ یہ صورت بے جان چیزوں کی بھی ہوسکتی ہے اور جاندار چیزوں کی بھی۔ تورات کی کتابِ سلاطین سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان دونوں ہی قسموں کی تماثیل بنوائیں۔ لیکن یہ حضرت سلیمان علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے اس گروہ کا اتہام ہے جو حضرت سلیمان علیہ السلام سے عداوت رکھتا تھا۔ اس لیے ان کی روایات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ویسے بھی یہود نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو ایک پیغمبر کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک بالکل دنیادار بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور ان کی سیرت ہر پہلو سے انھوں نے داغدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو شخص بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کو بطور ایک پیغمبر کے دیکھے گا اس کے لیے یہ بات باور کرنا ناممکن ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کوئی ایسا کام کرسکتے تھے جسے تورات نے حرام قرار دیا ہو جبکہ آپ تورات ہی کے پیروکار تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک بنی اسرائیل میں جتنے انبیاء بھی آئے ہیں، وہ سب تورات ہی کے پیرو تھے۔ اور تورات میں صراحت کے ساتھ ہمیں یہ حکم ملتا ہے کہ انسانی اور حیوانی تصویریں اور مجسمے قطعاً حرام ہیں۔ (خروج، ۲۰:۲۔۵ میں ہے)

"خداوند تیرا خدا جو تجھے زمینِ مصر سے، غلامی کے گھر سے، نکال لایا، میں ہوں۔ میرے حضور تیرے لیے دوسرا خدا نہ ہووے، تو اپنے لیے کوئی مورت یا کسی چیز کی صورت یا اوپر آسمان پر یا نیچے زمین پر یا پانی میں، زمین کے نیچے سے مت بنا۔ تو ان کے آگے اپنے تئیں مت جھکا اور نہ ان کی عبادت کر، کیونکہ میں تیرا خدا غیور خدا ہوں۔"

خروج باب ۲ آیت ۴ میں ہے "تو اپنے لیے کوئی تراشی ہوئی مورت نہ بنانا، نہ کسی چیز کی صورت بنانا جو اوپر آسمان یا نیچے زمین پر یا زمین کے نیچے پانی میں ہے۔"

دیکھ لیجیے، اس میں نہایت واضح الفاظ میں صورت یا مورت بنانے کی ممانعت ہے۔ اس وجہ سے یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ پچھلی شریعتوں میں یہ چیزیں جائز تھیں، صرف اسلام میں

Marfat.com

حرام قرار دی گئی ہیں۔ یہ چیزیں پہلے بھی ناجائز تھیں۔ جن مفسرین نے بنی اسرائیل کی روایات پر اعتماد کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ تصویر بنانے کی ممانعت ہماری شریعت میں وارد ہوئی ہے، سابقہ شریعتوں میں اس کی اجازت تھی، انھوں نے تورات سے بے خبری کا ثبوت دیا ہے۔ اور دشمنوں نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر جو الزام لگایا تھا اور جسے تورات کا حصہ بنا دیا گیا ہے، بے خبری میں اس کی تصدیق کی گئی ہے جبکہ تورات نے ہر صورت اور مورت بنانے کی ممانعت کی تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام ظاہر ہے کہ تورات کے حکم کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن حیرت ان جدید اور نام نہاد اہلِ علم پر ہے جو اہلِ مغرب کی تقلید میں مصوری اور بت تراشی کو حلال کرنا چاہتے ہیں، وہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے طرزِ عمل سے بھی دلیل پکڑتے ہیں اور قرآنِ کریم کی اس آیت کے لفظ تماثیل کو اپنے لیے دلیل بناتے ہیں۔ جبکہ تماثیل کا لفظ انسانی اور حیوانی تصاویر کے معنی میں صریح نہیں ہے بلکہ اس کا اطلاق غیر جاندار اشیاء کی تصویروں پر بھی ہوتا ہے۔ اس لیے محض اس لفظ کے سہارے اس حکم کو توڑا نہیں جاسکتا جس کا ثبوت نہایت کثیر التعداد، قوی الاسناد اور متواتر المعنی احادیث میں ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ذی روح اشیاء کی تصویریں بنانے اور رکھنے کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ ہم ان بیسیوں روایات میں سے چند ایک کا ذکر کرنا چاہتے ہیں تاکہ صحیح بات کو سمجھنا آسان ہو جائے۔

عن ابی جحیفة ان رسول الله ﷺ لعن المصور۔

(بخاری، کتاب البیوع، کتاب الطلاق و کتاب اللباس)

”ابو جحیفہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مصور پر لعنت فرمائی ہے۔“

عن عبداللہ بن مسعودؓ قال سمعت النبی ﷺ یقول ان اشدالناس عذاباً عنداللہ یوم القیامة المصورون۔

(بخاری، کتاب اللباس، مسلم، کتاب اللباس، نسائی، کتاب الزینة، مسند احمد)

”عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ترین سزا پانے والے مصور ہوں گے۔“

عن عائشةؓ قالت دخل علی رسول الله ﷺ وانا متسترة بقرام فیه صورة فتلوّن وجهه ثم تناول السفر نهتكه ثم

Marfat.com

قال ان من اشدالناس عذابا یوم القیامة الذین یشبھون بخلق اللہ ۔(مسلم، کتاب اللباس، بخاری، کتاب اللباس، نسائی کتاب الزینۃ)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف لائے اور میں نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا جس مین تصویر تھی، آپ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، پھر آپ ﷺ نے اس پردے کو لے کر پھاڑ ڈالا اور فرمایا قیامت کے روز سخت ترین عذاب جن لوگوں کو دیا جائے گا ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کی مانند، تخلیق کی کوشش کرتے ہیں۔''

عن جابر قال نھیٰ رسول اللہ ﷺ عن الصورۃ فی البیت ونھیٰ ان یصنع ذلک۔(ترمذی ابواب اللباس)

''حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ گھر میں تصویر رکھی جائے اور اس سے بھی منع فرمایا کہ کوئی شخص تصویر بنائے۔''

چنانچہ ان ہی احادیث کی وجہ سے ہمارے فقہاء نے اسے قانونِ اسلامی کی ایک دفعہ قرار دیا ہے۔ علامہ بدرالدین عینی توضیح کے حوالہ سے لکھتے ہیں (ہمارے اصحاب یعنی فقہاء احناف اور دوسرے فقہاء کہتے ہیں کہ کسی جاندار چیز کی تصویر بنانا حرام ہی نہیں، سخت حرام اور کبیرہ گناہوں میں سے ہے خواہ بنانے والے نے اسے کسی ایسے استعمال کے لیے بنایا ہو جس میں اس کی تذلیل ہو یا کسی دوسری غرض کے لیے، ہر حالت میں تصویر کشی حرام ہے کیونکہ اس میں اللہ کی تخلیق سے مشابہت ہے۔ اسی طرح تصویر خواہ کپڑے میں ہو یا فرش میں یا دینار یا درہم یا پیسے میں یا کسی برتن میں یا دیوار میں، بہر حال اس کا بنانا حرام ہے۔ البتہ جاندار کے سوا کسی چیز مثلاً درخت وغیرہ کی تصویر بنانا حرام نہیں ہے۔ ان تمام امور میں تصویر کے سایہ دار ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔)

اس تفصیل سے یہ بات اچھی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام میں تصاویر کی حرمت کوئی مختلف فیہ یا مشکوک مسئلہ نہیں ہے بلکہ نبی کریم ﷺ کے صریح ارشادات، صحابہ کرام کے عمل اور فقہاء اسلام کے متفقہ فتاویٰ کی رو سے ایک مسلم قانون ہے جسے آج بیرونی ثقافتوں

Marfat.com

سے متاثر لوگوں کی موشگافیاں بدل نہیں سکتیں۔

اس سلسلے میں چند اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں جن کی حیثیت غلط فہمیوں سے زیادہ نہیں۔ صاحبِ تفہیم القرآن اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

اعتراضات کا جواب

بعض لوگ فوٹو اور ہاتھ سے بنی ہوئی تصویر میں فرق کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ شریعت بجائے خود تصویر کو حرام کرتی ہے نہ کہ تصویر سازی کے کسی خاص طریقے کو۔ فوٹو اور دستی تصویر میں تصویر ہونے کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ ان کے درمیان جو کچھ بھی فرق ہے وہ طریقِ تصویر سازی کے لحاظ سے ہے اور اس لحاظ سے شریعت نے احکام میں کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

بعض لوگ یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلام میں تصویر کی حرمت کا حکم محض شرک و بت پرستی کو روکنے کی خاطر دیا گیا تھا، اور اب اس کا کوئی خطرہ نہیں ہے لہٰذا یہ حکم باقی نہ رہنا چاہیے لیکن یہ استدلال بالکل غلط ہے۔ اول تو احادیث میں کہیں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ تصاویر صرف شرک و بت پرستی کے خطرے سے بچانے کے لیے حرام کی گئی ہیں۔ دوسرے، یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے کہ اب دنیا میں شرک و بت پرستی کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ آج خود برِ صغیر ہند و پاک میں کروڑوں مشرکین موجود ہیں، دنیا کے مختلف خطوں میں طرح طرح سے شرک ہو رہا ہے، عیسائی اہلِ کتاب بھی حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم اور اپنے متعدد اولیاء کی تصاویر اور مجسموں کو پوج رہے ہیں، حتیٰ کہ مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد بھی مخلوق پرستی کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ صرف وہ تصویریں ممنوع ہونی چاہئیں جو مشرکانہ نوعیت کی ہیں، یعنی ایسے اشخاص کی تصاویر اور مجسمے جن کو معبود بنا لیا گیا ہو، باقی دوسری تصویروں اور مجسموں کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں

Marfat.com

ہے۔لیکن اس طرح کی باتیں کرنے والے دراصل شارع کے احکام و ارشادات سے قانون اخذ کرنے کی بجائے آپ ہی اپنے شارع بن بیٹھتے ہیں۔ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ تصویر صرف ایک شرک و بت پرستی ہی کی موجب نہیں بنتی بلکہ دنیا میں دوسرے بہت سے فتنوں کی موجب بھی بنی ہے اور بن رہی ہے۔تصویر ان بڑے ذرائع میں سے ایک ہے جن سے بادشاہوں، ڈکٹیٹروں اور سیاسی لیڈروں کی عظمت کا سکہ عوام الناس کے دماغوں پر بٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔تصویر کو دنیا میں شہوانیت پھیلانے کے لیے بھی بہت بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے اور آج یہ فتنہ ہر زمانے سے زیادہ عروج پر ہے۔تصاویر قوموں میں نفرت اور عداوت کے بیج بونے، فساد ڈلوانے اور عام لوگوں کو طرح طرح سے گمراہ کرنے کے لیے بھی بکثرت استعمال کی جاتی رہی ہیں اور آج سب سے زیادہ استعمال کی جارہی ہیں۔اس لیے یہ سمجھنا کہ شارع نے تصویر کی حرمت کا حکم صرف بت پرستی کے استیصال کی خاطر دیا ہے، اصلاً غلط ہے۔شارع نے مطلقاً جاندار اشیاء کی تصویر کو روکا ہے۔ہم اگر خود شارع نہیں بلکہ شارع کے متبع ہیں تو ہمیں علی الاطلاق اس سے رک جانا چاہیے۔ ہمارے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کوئی علتِ حکم خود تجویز کر کے اس کے لحاظ سے بعض تصویروں کو حرام اور بعض کو حلال قرار دینے لگیں۔

بعض لوگ چند بظاہر بالکل ''بے ضرر'' قسم کی تصاویر کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ آخر ان میں کیا خطرہ ہے، یہ تو شرک اور شہوانیت اور فساد انگیزی اور سیاسی پروپیگنڈے اور ایسے ہی دوسرے مفسدات سے قطعی پاک ہیں، پھر ان کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ ہوسکتی ہے؟ اس معاملہ میں لوگ پھر وہی غلطی کرتے ہیں کہ پہلے علتِ حکم خود تجویز کر لیتے ہیں اور اس کے بعد یہ سوال کرتے ہیں کہ جب فلاں چیز میں یہ علت نہیں پائی جاتی تو وہ کیوں ناجائز ہے۔علاوہ ازیں یہ لوگ اسلامی شریعت

Marfat.com

کے اس قاعدے کو بھی نہیں سمجھتے کہ وہ حلال اور حرام کے درمیان ایسی دھندلی اور مبہم حد بندیاں قائم نہیں کرتی جن سے آدمی یہ فیصلہ نہ کرسکتا ہو کہ وہ کہاں تک جواز کی حد میں ہے اور کہاں اس حد کو پار کر گیا ہے بلکہ ایسا واضح خطِ امتیاز کھینچتی ہے جسے ہر شخص روزِ روشن کی طرح دیکھ سکتا ہو۔ تصاویر کے درمیان یہ حد بندی قطعی واضح ہے کہ جانداروں کی تصویریں حرام اور بے جان اشیاء کی تصویریں حلال ہیں۔ اس خطِ امتیاز میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جسے احکام کی پیروی کرنی ہو وہ صاف صاف جان سکتا ہے کہ اس کے لیے کیا چیز جائز ہے اور کیا ناجائز۔ لیکن اگر جانداروں کی تصاویر میں سے بعض کو جائز اور بعض کو ناجائز ٹھہرایا جاتا تو دونوں قسم کی تصاویر کی کوئی بڑی سے بڑی فہرست بیان کر دینے کے بعد بھی جواز و عدم جواز کی سرحد کبھی واضح نہ ہوسکتی اور بے شمار تصویروں کے بارے میں یہ اشتباہ باقی رہ جاتا کہ انھیں حد جواز کے اندر سمجھا جائے یا باہر۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے شراب کے بارے میں اسلام کا یہ حکم کہ اس سے قطعی اجتناب کیا جائے ایک صرف حد قائم کر دیتا ہے لیکن اگر یہ کہا جاتا کہ اس کی اتنی مقدار استعمال کرنے سے پرہیز کیا جائے جس سے نشہ پیدا ہو تو حلال اور حرام کے درمیان کسی جگہ بھی حدِ فاصل قائم نہ کی جاسکتی اور کوئی شخص بھی فیصلہ نہ کرسکتا کہ کس حد تک وہ شراب پی سکتا ہے اور کہاں جا کر اسے رک جانا چاہیے۔

جِفَانٍ وَقُدُوْرٍ کا مفہوم

وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ ...... جِفَان، جَفْنَة کی جمع ہے، جس کے معنی لگن کے ہیں۔ اور جواب، جابية کی جمع ہے، اس کے معنی حوض کے ہیں۔ قدور، قِدر کی جمع ہے، بڑی دیگوں کو کہتے ہیں۔ اور ہنڈیوں پر بھی بول دیتے ہیں۔ رٰسِيٰتٍ ویسے تو یہ لفظ پہاڑوں کی صفت کے لیے آتا ہے اور یہاں یہ بڑی بڑی دیگوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو اتنی بھاری بھرکم ہوتیں کہ آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں کی جاسکتی

Marfat.com

تھیں، ایک ہی جگہ چولہوں پر نصب رہتیں، اور بیک وقت منوں کے حساب سے ان میں کھانا پکتا۔

محاریب اور تماثیل سے تو یہ بتانا مقصود ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی ہونے کے ساتھ ساتھ شان و شکوہ اور ہیبت و جبروت کے حامل بادشاہ بھی تھے۔ انھوں نے تمدن کو بلند و بالا عمارتوں اور فنِ تعمیر سے آراستہ کیا تھا۔ لیکن ان میں سے ہر چیز کسی نہ کسی مقصد کو واضح کرنے والی تھی۔ بالخصوص اس بات کو کہ جس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کا نام بلند ہوتا اور سر اس کے سامنے جھکتے ہیں وہ صرف جھونپڑوں کی بستی نہیں ہوتی بلکہ اس میں ہیبت کے اظہار کا سامان بھی ہوتا ہے۔

اور پھر بڑے بڑے لگن اور دیگوں کے ذکر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں اس مملکت میں ہیبت و فرمانروائی کی کارفرمائی دکھائی دیتی تھی وہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کا جود و کرم اور داد و دہش بھی نمایاں نظر آتا تھا، جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آپ کا خوانِ کرم اس قدر وسیع تھا کہ کوئی غریب بھوکا نہیں رہ سکتا اور کسی مہمان کو یہ خیال نہیں ستا سکتا کہ مجھے کھانا کہاں سے ملے گا۔ یہ آپ کی فیاضی اور سخاوت کی ایسی تعبیر تھی جس کی اس دور کی تاریخ قدم قدم پر گواہی دیتی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے دور کو صرف سائنس، آرٹ اور دیگر علوم ہی نہیں دیے تھے بلکہ ملک میں ایسا ماحول پیدا کر دیا تھا جس میں غرباء پروری کا نہایت وسیع اور فیاضانہ اہتمام بھی تھا۔

نعمتوں پر شکر لازم ہے

سائنس کی حکمرانی، دولت کی فراوانی اور آرٹ کا ذوق جہاں بے حد تعریف و تحسین کے مستحق ہیں وہیں اس کی حیثیت دو دھاری تلوار کی بھی ہے۔ اگر اس کے استعمال میں احتیاط نہ کی جائے اور اسے غلط ہاتھوں میں پہنچنے دیا جائے تو یہی چیزیں تمدنِ صالح کی دشمن ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے ارشاد فرمایا کہ اے آلِ داؤد شکر کے انداز میں زندگی گزارو اور عمل کرو۔ اللہ تعالیٰ نے جو بیشمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں کہیں بہک نہ جانا بلکہ اپنے رب کا شکر ادا کرتے ہوئے ہر نعمت کو صحیح محل میں برتنا اور ہر قدم صحیح سمت میں اٹھانا۔ اور آلِ داؤد کے لفظ سے حضرت سلیمان علیہ السلام، ان کی آل اولاد اور ان کے اتباع کو توجہ دلائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اس طرح کرنا جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کیا کرتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں کے نقشِ قدم

Marfat.com

پر چلے تو اللہ تعالیٰ نے انھیں وہ ہیبت اور عزت عطا فرمائی کہ جو ایک مثال بن گئی۔ آئندہ بھی اگر تم اس عظمت وحشمت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کی طرح اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری میں کوتاہی نہ کرنا۔ اور آیت کے آخری جملے میں تنبیہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا گیا ہے کہ شکر کی راہ کوئی آسان راہ نہیں۔ اس لیے اس راہ کو آسان نہ لینا بلکہ نہایت فکر مندی کے ساتھ زندگی کے ہر شعبے میں اس کے اثرات کو راسخ کرنے کی کوشش کرنا۔

Marfat.com

47- کتاب اللہ کے منتخب وارث

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْکِتٰبَ الَّذِیْنَ اصْطَفَیْنَا مِنْ عِبَادِنَا ج فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ م بِالْخَیْرٰتِ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط ذٰلِکَ هُوَ الْفَضْلُ الْکَبِیْرُ﴾

(پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنایا ان لوگوں کو جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا، پس ان میں سے کوئی تو اپنے نفس پر ظلم کرنے والا ہے، اور کوئی ان میں سے بیچ کی راس ہے اور کوئی ان میں سے اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیکیوں میں سبقت کرنے والا ہے، یہی بہت بڑا فضل ہے۔)

ثُمَّ حرفِ عطف ہے اور ترتیب پر دلالت کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حرف سے پہلے اور بعد کی دونوں چیزیں اصل وصف میں مشترک ہونے کے باوجود تقدیم و تاخیر رکھتی ہیں۔ اور یہ تقدیم و تاخیر زمانی بھی ہو سکتی ہے اور رتبہ و درجہ کے اعتبار سے بھی۔ سوال یہ ہے کہ اس آیت میں ثُمَّ کس تقدیم و تاخیر کی طرف اشارہ کر رہا ہے؟

اس سے پہلے ہم پڑھ چکے ہیں کہ تمام سابقہ آسمانی کتابوں کے محرّف اور مبدّل ہو جانے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آخری کتاب نازل فرمائی، جس کے بارے میں فرمایا کہ یہ وہ حق ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے نازل فرمایا ہے۔ اس میں غیرحق کی کوئی آمیزش نہیں۔ اس کا ہر حکم قطعی اور اس کی ہر پیش گوئی پتھر پر لکیر ہے۔ اسی سے قوموں کی قسمتیں وابستہ ہیں۔ اس پر عمل کرنے والی قومیں سرفراز ہوں گی اور اس کو چھوڑ کر مسلمان دنیا میں ذلیل اور آخرت میں ناکام ہوں گے۔ اسی کتاب کا دیا ہوا نظامِ زندگی افراد اور اقوام اور اسلامی ریاستوں کا دستور العمل ہوگا۔ چنانچہ لوگوں تک اسے پہنچانے، اس پر عمل کر کے دکھانے اور اس

Marfat.com

کی بنیاد پر ایک ریاست کو وجود دینے اور پھر ریاست کے ہر شعبے کو اس نظام کا نمائندہ بنانے اور ریاست کے ہر ادارے میں اس کے احکام کو جاری وساری کرنے کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ کے سپرد کی گئی۔ چنانچہ آپ نے ۲۳ سال کے عرصہ میں ان تمام ذمہ داریوں کو باحسن طریق پورا فرمایا۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنے اعوان وانصار اور اپنے جانشینوں کی ایک مضبوط جماعت تیار فرمائی جنھیں اس کام کی تکمیل کی ذمہ داری سونپی اور دنیا سے جاتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑ کے جا رہا ہوں وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور میری سنت ہے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ کا وہ دین جسے اس نے ادیانِ باطلہ پر غالب کرنے کی ذمہ داری آنحضرت ﷺ کے سپرد فرمائی تھی۔ آنحضرت ﷺ نے وہی ذمہ داری اپنے بعد اس مضبوط جماعت کے سپرد فرمائی جس کے لیے جزیرۂ عرب کو بنیاد بنایا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ باقی نوعِ انسانی کو اس آبِ حیات سے جس سے تمھیں زندگی ملی ہے سیراب اور زندہ کرنا ہے۔ چنانچہ اسی بات کو اس آیت میں بیان فرمایا گیا ہے کہ اصل ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے دین کو غالب اور جاری وساری کرنے کی جو نبی کریم ﷺ پر عائد کی گئی تھی آپ ﷺ نے اپنے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے اسے اپنی امت کے یہ کہہ کر سپرد فرمائی:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

جن لوگوں کے یہ کام سپرد کیا گیا اللہ تعالیٰ نے ان کی حیثیت کو بیان فرماتے ہوئے اِصْطَفَیْنَا کا لفظ استعمال فرمایا جس کا معنی ہے کہ ہم نے چن لیا، ہم نے انتخاب کر لیا۔ یعنی دنیا میں قوموں اور امتوں کی کمی نہیں۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل جس کام کے لیے چنے گئے تھے، لیکن رفتہ رفتہ وہ نااہل ثابت ہوئے۔ ان کے علاوہ ایشیا کے مختلف ملکوں اور یورپ میں کسی کو بھی چنا جا سکتا تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ عزت اور سعادت براہِ راست بنی اسماعیل اور اہلِ عرب کو عطا کی۔ کیونکہ بہت سی خصوصیات کے باعث وہی اس قابل تھے کہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔ ملوکیت کے زیرِ اثر مفلوج قومیں طبقات کے زخموں سے نڈھال بکھری ہوئی اولادِ آدم، شہری اور تمدنی زندگی میں اصلی سادگی کھو دینے والی بیمار اکثریت اور فطری زندگی سے کوسوں دور نام نہاد تہذیب کے زخم خوردہ انسانی گروہ اس قابل نہ تھے کہ ان پر اللہ تعالیٰ کے دین کی بالادستی کا بوجھ ڈالا جاتا۔ جزیرۂ عرب میں رہنے والے اپنے اندر ایسی خصوصیات رکھتے

Marfat.com

تھے کہ اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو وہ اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس ذمہ داری کے لیے ان کو منتخب فرمایا۔ چونکہ اس عظیم کام کے لیے انتخاب اللہ تعالیٰ کے نبیوں کا ہوتا رہا ہے، اس امت کے انتخاب کے لیے بھی وہی لفظ استعمال کیا گیا جو ان کے انتخاب کے لیے کیا جاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایک ایسی عزت سے نوازا جو انھیں انبیائے کرام علیہم السلام کے برابر تو نہیں لیکن ان کے قریب کرنے والی تھی۔

منتخب حاملین کے تین طبقات

جو امت بھی اس عظیم منصب پر فائز کی جائے گی فطری طور پر اس کے تین ہی طبقات ہوں گے۔ لیکن یہاں ان تین طبقات کے تعین کی ایک صورت یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی صورت میں جو جماعت اپنے پیچھے چھوڑی تھی اس میں یہ تینوں طرح کے لوگ تھے۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے تیار کردہ لوگ تو ایک ہی طرح کے تھے جنھیں سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن تابعین کے دور میں پہنچ کر ان کے معیار میں کمی آئی اور ان میں وہ طبقہ پیدا ہو گیا جنھیں یہاں مُقْتَصِدٌ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تبع تابعین کے زمانے میں پہنچ کر وہ تیسرا طبقہ پیدا ہوا جسے ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کہا گیا ہے۔ اس ناچیز کے نزدیک یہ دوسرا امکان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر پہلی بات کو بھی قبول کرلیا جائے تو جب بھی اس کی سطح یقیناً اس سطح سے مختلف ہوگی جو ان الفاظ کے مصداق کے حوالے سے بعد میں ہمیں امت میں دکھائی دیتی ہے۔ جس طرح قرآنِ کریم انبیائے کرام کی لغزشوں کو بھی گناہ قرار دے دیتا ہے حالانکہ شریعت کی نظر میں وہ گناہ نہیں ہوتا کیونکہ بعض دفعہ ابرار کی نیکیاں بھی مقرب لوگوں کے گناہ شمار ہوتے ہیں۔ کیونکہ دونوں کی سطح میں بے حد تفاوت پایا جاتا ہے۔ اسی طرح صحابہ میں جس کو ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ کہا گیا ہے اس کی سطح یقیناً وہ نہیں ہوگی جو امت کے عام گناہ گاروں کی ہے۔ لیکن ہم اپنی رائے پر اصرار کی بجائے امام ابنِ کثیر کی رائے کو ان الفاظ کی تفسیر میں پیش کر رہے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ ظالم سے مراد وہ آدمی ہے جو بعض واجبات میں کوتاہی کرتا ہے۔ اور بعض محرمات کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے اور مقتصد یعنی درمیانی چال چلنے والا وہ شخص ہے جو تمام واجبات شرعیہ کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات سے بچتا ہے۔ مگر بعض اوقات بعض مستحبات کو چھوڑ بھی دیتا ہے اور بعض مکروہات میں بھی مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور سَابِقٌ بِالْخَیْرٰتِ

Marfat.com

وہ شخص ہے جو تمام واجبات اور مستحبات کو ادا کرتا ہے اور تمام محرمات اور مکروہات سے بچتا ہے۔ اور بعض مباحات کو اشتغالِ عبادت یا شبہِ حرمت کی وجہ سے چھوڑ دیتا ہے۔ جمہور مفسرین بھی اس بات میں امام ابنِ کثیر کے ہم خیال ہیں۔

لیکن ایک بات واضح رہے کہ یہ تینوں گروہ اعمال کے اعتبار سے تو ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ان میں تفاوت پایا جاتا ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی دانستہ معصیت کرنے والا نہیں۔ اور اگر معصیت ہو جائے تو توبہ کرنے میں تاخیر نہیں کرتے۔ اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے دین کے فروغ اور نفاذ کی ذمہ داریوں کا تعلق ہے اس میں پہلے طبقے کے لوگوں میں ممکن ہے کوئی تساہل پایا جاتا ہو۔ لیکن لاپروائی یا بے نیازی ان میں سے کسی میں بھی نہیں پائی جاتی۔ درجات میں فرق ہوسکتا ہے، لیکن دین سے وابستگی اور دین کے حوالے سے ذمہ داریوں کے احساس کے حوالے سے ان میں کوئی فرق نہیں۔ اور یہی وہ دولت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے فضلِ کبیر قرار دیا ہے۔ اور اسی کی قدر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ پہلے گروہ کو بھی اسی طرح جنت کا استحقاق بخشے گا جیسے دوسرے دونوں گروہوں کو۔ البتہ جنت میں تینوں گروہوں کے درجات یقیناً ایک دوسرے سے مختلف ہوں گے۔ چنانچہ اس کی تائید نبی کریم ﷺ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔ اور امام احمد، ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم، طبرانی، بیہقی اور دوسرے محدثین نے نقل کیا ہے۔ اس میں حضور ﷺ فرماتے ہیں:

فاما الذين سبقوا فاولئك الذين يدخلون الجنة بغيرحساب ، واما الذين اقتصدوا فاولئك الذين يحاسبون حسابا يسيرا، واما الذين ظلموا انفسهم فاولئك يحبسون طول المحشر ثم هم الذين تتلقا هم الله برحمته فهم الذين يقولون الحمدلله الذى اذهب عنا الحزن۔

”جو لوگ نیکیوں میں سبقت لے گئے ہیں وہ جنت میں کسی حساب کے بغیر داخل ہوں گے، اور جو بیچ کی راس رہے ہیں ان سے محاسبہ ہوگا مگر ہلکا محاسبہ، رہے وہ لوگ جنھوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے تو وہ محشر کے طویل عرصے میں روک رکھے جائیں گے۔ پھر انھیں اللہ اپنی رحمت میں

Marfat.com

لے لے گا اور یہ لوگ ہیں جو کہیں گے کہ شکر ہے اس خدا کا جس نے ہم سے غم دور کر دیے۔''

اس حدیث میں آنحضرت ﷺ نے اس آیت کی پوری تفسیر بیان کر دی اور اہل ایمان کے تینوں طبقوں کا انجام الگ الگ بیان فرما دیا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمانوں میں سے جن لوگوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے انھیں مطلق سزا نہیں ہوسکتی۔ قرآن اور حدیث میں متعدد ایسے جرائم ذکر کیے گئے ہیں جن کے مرتکب کو ایمان بھی جہنم میں جانے سے نہیں بچا سکتا۔ مثلاً مومن کا قتلِ عمد، قانوناً میراث کی پامالی، اور ایسے ہی بعض دیگر کبائر کا ارتکاب جیسے سودخوری، جہنم میں جانے کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکن اس کی سزا بھگتنے کے بعد یقیناً وہ لوگ اپنے ایمان کی وجہ سے جنت میں جائیں گے۔

﴿جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَهَا یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا ج وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ﴾

(ہمیشہ رہنے والی جنتیں ہیں جن میں وہ داخل ہوں گے، ان میں ان کو سونے کے کنگن اور موتی کے پہنائے جائیں گے، اور اس جنت میں ان کا لباس ریشم ہوگا۔)

اِن منتخب لوگوں کا انجام

اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی اور فروغ کے راستے میں سب کچھ قربان کر دینے والوں اور اسی کو زندگی کی سب سے بڑی ترجیح قرار دینے والوں سے آخرت میں جو سلوک کیا جائے گا اور وہ جن انعامات سے نوازے جائیں گے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ان کی اقامت کے لیے ایسے باغات ہوں گے جن پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ جس کی سرسبزی اور شادابی اور مسرت و شادمانی کو کبھی فنا نہیں ہوگی۔ وہاں کی ہر چیز دوام آشنا ہوگی اور ان میں جب یہ لوگ داخل ہوں گے تو کبھی وہاں سے نکالے نہیں جائیں گے۔ ان باغات میں داخل ہونا محض وقتی سیر و تفریح کے لیے نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ کے لیے ہوگا۔ وہاں انھیں لباس ریشم کا پہنایا جائے گا۔ مراد یہ ہے کہ زیب و زینت اور آرام و راحت کے اعتبار سے سب سے بہتر لباس انھیں دیا جائے گا۔ چونکہ نزولِ قرآن کے وقت ریشم ہی سب سے قیمتی لباس تھا اس لیے تقریبِ فہم کے

Marfat.com

لیے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور انھیں سونے کے کنگن پہنائے جائیں گے جو موتیوں سے آراستہ ہوں گے۔ اصل حقیقت ان کی کیا ہوگی وہ تو اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن یہاں بتانا صرف یہ ہے کہ انھیں وہ نعمتیں عطا کی جائیں گی جو دنیا میں انسانوں کی سب سے بڑی متاع سمجھی جاتی ہیں اور انسان کبھی فرطِ مسرت میں ان کا خواب دیکھتا ہے۔ یہ سونا چاندی اور ریشم کا ذکر شاید اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ پہلے زمانے میں بڑے بڑے شہنشاہ سونے کے کنگن اور موتی پہنا کرتے تھے۔ اور ان کا لباس ریشم کا ہوتا تھا۔ تو یہ گویا دنیا میں جسم کی آسودگی کی معراج تھی، اس لیے اس کا ذکر فرمایا گیا ہے۔

Marfat.com

48- زندگی میں بے اعتدالی سے محفوظ لوگ اور ان کی صفات

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَحْدَهٗ وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَهٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
﴿اِلَّا الْمُصَلِّیْنَ ○ الَّذِیْنَ هُمْ عَلٰی صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ﴾
(مگر وہ لوگ (اس عیب سے بچے ہوئے ہیں) جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ جو اپنی نمازوں کی مداومت رکھتے ہیں۔)

سابقہ آیتِ کریمہ میں ان لوگوں کا ذکر کیا گیا ہے جو ہر تکلیف میں بلبلا اٹھتے ہیں اور ہر خوشحالی پر مارِ گنج بن کر بیٹھ جاتے ہیں، ان کی زندگی چونکہ اعتدال کے جوہر سے خالی ہوتی ہے اس لیے ان کا کوئی رویہ پائیدار نہیں ہوتا بلکہ حالات کی تبدیلی سے بدلتا رہتا ہے۔ اب اس آیتِ کریمہ میں فرمایا جا رہا ہے کہ زندگی کے اس بہت بڑے عیب اور ناہمواری سے صرف وہ لوگ بچے ہوئے ہیں جن کی صفات آگے آ رہی ہیں۔ ان میں سب سے پہلے لوگ وہ ہیں جو نماز پڑھنے والے ہیں۔ نماز کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کے تعلق میں ایک ایسی مضبوطی اور استقامت پیدا ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے متضاد رویوں میں ٹھیک اس راستے پر چلتے ہیں جو راستہ اللہ تعالیٰ کی طرف لے جاتا ہے۔ نماز ان کے اندر چونکہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے وفاداری کا ایک جذبہ پیدا کر دیتی ہے اور غیر اللہ کے ہر اس راستے سے جو اللہ تعالیٰ کے راستے سے متصادم ہو یکسو کر دیتی ہے۔ اس لیے بے اعتدالی اور ناہمواری ان کی زندگیوں میں داخل نہیں ہو سکتی۔ البتہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک صفت کا پیدا کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ نماز پڑھنے والا نمازوں کی مداومت بھی رکھتا ہو۔

Marfat.com

پہلی صفت مداومت کا مفہوم

مداومت کے متعدد مفاہیم ہیں، جن میں سے ایک مفہوم یہ ہے کہ نماز ان لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے تعلق اور زندگی میں اعتدال پیدا کرتی ہے جو ہر قسم کی سستی، آرام طلبی، مصروفیت یا دلچسپی کو بہانہ بنا کر نماز چھوڑنے والے نہ ہوں، بلکہ ان کا حال یہ ہو کہ جب نماز کا وقت آ جائے تو وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اپنے مالک کی عبادت بجا لانے کے لیے کھڑے ہو جاتے ہوں۔ احادیثِ مبارکہ میں آنحضرت ﷺ کے بارے میں آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات بیان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ اپنے اہلِ خانہ سے نہایت محبت بھرے انداز میں گفتگو فرما رہے ہوتے کہ اذان کی آواز آ جاتی، تو آپ ﷺ اس طرح نماز کی طرف متوجہ ہو جاتے اور اہلِ خانہ سے یوں لاتعلق ہو جاتے جیسے وہ کسی کو پہچانتے ہی نہ ہوں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کی مداومت کے مفہوم کا معنی ہر چیز پر نماز کے تصور کا غالب آ جانا ہے۔

دوسرا مفہوم اس کا وہ ہو سکتا ہے جو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا ہے کہ وہ پورے سکون اور خشوع کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں، کوے کی طرح ٹھونگیں نہیں مارتے اور نماز کے دوران اِدھر اُدھر التفات بھی نہیں کرتے۔

اور تیسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہوتے کہ انھیں عام حالات میں ذکرِ الٰہی یا نماز پڑھنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ لیکن ان پر کوئی مصیبت آ جائے تو بڑے نمازی اور بڑی لمبی لمبی دعائیں کرنے والے بن جاتے ہیں۔ کوئی امتحان درپیش ہو تو امتحان میں کامیابی کے لیے نمازوں کی پابندی بھی شروع ہو جاتی ہے اور دعائیں بھی خوب دل لگا کے مانگی جاتی ہیں۔ کاروبار میں کوئی نقصان ہو جائے تو اس کی تلافی کے لیے ان کا خشوع وخضوع دیدنی ہوتا ہے۔ اور جب وہ وقت گزر جائے اور معاملات درست ہو جائیں تو وہ کان جھاڑ کے اس طرح نمازوں سے الگ ہو جاتے ہیں، گویا خدا سے نہ کبھی ان کو کوئی سابقہ پڑا ہے اور نہ آئندہ کبھی پڑنے والا ہے۔ ایسی نماز تو بجائے خود عدمِ توازن کا مظہر ہے۔ وہ زندگی کے عدمِ توازن اور ناہمواری کو کیونکر ختم کر سکتی ہے۔ پروردگار جن نمازوں کو مثمر بناتے ہیں اور آخرت میں جو بہت بڑے اجر وثواب کا باعث ہوں گی وہ، وہ نمازیں ہیں جو پابندی اور تسلسل کے ساتھ پڑھی جائیں۔ آنحضرت ﷺ کے ارشادات اور آپ ﷺ کے عمل سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے

Marfat.com

کہ اس عمل میں برکت ہوتی ہے جو اگرچہ مقدار میں زیادہ نہ ہو لیکن پابندی کے ساتھ ہمیشہ اس کو انجام دیا جائے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے آنحضرت ﷺ کے عمل کو جھڑی سے تشبیہ دی ہے۔ مراد اس سے یہ ہے کہ آپ ﷺ کا عمل وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتا تھا کہ جس طرح ایک زوردار بارش ہو جائے اور اس کے بعد طویل عرصے کے لیے ابر غائب ہو جائے، تو اس بارش کا فصلوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا بلکہ فصلیں سوکھ کر تباہ ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے برعکس تھوڑی بارش بھی جھڑی کی شکل میں قائم و دائم رہے تو وہ کھیتوں کو شاداب رکھتی اور فصلوں کو بار آور کرتی ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾

(اور وہ جن کے مالوں میں ایک مقرر حق ہے۔ سائل اور محروم کا۔)

دوسری صفت انفاق

ایسے لوگوں کی دوسری صفت ایک ایسی بات کو بیان فرمایا گیا ہے جو دین کے دوسرے بازو کی حیثیت رکھتی ہے۔ یعنی دین کا ایک بازو اگر نماز ہے تو دوسرا بازو انفاق ہے۔ اور ان دونوں کو دین میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اور پھر یہی دونوں بنیادی صفات جہاد کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں راست روی اس وقت آتی ہے جب اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ سے مضبوط ہو جائے اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ کے بندوں سے۔ اور یہی دینِ اسلام کا اصل مطالبہ اور اسلامی تعلیمات کا نچوڑ ہے۔ نماز بندے کو خدا سے جوڑتی ہے۔ اور انفاق سے بندے کا تعلق نوعِ انسانی سے صحیح معنی میں پیدا ہوتا ہے۔

آیت میں حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی وہ لوگ اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر و متعین حق سمجھتے ہیں۔ اس سے بعض اہلِ تفسیر نے یہ سمجھا ہے کہ اس سے مراد زکوٰۃ ہے۔ کیونکہ زکوٰۃ ہی ایک ایسا عطیہ ہے جس کا نصاب اور جس کی مقادیر پروردگار نے مقرر فرمائی ہیں۔ اصولی طور پر تو یہ بات صحیح ہے لیکن اس آیت میں زکوٰۃ مراد لینا اس لیے صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ زکوٰۃ کا نظام ایک معین شرحِ نصاب کے ساتھ مدنی دور میں نافذ ہوا اور یہ سورۃ بالاتفاق مکی ہے۔ البتہ اس سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طور پر اپنے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک حصہ طے کر رکھا ہے جسے وہ ان کا حق سمجھ کر ادا کرتے ہیں۔ یہی معنی حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن عباس رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ ابن عمر رضی اللہ عنہ،

Marfat.com

مجاہد رحمہ اللہ، شعبی رحمہ اللہ اور ابراہیم نخعی رحمہ اللہ نے بیان کیے ہیں۔

لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ...... سائل سے مراد پیشہ ور بھیک مانگنے والا نہیں، بلکہ وہ حاجت مند شخص ہے جو کسی سے مانگے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرے۔ البتہ یہ بات جاننا ضروری ہے کہ ہر ہاتھ پھیلانے والا پیشہ ور نہیں ہوتا۔ اب چونکہ مانگنے والوں کی کثرت ہوگئی ہے جو امتِ مسلمہ کے لیے نہایت شرمناک بات ہے۔ اس لیے مدد دینے والے کو تھوڑا بہت تردد ضرور کرنا چاہیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ حقیقت میں ضرورت مند لوگ رہ جائیں اور پیشہ ور لے جائیں۔ لیکن اس میں بہت جستجو کرنا بھی اچھا نہیں۔ اور کسی کو جھڑکنا یا ملامت کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ قرآن وسنت نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔

محروم سے مراد ایسا شخص ہے جو بیروزگار ہو یا اس کا روزگار اس کی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہو۔ یا کسی حادثے یا آفت کا شکار ہو کر محتاج ہو گیا ہو۔ لیکن وہ سوال کرنے سے گریز کرتا ہو۔ اس کی عزتِ نفس ناداری کے باوجود اسے خودداری مجروح کرنے کی اجازت نہ دیتی ہو۔ خاص طور پر وہ مصیبت زدہ جو پہلے صاحبِ حیثیت رہ چکا ہو، پھر گردشِ روزگار کے ہاتھوں نانِ شبینہ کا محتاج ہو گیا ہو۔ یہ لوگ جن کا ذکر ہو رہا ہے ایسے محروم لوگوں کی آگے بڑھ کر مدد کرتے ہیں، انھیں خود تلاش کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ وہ ان سے مدد مانگیں بلکہ ایسے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں کہ وہ ایسے خوددار لوگوں کی عزتِ نفس کو مجروح کیے بغیر ان کی مدد کریں۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ﴾

(اور وہ جو جزاء کے دن کی تصدیق کرتے ہیں۔ اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔)

تیسری صفت روزِ جزاء کا یقین

جو لوگ سائلوں اور محروموں کا اپنے مال میں ایک متعین حصہ رکھتے ہیں ان کے اس عمل کا محرک اور سبب یہ ہے کہ وہ روزِ جزاء پر یقین رکھتے ہیں کیونکہ تصدیق کا تعلق دل کے یقین سے ہوتا ہے۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ ایک روز اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہونا ہے۔ اپنے

Marfat.com

ایک ایک لمحہ اور ایک ایک عمل کی جوابدہی کرنی ہے۔ مال کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا کہ تم نے اس کا حق ادا کیا تھا یا نہیں۔ چنانچہ یہ محرک انھیں ہمیشہ سائلوں اور محروموں کے لیے مدد کرنے پر انگیخت کرتا رہتا ہے اور یہ بات بھی ہمیں قرآنِ کریم سے معلوم ہوتی ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا یقین نہیں رکھتے اور روزِ جزاء کو محض ایک افسانہ سمجھتے ہیں، وہ کبھی غریبوں اور مسکینوں پر اپنا مال خرچ کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ سورۃ الماعون میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ O فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ﴾

''بھلا دیکھا تم نے اس کو جو روزِ جزاء کو جھٹلاتا ہے، وہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔''

دوسری آیتِ کریمہ میں تصدیق بِیَوْمِ الدِّیْن کا نتیجہ بیان فرمایا ہے۔ چونکہ وہ لوگ روزِ جزاء کا یقین رکھتے ہیں تو اس یقین نے ان کے اندر اللہ تعالیٰ کے عذاب کا خوف پیدا کر دیا ہے۔ وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے ہیں کہ اگر ہم اپنے مال میں مستحقین کے حقوق ادا کرنے سے قاصر رہے تو اللہ تعالیٰ کو کیا جواب دیں گے اور اس کے عذاب کا کیسے سامنا کر سکیں گے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ الدہر کی آیت ۷ تا ۱۰ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ (وہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اپنے نذریں پوری کرتے اور اس دن سے ڈرتے ہیں جس کی آفت ہمہ گیر ہے اور مسکینوں، یتیموں اور اسیروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اس کی کمیابی یا اس کے ضرورت مند ہونے کے باوجود وہ کہتے ہیں کہ ہم تمھیں صرف رضائے الٰہی کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے کسی بدلے یا شکرگزاری کے خواہاں نہیں ہیں۔ ہم اپنے رب کی طرف سے ایک سخت منحوس قسم کے دن کا اندیشہ رکھتے ہیں۔)

﴿ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَیْرُ مَاْمُوْنٍ ﴾

(بیشک ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔)

نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف

اس آیتِ کریمہ میں ان نیک بندوں کے طرزِ فکر کی تعریف فرمائی گئی ہے، یعنی ان کا اپنے رب کے عذاب سے ڈرنا اور اس سے بچنے کے لیے غریبوں، یتیموں، مسکینوں اور قیدیوں

Marfat.com

کو کھلانا پلانا اور ان کی مدد کرنا، یہ ان کی اس قابلِ تعریف فکر کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب ایسی چیز نہیں جس کے بارے میں بے خوف رہا جا سکتا ہو۔ وہ کسی وقت اور کسی حال میں بھی نازل ہو سکتا ہے۔ اور پھر وہ ایسا ہمہ گیر اور شدید عذاب ہے کہ جس سے بچاؤ کی کوئی صورت ممکن نہیں۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰی اَزْوَاجِهِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾

(اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے، سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔ البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔)

چوتھی صفت کردار کی پاکیزگی

نماز، انفاق اور خشیتِ الٰہی کے بعد اب ان نیک بندوں کی اخلاقی بلندی اور کردار کی پاکیزگی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی وہ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ یعنی جسم کے وہ حصے جنھیں چھپانا ضروری ہے۔ انھیں کھولنے اور عریاں کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ نہ وہ دوسروں کے ستر پر نگاہ ڈالتے ہیں اور نہ اسے برداشت کرتے ہیں کہ کوئی ان کے ستر پر نگاہ ڈالے۔ آنحضرت ﷺ کا ایک ارشاد ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ:

"کوئی شخص مجھے عریاں حالت میں دیکھے یعنی اس کی نظر میرے ستر پر پڑے اس سے بہتر ہے کہ مجھے آسمانوں سے گرا دیا جائے اور میرے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔"

اور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ مرد کا ستر ناف سے گھٹنوں تک ہے اور عورت کا ستر ہاتھ پاؤں اور چہرے کے علاوہ سارا جسم ہے۔ اب اس کی شکایت کس سے کی جائے کہ حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ کی بیٹیاں مختلف کھیلوں میں شریک ہو کر ٹی وی پر اپنے جسم کی نمائش کرتی ہیں اور ڈراموں اور کمرشل میں کام کرنے والی بہو بیٹیاں اپنے ناز و انداز، اپنے جسم کے مختلف زاویے اور اپنی اداؤں سے دنیا کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ ہم کرسٹن کیلر کے قبیل سے تعلق رکھتی ہیں، ہمارا فاطمہ

Marfat.com

اور عائشہ سے کوئی تعلق نہیں۔ان کی حالت دیکھ کر تو بعض دفعہ بے ساختہ کہنے کو جی چاہتا ہے۔

بانجھ ہو جائیں زمینیں لڑکیاں پیدا نہ ہوں
اے خدا شہناز گل سی بیٹیاں پیدا نہ ہوں
پھول پیدا ہوں مگر شاخوں کی آرائش رہیں
لڑکیاں پیدا ہوں لیکن تتلیاں پیدا نہ ہوں

اور جہاں تک مردوں کا تعلق ہے انھوں نے فری سٹائل کشتیوں،کبڈی اور بعض دوسری کھیلوں سے امتیاز ہی ختم کر ڈالا ہے کہ مرد کا بھی کوئی ستر ہوتا ہے۔

دوسرا مفہوم اس آیت کا یہ ہے کہ وہ اپنی عصمت وعفت کو محفوظ رکھتے ہیں۔یعنی صنفی معاملات میں آزادی نہیں برتتے۔شہوانی خواہشات کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اس کے استعمال میں بے لگام نہیں ہوتے۔وہ ان کو صرف وہیں آزادی دیتے ہیں جہاں اس کا حق ان کو حاصل ہے۔

﴿اِلاَّ عَلٰی اَزْوَاجِھِمْ اَوْمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ فَاِنَّھُمْ غَیْرُمَلُوْمِیْنَ، جفَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِکَ فَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْعٰدُوْنَ﴾

(بجز اپنی بیویوں اور اپنی مملوکہ عورتوں کے،سو اس باب میں ان کو کوئی ملامت نہیں۔البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہیں وہی حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔)

ایک غلط فہمی کا ازالہ

سابقہ آیتِ کریمہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ جو اصحابِ ایمان اور اللہ والے ہوتے ہیں وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ وہ جنسی تعلق کو اپنے لیے ایک عیب سمجھتے ہیں۔وہ بالکل راہبوں اور جوگیوں کی طرح زندگی بھر نہ شادی کرتے ہیں اور نہ کسی اور طرح اس تعلق کے قریب جاتے ہیں۔چنانچہ اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی شرمگاہوں کی اس طرح حفاظت کرتے ہیں کہ بیویوں اور کنیزوں کے سوا صنفی تعلق کسی اور سے قائم نہیں کرتے۔وہ چونکہ اپنے اللہ پر ایمان لائے ہیں اس کی شریعت کو انھوں نے اپنا دستور العمل بنایا ہے اور اس کے رسول کو اپنا آئیڈیل اور اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے اس لیے جہاں اس کی شریعت کسی چیز کی اجازت دیتی ہے تو وہ اجازت کو اپنے لیے ذریعۂ فلاح سمجھتے ہیں اور جہاں

Marfat.com

کسی چیز سے روکتی ہے تو اس سے رک جانے کو اللہ کی رضا کا راستہ جانتے ہیں۔ وہ اپنے صنفی تعلقات میں نہ تو بالکل سانڈھ بن جاتے ہیں کہ آبروئیں برباد کرتے پھریں اور انسانی معاشرے کو لاعلاج امراض کا شکار کر دیں اور نہ وہ اپنے اوپر غیر ضروری پابندیاں لگا کر رہبانیت کا راستہ اختیار کر کے فطرت سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ نے انھیں نکاح کرنے کی اجازت دی ہے تاکہ وہ اپنی بیویوں سے صنفی تعلق قائم کریں۔ اسی طرح لونڈیوں اور کنیزوں سے بھی جنسی تعلق قائم کرنے کی اجازت دی ہے کیونکہ ایک وقت میں یہ بھی اسلامی معاشرے کی بہتری اور اصلاح کے لیے بہت ضروری تھا۔ بیوی سے یہ تعلق اس لیے جائز ہے کہ نکاح کو جائز طریقہ قرار دیا گیا ہے اور لونڈی سے اس تعلق کے جواز کا سبب یہ ہے کہ باقاعدہ قانونی حیثیت سے لونڈی اپنے آقا کی مِلک میں آتی ہے اور وہ مِلک اس کے آقا کو اس سے تمتع کا حق دیتی ہے۔ لیکن اب چونکہ غلامی کا دور گزر گیا ہے اسلام نے اپنی ہمہ گیر کوششوں سے غلامی کو ختم کر ڈالا ہے اس لیے ازسرِ نو ان بحثوں کو زندہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ یہاں تو بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں صنفی ضرورت ان کا فطری تقاضا ہے۔ اللہ نے اس تقاضے کو قانونی شکل دے کر نکاح اور ملک کی صورت میں اس کی اجازت دی ہے۔ لیکن جو شخص ان دونوں جائز طریقوں سے تجاوز کرتا ہوا کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے تو وہ حد سے تجاوز کرنے والوں میں شمار ہوگا اور اسلامی شریعت میں حد سے تجاوز کو زنا کہا گیا ہے جس پر حدِ زنا جاری کی جاتی ہے۔

متعہ کا رد

بعض علما نے انھیں آیات سے متعہ کی حرمت کو ثابت کیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ ایک مومن کے لیے صنفی خواہشات کی تکمیل کے دو ہی طریقے ہیں جنھیں قرآنِ کریم نے جائز ٹھہرایا ہے۔ ایک ہے ''منکوحہ بیوی'' اور دوسری ہے ''مملوکہ لونڈی''۔ اس کے علاوہ تیسری ایسی کوئی جگہ نہیں جہاں صنفی تعلق پیدا کیا جا سکے۔ جو شخص کسی عورت سے متعہ کرتا ہے تو یہ ممنوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو ظاہر ہے کہ وہ نہیں ہے اور جہاں تک بیوی ہونے کا تعلق ہے اسے بیوی بھی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا۔ نہ وہ مرد کی وارث ہوتی ہے، نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے۔ نہ اس کے لیے عدت ہے، نہ طلاق۔ نہ نفقہ، نہ ایلاء اور ظہار اور لعان وغیرہ۔

Marfat.com

بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی وہ مستثنیٰ ہے۔ پس جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ کچھ اور میں شمار ہوگی۔ جس کے طالب کو قرآن حد سے گزرنے والا قرار دیتا ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''المامون'' میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ خلیفہ مامون اہلِ تشیع کے دلائل سے متاثر ہو کر متعہ کے جواز کا قائل ہو گیا اور اس نے شہر میں متعہ کے جواز کا اعلان کرنے کا حکم دیا۔ جب شیخ الاسلام کو علم ہوا تو وہ خلیفہ کے پاس آئے اور اس سے آکر بات کی اور انھیں آیات سے استدلال کیا اور مامون سے پوچھا کہ ممتوعہ عورت لونڈی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو کیا بیوی ہے؟ اس نے کہا: نہیں۔ تو شیخ الاسلام نے کہا کہ اس کے علاوہ تو ہر تعلق قرآنِ کریم نے حرام قرار دیا ہے اور ایسا کرنے والے کو حد سے تجاوز کرنے والا قرار دیا ہے۔ مامون کو فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا تو دوبارہ شہر میں متعہ کے حرام ہونے کا اعلان کرایا گیا۔

اہلِ تشیع کی جسارت

اہلِ تشیع متعہ کو مباح ہی نہیں سمجھتے بلکہ اس کے فضائل بیان کرنے میں انتہائی مبالغہ سے کام لیتے ہیں۔ پیشِ نظر آیات کی موجودگی میں میں نہیں سمجھتا کہ وہ کون سے دلائل کا سہارا لیتے ہیں۔ لیکن دلائل سے قطع نظر ایک بات نہایت حیران کن ہے کہ جس کام کو وہ فضیلت اور ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے ہیں اسی کام کو وہ اپنی بچیوں اور اپنی بہنوں کے لیے کبھی سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں بازاری عورتوں کا ایک بازار لگا رہے؟ یا طبقۂ امرا کے لوگ غریب بچیوں سے متعہ کے نام پر عیاشی کرتے رہیں؟ اگر ایک فعل ایک خاندان کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے تو دوسرے کسی خاندان کے لیے باعثِ عز و وقار کیسے ہو سکتا ہے؟

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾

''اور وہ اپنی امانتوں اور اپنے عہد و پیمان کا پاس رکھنے والے ہیں۔''

پانچویں اور چھٹی صفت امانتوں اور عہد کی پاسداری

اہلِ ایمان کی پانچویں اور چھٹی صفت کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ پانچویں صفت[۱] یہ ہے کہ وہ اپنی امانتوں کا پاس رکھنے والے ہیں۔ امانت کا لفظ بڑا وسیع ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

Marfat.com

انسانوں کو جو صلاحیتیں اور قوتیں عطا فرمائی ہیں یہ اس کی انسانوں کے پاس امانتیں ہیں۔ زندگی سب سے بڑی امانت ہے۔ جوانی زندگی کا ایک حصہ ہے لیکن اپنی اہمیت کے پیش نظر الگ سے اسے امانت کا درجہ دیا گیا ہے۔ مال و دولت بھی اللہ کی امانت ہے اور مال و دولت کے حصول کی صلاحیت بھی اللہ کی امانت ہے۔ ذہنی صلاحیتیں حصولِ علم کے ذرائع اور پھر اسے عام کرنے کی کوششیں بھی اللہ کی امانت ہیں۔ ان سب کے بارے میں الگ الگ پوچھا جائے گا کہ تم نے ان امانتوں کا حق کیسے ادا کیا؟ کیا یہ امانتیں، امانتیں رکھنے والے کی ہدایت کے مطابق صحیح مصرف میں صرف کی گئیں یا ان میں خیانت کی گئی؟ اسی طرح اولاد بھی اللہ کی امانت ہے۔ عہدہ ومنصب بھی اللہ کی دین ہے۔ وجاہت اور شخصیت بھی اللہ کا عطیہ ہے۔ ان سب کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ اسی طرح انسان جو ایک دوسرے کے پاس امانتیں رکھواتے ہیں یا دوسروں کے جو حقوق کسی شخص کے ذمہ عائد ہوتے ہیں یہ بھی امانت کے زمرے میں شمار ہوتے ہیں۔ اہلِ ایمان ان تمام امانتوں کو اللہ کا حق جان کر ادا کرنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں۔

اہلِ ایمان کی ایک اور صفت

اصحابِ ایمان کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ عہد کا پاس کرنے والے ہوتے ہیں۔ عہد میں وہ تمام عہد و میثاق شامل ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ہماری فطرت سے عالمِ غیب میں لیے ہیں یا اپنے نبیوں کے واسطے سے اپنی شریعت کی شکل میں اس دنیا میں لیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام عہد و میثاق بھی اس میں شامل ہیں جو ہم نے ایمان کی صورت میں اپنے اللہ سے کیے ہیں۔ اسی طرح وہ تمام معاہدات اور تمام قول و قرار جو ہم نے مختلف قوموں اور مختلف افراد سے کیے ہیں، خواہ وہ تحریری شکل میں ہوں یا زبانی حد تک یا معاشرے کے معروف کی صورت میں ہم اسے قبول کر چکے ہیں یہ تمام بھی عہد و میثاق میں شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ایسی تمام امانتوں اور تمام عہد و میثاق کی پاس داری کا حکم دیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا شاید ہی کوئی خطبہ ایسا ہوگا جس میں آپ نے یہ ارشاد نہ فرمایا ہو: لا ایمان لمن لا امانة له ''اس آدمی کا ایمان نہیں جس میں امانت کی پابندی نہیں۔'' اور لا دین لمن لا عهد له ''اور اس آدمی کا کوئی دین نہیں جس میں عہد کی پاسداری نہیں۔'' اسی طرح نبی کریم ﷺ نے منافق کی علامتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا، بخاری اور مسلم کی متفق علیہ روایت ہے کہ چار خصلتیں

Marfat.com

ہیں کہ جس میں وہ چاروں پائی جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں کوئی ایک پائی جائے اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے۔ جب تک کہ وہ اسے چھوڑ نہ دے وہ چار خصلتیں یہ ہیں کہ ۱:۔ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو خیانت کرے۔ ۲:۔ جب بولے تو جھوٹ بولے۔ ۳:۔ جب عہد کرے تو توڑ دے۔ ۴:۔ اور جب کسی سے جھگڑے تو اخلاق و دیانت کی ساری حدیں پھلانگ جائے۔ وہ اصحابِ ایمان جنھیں اللہ نے کامیابی سے نوازا ہے وہ امانتوں کی بھی پاسداری کرتے ہیں اور عہد و میثاق کا بھی پاس کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ﴾

''اور وہ جو اپنی شہادتوں کو ادا کرنے والے ہیں۔''

ساتویں صفت ادائے شہادت

گزشتہ آیتِ کریمہ میں جس طرح امانت اور عہد کے الفاظ وسیع معنی میں استعمال ہوئے ہیں اس طرح لفظ شہادت اس آیت میں وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ شہادت کی جمع ہے۔ شہادت کا معنی گواہی ہوتا ہے۔ یہاں نیک بندوں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی گئی ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے معاملے میں شہادت کے ادا کرنے والے ہوتے ہیں۔ یعنی جس شہادت کا ذمہ انھوں نے اپنے سر لیا ہے اور جس شہادت کا وہ وعدہ کر چکے ہیں چاہے وہ شہادتِ کبریٰ ہو جو اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم ذمہ داری کے طور پر اس امت پر فرض کی ہے، جسے عام الفاظ میں شہادتِ حق کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ سورۃ البقرۃ میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

﴿لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾

''تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو اور رسول کریم ﷺ تم پر گواہ بنیں۔''

اسی طرح ہر سچی بات کی گواہی یا ہر ایسی گواہی جس کی ذمہ داری ایک مومن قبول کر لے یا کوئی ایسا واقعہ جو اس کی نظروں کے سامنے ہوا اور کوئی اور اسے دیکھنے والا نہ ہو یا گواہی دینے والا نہ ہو۔ اور اسے اس کی گواہی کے لیے طلب کیا جائے، اس کا حق ادا کرنا اس کے لیے لازم ہو جائے گا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے خطرے کا سامنا کرتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِیْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ﴾

''اور جو اپنی نماز کی حفاظت کرتے ہیں۔''

Marfat.com

آٹھویں صفت نماز کی محافظت

اس آیتِ کریمہ میں اہلِ ایمان کی ایک اور صفت کو بیان کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں۔ ان صفات کا ذکر نماز ہی سے شروع ہوا تھا اور نماز ہی پر ختم کیا جا رہا ہے۔ البتہ! فرق یہ ہے کہ پہلے نماز کی روح یعنی نماز کے اندر خشوع کا ذکر کیا گیا تھا اور اب نماز کی محافظت یعنی اس کی دیکھ بھال اور اس کے اہتمام کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہاں نماز کو اگرچہ واحد لایا گیا ہے لیکن اس سے جنس صلوٰۃ مراد ہے جس کا اطلاق واحد جمع دونوں پر ہوتا ہے۔ نماز جہاں بھی ہو اور جب بھی ہو اگر اس میں خشوع نہیں تو وہ روح سے خالی نماز ہے۔ جس سے نماز کی صورت تو وجود میں آسکتی ہے نماز کی حقیقت نہیں اور صرف کسی چیز کی صورت حقیقت کے بغیر دیر تک باقی نہیں رہا کرتی۔ اور یہ صورت سے حقیقت کا سفر تب ممکن ہوتا ہے جب صورت اور سیرت دونوں کی محافظت کی جائے کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ جیسے جیسے صورت بہتر ہوتی جاتی ہے ویسے ویسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے اور جیسے جیسے حقیقت کی طرف دھیان بڑھتا جاتا ہے ویسے ویسے صورت کے اہتمام میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس لیے اصل اہتمام اور توجہ سب سے پہلے صورت پر ہوتی ہے جس کے اندر سے حقیقت وجود میں آتی ہے۔ اس لیے اہلِ ایمان کی یہ صفت بیان کی گئی کہ وہ اپنی نمازوں کی محافظت کرتے ہیں یعنی اس کے ایک ایک پہلو کی نگہداشت کرتے ہیں۔ وہ اوقاتِ نماز، آدابِ نماز، اور ارکان و اجزاءِ نماز، غرض نماز سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی پوری طرح نگہداشت کرتے ہیں۔ نماز کی تیاری کے لیے صاف کپڑوں کا اہتمام کرتے ہیں۔ جسم کی پاکیزگی کا خیال کرتے ہیں۔ وضو، سنن، مستحبات اور آداب کے اہتمام کے ساتھ کرتے ہیں۔ نماز کبھی وقت ٹال کر نہیں پڑھتے۔ جب تک ایک رکن کی ادائیگی نہیں ہو جاتی دوسرے رکن کی طرف انتقال نہیں کرتے۔ یعنی تعدیلِ ارکان کا اہتمام رکھتے ہیں۔ نماز میں جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے ہیں۔ اس کے معنی اور مفہوم پر توجہ دیتے اور اپنے دل میں اسے اتارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حتی الامکان نماز جماعت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ وقت سے پہلے مسجد میں پہنچتے ہیں اور نہایت اطمینان سے نماز ادا کرنے کے بعد مسجد سے نکلتے ہیں۔ دل ان کا مسجد میں اٹکا رہتا ہے۔ جب تک نماز میں رہتے ہیں یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے

Marfat.com

سامنے ہیں۔ ان کے دل پگھلتے اور آنکھوں سے آنسو برستے ہیں۔ اس طرح سے خشوع کی طرف ان کا سفر جاری رہتا ہے اور یہ سب کچھ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ نماز باغِ جنت کا پودا ہے اس کی طرف سے ذرا سی غفلت اور ناقدری اس کے بے ثمر ہونے کا باعث بن سکتی ہے۔ اگر اسے پورے اہتمام سے قائم رکھا گیا تو دین کا ایک ایک ستون باقی رہے گا اور اگر اس کی طرف سے لاپرواہی برتی گئی تو دین کی عمارت کو کسی وقت بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

اَلصَّلٰوۃُ عِمَادُ الدِّیْنِ مَنْ اَقَامَھَا فَقَدْ اَقَامَ الدِّیْنِ وَمَنْ ھَدَمَھَا فَقَدْ ھَدَمَ الدِّیْنِ۔

''نماز دین کا ستون ہے جس نے اسے قائم رکھا اس نے دین کو قائم رکھا اور جس نے اسے گرادیا اس نے دین کو ڈھادیا''۔

اُولٰٓئِكَ فِیْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ

''یہی لوگ جنتوں میں عزت کے ساتھ رہنے والے ہوں گے۔''

مذکورہ اوصاف کے حاملین کا انعام

یہ لوگ جو مذکورہ اوصاف کے حامل ہوں گے، اس قابل ہیں کہ انھیں جنتوں میں نہایت عزت و احترام سے رکھا جائے۔ اس سے مراد وہ تمام لوگ ہیں جو آنحضرت ﷺ پر ایمان لاچکے تھے اور ان میں سے ہر ایک ان ہی صفات کا پیکر تھا۔ البتہ ان میں سے ہر ایک غربت کی تصویر بھی تھا۔ کیونکہ اولاً تو نبوت کی روایت کے مطابق ہر نبی پر وہ لوگ ایمان لانے میں پہل کرتے ہیں جو اس دور کے ستائے ہوئے اور مفلوک الحال لوگ ہوتے ہیں۔ انھیں جب معاشرے کے مظالم سے نکلنے کا ایک راستہ نظر آتا ہے اور اپنی محرومیوں کی تلافی کی ایک صورت نظر آتی ہے، تو وہ آگے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کا دین قبول کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہی حال صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بھی تھا۔ ان میں بڑی تعداد ایسے ہی غریب لوگوں کی تھی۔ ثانیاً وہ لوگ جو ایمان لانے سے پہلے خوشحال اور بڑے کاروباری لوگ تھے۔ اسلام قبول کرنے سے نہ ان کی تجارت باقی رہی اور نہ پہلی سی خوشحالی۔ جو کچھ پاس تھا وہ غلاموں کو آزاد کرانے اور غریبوں کی مدد کرنے پر خرچ ہو گیا۔ اور اہلِ شہر کی بہیمانہ مخالفت سے ہر طرح کا کاروبار تباہ ہو کر رہ گیا، تو وہ بھی غریب

Marfat.com

ہو کر رہ گئے۔ چنانچہ قریش جب ان لوگوں کو دیکھتے تو مذاق اڑاتے، کہ یہ لوگ اپنے آپ کو جنت کا وارث اور خلافتِ ارضی کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اور حال یہ ہے کہ نہ پیٹ بھرنے کو نانِ جویں میسر ہے اور نہ تن پوشی کا مناسب لباس۔ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں، لیکن دعوے بہت بلند ہیں۔ ان کے مقابلے میں ہم لوگ دنیا میں بھی آسودہ حال اور مدارجِ عالیہ پر فائز ہیں۔ یقیناً قیامت میں بھی ہمیں ایسے ہی انعامات سے نوازا جائے گا اور جنت کے وارث بھی ہم ہی ٹھہریں گے۔ ان پر تعریض کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ جنت کوئی وراثت میں ملنے والی چیز نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ کی رضا اور ہر صاحبِ ایمان کے کردار و اعمال کا نتیجہ ہے۔ جو لوگ یہ کردار اپنائیں گے انھیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت ملے گی، خواہ وہ امیر ہوں یا غریب۔ اور جو اس کردار سے محروم رہیں گے وہ جنت کی کبھی بو بھی نہ سونگھ سکیں گے۔ قیامت میں سب کو ایک سوال کا سامنا کرنا پڑے گا اور اسی کے مناسب جواب پر جنت اور جہنم کا دارومدار ہوگا۔ وہ سوال یہ ہے کہ:

یہ گھڑی محشر کی ہے، تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل، کوئی اگر دفتر میں ہے

Marfat.com

49- آنخضرت ﷺ کا مقصدِ بعثت اور اس کے تقاضے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْم
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْم
یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرْO قُمْ فَاَنْذِرْ O وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ

آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ آپ ﷺ کمر ہمت باندھ کر اٹھیں اور پورے عزم و حوصلہ کے ساتھ اپنی قوم کو انذار کریں۔ اور یہ وہ چیز ہے کہ ہر پیغمبر کو نبوت اور رسالت کے منصب پر فائز کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے جس کا حکم دیا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کے بعد پہلے رسول ہیں انھیں بھی نبوت کے منصب پر مامور کرتے ہوئے حکم دیا گیا اَنْذِرْ قَوْمَکَ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ''اپنی قوم کو ڈراؤ، اس سے پہلے کہ ان پر ایک دردناک عذاب آ جائے۔'' پیغمبر دنیا میں اس وقت مبعوث ہوتے ہیں جب لوگ اللہ تعالیٰ کو بھول کر خوابِ غفلت کے مزے لوٹنے لگتے ہیں۔ ان کے اندر یہ احساس بالکل مر جاتا ہے کہ زندگی کا کسی کو حساب بھی دینا ہے اور وہ خواہشِ نفس کی پیروی میں ہر وہ کام کر گزرتے ہیں جس کا حکم ان کا نفس دیتا ہے۔ پیغمبر آ کر لوگوں کو اس روش کے انجام سے ڈراتے اور انذار کرتے ہیں۔ آنخضرت ﷺ کو بھی اسی منصب پر فائز کیا گیا کہ آپ ﷺ لوگوں کو خبردار کر دیں کہ وہ کسی اندھیر نگری کے رہنے والے نہیں جس میں وہ اپنی مرضی سے جو کچھ چاہیں کرتے رہیں اور ان کے کسی عمل کی بازپرس نہ ہو اور نہ یہ دنیا کھیل تماشا ہے کہ لوگ اپنا اپنا کردار ادا کر کے چلتے بنیں۔ اور نہ انسان جیسی مخلوق خودرو پودوں کی حیثیت رکھتی ہے کہ مل دَل کر ختم ہو جائے۔ اسے مکلّف، صاحب عقل و خرد مخلوق بنایا گیا ہے۔ زندگی گزارنے کا ایک طریقہ اس کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اسے چند بنیادی عقائد دیے گئے ہیں جن سے دنیا اور

Marfat.com

آخرت کی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ چنانچہ ان ہی حقیقتوں کو واضح کرنے اور غفلت کی زندگی گزارنے والوں کو انذار کرنے کے لیے حضور نبی کریم ﷺ کو بھیجا گیا۔

﴿وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ﴾

''اور اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کیجیے۔''

انذار کا پہلا حکم سب سے بڑے بگاڑ کی اصلاح ہے

دنیا میں بگاڑ کے اسباب بہت سے ہیں لیکن جس سبب نے انسانوں کے بگاڑ میں سب سے اہم کردار ادا کیا ہے وہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ یا اس کی شراکت میں دوسری بہت سی قوتوں کی بڑائی کو تسلیم کرنا ہے۔ انسان کبھی کسی کو غیر مشروط اطاعت کا حق دے دیتا ہے تو اس کے لیے اس کی بے پایاں عظمت کو تسلیم کرنے لگتا ہے۔ وہ عظمت اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اس کی ہر بات اور ہر اشارے کو حکم کا درجہ دے، چاہے وہ عظمت اقتدار کی بے پناہی سے پھوٹی ہو یا دولت کے انباروں سے، یا مشیخیت و تقدس کے دعویداروں کی نام نہاد کرامتوں اور شعبدہ بازیوں سے، یا جنگ کے نتیجے میں یا ظلماً ہاتھ آ جانے والوں کی غلامی سے۔ چنانچہ ایسی تمام قوتوں کو اسلام طاغوت قرار دیتا ہے۔ اس لیے وہ ہر طاغوت کی اطاعت اور بندگی سے بغاوت و براءت کا اعلان کرنے کا حکم دیتا ہے۔

حضرت ربعی بن عامر رضی اللہ عنہ جب رستم کے دربار میں مسلمانوں کے سفیر بن کے گئے تو رستم نے پوچھا آپ ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو، تو آپ رضی اللہ عنہ نے ایسی ہی باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارا پہلا مقصد یہ ہے کہ ہم انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نجات دیں۔ تم نے اقتدار کی قوت سے اپنے آپ کو خدا بنا رکھا ہے اور اپنے جیسے انسانوں کو غلاموں کی طرح ہاتھ باندھ کر کھڑے ہونے پر مجبور کر رکھا ہے۔ اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ ہم تمھیں اس غلط مذہب سے نجات دے دیں جس نے انسانوں کو تقدس اور مشیخیت کی آڑ میں انسانوں کے سامنے جھکنے پر مجبور کر رکھا ہے اور کچھ لوگوں نے محض شعبدہ بازیوں سے دوسروں کے دلوں میں یہ بات ڈال رکھی ہے کہ انھیں کوئی غیر معمولی قوتیں حاصل ہیں۔ اور تیسرا مقصد یہ ہے کہ انسان ہوسِ زر میں اندھا ہو کر ایسی ہر چوکھٹ پر ضمیر کو جھکنے پر مجبور کر دیتا ہے جس سے اس کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ دنیا اپنی تنگی کے باوجود وسیع کر دی گئی ہے اور آخرت اپنی وسعت

Marfat.com

کے باوجود واہمہ بنا دی گئی ہے۔ ہم انسانوں کو دنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی فراخی میں داخل کرنے کے لیے آئے ہیں۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آستانے کے سوا ہر آستانہ توڑ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ کے سوا ہر چوکھٹ اکھاڑ دی جائے۔ تخت و تاج اچھال دیے جائیں، انسانوں کے نام نہاد اختیارات ختم کر دیے جائیں، غیر مشروط قانون سازی کا حق انسان سے چھین لیا جائے، کردار کا بول بالا ہو، نسبتیں مفلوج ہو جائیں، کبریائی، بڑائی اور عظمت صرف اللہ تعالیٰ کی مانی جائے، اس کے سوا نہ کسی کا خوف دامن گیر ہو اور نہ کسی کی چاہت دلگرفتگی کا باعث بنے۔ یہ ہے وہ اعلان جو ہر پیغمبر دنیا میں کرنے کے لیے آیا اور آنحضرت ﷺ کو بھی زیادہ وسیع سطح پر اسی کام کرنے کا حکم دیا گیا۔

سروری زیبا فقط اس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

انسان کی اصلاح اور تعمیر انسانیت کے لیے یہ چونکہ پہلا نکتہ ہے جسے نظر انداز کر کے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اسے ہر مومن کے دل و دماغ میں راسخ کر دیا جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں کلمۂ اللہ اکبر کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اذان جو رات کی تاریکی اور سناٹے میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا اعلان ہے اور پھر دن کی ہمہ ہمی اور مصروفیات میں اسی کی یاد دہانی ہے۔ اور پھر سونے سے پہلے رات کی نماز میں اسی کو حرزِ جان بنانے کی نصیحت ہے، اس کا آغاز بھی اللہ اکبر کے اعلان سے ہوتا ہے۔ نماز عہدِ وفا کی مشق اور بندگیِ رب کی تعبیر ہے۔ اس میں ایک مسلمان اللہ اکبر کہہ کر داخل ہوتا ہے پھر اٹھتا بیٹھتا اللہ اکبر کا اعادہ کرتا ہے۔ جانور کے گلے پر چھری بھی اللہ اکبر کہے بغیر چلائی نہیں جا سکتی اور آج مسلمانوں کا سب سے بڑا امتیازی شعار اللہ اکبر ہی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کی عظمت اور عزت و حرمت کا دارومدار اسی بنیادی تصور پر ہے۔ جب تک مسلمان اس تصور کی پاسداری کریں گے اللہ تعالیٰ ان کے حقوق کی پاسداری کرے گا اور جب خدا کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی کبریائی کا ڈنکا بجنے کی بجائے غیر اللہ کی کبریائی کا ڈنکا بجے گا اور مسلمان اس پر خاموش رہیں گے تو یہ خود ذلیل ہو جائیں گے۔

﴿وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ﴾

"اور اپنے کپڑے پاک رکھو"

Marfat.com

ثیاب کا مفہوم

یہ بڑے جامع الفاظ ہیں جن کے مفہوم میں بڑی وسعت ہے۔ صاحبِ تفہیم القرآن نے اس پر ایک جامع نوٹ لکھا ہے ہم سب سے پہلے اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

ان الفاظ کا ایک مطلب یہ ہے کہ اپنے لباس کو نجاست سے پاک رکھو کیونکہ جسم و لباس کی پاکیزگی اور روح کی پاکیزگی دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ ایک پاکیزہ روح گندے جسم اور ناپاک لباس میں نہیں رہ سکتی۔ رسول اللہ ﷺ جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا اور حضور ﷺ کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپ کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور ﷺ نے نوعِ انسانی کو طہارتِ جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانۂ جاہلیت کے اہلِ عرب تو درکنار، آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیادار انسان ہے حالانکہ انسانی فطرت میل کچیل سے نفرت کرتی ہے اور شائستگی کی معمولی حس بھی جس

Marfat.com

شخص کے اندر موجود ہو وہ صاف ستھرے انسان ہی سے مانوس ہوتا ہے۔

اسی بنا پر اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے والے کے لیے یہ بات ضروری قرار دی گئی کہ اس کی ظاہری حالت بھی ایسی پاکیزہ اور نفیس ہونی چاہیے کہ لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھیں اور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی کثافت نہ پائی جائے جو طبائع کو اس سے متنفر کرنے والی ہو۔

تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمھارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو مگر اس میں فخر و غرور، ریاء نمائش، ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے۔ لباس وہ اولین چیز ہے جو آدمی کی شخصیت کا تعارف لوگوں سے کراتی ہے۔ جس قسم کا لباس کوئی شخص پہنتا ہے اس کو دیکھ کر لوگ پہلی نگاہ ہی میں یہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ رئیسوں اور نوابوں کے لباس، مذہبی پیشہ وروں کے لباس، متکبر اور برخود غلط لوگوں کے لباس، چھچھورے اور کم ظرف لوگوں کے لباس، بدقوارہ اور آوارہ منش لوگوں کے لباس، سب اپنے پہننے والوں کے مزاج کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کا مزاج ایسے سب لوگوں سے فطرۃً مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا لباس بھی ان سب سے لازماً مختلف ہونا چاہیے۔ اس کو ایسا لباس پہننا چاہیے جسے دیکھ کر ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ ایک شریف اور شائستہ انسان ہے جو نفس کی کسی برائی میں مبتلا نہیں ہے۔

چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی زبان میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباس، ابراہیم نخعی، شعبی، عطاء، مجاہد، قتادہ، سعید بن جبیر، حسن بصری اور دوسرے اکابرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔ عربی محاورے میں کہتے ہیں کہ فلان طاھر الثیاب وفلان طاھر الذیل ''فلاں شخص کے

Marfat.com

کپڑے پاک ہیں یا اس کا دامن پاک ہے۔'' اور اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اس کے اخلاق اچھے ہیں۔ اس کے برعکس کہتے ہیں فلانٌ دَنِس الثیاب ''اس شخص کے کپڑے گندے ہیں۔'' اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بدمعاملہ آدمی ہے، اس کے قول قرار کا کوئی اعتبار نہیں۔

﴿وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ﴾

''اور گندگی سے دور رہو۔''

رُجْز کا تلفظ اور مفہوم

رُجْز، رِجْز اور رِجْس سب قریب المخرج اور تقریباً ہم معنی الفاظ ہیں۔ گندگی کے معنی میں مستعمل ہیں۔

یہاں گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے۔ مثلاً عقائد کی گندگی، جیسے شرک اور ریا وغیرہ۔ اور خیالات کی گندگی، مثلاً جنسی خیالات، سفلی تصورات، متکبرانہ خیالات وغیرہ۔ اخلاق واعمال کی گندگی، مثلاً حسد وبغض، ہوسِ زر، شہرت کی طلب، دوسروں کو نقصان پہنچانے کی فکر وغیرہ۔ جسم اور لباس کی گندگی جس سے سب واقف ہیں۔ اسی طرح رہن سہن میں گری ہوئی حرکتیں اور نامناسب طرزِعمل یہ وہ تمام گندگیاں ہیں جن سے انسانی زندگی آلودہ ہو جاتی ہے۔ آیتِ کریمہ میں جس گندگی سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے اس سے یہ تمام گندگیاں مراد ہیں۔ ایسی تمام نجاستوں، غلاظتوں اور آلودگیوں سے محفوظ رہنے کے نتیجے میں وہ شائستہ اور پاکیزہ زندگی وجود میں آتی ہے جو نوعِ انسانی کے لیے نمونہ بن سکتی ہے۔ آنحضرت ﷺ کی زندگی کو چونکہ تمام انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ بنایا گیا تھا اس لیے یہ بات ازبس ضروری تھی کہ آپ ﷺ کا دامن ایسی ہر آلودگی سے محفوظ رہتا تاکہ کل کو کوئی شخص حرف گیری نہ کرسکتا۔

﴿وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ﴾

''اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے۔''

مَن اور اِستِکثار کا مفہوم

وَلَا تَمْنُن، مَنٌّ سے ہے۔ اس کا ایک معنی ہے احسان کرنا۔ اور اس معنی میں یہ

Marfat.com

لفظ عربی زبان میں عام استعمال ہوتا ہے۔

تَسْتَکْثِرُ، استکثار سے ہے۔ اس کا ایک معنی ہے، کسی چیز کا زیادہ چاہنا۔ مثلاً سورۃ الاعراف آیت ۱۸۸ میں ہے وَلَوْكُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ''اگر میں غیب جانتا تو میں بہت ساری بھلائیاں اکٹھی کر لیتا۔'' اس لحاظ سے اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ آپ کسی پر احسان اس نیت سے نہ کریں کہ جو کچھ اس کو دیا ہے اس سے زیادہ وصول ہو جائے گا یعنی آپ کا احسان بے غرضانہ ہونا چاہیے۔ آپ کی عطا اور بخشش، سخاوت اور حُسنِ سلوک محض اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اس میں اس بات کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے کہ احسان کے بدلے میں آپ کو کوئی دنیوی فائدہ حاصل ہوگا۔ یہ وہ اعلیٰ تعلیم ہے جو نبی کریم ﷺ کو دی جا رہی ہے۔ حالانکہ فطری طور پر احسان کا بدلہ احسان ہوتا ہے۔ جب اس بات کا علم ہو کہ میں جس پر احسان کر رہا ہوں وہ میرے ساتھ کبھی احسان کا معاملہ کرنے والا نہیں تو انسان کا بڑھتا ہوا قدم خود بخود رک جاتا ہے۔ جو شخص کبھی تحفہ کے جواب میں تحفہ نہیں دیتا اسے تحفہ دینے والا آخر ہاتھ روک لیتا ہے۔ اور اسے عام اخلاقی زندگی میں معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لیکن آنحضرت ﷺ کو چونکہ انسانیت کے لیے نمونہ بننا تھا اس لیے جس خدا نے انھیں یہ تعلیم دی کہ جو شخص آپ ﷺ سے تعلق توڑے آپ ﷺ اس سے تعلق جوڑیں۔ اور جو قطع رحمی کرے آپ ﷺ اس کے ساتھ صلہ رحمی کریں۔ آپ ﷺ بدزبانی کے جواب میں عفو و درگزر سے کام لیں۔ اسی پروردگار نے آپ ﷺ کو ایسے ہی بے غرضانہ احسان کی تعلیم دی۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ بات سیاقِ کلام سے نہ صرف ہٹی ہوئی محسوس نہیں ہوتی بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ ان اعلیٰ اخلاقیات میں سے ایک اہم ترین نصیحت ہے جس سے دشمن بھی اللہ تعالیٰ کے رسول کے قریب آجاتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی زندگی کے واقعات میں جابجا ہمیں اس کی تائید ملتی ہے۔

مَنٌّ کا دوسرا معنی کسی چیز کو منقطع کر دینا، روک دینا اور کاٹ دینا بھی ہے۔ سورۃ القلم کی آیت ۳ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ''بیشک آپ کے لیے ایک کبھی نہ ختم ہونے والا اور نہ منقطع ہونے والا صلہ ہے۔''

اِسْتِكْثَارْ کا دوسرا معنی اہلِ لغت کے نزدیک اِسْتَكْثَرَ الشَّيُّ رَاٰهُ كَثِيْرًا وَعَدَّهٗ كَثِيْرًا ''کسی چیز کو زیادہ خیال کیا یا شمار کیا۔'' صاحب اقرب الموارد نے اسی معنی کو پہلے

Marfat.com

ذکر کیا ہے۔ اس لحاظ سے آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو انذار و تبلیغ کے جس منصب پر فائز کیا ہے اسے برابر جاری رکھئے اور یہ انذار اس وقت تک جاری رہنا چاہیے جب تک اتمامِ حجت نہ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہجرت کا حکم نہ آ جائے۔ چاہے اس پر کتنا طویل زمانہ گزر جائے اور یہ کبھی خیال نہ کیجیے کہ اب انذار بہت ہو چکا، مزید کی ضرورت نہیں رہی۔ اس لیے اب میں اسے روک دیتا ہوں، ایسا کبھی نہ کیجیے۔

حضرت یونس علیہ السلام سے یہی اجتہادی فروگزشت ہوئی کہ جس قوم کی طرف آپ مبعوث ہوئے تھے ان کو طویل عرصہ تک انذار کیا، اس کی ہٹ دھرمی دیکھ کر آپ ان کی ہدایت سے مایوس ہو گئے اور ان کو ناقابلِ اصلاح سمجھ کر وہاں سے نکل گئے۔ جس پر اللہ تعالیٰ نے انھیں سخت تنبیہ فرمائی اور ایک سخت امتحان سے گزارنے کے بعد ان کو پھر قوم کے پاس انذار کے لیے واپس بھیجا اور اس دوبارہ انذار سے اللہ تعالیٰ نے ان کی پوری قوم کو ایمان کی توفیق بخشی۔ چنانچہ اس آیتِ کریمہ میں ہر طرح کے حالات میں نہایت استقامت کے ساتھ انذار کو جاری رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ دوسرا مفہوم جو ہم نے بیان کیا ہے بعض اہلِ علم نے اس کو ترجیح دی ہے اور آیت کے الفاظ میں یقیناً اس کی گنجائش موجود ہے۔ لیکن ہمارے بیشتر آئمہ تفسیر نے پہلا ہی مفہوم مراد لیا ہے اور وہی سیاقِ کلام سے زیادہ میل کھاتا محسوس ہوتا ہے۔ رہی وہ بات جو اس دوسرے مفہوم میں نمایاں کی گئی ہے اگلی آیت اسی دوسرے مفہوم کو متضمن معلوم ہوتی ہے۔

﴿وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ﴾

''اور اپنے رب کی خاطر صبر کرو۔''

صبر کا مفہوم

آنحضرت ﷺ سے فرمایا جا رہا ہے کہ انذار کا جو عظیم کام آپ ﷺ کے سپرد کیا گیا ہے یہ بڑے جان جوکھوں کا کام ہے۔ جیسے جیسے آپ ﷺ کی دعوت آگے بڑھے گی آپ ﷺ کی مخالفت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ آپ ﷺ کے مصائب اور مشکلات بڑھتی جائیں گی، آپ ﷺ کو ایک ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے جو اپنے عقائد اور رسم و رواج میں نہایت سخت اور جامد واقع ہوئی ہے۔ ان کے بنیادی تصورات کی سب سے بڑی اساس

Marfat.com

آباؤاجداد کی تقلید ہے۔ وہ اپنے آباء کے بارے میں یہ تصور قبول نہیں کر سکتے کہ وہ بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ اس لیے جب آپ ﷺ کی تعلیم اور دعوت ان جاہلانہ خیالات اور تصورات سے متصادم ہوگی تو قوم سے آپ ﷺ کا تصادم بڑھے گا۔ اور وہ لوگ اپنے آبائی ورثے کی حفاظت کے لیے مرنے مارنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔ ایک دن آئے گا جب سارا عرب آپ ﷺ کیخلاف صف آراء ہو جائے گا۔ اس لیے آپ ﷺ کو اس کام کے آغاز ہی میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ حالات کیسے ہی منہ زور ہو جائیں اور مخالفین کسی طریقے سے بھی آپ ﷺ کی دعوت کو روکنے کی کوشش کریں آپ ﷺ کو اس کا ہرگز اثر قبول نہیں کرنا ہوگا، بلکہ نہایت ثابت قدمی اور مستقل مزاجی کے ساتھ اپنا فرض انجام دیتے رہنا ہوگا اور اسی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ یہ فرض اس وقت تک انجام دینا ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ کا دین اللہ تعالیٰ کی دھرتی پر غالب نہ آجائے۔ اور یا اس قوم پر اتمامِ حجت کے بعد ان پر عذاب بھیجنے کا فیصلہ نہ ہو جائے۔

یہ ہیں وہ چھ بنیادی ہدایات جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اس وقت دی تھیں جب آپ ﷺ کو نبوت عطا کی گئی اور لوگوں کی اصلاح کے منصب پر فائز کیا گیا۔ ان ہدایات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کی اصلاح کا کام کس قدر عظیم اور کٹھن ہے اور انسانوں کی اصلاح کے لیے جو اللہ تعالیٰ کے رسول آتے ہیں وہ کس قدر اعلیٰ صفات سے متصف ہوتے ہیں۔ اور دعوت اور رہنمائی کے حوالے سے اس سے بہتر اوصاف اور ہدایات کا تصور بھی انسانی دماغ میں نہیں آسکتا۔ اور اگر یہ باتیں آنحضرت ﷺ پر نازل نہ کی گئی ہوتیں تو انسانی دماغ کی پرواز کبھی ان تک رسائی حاصل نہ کر سکتی۔ صدیاں گزر جانے کے بعد آج بھی اگر انسانوں میں اسی قسم کی زندگی پیدا کرنا مطلوب ہو اور وہی انقلاب برپا کرنا مقصود ہو جو آنحضرت ﷺ نے کیا تو اس راستے میں کام کرنے والوں کو انہی اوصاف سے اپنے آپ کو بقدرِ ہمت متصف کرنا ہوگا، ورنہ کامیابی کی امید خواب و خیال سے زیادہ کچھ نہیں۔

Marfat.com

50- انسانی بگاڑ کا اصل سبب اور اس کے مسائل کا حل

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ

اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ O حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ O کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O ثُمَّ کَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ O کَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْیَقِیْنِ O لَتَرَوُنَّ الْجَحِیْمَ O ثُمَّ لَتَرَوُنَّھَا عَیْنَ الْیَقِیْنِ O ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ یَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِیْمِ ﴾

(تم کو کثرتِ مال کی خواہش نے غافل رکھا۔ یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔ ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔ ہرگز نہیں! اگر تم یقین کے ساتھ جانتے (تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر تم آخرت میں دوزخ کو یقین کی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔)

﴿اَلْھٰکُمُ التَّکَاثُرُ﴾

''تم کو کثرتِ مال کی خواہش نے غافل رکھا۔''

لہو اور تکاثر کا مفہوم اور تکاثر سے مراد

اَلْھٰکُمُ لہو سے ہے۔ یوں تو اس کا معنی کھیل کود اور غفلت سے کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ ایک اسلامی اصطلاح ہے۔ اس کا اطلاق ہر اس کام پر ہوتا ہے جس کی مشغولیت

Marfat.com

اور دلچسپی مقصدِ زندگی یا فرائض سے غافل کردے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کل لھو باطل اذا شغله عن طاعة الله ''یعنی ہر لہو جب انسان کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے غافل کردے تو وہ باطل یعنی گناہ ہے۔'' الھیٰ اسی سے فعل ماضی ہے۔ اس کا معنی ہے اس نے غافل کردیا۔ اور'' کم '' ضمیر مفعول ہے۔ التَّکَاثُرُ یہ اسمِ فاعل ہے۔ یعنی تمھیں تکاثر نے غفلت میں رکھا۔ تکاثر کا اطلاق تین چیزوں پر ہوتا ہے۔

(۱) زیادہ سے زیادہ کثرت حاصل کرنے کی کوشش کرنا، (۲) کثرت کے حصول میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا، (۳) کثرت حاصل ہوجانے کی صورت میں دوسروں پر فخر جتانا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان صرف کثرت کا خواہش مند نہیں بلکہ وہ ایسی کثرت کا خواہش مند ہے جو اسے دوسروں پر بڑائی کا موقع دے دے۔ اور وہ اس کثرت سے دوسروں پر فخر جتا سکے۔ لیکن اس آیتِ کریمہ میں یہ تصریح نہیں فرمائی گئی کہ تکاثر میں کس چیز کی کثرت مراد ہے۔ اور نہ یہ بات واضح فرمائی گئی ہے کہ یہاں خطاب کن لوگوں سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تکاثر کے مفہوم میں بھی وسعت پائی جاتی ہے اور اَلْھٰکُمُ کے مخاطب بھی محدود نہیں بلکہ ہر زمانے کے لوگ اپنی انفرادی حیثیت سے بھی اور اجتماعی حیثیت سے بھی اس کے مخاطب ہیں۔ یعنی نہ تو کثرت کے متعلقات کی کوئی انتہا ہے اور نہ یہ بیماری نوعِ انسانی میں سے کسی خاص گروہ کو لاحق ہے بلکہ پوری نوعِ انسانی اس کی مریض ہے۔ اس کی تائید ایک چھوٹے سے واقعہ سے بھی ہوتی ہے۔ علامہ اسد ایک نومسلم ہیں جن کا اصل نام لیو پولڈ تھا۔ جرمن کے رہنے والے اور مذہباً یہودی تھے اور پیشہ ان کا صحافت تھا۔ انھیں اور ان کی بیوی کو بعض حالات کی بناء پر اسلام کے بارے میں تجسس ہوا۔ چنانچہ انھوں نے ایک سے زیادہ مرتبہ برصغیر کی تقسیم سے پہلے عرب ملکوں کے سفر کیے۔ ایک دن اچانک انھیں لوگوں سے ملنے ملانے کے بعد احساس ہوا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی بہت بڑی اکثریت پریشانیوں کا شکار ہے۔ جسے دیکھیے محسوس ہوتا ہے اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ہیں۔ انھوں نے اپنا یہ گمان اپنی بیوی کے سامنے رکھا۔ انھوں نے بھی انسانی چہروں کے مطالعے کے بعد اس کی تصدیق کی۔ اب دونوں نے تجسس شروع کیا کہ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ لیکن یہ عقدہ ان کے لیے روز بروز لاینحل ہوتا گیا۔ ایک دن اچانک لیو پولڈ نے اپنی بیوی سے کہا کہ میں نے اس راز

Marfat.com

کو پالیا ہے اور اس انکشاف کی وجہ سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اسلام ایک سچا دین ہے۔ بیوی نے حیران ہوکر پوچھا کہ یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ تو لیوپولڈ نے قرآنِ کریم کا ایک نسخہ اٹھایا اور قرآنِ کریم کی یہی سورۃ جو اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہے اپنی بیوی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے کہا ذرا غور سے دیکھو یہ کتاب آج سے صدیوں پہلے نازل ہوئی۔ اور جس عظیم شخصیت پر نازل ہوئی اس نے عرب کے باہر کی دنیا کو بہت کم دیکھا تھا۔ اسے یہ بات کیسے معلوم ہوگئی کہ صدیوں بعد بھی انسان ایک ایسی کیفیت کا شکار ہوگا جو اس کے لیے مستقبل میں پریشانی بن جائے گی اور وہ اسی کیفیت میں مبتلا ہونے کی حالت ہی میں موت کی نذر ہوجائے گا۔ لیکن کبھی وہ اس سے جان نہیں چھڑا سکے گا۔ اور وہ کیفیت کیا ہے کثرت کے حصول کی کوشش اور دوسروں سے اس کثرت میں آگے بڑھنے کی خواہش۔ اور پھر اس میں دوسروں پر فخر جتانے کی آرزو۔ یہی وہ چیز ہے جس نے آج کے انسان کو پریشان کر رکھا ہے۔ ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ میرے پاس مال و دولت کی نہ صرف فراوانی ہو بلکہ دوسروں سے بڑھ چڑھ کر مال میرے پاس ہو۔ اور وہ اسی کو اپنے لیے نام و نمود اور عزت و شہرت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح وہ آئے روز بہتر سے بہتر منصب اور عز و جاہ کی تلاش میں رہتا ہے۔ اس کے نزدیک مال و دولت اور منصب و اقتدار ضرورت کی چیز نہیں۔ اور نہ کوئی ذمہ داری ہے۔ بلکہ بجائے خود یہ ایسا مقصدِ زندگی ہے جس کا زیادہ سے زیادہ حصول زندگی بھر ایک حقیقت بن کر اس کے دماغ پر سوار رہتا ہے۔ نزولِ قرآن کے وقت قبائلی زندگی میں جس طرح کثرتِ مال ان کا ہدف ہوتا تھا اسی طرح کثرتِ اولاد کے لیے بھی وہ کوشاں رہتے تھے۔ کیونکہ قبیلے کا سردار وہ شخص بنتا تھا جس کے نوجوان بیٹے اس کے قوتِ بازو ثابت ہوتے تھے۔ اور قبیلہ دوسرے قبائل پر تب فوقیت حاصل کرتا تھا جب ان کے پاس افراد کی بھی کثرت ہوتی اور مال کی بھی کثرت ہوتی۔ لیکن آج کثرتِ اولاد کو اجتماعی زندگی کے بدلے ہوئے نظام اور خاص طور پر خاندانی منصوبہ بندی کے تصور نے معیارِ زندگی کے رجحان میں تبدیل کردیا ہے۔ آج ہر شخص معیارِ زندگی اونچا کرنے کی دھن میں مصروف اور پریشان ہے۔ پھر اس معیارِ زندگی کی بلندی کی کوئی انتہا نہیں۔ اور چونکہ اس کا سارا انحصار مال و دولت پر ہے اس لیے مال و دولت کی کثرت کی بھی کوئی حد نہیں۔ جیسے جیسے زندگی کا معیار اونچا ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے مال کی تونس بڑھتی جاتی ہے۔ اسی کو قرآنِ کریم نے تکاثر کے نام سے یاد کیا ہے۔

Marfat.com

چنانچہ اس تکاثر کی دھن نے انسان کو نہ صرف مقصدِ زندگی سے تہی دامن کیا بلکہ اخلاقی حدود اور اخلاقی پابندیوں سے بھی اسے بے تعلق کر دیا۔ اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حوالے سے عائد ہونے والے فرائض مال و دولت کی ہوس کی نذر ہو گئے۔ اقدارِ انسانیت ہی پامال نہیں ہوئیں بلکہ قرابت کے تمام حقوق نظر انداز ہو گئے۔ دولت، طاقت اور عزت زندگی کی کامیابی کے عنوان بن گئے۔ حکومتوں اور ملکوں کی سطح پر زیادہ سے زیادہ طاقت کا حصول زیادہ سے زیادہ ہتھیار فراہم کرنے کی فکر، چھوٹے ملکوں کی تجارت پر غلبہ اور ان کے پاس قدرتی وسائل پر قبضہ ترقی کی علامت بن گیا۔ اور اس میں تخصیص غیر مسلم کی نہیں، امتِ مسلمہ بھی اسی کا شکار ہو گئی۔ جسے دیکھو معیارِ زندگی کے بت کی پرستش کر رہا ہے۔ حالانکہ حضور ﷺ نے فرمایا تھا:

ازهد فی الدنیا یحبك الله وازهد فیما ایدی الناس یحبك الناس ۔

”دنیا سے بے رغبت ہو جا، اللہ تجھ سے پیار کرے گا، جو کچھ لوگوں کے پاس ہے اس سے بے نیاز ہو جا، لوگوں کے دلوں میں اللہ تیرا احترام پیدا کرے گا۔“

﴿حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ﴾

”یہاں تک کہ قبروں میں جا پہنچے۔“

کثرت کی خواہش موت تک جاری رہتی ہے

یعنی کثرتِ مال کی کوشش، پھر دوسروں سے آگے بڑھنے کی ہوس اور دوسروں کے مقابلے میں فخر جتانے کی خواہش میں تمہاری پوری زندگی گزر گئی۔ مثال کے طور پر تم میں سے ایک نے چاہا کہ میرے پاس ایک خوبصورت مکان ہونا چاہیے۔ مکان بن گیا۔ اور جب دوسرے نے بھی اسی خواہش کے تحت ویسا ہی مکان بنا لیا تو پھر بے چینی اور بڑھی تو اس کو نیچا دکھانے کے لیے دوسری منزل اٹھا لی گئی۔ اس نے بھی مقابلے میں دوسری منزل بنا لی۔ اس کی کثرت کی خواہش نے اسے تیسری منزل اٹھانے پر مجبور کیا۔ اور دوسرے کی تکاثر کی ہوس نے بھی تیسری منزل اٹھا لی۔ حتیٰ کہ دونوں مقابلے میں دوسرے کو نیچا دکھانے اور اپنے سر کی کلغی کو بلند کرنے کے لیے منزلوں پر منزلیں اٹھاتے رہے۔ آخر ایک وقت آیا کہ یہ منزلیں دونوں کو

Marfat.com

ساتھ لے کر زمین بوس ہو گئیں۔ اس ایک مثال سے زندگی کی تمام جہتوں کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ کس طرح زندگی کی قدریں، زندگی کی صلاحیتیں، دل و دماغ کی رعنائیاں صرف ایک ہوس کی نذر ہوتی جا رہی ہیں۔ اور نتیجہ کیا ہوتا ہے کہ لوگ قبروں میں پہنچ جاتے ہیں لیکن انھیں منزل نصیب نہیں ہوتی۔ ایک دوڑ ہے جس سے کوئی نکلنا پسند نہیں کرتا۔ اکبر نے ٹھیک کہا:

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا، نوکر ہوئے، پنشن ملی پھر مر گئے

﴿كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ﴾

''ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔ پھر (سن لو کہ) ہرگز نہیں، تم عنقریب جان لو گے۔''

تکاثر کی ہوس کامیابی نہیں

یعنی تم متاعِ دنیا کی کثرت اور اس میں دوسروں سے بڑھ جانے کو کامیابی اور ترقی سمجھتے ہو۔ حالانکہ یہ ہرگز ترقی اور کامیابی نہیں ہے۔ تمھیں عنقریب اندازہ ہو جائے گا۔

یہ مال و دولتِ دنیا، یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الہ الا اللہ

تم نے متاعِ دنیا میں اضافے کے لیے کارخانوں پہ کارخانے لگائے، ملوں پر ملیں لگائیں۔ اور اپنے بچوں کو دیکھنے کے لیے کبھی وقت نہ نکال سکے۔ بیوی کی دلجوئی کے لیے کبھی تمھارے پاس چند ساعتیں نہ نکل سکیں۔ تم اپنے رحمی رشتوں کا کبھی حق ادا نہ کر سکے۔ کیونکہ تمھارے پاس ان باتوں کے سوچنے کا وقت ہی نہیں ہے۔ لیکن تمھیں بہت جلد اندازہ ہو جائے گا کہ اس روش کا کیا انجام ہوگا۔ جب تمھاری بیوی تم سے متنفر ہو جائے گی۔ تمھاری اولاد جوان ہو کر نافرمان ہو جائے گی۔ اپنے بیگانے ہو جائیں گے اور تمھارا وجود عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ تمھارے لیے بوجھ بن جائے گا اور تمھیں سہارا دینے والا کوئی نہیں ہوگا۔ تمھاری تنہائیاں تمھیں کاٹیں گی۔ تب تمھیں اندازہ ہوگا کہ تکاثر کی ہوس ایک ایسی آگ تھی جس نے تمھارا سب کچھ جلا ڈالا۔

بعض اہلِ علم کے نزدیک عنقریب سے مراد آخرت بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ جس ہستی

Marfat.com

کی نگاہ ازل سے ابد تک تمام زمانوں پر حاوی ہے اس کے لیے چند ہزار یا چند لاکھ سال بھی زمانے کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ اسی طرح سے مراد موت بھی ہوسکتی ہے۔ وہ تو ہر وقت انسان کے قریب ہے۔ موت کے وقت بھی اور آخرت میں بھی انسان کو اندازہ ہو جائے گا کہ جن مشاغل میں وہ اپنی ساری عمر کھو کے آیا ہے وہ آج اس کے لیے سعادت کا باعث بنتے ہیں یا بدبختی کا۔

﴿كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ ۝ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ۝ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ۝ ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ﴾

''ہرگز نہیں! اگر تم یقین کے ساتھ جانتے (تو تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا)۔ تم دوزخ دیکھ کر رہو گے۔ پھر تم آخرت میں دوزخ کو یقین کی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ پھر ضرور اس دن تم سے ان نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔''

غفلت کا اصل سبب

تمھارا یہ طرزِ عمل کہ تم نے زندگی کا اصل ہدف مال و دولت کی کثرت، عہدہ و منصب کی بہتات اور معیارِ زندگی کو اونچا کرنے کی ہوس کو اس طرح بنایا ہے کہ ساری زندگی اسی کے حصول میں کھپ جاتی ہے حتیٰ کہ موت کا بلاوا آ جاتا ہے، لیکن تمھیں کبھی اپنے طرزِ عمل پر نظر ثانی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ اس کی حقیقی وجہ یہ ہے کہ (جو اس آیتِ کریمہ میں بیان کی گئی ہے) کہ تمھارے اندر یہ یقین پیدا نہیں ہو رہا کہ کبھی آخرت بھی آئے گی۔ اور تمھیں اپنی زندگی کے ہر عمل کا حساب دینا ہوگا۔ جوابدہی کے تصور کی طرف سے بے یقینی نے تمھیں دنیا طلبی کا مریض بنا دیا ہے۔ کاش تمھارے اندر یقین کی کچھ بھی رمق پیدا ہوتی تو تمھاری غفلت کے پردے اتنے دبیز نہ ہوتے۔ کیونکہ:

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیر ملت ہے

لَوْ تَعْلَمُوْنَ کا جواب محذوف ہے لَمَا تَكَاثَرْتُمْ اور عِلْمُ الْيَقِيْنِ کا معنی ہے عِلْمًا كَعِلْمِ الْاَمْرِ الْمُتَيَقِّنِ (مظہری) ''یعنی ایسا علم جو ایک یقینی بات کا ہوتا ہے۔''

Marfat.com

اس کے بعد کی آیات کا مفہوم دو طرح سے متعین کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو یہ کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کو لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ کے مفعول کے محل میں لیا جائے۔ یعنی اگر تم یقین کے ساتھ جانتے کہ تم جہنم کو لازماً دیکھو گے۔ اور پھر آخرت میں جہنم کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے جو ظاہر ہے علم الیقین کا دوسرا درجہ ہے۔ اور پھر تمھیں یقین ہوتا کہ آخرت میں تمھیں ایک ایک نعمت کے بارے میں جوابدہی کرنا ہے تو یقیناً تمھارا یہ طرزِ عمل نہ ہوتا، اور تم اپنے آپ کو اس طرح برباد نہ کر لیتے۔

اور مفہوم کو متعین کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ کو جملہ مستانفہ قرار دیا جائے۔ تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اقرار کرو یا انکار امر واقعہ یہ ہے کہ تم جہنم کو ایک نہ ایک دن دیکھ کے رہو گے۔ اور پھر قیامت کے دن تم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔ مومن بھی اسے دیکھیں گے اور کافر بھی دیکھیں گے۔ لیکن دونوں کے دیکھنے میں بڑا فرق ہوگا۔ کفار تو اسے گھر کے طور پر دیکھیں گے اور وہیں ٹھہریں گے۔ اور مومنوں کے لیے محض گزرگاہ ہوگی۔ کچھ تو بجلی کی سرعت کے ساتھ گزر جائیں گے اور کوئی پرندوں کی طرح اپنے اپنے درجات کے مطابق ان کے گزرنے کی رفتار ہوگی۔ اور آج تم جن نعمتوں پر اترا رہے ہو اس دن ہر نعمت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ انسان کو جتنی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کی گئی ہیں اور جو وسائل اور ذرائع بخشے گئے ہیں وہ سب نعیم میں داخل ہیں۔ آدمی ان میں سے ہر نعمت پر شکر ادا کرنے کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔ اور ہر نعمت کے شکر کا مطلب یہ ہے کہ اس نعمت کو اس کے مقرر کردہ حدود کے اندر بتائے گئے طریقے کے مطابق صرف کیا جائے۔ اگر کسی نعمت کے استعمال میں حدود سے تجاوز کیا گیا یا اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں استعمال کیا گیا یا استعمال میں غلط طریقہ اختیار کیا گیا، تو اللہ تعالیٰ یقیناً اس پر سزا دے گا۔ وہ جس بات کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جس پر چاہے گا گرفت فرمائے گا۔ لیکن اس کا اندازہ ایک حدیث سے کیا جاسکتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت تم دونوں اپنے گھروں سے باہر کس مقصد سے نکلے ہو؟ دونوں نے کہا، الجوع رسول اللہ۔ حضور سخت بھوک لگی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا میں بھی اسی وجہ سے باہر نکلا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دونوں کو ہمراہ لے کر ایک انصاری کے گھر تشریف لے گئے۔ دوسری روایت میں ان کا نام مالک بن التیہان

Marfat.com

درج ہے۔ لیکن وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ان کی بیوی نے جب حضور ﷺ کو دیکھا تو بڑی گرمجوشی سے خوش آمدید کہا۔ حضور ﷺ نے پوچھا تمھارا شوہر کہاں ہے۔ اس نے کہا پانی لینے گیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ انصاری تشریف لے آئے۔ جب حضور اور آپ کے ساتھیوں کے دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اپنی باغ کی طرف گئے اور کھجوروں کا ایک خوشہ توڑ کر لے آئے۔ جس میں پختہ، نیم پختہ اور تر کھجوریں تھیں۔ خدمتِ اقدس میں رکھا اور تناول فرمانے کی التجا کی۔ پھر چھری پکڑی۔ حضور ﷺ نے فرمایا ایاك والحلوب یعنی شیر دار بکری کو ذبح نہ کرنا۔ پس انھوں نے ایک بکری ذبح کی، اسے پکایا اور ان معزز مہمانوں نے اس کا گوشت بھی تناول فرمایا اور کھجوریں بھی کھائیں اور ٹھنڈا پانی بھی پیا۔ جب سیر ہوگئے تو آپ نے ان دونوں دوستوں سے فرمایا اس خدا کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے روزِ قیامت تم سے آج کی نعمتوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ فاقہ نے تم کو اپنے گھروں سے نکالا اور تم ان نعمتوں سے شادکام ہو کر واپس جا رہے ہو۔

اس حدیث سے اندازہ ہوتا ہے کہ پروردگار اپنی ان نعمتوں سے متعلق بھی بازپرس کرے گا جو شدید ضرورت کے بعد بھی میسر آئی ہوں۔ چہ جائیکہ وہ نعمتیں جو تکلفات اور تلذذات میں داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر طرح کی نعمت پر شکر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

Marfat.com

51- انسانی زندگی میں خسارے سے بچاؤ کی ضمانت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿وَالْعَصْرِ O اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ O اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾

(قسم ہے زمانے کی۔ بیشک انسان خسارے میں ہے۔ بجز ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔)

﴿وَالْعَصْرِ﴾ (قسم ہے زمانے کی۔)

قسم کی وضاحت

ہم اس سے پہلے بھی متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ جس لفظ یا جملے پر واوٗ قسمیہ آتی ہے اسے قسم کہتے ہیں اور اس کی حیثیت دلیل کی ہوتی ہے۔ اور اس کے بعد جو جملہ آتا ہے اسے جوابِ قسم کہتے ہیں اور اس کی حیثیت دعویٰ کی ہوتی ہے۔ گویا قسم دلیل بن کر اس دعوے کا اثبات کرتی ہے۔ اور کبھی اسی قسم کو شاہد یعنی گواہ کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ شاہد جوابِ قسم کے اثبات کے لیے گواہی دیتا ہے۔

عصر کا مفہوم

یہاں زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔ زمانہ کا لفظ عام طور پر تین معنوں پر بولا جاتا ہے

Marfat.com

ماضی، حال اور مستقبل۔ زمانے کے مجموعے پر تو دہر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ لیکن عصر زمانے کے اجزاء پر دلالت کرتا ہے۔ زمانے کا چونکہ غالب حصہ ماضی ہی ہے اس لیے جو آن کہنے کو اس وقت حال ہے وہ گزر کر ماضی بنتی جا رہی ہے۔ اور جو مستقبل ہے اس کی ہر گزرتی ہوئی گھڑی حال بن کر ماضی میں اتر جاتی ہے۔ گویا زمانہ جس کو عصر کہا گیا ہے اور جس کی قسم کھائی گئی ہے اس کا غالب استعمال گزرے ہوئے زمانے پر ہی ہوتا ہے۔ چاہے وہ ماضی بن چکا ہو یا وہ حال کی شکل میں ماضی کی طرف بڑھ رہا ہو۔ اقبال نے اس کو ٹھیک تعبیر دی:

جو تھا نہیں ہے جو ہے نہ ہوگا یہی ہے اِک حرفِ محرمانہ
قریب تر ہے نمود جس کی اسی کا مشتاق ہے زمانہ

اور بعض اہلِ علم کے نزدیک مستقبل صرف امید کا نام ہے۔ زمانے درحقیقت دو ہیں۔ ایک وہ زمانہ جو ماضی بن چکا ہے اور ایک وہ جسے ہم حال سمجھتے ہیں لیکن وہ تیزی سے ماضی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہاں دونوں طرح کے زمانوں کی قسم کھائی گئی ہے۔ گزرے ہوئے زمانے کی قسم کھانے کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ انسان نے ہمیشہ ٹھوکر کھائی ہے اور وہ نقصان میں رہا ہے بجز ان لوگوں کے جنھوں نے اپنے اندر متذکرہ چار صفات پیدا کر لی ہیں۔ تاریخ نے ماضی میں نافذ ہونے والے ان فیصلوں کا ذکر کیا ہے جو اللہ تعالیٰ کے قانونِ مکافات کے تحت انسانوں کے اعمال و افعال پر صادر کیے گئے۔ وہ قومیں چاہے عاد و ثمود ہوں یا قومِ لوط، قومِ نوح ہوں یا قومِ ہود ہوں تاریخ نے ان کے اعمال پر ہونے والے فیصلوں کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔ اور پھر اسی سے نتیجہ اخذ کرتے ہوئے گزرتے ہوئے زمانے کو دلیل بنایا گیا ہے جس میں ایک تو اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ زمانہ تیز رفتاری سے گزر رہا ہے اور یہ کسی کا انتظار نہیں کرتا۔ افراد ہوں یا قومیں وہ زمانے کی تیز رفتاری میں عروج و زوال کی منزلیں طے کرتی ہیں۔ لیکن زمانے کی تیز رفتاری میں کہیں کمی نہیں آتی۔ ہم اس کی تیز رفتاری کا صحیح تعین تو نہیں کر سکتے البتہ کسی حد تک اندازہ کرنے کے لیے اپنی گھڑی میں سیکنڈ کی سوئی کو حرکت کرتے ہوئے دیکھ کر کر سکتے ہیں۔ حالانکہ ایک سیکنڈ بھی وقت کی بہت بڑی مقدار ہے۔ اس میں روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا راستہ طے کر لیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے کہ افراد اور قوموں کی قسمتوں میں ایک سیکنڈ میں کتنے تغیرات واقع ہوتے ہیں۔ لیکن گزرتے ہوئے زمانے سے انسان کو اپنی زندگی بنانے کے لیے جو وقت دیا گیا ہے وہ درحقیقت اس کی عمر

Marfat.com

ہے۔ ایک فرد بھی اپنی عمر میں جو بن سکتا ہے، سو بنتا ہے۔ اور قومیں بھی ایک عمر پاتی ہیں اور وہی ان کی اجل ہے اور اسی پر ان کے بقاء و زوال کا دارومدار ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے اس وقت کا تصور کیا جاسکتا ہے جو امتحان گاہ میں ایک طالب علم کو پرچہ حل کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ اس طالب علم کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس بات پر ہے کہ وہ اس مہلتِ عمل اور اس مدتِ وقت سے کتنا فائدہ اٹھاتا ہے یا اسے ضائع کرتا ہے۔ اسے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس وقت کی قسم ہے جو تمھیں پرچہ حل کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ گھڑی کی سیکنڈ کی سوئی کو دیکھو کہ وہ تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اگر تم نے اسی تیزی سے کام نہ کیا تو تمھیں خسارے یعنی ناکامی سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ اسی طرح انسان کو بھی زمانے اور اس کی تیز رفتاری کی طرف متوجہ کر کے کہا گیا ہے کہ تمھاری عمر یہی مہلتِ عمل ہے اور یہ اس طرح ڈھل رہی ہے جس طرح برف پگھلتی ہے۔ اگر اس کے پگھلنے سے پہلے تم نے اس سے صحیح فائدہ نہ اٹھایا تو تمھیں ناکامی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔

ہو رہی ہے عمر مثلِ برف کم
رفتہ رفتہ لحظہ لحظہ دم بدم
سانس ہے اک رہروِ ملکِ عدم
دفعتاً اک روز یہ جائے گا تھم

﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾
(بیشک انسان خسارے میں ہے۔)

یہ ہے جوابِ قسم

یہ ہے وہ جوابِ قسم جس کو ثابت کرنے کے لیے زمانہ کی قسم کھائی گئی ہے۔ یعنی عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہی زمانہ ہے جو تیزی سے گزر رہا ہے۔ اس کو اگر ضائع کر دیا جائے اور صحیح صفات سے متصف کرنے کی بجائے اسے غلط کاموں میں صرف کر ڈالا جائے تو یہی انسان کا خسارہ ہے جس پر گزرتے ہوئے زمانے کی قسم کھائی گئی ہے۔

انسان کا لفظ اگرچہ واحد ہے لیکن اس سے مراد کوئی ایک انسان نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد کی آیت میں ان لوگوں کو اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے جو چار صفات سے متصف ہیں۔ اور ان لوگوں کو بغیر کسی تحدید کے ذکر کیا گیا ہے۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ یہاں انسان کا لفظ اسمِ جنس کے

Marfat.com

طور پر استعمال ہوا ہے اور اس کا اطلاق افراد، گروہوں، اقوام اور پوری نوعِ انسانی پر یکساں ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس انسان کے خسارے کی بات ہو رہی ہے وہ کوئی ایک انسان نہیں، نہ کسی خاص قبیلے سے اس کا کوئی تعلق ہے نہ وہ کسی گروہ کا نام ہے نہ کسی خاص علاقے کا رہنے والا ہے بلکہ اس سے مراد نوعِ انسانی کا ہر فرد ہے۔ قطع نظر اس سے کہ وہ واحد ہو یا جمع۔ وہ اس وقت تک خسارے میں رہے گا جب تک وہ ان چار صفات کو اختیار نہیں کر لیتا جو آگے بیان کی جا رہی ہیں۔

خسر کا مفہوم

اس آیت میں جو ''خسر'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ ہم نے خسارہ کیا ہے اس کا استعمال کسی محدود معنی میں نہیں ہوا۔ اس سے مراد نہ تجارتی خسارہ ہے نہ زرعی خسارہ نہ ملازمت کا نقصان نہ کسی اتفاقی حادثے سے پیش آنے والا نقصان، بلکہ یہ ایسا خسارہ ہے جو قرآنِ کریم فلاح کے مقابلے میں استعمال کرتا ہے اور یہ واضح ہے کہ قرآنِ کریم کا دیا ہوا تصورِ فلاح کسی دنیوی خوشحالی تک محدود نہیں بلکہ اس میں دنیوی اور اخروی دونوں کامیابیاں شامل ہیں۔ ایک شخص پُر ہیبت اقتدار کے تخت پر فائز ہے لیکن اس کی زندگی متذکرہ چار باتوں کے نور سے خالی ہے تو اس کی زندگی ایک ناکام زندگی ہے۔ لیکن ایک شخص جھونپڑے میں رہتا ہے، نانِ شبینہ کا محتاج ہے لیکن وہ ایمان و عملِ صالح کی دولت سے مالا مال ہے اور ہر حال میں حق پر استقامت اور دوسروں کی خیر خواہی اس کا وطیرہ ہے تو وہ ایک کامیاب انسان ہے۔

﴿إِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾

(بجز ان کے جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کی اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کی۔)

خسارے سے بچنے والوں کی چار صفات

قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ کہ ساری دنیا کے انسان خسارے میں پڑے ہوئے ہیں سوائے ان لوگوں کے جن میں آگے بیان کی جانے والی چار صفات موجود ہوں۔ ضروری ہے کہ ان چار صفات میں سے ایک ایک کو سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

Marfat.com

ایمان کا مفہوم

ان میں سب سے پہلی صفت ایمان ہے۔ ایمان کا لفظ اٰمَنَ سے بنا ہے۔ یہ لغت میں مختلف معنی کے لیے بولا جاتا ہے۔ اس کا ابتدائی معنی اگر چہ زبانی اقرار ہے۔ اور قرآنِ کریم نے بھی بعض جگہ اسے اسی معنی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن اس کی حقیقت کا تحقق اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کے ان تمام معانی کا استقصاء نہ کیا جائے جن معانی میں اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اٰمَنَہٗ، ای اعطاہ امنًا ''اس کو امن دیا۔'' اٰمَنَ لَہٗ کے معنی ہیں صَدَّقَہٗ وَاعْتَمَدَ عَلَیْهِ ''اس کی تصدیق کی اور اس پر اعتماد کیا۔'' اور اٰمَنَ بِہٖ اس کے معنی ہیں اَیْقَنَ بِہٖ ''اس پر یقین کیا۔'' قرآنِ کریم انہی معنوں میں ایمان کے لفظ کو استعمال کرتا ہے اور اسی کو حقیقی ایمان قرار دیتا ہے۔ اور قرآنِ کریم میں جابجا انھیں معنوں میں اس لفظ کا استعمال ہوا ہے۔ مثلاً

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا﴾

''مومن تو حقیقت میں وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر شک میں نہ پڑے۔''

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾

''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس پر ڈٹ گئے۔''

﴿فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ﴾

''پس نہیں، اے نبی! آپ کے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہیں جب تک کہ اپنے باہمی اختلاف میں آپ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ بھی آپ فیصلہ کریں اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں۔''

قرآنِ کریم کی یہ آیات اور اس کی ہم معنی دیگر آیات کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ایمان کا آغاز اگر چہ زبانی اقرار سے ہوتا ہے لیکن اس میں حقیقت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا اعتبار نہیں ہوتا جب تک اس میں یقین کی قوت پیدا نہ ہو۔ یعنی ایک ایمان لانے والا دینِ اسلام کی جن باتوں کو قبول کرتا ہے دل سے ان کی تصدیق بھی

Marfat.com

کرے۔ اور اس کا اعتماد عقل یا تجربے پر نہیں بلکہ وحیِ الٰہی اور اللہ تعالیٰ کے رسول کی ذات پر ہو۔ اس کا علم اور اس کی دانش اور وقت کا چلن چاہے اسے قبول کرنے سے انکار کردے لیکن اس کے دل میں انکار یا تشکک کی خراش بھی نہ آنے پائے۔ اور پھر یقین کے ساتھ خشیتِ الٰہی اور توکل علی اللہ کے تمام لوازم وشرائط بھی پائے جائیں۔ اور وہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کے فیصلوں پر راضی رہے تو یہ وہ ایمان ہے جس کی طرف اس آیتِ کریمہ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اس سورۃ مبارکہ میں مطلق ایمان کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا گیا کہ ایمان کن چیزوں پر لانا مراد ہے۔ لیکن قرآن وسنت کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وہ کون کون سی چیزیں ہیں جن پر ایک مومن کو ایمان لانا ضروری ہے۔ سب سے پہلے اللہ تعالیٰ پر ایمان لانا ہے۔ کیونکہ ایمان باللہ تمام ایمانیات کی جڑ ہے۔ یہی بنیاد ہے جس پر باقی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ اور اس ایمان سے مراد محض اس کے وجود کو ماننا نہیں بلکہ اس طرح ماننا ہے جس کی تفصیل اوپر ایمان کے معنی میں گزر چکی ہے۔ حالی مرحوم نے نہایت خوبصورتی سے اجمالاً اس کا ذکر کیا ہے:

کہ ہے ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زباں اور دل کی شہادت کے لائق
اسی کے ہیں فرماں اطاعت کے لائق
اسی کی ہے سرکار خدمت کے لائق
لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ
جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ
اسی پر ہمیشہ بھروسہ کرو تم
اسی کے سدا عشق کا دم بھرو تم
اسی کے غضب سے ڈرو گر ڈرو تم
اسی کی طلب میں مرو جب مرو تم
مبرا ہے شرکت سے اس کی خدائی
نہیں اس کے آگے کسی کو بڑائی

Marfat.com

۲۔ رسول کو ماننا، اس حیثیت سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا مامور کیا ہوا ہادی و رہنما ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے معصوم بنایا ہے۔ اس کی زبان سے کبھی جھوٹ سرزد نہیں ہوتا۔ اس کا ہر قول و فعل اور تقریر حجت ہے، اسے چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بھی لے کے آیا ہے وہ برحق اور واجب التسلیم ہے۔ اور وہ خاتم النبیین ہے کہ اس کے بعد کوئی تشریعی، ظلی یا بروزی نبی نہیں آئے گا۔ اسی ایمان بالرسالت میں ملائکہ، انبیاء، کتبِ الٰہیہ اور قرآنِ کریم پر بھی ایمان لانا شامل ہے۔

۳۔ آخرت کو ماننا، اس حیثیت سے کہ انسان کی موجودہ زندگی مکمل زندگی نہیں بلکہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ اور دنیا میں جو کچھ اس نے کیا اور جو کچھ کہا ہر قول و عمل کا حساب دینا ہے۔ نیک اعمال پر جزاء ملے گی اور برے اعمال پر سزا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے فرشتے اسے محفوظ کر لیتے ہیں۔ پروردگار کی نگاہ ہمیشہ اس کے تعاقب میں رہتی ہے۔ وہ ہر وقت اسے دیکھتا ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کی سیرت و کردار کی تعمیر کرتا ہے۔ اور جس میں یہ عقیدہ سرے سے موجود نہ ہو یا کمزور ہو اس کے ایمان، اخلاق اور سیرت و کردار کے لیے کوئی مضبوط حصار نہیں۔

صالحات پر عمل

دوسری چیز جو انسان کو خسارے سے بچانے کے لیے ضروری ہے وہ صالحات پر عمل کرنا ہے۔ اس میں دو لفظ ہیں، عمل اور صالحات۔ اسلام اگر محض ایک فلسفے کا نام ہوتا تو چند بنیادی حقائق کو تسلیم کر لینا اور ان پر یقین لے آنا کافی ہوتا۔ لیکن اسلام چونکہ ایک دین ہے، زندگی کا رویہ ہے، ایک طرزِ عمل ہے۔ اس لیے چند بنیادی حقائق کو تسلیم کرانے کے بعد وہ زندگی کے ہر شعبے کے بارے میں احکام دیتا ہے اور ان پر عمل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے احکام کی اصل روح اللہ تعالیٰ کی بڑائی کو تسلیم کرنا اس کو مطاعِ مطلق جاننا اور اپنے آپ کو اس کی اطاعت کے حوالے کر دینا ہے۔ اس روح کا تحقق ظاہر ہے اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک ان باتوں پر عمل کو لازم نہ کیا جائے جن کو صالحات کہا گیا ہے۔ ایمان درحقیقت ایک بیج ہے جو دلوں کی زمین میں کاشت کیا جاتا ہے اور اس سے پیدا ہونے والی پیداوار اعمالِ صالحہ ہیں۔ اگر کسی بیج سے کوئی پودا پیدا نہیں ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بیج زمین میں دفن ہو کے

Marfat.com

رہ گیا ہے۔ بالکل اسی طرح جس ایمان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا ظہور اعمالِ صالحہ کی شکل میں نہیں ہوتا تو وہ ایمان ایک مردہ بیج ہے جس کی تجدید ہونی چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم بار بار عملِ صالح کے ساتھ ایمان کا ذکر کرتا ہے۔ اور ایمان کے بعد عملِ صالح کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم ہیں۔ حقیقی ایمان کی تائید عملِ صالح سے ہوتی ہے۔ جس طرح صالح بیج کی تائید اس سے نکلنے والے پودے سے ہوتی ہے۔ اسی طرح عملِ صالح وہ ہے جس کی تہ میں ایمان کارفرما ہو۔ جس طرح خودرو پودوں پر اعتماد نہیں ہوتا، اسی طرح جو عمل ایمان سے وابستگی نہیں رکھتا اور اس کی جڑ میں ایمان موجود نہیں اور وہ اس ہدایت کی پیروی میں نہیں کیا جاتا جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے دی ہے تو اسے عملِ صالح نہیں کہا جا سکتا۔

دوسرا لفظ صالحات ہے، نیک کاموں کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد وہ تمام نیکیاں ہیں جن کا حکم شریعت نے دیا ہے، جو شریعت کے مزاج نے پیدا کی ہیں، جنھیں شرعی احکام اور شرعی مزاج نے ناپسند نہیں کیا، جنھیں امتِ اسلامیہ کا معروف ہونے کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایمان کا ثمر بھی ہیں اور ایمان اور امتِ مسلمہ کی علامت اور شناخت بھی۔

اعمالِ حسنہ کی صالحات سے تعبیر اس بات کی طرف بھی رہنمائی کرتی ہے کہ انسان کی تمام ظاہری و باطنی، دینی و دنیوی، شخصی و اجتماعی، جسمانی و عقلی، صلاح و ترقی کا ذریعہ اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ اور یہ وہ اعمال ہیں جو ایک مومن کی زندگی اور نشوونما کا سبب بن سکتے ہیں۔ اور جن کے ذریعے سے انسان ترقی کے ان اعلیٰ مدارج تک پہنچ سکتا ہے جو اس کی فطرت کے اندر ودیعت ہیں۔

ایمان وعمل جن کا تذکرہ ہم نے کیا ہے یہ وہ دو صفتیں ہیں جو ایک ایک فرد میں ہونی چاہئیں۔ ان دونوں صفات کے پیدا ہونے سے انفرادی طور پر ایک مومن تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر اسلام کی بنیادی صداقتوں کے ساتھ گہری وابستگی بھی پیدا ہو جاتی ہے اور اس کی سیرت وکردار کے لیے مضبوط بنیاد بھی فراہم ہو جاتی ہے۔ اور ان کے نتیجہ میں اس کے اندر حُسنِ سیرت اور کردار کی بلندی کا نور جگمگانے لگتا ہے۔ اس کے دل و دماغ بھی روشن ہوتے ہیں اور اس کی زندگی کا ہر شعبہ اور اس کے رویئے کا ہر پہلو طاہر اور مطہر ہو جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجیے کہ ایک سپاہی تیار ہو جاتا ہے جو لادینی قوتوں کے مقابلے میں اور شیطانی ارادوں کے

Marfat.com

علی الرغم ہر محاذ پر استقامت کی تصویر بن کر کھڑا رہ سکتا ہے۔ وہ ایک ایسی مشعلِ نور کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ جس سے ماحول کی تاریکیاں دور کی جا سکتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اسلام صرف اچھے افراد تیار کرنے کے لیے تو نہیں آیا اس کے پیشِ نظر اللہ تعالیٰ کی زمین کو ہر طاغوتی طاقت، ہر شیطانی استبداد اور ہر برائی اور گمراہی کو ختم کر کے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا تھا۔ بلاشبہ اسے صالح افراد بھی تیار کرنے ہیں کیونکہ وہ کشتی کبھی مضبوط نہیں ہوتی جس کے تختے دیمک زدہ ہوں۔ تختوں کی باہم پیوستگی اگرچہ ان کی طاقت کو بڑھا دیتی ہے لیکن اس کے لیے ہر تختے کا مضبوط ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

لیکن افراد کو ملت بننے کے لیے ضروری ہے کہ اس مشعل کی روشنی دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اس دریا سے صحراؤں اور چٹیل میدانوں کو سیراب کرنے کا کام لیا جائے۔ اس سپاہی کو میدانِ عمل اور میدانِ حرب میں اتارا جائے۔ اسی سے ملت بھی وجود میں آئے گی اور اللہ تعالیٰ کی زمین غیر اللہ کی چیرہ دستی سے آزاد ہو جائے گی۔

فرد قائم ربطِ ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

اس لیے مزید دو باتوں کا حکم دیا گیا۔

تواصی بالحق

پہلا حکم وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ کہ وہ ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں۔ حق اصل میں اس فیصلہ کن امر کو کہتے ہیں جو اپنی ذات اور اپنی صداقت کی قوت سے قائم ہو۔ اس حقیقی معنی کے اعتبار سے وہ باطل کی ضد ہے۔ لیکن اس کا استعمال مختلف معنوں میں ہوتا ہے اور وہ سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

۱۔ وہ بات جس کا واقع ہونا قطعی ہو۔

۲۔ جو عقل کے نزدیک مسلم ہو اور علم و دانش کے بدلتے ہوئے پیمانے اسے غلط ثابت کرنے سے عاجز ہوں۔

Marfat.com

۳۔ ایک ایسی بات جو صحیح اور سچی اور عدل و انصاف کے مطابق اور حقیقت کے مطابق ہو۔ اس کا تعلق عقیدہ و ایمان سے ہو یا دنیا کے معاملات سے۔

۴۔ وہ بات جو اخلاقاً فرض ہو خدا کے حق کے طور پر یا بندوں کے حق کے طور پر یا نفس کے حق کے طور پر۔ اور بندوں کے حقوق میں فقراء اور مساکین کے وہ تمام حقوق داخل ہیں جو خوشحال لوگوں پر لازم ہیں۔

اس حق سے وابستگی ایمان و عمل کا لازمی تقاضا ہے۔ لیکن اس وابستگی میں شکست و ریخت سے بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے کہ حق پر ایمان رکھنے والا اور اس سے گہری وابستگی رکھنے والا شخص اتنا حساس ہو کہ باطل کی پرچھائیں بھی اس پر نہ پڑ سکے۔ جس طرح آنکھ میں اگر غبار پڑ جائے تو آنسو آ کر اسے دھوڈالتا ہے۔ اسی طرح اگر کبھی مومن پر پراپیگنڈے کے نتیجے میں یا خواہشات کے ہجوم میں یا بگڑے ہوئے ماحول کے زیرِ اثر کبھی کوئی گناہ کا چھینٹا ایمان پر پڑ ہی جائے تو اس وقت تک وہ بے قرار رہے جب تک اسے دھو نہ ڈالے۔ اور اگر کہیں دامن بھیگ جائے تو ہاتھوں میں ایسی قوت ہونی چاہیے کہ اسے نچوڑ ڈالے۔ اس گہرے احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد دوسرے فرد کو جگائے رکھتا ہے اور ہر فرد دوسرے کی نگرانی کرتا ہے کہ کوئی غلط بات کسی مومن پر حملہ آور ہونے کی جرأت نہ کرے۔ اور اسلامی معاشرے کا ہر فرد حق پرستی اور راست بازی اور عدل و انصاف پر قائم رہنے اور حقداروں کے حقوق ادا کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ دوسروں کو بھی اسی طرزِ عمل کی نصیحت کرتا رہے۔ یہ وہ چیز ہے جو معاشرے کو اخلاقی زوال کے انحطاط سے بچانے کی ضامن ہے۔ اور اگر اس کی طرف سے بے اعتنائی اور بے حسی پیدا ہو جائے تو پھر خسران سے بچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اس سے تہی دامن لوگ اگر اپنی ذات میں حق پر قائم بھی رہیں مگر معاشرے کو حق پر قائم رکھنے کی کوشش نہ کریں اور لادینی قوتوں کے خلاف دیوار نہ بنیں تو ایسے پاکیزہ لوگ معاشرے کو غیر اسلامی تصورات سے بچا نہیں سکتے۔ بلکہ جب لادینیت کا طوفان اٹھے گا تو یہ بھی اس میں بہہ جائیں گے۔ باپ اپنے بیٹے کی طغیانی کی نذر ہو جائے گا اور ماں اپنی بیٹی کی تہذیبی رعونت میں بہہ جائے گی۔ قرآنِ کریم میں جابجا ایسی قوموں پر تنقید کی گئی ہے کہ جن کے نیک اور اہلِ علم لوگ دوسروں کو برے افعال سے روکتے نہیں تھے۔ سورۃ المائدہ میں اسی جرم کے باعث بنی اسرائیل پر حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی زبان سے لعنت کی گئی ہے۔ اور سبت کے احکام کی خلاف ورزی

Marfat.com

کے نتیجے میں ان لوگوں پر بھی عذاب نازل کر دیا گیا جو خود اس جرم میں شریک نہیں تھے لیکن دوسروں کو روکنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کیا گیا ہے۔

تواصی بالصبر

آخری چیز جو اہلِ ایمان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے لازمی قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی اطاعت میں اگر مشکلات پیش آئیں تو گھبرانے کی بجائے صبر و استقامت کی تصویر بن جائیں۔ اسلام نے جن باتوں کی پابندی کا حکم دیا ہے انھیں بجا لانے پر صبر کریں یعنی اطاعت میں کمزوری نہ آنے دیں اور اپنے طریقے پر جمے رہیں۔ ہر چند کہ معاشرہ گناہوں پر ہر ممکن طریقے سے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ مگر اس کی ترغیبات اور اس کے پریشرز پر صبر کریں یعنی گناہوں سے اجتناب کریں۔ اور اگر نیکی پر عمل کرتے ہوئے کسی نقصان یا سزا کا سامنا کرنا پڑے تو اس پر صبر کریں یعنی اسے برداشت کریں۔ یعنی صبر علی المصائب، صبر علی الطاعات اور صبر عن المعصیات کا پیکر بن جائیں۔ جب ایک امت ان صفات سے متصف ہو کر میدانِ عمل میں نکلے گی تو باطل ان کا راستہ روک نہیں سکے گا۔ اور جب تک وہ ان صفات سے متصف رہے گی تو حق کا پرچم سربلند رہے گا اور کوئی طوفان ان کو سرنگوں نہ کر سکے گا اور کوئی آندھی ان کی روشن کی ہوئی شمع کو بجھا نہ سکے گی۔ عہدِ نبوت اور عہدِ صحابہ کے شب و روز اس کی زندہ گواہی ہیں۔ اور تاریخ کبھی اس سے انکار نہیں کر سکتی۔

مختصر یہ کہ زمانہ اس بات کا گواہ ہے کہ عہدِ ماضی میں وہ قومیں ہمیشہ شکست و ریخت کا شکار ہوئیں جنھوں نے ایمان و عمل، ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور راہِ حق میں آنے والی مشکلات میں صبر سے کنارہ کشی کی۔ اور گزرتا ہوا زمانہ بھی اس بات پر شاہد ہے کہ امتِ مسلمہ جو کبھی اس دھرتی کی سب سے بڑی قوت تھی اور جس نے زندگی کے ہر میدان میں سچائی اور راستی کی شمع روشن کی تھی اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اطاعت کے چراغ جلائے تھے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا عنوان بن کر رہی تھی آج وہ زوال کے انتہائی دور سے گزر رہی ہے۔ لادینی قوتیں اس طرح اس پر حملہ آور ہیں جیسے بھوکے دسترخوان پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

Marfat.com

اور وہ اپنی افرادی قوت کی بے پناہی کے باوجود اپنا دفاع کرنے پر قادر نہیں۔ وجہ اس کی صرف ایک ہی ہے کہ ان کے ایمان اور عمل میں خرابیوں کی ہر قسم در آئی ہو۔ وہ ایمان کی بجائے تشکک اور ارتیاب کی تصویر بن گئے ہیں۔ ان کا علم اور دانش غیروں کے ایجنٹ اور اپنوں کے دشمن بن گئے ہیں۔ ان کی قوتِ حاکمہ لادینی قوتوں کی آلہِ کار بن کر رہ گئی ہیں۔ انھیں نہ آخرت کا یقین ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر بھروسہ ہے۔ ان کے اعمال بدترین قسم کی بداعمالیوں کی تصویر بن گئے ہیں۔ بدعملی اور بےعملی کا ہر روگ ان میں پایا جاتا ہے۔ مسجدیں نمازیوں کی کمی پر مرثیہ خواں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے راستے پر چلنے والے اپنوں کے ہاتھوں سے ادھیڑے کھدیڑے جا رہے ہیں۔ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کا ایک ایک ٹانکا ٹوٹ کر رہ گیا ہے۔ لیکن پیشِ نظر سورۃ مبارکہ کا سبق یہ ہے کہ ہم جب تک عہدِ رفتہ کی طرف نہیں لوٹیں گے اور اس صورت میں بیان کردہ حقائق کو مشعلِ راہ نہیں بنائیں گے اس وقت تک خسارے سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ ہم جیسے جیسے اندھیروں کی طرف بڑھتے جا رہے ہیں ویسے ویسے روشنی کی ضرورت فراواں ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بزمِ آب و گل جتنی کہ برہم ہوتی جاتی ہے
محمدؐ کی شریعت اور محکم ہوتی جاتی ہے

Marfat.com

52- توحید کامل ایمان کی خشتِ اوّل ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنْ لَّا نَبِیَّ بَعْدَہٗ
اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ
بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمَانِ الرَّحِیْمِ
﴿قُلْ هُوَاللّٰهُ اَحَدٌ O اَللّٰهُ الصَّمَدُ O لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ O وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ﴾

(کہہ دیجیے! وہ اللہ ہے یکتا۔ اللہ صمد ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔)

قُلْ کا مفہوم

سب سے پہلے آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ آپ کہہ دیجیے یعنی اعلان کر دیجیے اور جو سوالات آپ سے کیے جارہے ہیں ان کے جواب میں یہ سورۃ ان کو پڑھ کر سنا دیجیے۔ بعض اہلِ علم کا خیال یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد قریش میں سب سے زیادہ جس موضوع پر بحث ہوتی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کی وحدانیت تھی۔ کیونکہ حضور ﷺ اپنی دعوت میں سب سے زیادہ زور اسی مرکزی مضمون پر دیتے تھے۔ اگرچہ رسالت اور معاد بھی ہر مجلس کا موضوع تھے، لیکن ان کی حیثیت ضمنی مباحث کی تھی، توحید کا مسئلہ سب سے اہم تھا۔ دنیا کا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی بات پر گرما گرمی ہوتی اور وہ ہر مجلس کا موضوع بن جاتی اور بات بحث ومناظرہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کے ختم کرنے کی یہی ایک صورت ہے کہ اس کا دوٹوک انداز میں اعلان کردیا جائے تاکہ بحث کرنے والی زبانیں بند ہوجائیں۔ اس لیے آنحضرت ﷺ کو قُلْ کے ذریعے اس بات کا حکم دیا گیا۔ لیکن یہ بات

Marfat.com

جو بعض روایات میں کہی گئی ہے کہ لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا تھا کہ آپ جس رب کی طرف ہمیں دعوت دے رہے ہیں، وہ کون ہے؟ اس کا آپ ہم سے تعارف کرائیے تو اس بات کی کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اس عاجز کا گمان یہ ہے کہ جب ہم اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآنِ کریم قریش کے اسلوب پر نازل ہوا ہے اور بالخصوص اس کا اندازِ تخاطب اور سوالات کا انداز وہی ہے اور کسی بات کو سمجھنے کا اسلوب بھی وہی ہے جو قریش کا عام طریقہ تھا، تو پھر ان روایات کے انکار کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ قریش کا یہی طریقہ تھا کہ جب کوئی اہم بات ان کے سامنے آتی تھی اور کسی ذات کی طرف انھیں دعوت دی جاتی تھی۔ تو وہ سب سے پہلے اس کا تعارف چاہتے تھے اور ان کا انداز یہ تھا کہ وہ یہ کہتے کہ اس کا نسب بیان کیجیے۔ اور مراد یہ ہوتی تھی کہ اس کی پہچان کی جو باتیں کہی جاسکتی ہیں وہ آپ ہم سے کہیے۔ اور ان دونوں باتوں میں کوئی تعرض نہیں کہ ان کی مجالس میں توحید سب سے اہم موضوع تھا اور آنحضرت ﷺ جب انھیں توحید کی دعوت دیتے تھے یا اپنے رب کی طرف بلاتے تھے تو وہ اس رب کا تعارف چاہتے تھے جس کی انھیں دعوت دی جارہی تھی، انجام کے اعتبار سے بات ایک ہی ہے۔

آیت کی ترکیب اور مفہوم

هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ اگر هُوَ کو ضمیرِ شان قرار دیا جائے، جب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور اگر یہ کہا جائے کہ هُوَ مبتداء ہے اور اللہ اس کی خبر ہے تو تب بھی بات وہی ہے۔ اور اگر اس بات کو مزید کھول دیا جائے کہ اَحَدٌ اس کی دوسری خبر ہے تو تب بھی کوئی فرق پڑنے کی بجائے بات اور زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جس رب کی طرف تمھیں دعوت دے رہا ہوں اور جس کا تم مجھ سے تعارف چاہتے ہو، وہ کوئی ایسا رب نہیں جو تمھارے لیے اجنبی ہو، بلکہ وہ اللہ ہے۔ یعنی وہی ہستی ہے جس کو تم اللہ کے نام سے جانتے ہو۔ اور اللہ رب کے لیے اسمِ ذات ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا۔ فارسی کے خدا یا انگریزی کے گاڈ (God) کی طرح اسمِ نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جا سکے۔ اس کی نہ جمع آتی ہے نہ یہ کسی لفظ سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن ہے۔

Marfat.com

نزولِ قرآن سے پہلے بھی عربوں میں اللہ کا لفظ خدا کے لیے بطور اسمِ ذات کے ہی مستعمل تھا جیسا کہ شعراء جاہلیت کے کلام سے ظاہر ہے بلکہ نوعِ انسانی کے دینی تصورات کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے تصورِ توحید میں جب بگاڑ پیدا ہوا اور شرک کی مختلف صورتیں پیدا ہوئیں تو ان میں اہم تر مظاہرِ فطرت کی پرستش تھی۔ اسی پرستش نے بتدریج اصنام پرستی کی صورت اختیار کی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مختلف زبانوں میں مختلف الفاظ دیوتاؤں کے لیے پیدا ہوگئے اور جوں جوں پرستش کی نوعیت میں وسعت ہوتی گئی الفاظ کا تنوع بھی بڑھتا گیا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اصنام پرستی کی اس وسعت کے باوجود ایک ایسی ہستی کے تصور سے انسان کا ذہن کبھی خالی نہیں رہا جو سب سے اعلیٰ اور سب کو پیدا کرنے والی ہستی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ تمام قوموں میں کوئی نہ کوئی لفظ ایسا ضرور مستعمل رہا جس کے ذریعے سے اس ان دیکھی اور اعلیٰ ترین ہستی کو پکارا جاتا تھا بلکہ یہ دلچسپ حقیقت ہے کہ سامی زبانوں میں حروف واصوات کی ایک خاص ترکیب موجود رہی ہے جو اس معبودِ اعلیٰ کی طرف اشارہ کرتی ہے اور تمام زبانوں میں اس کا مادہ مشترک رہا ہے۔ چنانچہ کلدانی اور سریانی کا "الاھیا" عبرانی کا "الوہ" اور عربی کا "اِلٰہ" اسی سے ہے اور بعض علماء کے نزدیک یہی اِلٰہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مگر بیشتر علماء الف، لام کو تعریف کے لیے نہیں مانتے بلکہ اسے اس نام کا جزو قرار دیتے ہیں۔ اس لیے وہ لفظ اللہ کو کسی سے مشتق نہیں مانتے اور نہ اس سے کسی کو مشتق مانتے ہیں۔ چنانچہ یہی لفظ اللہ ہے جسے قرآنِ کریم نے بطور اسمِ ذات کے اختیار کیا اور تمام صفتوں کو اس کی طرف نسبت دی۔ ارشاد ہوا:

﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا﴾

''اللہ کے لیے حسن وخوبی کے نام ہیں (یعنی صفتیں ہیں) پس چاہیے کہ
اسے ان صفتوں کے ساتھ پکارو۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہِ طور پر جن کلماتِ الٰہی کے ذریعے ذاتِ حق سبحانہٗ کا عرفان بخشا گیا وہ یہ ہیں اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا (طٰه:۱۴) اس میں بھی پروردگار نے لفظ اللہ کو بطور اسمِ ذات کے اختیار فرمایا اس لفظ کی معنوی بحث تو آگے آئے گی اس کے خواص لفظی کے سلسلہ میں ہم چند باتیں عرض کرتے ہیں:۔

Marfat.com

اللہ کے لفظی خواص

۱۔ یہ لفظ عجیب شان رکھتا ہے کہ جس کلمۂ توحید کے ذریعے اللہ نے اپنا تعارف کرایا یعنی لاَاِلٰہَ اِلّا اللّٰہ اور اسے مسلمانوں کا شعار بنایا۔ اس میں غور کریں تو آپ دیکھیں گے کہ اس کلمۂ توحید میں کوئی بھی زائد حرف موجود نہیں۔ وہی حروف ہیں جو اسمِ ذات کے اندر موجود ہیں، انہی کی ترکیب سے کلمۂ توحید کو متشکل کیا گیا۔

۲۔ اللہ کا اگر حرف ''ھمزہ'' نہ لکھا جائے تو للہ پڑھا جائے گا۔ جس کے معنی ہیں ہر شے اللہ ہی کی ملک ہے۔

لِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (منافقون:۷)

۳۔ للہ سے ایک لام کم کر دیا جائے تو (لہ) اور مزید ایک لام کرنے سے صرف (ہ) رہ جائیگا۔ جس کا تلفظ ''ھو'' ہے۔ یہ حرف واحد بھی اسی ذاتِ احد پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے ''قُلْ ھُوَاللّٰہُ اَحَدٌ'' ''ھُوَالْحَیُّ لَآاِلٰہَ اِلَّا ھُوَ''

۴۔ یہ اسی لفظ اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس پر تائے قسم وارد ہوتی ہے۔ ورنہ حرف ''تا'' بمعنی قسم اور کسی اسم پر وارد نہیں ہوتا۔

۵۔ اس اسمِ پاک کا ایک خاصہ یہ ہے کہ الحمد کا استعمال اسی اسمِ ذات کے لیے خاص ہے اور کسی اسم کے ساتھ الحمد کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ الحمد للّٰہ کہیں گے۔ الحمدللرحمن یا الحمد للرحیم وغیرہ نہیں بولا جاتا۔ وجہ یہ ہے کہ جس طرح یہ اسمِ پاک مسمّٰی کی ذات وصفات سب پر حاوی ہے اسی طرح لفظ حمد بھی تمام صفاتِ کمال و جمال کا جامع ہے۔ لہٰذا کامل اسم کے لیے کامل تر نعت کی ضرورت تھی۔

۶۔ یہ بھی اسم اللہ ہی کا خاصہ ہے کہ اس کے آخر میں حرف ''م'' شامل کیا جاتا ہے اور وہ حرفِ ندا کا کام دیتا ہے اور اس کے ساتھ حرفِ ندا شامل نہیں ہوتا یعنی یااللھم نہیں کہتے بلکہ اللّٰھم کا معنی ہے ''اے اللہ'' قرآنِ کریم نے کئی جگہ اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً

﴿قُلِ اللّٰھُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ

Marfat.com

الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ط اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾(آلِ عمران: ٢٦)

یہ تو تھے اس اسمِ پاک کے خواص لفظی اب دیکھئے اس کی معنوی بحث کو۔ پیچھے گزر گیا کہ بعض علماء کے نزدیک لفظ ''اللہ'' وہ عربی کا اِلٰہ ہے جو حرف تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر اللہ، اِلٰہ سے ہے تو اِلٰہ کے معنی کیا ہیں؟ علماء لغت واشتقاق نے مختلف اقوال بیان کیے ہیں۔ جنھیں ہم تفسیر کبیر کے حوالہ سے یہاں نقل کرتے ہیں۔

۱۔ الهت الی فلاں سے مشتق ہے۔ جس کے معنی ہیں سکنت الی فلاں یعنی اللہ وہ ہے جس کے نام سے دلوں کو تسکین ملتی ہے اور قلبِ مضطر کو سکون۔ جیسے قرآنِ کریم کہتا ہے اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (الرعد: ٢٨)

۲۔ اِله، وله سے مشتق ہے جس کے معنی وارفتگی، تحیر اور درماندگی کے ہیں۔

۳۔ اله لاہ سے مشتق ہے۔ جس کے معنی بلند شان کے ہیں یعنی اللہ وہ ہے جو لوازمات مادہ سے زمان و مکان کے احاطہ سے اور عقلمندوں کے فہم وادراک سے ارفع اور بلند ہے۔

۴۔ لاہ یلوہ لاهیا سے مشتق ہے۔ جس کے معنی پوشیدہ اور مستور ہونا ہے یعنی اللہ وہ ہے جس کی ذات عقول سے محجوب ہے۔

۵۔ اِله الفیصل سے بنا ہے۔ یعنی اونٹنی کا بچہ جب بچھڑنے کے بعد ماں کو ملتا ہے تو وہ ماں سے چمٹ جاتا ہے۔

اسی طرح اللہ وہ ہے کہ آفات ومصائب میں انسان اسی کی جانب لپکتا ہے اور وہیں اسے تسکین ملتی ہے۔

۶۔ اله الة (سمع) سے بنا ہے۔ محاورہ ہے "اله علی فلاں" اس سے ڈرتا رہا۔ اله الة اس کی پناہ ڈھونڈی۔

یعنی اللہ وہ ہے جو خوف وہراس کے وقت بندوں کی پناہ ہے۔ تمام عالم اور تمام مخلوقات اس کی حفاظت میں ہر ایک خطرہ سے محفوظ ہیں۔

ان تمام معنوں پر اگر تدبر سے کام لیا جائے تو چند باتیں صاف معلوم ہوتی ہیں۔ ایک

Marfat.com

یہ کہ اللہ ہی کی ذات ہے جہاں پریشانی اور مصیبت میں قرار اور پناہ ملتی ہے۔ وہی آغوش ہے جہاں انسان سکون پاتا ہے۔ دل اس کی طرف لپکتے ہیں۔ محبتیں اسی کے لیے بے تاب ہوتی ہیں اور دوسری یہ بات کہ اگر اس ذات کی حقیقت کو جاننے کے لیے فہم وادراک سے کام لیا جائے اور انسان کے پاس جتنے علوم دستیاب ہیں ان سب کو اس راستے میں استعمال کر کے دیکھ لیا جائے اور ظن وتخمین کے تمام آلات بھی استعمال کر لیے جائیں تو حقیقت یہ ہے کہ بجز اس کے کہ انسان تحیر اور درماندگی کا شکار ہو جائے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کی ہستی میں غور وخوض کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی۔ اس لیے کہ ایک مخلوق اپنی فہم وادراک کی وسعتوں کے باوجود مخلوق ہی ہے۔ وہ اپنے دستیاب وسائل میں ایک خالق کی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتا۔ انسانی ذہن مخلوقات میں قدرت کا شاہکار ہے، لیکن وہ بہرحال مخلوق اور محدود ہے۔ محدود میں غیر محدود کبھی نہیں سما سکتا، اکبر مرحوم نے خوب کہا:

جو ذہن میں گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا
جو سمجھ میں آ گیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

البتہ! اس سے اگر اپنی ذات میں فہم وادراک کی نارسائی اور اپنی عجز ودرماندگی کا اعتراف نصیب ہو جائے تو یہ وہ دولت ہے جو عبدیت کی معراج ہے۔ اس وجہ سے جو لوگ عرفان وبصیرت کی راہ کے سالک ہیں ان کے ادراک کا منتہا ہمیشہ یہی رہا رب زدني فيك تحيرا ''اے اللہ! ہمیں اپنے بارے میں ایسا کر کہ تیرے بارے میں ہمارا تحیر ہمیشہ بڑھتا رہے'' اس لیے اگر اس لفظ کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے تو وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ جل جلالہٗ وہ ذات ہے جس کو جاننے اور سمجھنے کے لیے تمام فہم وادراک کی قوتیں عاجز ودرماندہ ہیں۔ البتہ! انسان کے پریشان دل کو اس وقت تک قرار نصیب نہیں ہوگا اور اس کے الجھے ہوئے مسائل کی گرہ اس وقت تک نہ کھلے گی جب تک اللہ کے ذکر سے زبانیں زمزمہ سنج نہیں ہوں گی اور اس کی دی ہوئی تعلیمات سے انسان کی فکر روشن نہیں ہو گی۔

آیتِ کریمہ میں فرمایا گیا ہے اللہ احد ہے۔ اہلِ لغت نے واحد اور احد میں یہ فرق کیا ہے کہ احد وہ ہے جس کی ذات میں کوئی شریک نہ ہو۔ اور واحد وہ ہے جس کی صفات میں کوئی شریک نہ ہو۔ غالباً اسی وجہ سے لفظِ احد اللہ تعالیٰ کے سوا صفت کے طور پر نہیں آیا۔ اس

Marfat.com

سے یکتائی و بے ہمگی من کل الوجوہ سمجھی جاتی ہے۔ ہر رشتہ وقرابت سے پاکی و برتری اس کا لازمہ ہے۔ اس سے یہ بات بھی نکلی ہے کہ وہ قدیم اور باقی سارے حادث ومخلوق۔ وہ چونکہ احد ہے اس لیے اس میں کسی حیثیت سے کثرت کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ اجزاء سے مرکب وجود نہیں ہے جو قابلِ تجزیہ وتقسیم ہو، جو کوئی شکل اور صورت رکھتا ہو، جو کسی جگہ میں رہتا ہو یا کوئی چیز اس کے اندر جگہ پاتی ہو جس کا کوئی رنگ ہو، جس کے کچھ اعضاء ہوں، جس کی کوئی سمت اور جہت ہو اور جس کے اندر کسی قسم کا تغیر وتبدل ہوتا ہو۔ تمام اقسام کی کثرتوں سے بالکل پاک اور منزہ وہ ایک ہی ذات ہے جو ہر لحاظ سے احد ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ وہ قدیم لم یزل اور خالقِ کل ہے۔

صَمَد کا مفہوم

اَللّٰہُ الصَّمَدُ اللہ تعالیٰ کی صفت احد کے بعد دوسری صفتِ صمد لائی گئی ہے تاکہ لفظِ احد سے اللہ تعالیٰ کی یکتائی اور بے ہمگی کا جو تصور سامنے آتا ہے اس سے مغلوب ہو کر کوئی اللہ تعالیٰ کو ایک بالکل الگ تھلگ اور خاموش علۃ العلل نہ سمجھ بیٹھے۔ ورنہ یہ غلط فہمی بھی دوسرے سہارے کی تلاش کا سبب بن سکتی ہے۔ اس غلط فہمی سے بچانے کے لیے اللہ الصمد کہہ کر وضاحت فرما دی ہے کہ بے شک اللہ ہے تو سب سے الگ، بے نیاز و بے ہمہ مگر وہ سب کی خبرگیری اور دستگیری بھی کرتا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس لفظ کی تھوڑی سی معنوی تشریح کر دی جائے۔ عربی زبان میں یہ لفظ اور اس مادے سے نکلنے والے الفاظ کے اگر معانی دیکھے جائیں تو اس لفظ کی معنوی وسعت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ اسی معنوی وسعت کی وجہ سے صحابہ تابعین اور بعد کے اہلِ علم سے اس لفظ کی تعریف میں مختلف اقوال منقول ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمام اقوال اس کے کسی نہ کسی معنی کو نمایاں کرتے ہیں۔ وہ سب کے سب صحیح ہیں اگر انھیں جمع کر دیا جائے تو ایک ایسی تصویر بن جاتی ہے جو پروردگار کے اس اسمِ پاک کی معنوی وسعتوں کو کسی حد تک واضح کر دیتی ہے۔ ہم بغیر نام کے حوالے کے وہ اقوال ذکر رہے ہیں۔

۱۔ وہ جس سے بالاتر نہ ہو۔

۲۔ وہ سردار جس کی سیادت کامل ہو اور انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔

۳۔ جس کی طرف لوگ کسی بلا یا مصیبت نازل ہونے پر مدد کے لیے رجوع کریں۔

Marfat.com

۴۔ وہ سردار جو اپنی سیادت میں، اپنے شرف میں، اپنی عظمت میں، اپنے علم میں اور بردباری میں اپنے حلم میں اور اپنی حکمتِ عملی میں کامل ہو۔

۵۔ وہ جو سب سے بے نیاز ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔

۶۔ وہ جس میں سے نہ کوئی چیز کبھی نکلی ہو نہ نکلتی ہو، جو نہ کھاتا ہو نہ پیتا ہو۔

۷۔ وہ جو اپنی تمام صفات اور اعمال میں کامل ہو۔

۸۔ وہ جو بے عیب ہو۔

۹۔ جو باقی رہنے والا اور لازوال ہو۔

۱۰۔ جس کے حکم اور فیصلے پر نظر ثانی کرنے والا کوئی نہ ہو۔

۱۱۔ وہ جو کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں اور سب لوگ اپنی حاجتوں کے لیے اس کی طرف رجوع کریں۔

سورۃ الاخلاص میں اللہ احد کے بعد اللہ الصمد کہا گیا۔ یعنی احد نکرہ اور الصمد معرفہ لایا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اصلی اور حقیقی صمد اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ مخلوق اگر کسی حیثیت سے صمد ہو بھی تو کسی دوسری حیثیت سے وہ صمد نہیں ہے کیونکہ وہ فانی ہے، لازوال نہیں۔ قابلِ تجزیہ وتقسیم ہے۔ مرکب ہے کسی وقت اس کے اجزاء بکھر سکتے ہیں۔ بعض مخلوقات اس کی محتاج ہیں تو بعض کا وہ خود محتاج ہے۔ کسی کے مقابلے میں وہ برتر ہے تو اس کے مقابلے میں کوئی اور برتر ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ کی صمدیت ہر لحاظ سے کامل ہے ساری دنیا اس کی محتاج ہے اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ دنیا کی ہر چیز اپنے وجود وبقاء اور اپنی حاجات وضروریات کے لیے شعوری یا غیر شعوری طور پر اسی کی طرف رجوع کرتی ہے اور وہ سب کی تمام حاجات پوری کرنے والا ہے۔ وہ غیر فانی اور لازوال ہے۔ رزق دیتا ہے لیتا نہیں۔ مفرد ہے مرکب نہیں۔ ساری کائنات پر اس کی سیادت قائم ہے اور وہ سب سے برتر ہے۔ اس لیے محض صمد نہیں بلکہ الصمد ہے یعنی ایک ہی ایسی ہستی ہے جو حقیقت میں صمدیت سے بتمام وکمال متصف ہے۔

پھر اس کے الصمد ہونے سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ وہ ایک معبود ہو یکتا اور یگانہ کیونکہ انسان عبادات اسی کی کرتا ہے جس کا وہ محتاج ہو اور اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہ ہو کیونکہ جو حاجت روائی کی طاقت اور اختیارات ہی نہ رکھتا ہو اس کی بندگی اور عبادت کوئی ہوش مند آدمی نہیں کرسکتا ہے۔

Marfat.com

شرک سے پیدا ہونے والے واہموں کا ازالہ

لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ''نہ اس کی کوئی اولاد ہے، اور نہ وہ کسی کی اولاد۔'' مشرکین نے ہر دور میں جو شرک کے مختلف راستے نکالے ہیں اس میں ایک یہ بھی ہے کہ انھوں نے انسانوں کی طرح خداؤں کی بھی ایک جنس تصور کی ہے جس کے بہت سے افراد ہیں۔ جن میں شادی بیاہ اور توالد و تناسل کا سلسلہ چلتا ہے اور ایسا تصور کرنے والے صرف جاہل اور غیر متمدن اقوام ہی نہیں بلکہ اس گمراہی میں وہ قومیں بھی بری طرح مبتلا رہی ہیں جو انبیاء و رسل پر ایمان لائی تھیں اور جن کے پاس آسمانی کتب موجود تھیں۔ اگر عرب کے جاہل مشرک فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے تو یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی امت اور تورات کے حامل حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا فرزند کہتے تھے اور عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا کہتے تھے۔ حالانکہ معمولی عقل کا آدمی سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس طرح کے تصورات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک نہیں بلکہ باقاعدہ خداؤں کی ایک جنس ہے اور ان میں خدائی کے اختیارات موجود ہیں۔ اس سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ ان کے یہاں اگر اولاد ہوتی ہے تو پھر وہ جسم بھی رکھتے ہیں، ان میں نر اور مادہ کی تقسیم بھی ہے، ان میں اتصال بھی ہوتا ہے اور پھر ان میں ہر ایک فانی بھی ہے اور تمام فانی افراد کی طرح نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کی بھی ایک ابتداء اور انتہاء ہے۔ اور اس سے یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس طرح ایک لاولد شخص اپنی زندگی میں کسی مددگار کا اور اپنی وفات کے بعد کسی وارث کا حاجت مند ہوتا ہے، اسی طرح ایسا خدا بھی ان دونوں باتوں سے موصوف ہوگا۔ اسی طرح کی اور کمزوریاں بھی ہیں جو ان مشرکانہ تصورات سے خود بخود جنم لیتی ہیں۔ اولاً تو اللہ تعالیٰ نے اللہ الصمد کہہ کر ہی ان تمام مفروضات کی جڑ کاٹ دی ہے، لیکن پیشِ نظر آیت نے تو ان باطل تصورات کو یکسر مٹا ڈالا اور واضح کیا کہ نہ اس کا کوئی بیٹا اور نہ وہ کسی کا بیٹا ہے۔ وہ لم یزل ولایزال ہے۔ فنا و حدوث سے منزہ اور پاک ہے۔ ساری مخلوقات اس کے سامنے سر جھکائے کھڑی ہیں۔ اس کو کیا ضرورت ہے کہ کسی کو بیٹا بنائے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ''اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔'' کُفُوْ ہمسر کو کہتے ہیں جو قدرت، علم، حکمت اور دیگر صفات میں ہم پلہ اور ہم پایہ ہو۔ کائنات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو کسی پہلو، کسی جہت اور کسی انداز سے اللہ تعالیٰ کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ سب اس کے

Marfat.com

بندے ہیں، اس کی مخلوق ہیں، اسی کے حضور سجدہ ریز ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے ''علماء لکھتے ہیں کہ شرک کبھی عدد میں ہوتا ہے۔ احد کہہ کر اس کی نفی فرمادی۔ اور کبھی مرتبہ و منصب میں ہوتا ہے، صمد کہہ کر اس کا بطلان کردیا۔ کبھی نسب میں ہوتا ہے، لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ سے اس کا ابطال کردیا۔ اور کبھی کوئی کام کرنے اور اثر اندازی میں ہوتا ہے، اس کی تردید وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ سے کردی ہے۔ توحید کے اسی جامع مضمون کے باعث اس سورۃ کو سورۃ الاخلاص کہا جاتا ہے۔

Marfat.com

خطباتِ صدیقی

ایمانیات • عبادات • اصلاح و تربیت

اور اجتماعی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات

مولانا ڈاکٹر محمد اسلم صدیقی

نشریات

Marfat.com